ایک خواب

Dreams make reality. "خواب حقیقت کی تعبیر کرتے ہیں" ایک مقولہ ہے، جس پر شیخ طریقت حضرت شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی چشتی حفظہ اللہ بھی یقین رکھتے ہیں۔ اسی یقین کے تحت انھوں نے ایک خواب سجایا ہے۔ وہ خواب ہے شریعت وطریقت، مدرسہ وخانقاہ، جدید وقدیم، تحقیق وتفکیر، جذب وسلوک، قال وحال اور دعوت واصلاح کے اجتماع اور جسم وروح کے علاج کا۔ خدا بندے کے گمان کے قریب ہے (انا عند ظن عبدی بی) پر انہیں کامل اعتماد ہے اور وہ اسی اعتماد کے ساتھ اپنے خواب کو زمین پر اتارنے کے لیے سید سراواں، کوشامبی، الہ آباد میں ایک مکمل خانقاہی نظام کے قیام کے بعد ۱۹۹۳ء میں قدیم صالح وجدید نافع کے حامل تعلیمی وتربیتی ادارہ جامعہ عارفیہ قائم کیا، جس میں درجہ عالمیت تک NCERT کے نصاب تعلیم کے مطابق انٹرمیڈیٹ سطح کی انگریزی، سائنس، ہندی اور ریاضی کی اور بعض کتب تصوف کے اضافے اور جزوی تبدیلی کے ساتھ درس نظامی کے مطابق اچھی تعلیم ہو رہی ہے۔ ادارے کے تعلیمی وتربیتی معیار ومنہاج کی شہرت ملک گیر ہوتی جارہی ہے۔ دوسری طرف تصوف اور صوفیہ پر تحقیق اور ریسرچ کے لیے "شاہ صفی اکیڈمی" کا قیام عمل میں آیا ہے، جس کے زیر اہتمام تصوف پر ایک معیاری مجلّہ کتابی سلسلہ "**الاحسان**" شائع ہو رہا ہے، جس کا پہلا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ سفر جاری ہے۔ لوگ ساتھ آرہے ہیں اور کارواں بڑھتا جارہا ہے...

تصوف پر علمی، تحقیقی و دعوتی مجلّہ

کتابی سلسلہ **الاحسان** الٰہ آباد

زیر سرپرستی: شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ چشتی ادام اللہ ظلہ علینا

مدیر: حسن سعید چشتی

مرتبین

مجیب الرحمٰن علیمی ○ ذیشان احمد مصباحی ○ ضیاء الرحمٰن علیمی ○ رفعت رضا نوری

معاونین

محمد عمران احمد ثقافی ○ عارف اقبال مصباحی ○ کتاب الدین رضوی

مجلس مشاورت

ناشر: شاہ صفی اکیڈمی، جامعہ عارفیہ/ خانقاہ عارفیہ، سید سراواں، الٰہ آباد (یوپی)

فون نمبر: 09560710973, 09026981216، ای میل: alehsaan.yearly@gmail.com

الاحسان-1

سلسلۂ مطبوعات شاہ صفی اکیڈمی نمبر (۱)

کتابی سلسلہ : الاحسان (شمارہ نمبر-۱)

مدیر: : حسن سعید چشتی

ترتیب : مجیب الرحمٰن علیمی، ذیشان احمد مصباحی، ضیاء الرحمٰن علیمی، رفعت رضا نوری

سال اشاعت : اپریل ۲۰۱۰ء

قیمت : ۱۰۰/روپے

کمپوزنگ : معراج احمد، رکن الدین سعیدی

ناشر : شاہ صفی اکیڈمی، جامعہ عارفیہ، سید سراواں، الٰہ آباد (یوپی)

تقسیم کار : مکتبہ جام نور، ۴۲۲، مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی-۶

Al-Ehsaan (*a Journal on Islamic Sprituality*)
Published by: Shah Safi Academy, Jamia Arifia
Saied Sarawan, Kaushambi, Allahabad U.P.(India)
Telifax: 05322702332 Mob: 09026981216, 09560710973

Distributer
MAKTABA JAM-E-NOOR
422,Matia Mahal, Jama Masjid, Delhi-6
Phone:011-23281418

اہل قلم کی رائے سے ادارے کا اتفاق ضروری نہیں!

انتساب

عشق وعرفان کے مسافر، اجالوں کے سفیر

مجدد علوم اسلامی، مدون فن تصوف

حجة الاسلام الامام محمد بن محمد الغزالی قدس سرہ

(پیدائش: ۴۵۰ھ/ ۱۰۵۸ء — وفات: ۵۰۵ھ/ ۱۱۱۱ء)

کے نام

جنھوں نے

مقاصد شریعت کو اجاگر کیا

اسلام کے روحانی پہلو کو ترجیح دی

شریعت اسلامی کی واقعی اہمیت کو واضح کیا

اور امت میں پیدا شدہ اختلافات کو کم سے کم کرکے

ملت اسلامی کے اتحاد کا تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا —

مشمولات

تذکیر

43—60

تحقیق وتنقید

61—204

بحث ونظر

کیا تصوف اور صوفیہ کا دور ختم ہو گیا؟

205—218

شناسائی

219—264

صوفی ادب

265—274

زاویہ

امام غزالی کی تاریخی خدمات پر خصوصی گوشہ

275—365

پیمانہ

377—392

مکتوبات

393—403

بادہ وساغر

الامام محمد الغزالی

قل لاخوانی رأونی میتا

امام غزالی کا وہ مشہور قصیدہ جوان کی وفات کے بعد ان کے سرہانے ملا۔ ترجمہ امام غزالی کے گوشے میں ''امام غزالی کے آخری الفاظ'' کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔ (ادارہ)

قل لاخوان رأوني ميتا — فبكوني ورثوني حزنا
أتظنون بأني ميتكم — ليس هذا الميت والله أنا
أنا في الصور و هذا جسدي — كان لباسي و قيمصي زمنا
أنا در قد حواني صدف — طرت عنه و بقى مرتهنا
أنا عصفور و هذا قفصي — كان سجني فتركت السجنا
أشكر الله الذي خلصني — و بنا لي في المعالي وطنا
كنت قبل اليوم ميتا بينكم — فحييت و خلعت الكفنا
قد ترحلت و خلفتكم — لست أرضى داركم لي و طنا
و أنا اليوم أناجي ملكا — و أرى الحق جهارا علنا
عاكفا في اللوح أقرأ و أرى — كل ما كان و يأتي أو دنا
و طعامي و شرابي واحد — و هو رمز فافهموه حسنا
ليس خمرا سائغا أو عسلا — لا ولا ماء و لكن لبنا
هو شراب رسول الله إذ — كان لسر من فطرة فطرتنا
حي ذى الدار بنوم مغرق — فإذا ما مات طار الوسنا

لا تظنوا الموت موتا إنه　　　لحياة و هو غايات المنى

لا ترعكم هجمة الموت فما　　　هو إلا انتقال من هنا

اخلعوا الأجساد من أنفسكم　　　تبصروا الحق عيانا بينا

و خذوا في الزاد جهدا لا تنوا　　　ليس بالعاقل هنا من و نا

أحسنوا الظن برب راحم　　　تشكروا السعي و تأتوا أمنا

ما أرى نفسي إلا أنتم　　　و اعتقادي أنكم أنتم أنا

عنصر الأنفاس منا واحد　　　وكذا الأجسام جسم عمّنا

فمتى ما كان خير لنا　　　و متى ما كان شر فمنا

فارحموني ترحموا أنفسكم　　　و اعلموا أنكم في أثرنا

أسأل الله لفنسي رحمة　　　رحم الله صديقا أمنا

و عليكم مني سلام طيب　　　و سلام الله برّ وثنا

شیخ ابوسعید چشتی

مناجات

یہی ہے مری آرزو یاالٰہی
کہ دیکھوں تجھے چار سو یاالٰہی

یہی اک تمنا ہے روزِ ازل سے
کہ دل میں ہو بس تو ہی تو یاالٰہی

ترا آئینہ ہیں ترے خاص بندے
زمیں پر ہیں یہ تیری بو یاالٰہی

وہ کیوں کر نہ کھو جائے جلووں میں تیرے
کرے جو تری جستجو یاالٰہی

جدھر دیکھتا ہوں جہاں دیکھتا ہوں
نظر میں ہے بس تو ہی تو یاالٰہی

کدھر جاؤں میں چھوڑ کر تیرے در کو
کہ مولیٰ ہے بس میرا تو یاالٰہی

سعیدؔ اللہ کس سے کہوں میں
کہ ہے میری نظروں میں تو یاالٰہی

راز پنہاں

تو مسجود ملک تو قبلۂ ارباب ایماں ہے
تری خاک کف پا غیرت ملک سلیماں ہے

تجھے دیکھیں تو برزخ ہے میان واجب و امکاں
وہ آئینہ ہے تو جس میں کمال حسن یزداں ہے

سمٹ کر عالم ارواح جس کا جسم بن جائے
پھر اس کی روح کا کیا ذکر جو اک راز پنہاں ہے

عروج ایسا کہ خود جبریل بھی پرواز سے عاجز
نزول ایسا کہ ہر ذرہ میں تو ہی تو نمایاں ہے

امام الانبیاء تو، خاتمِ شانِ نبوت تو
لوائے حمد تیرے دست نازک میں درخشاں ہے

زمین و آسماں ہرگز نہ ہوتے گر نہ تو ہوتا
یہ تیرا نور ہے دونوں جہاں میں جو نمایاں ہے

جلوۂ رعنایے محمد

گم عرش سے تا فرش تہ پائے محمد
نقش دو جہاں موجۂ دریائے محمد

معراج نظر کی ہے سراپائے محمد
ہر عضو میں ہے جلوۂ مولائے محمد

اب اپنی خبر ہے نہ ازل کی نہ ابد کی
ہے یہ اثر قطرۂ مینائے محمد

پھر خاک سے تا حشر اٹھاؤں نہ جبیں کو
مل جائے اگر نقش کف پائے محمد

انگشت ہے کیا سینہ و دل کاٹ کے رکھ دیں
آجائے نظر گر رخ زیبائے محمد

معلوم نہیں حشر میں کیا حشر بپا ہو
جس دم نظر آئے قدِ رعنائے محمد

ہے طاقتِ پرواز، بشر کو نہ ملک کو
اس اوج پہ ہے جلوۂ رعنائے محمد

سیدضیاء علوی

بے حجابانہ درآ از در کاشانۂ ما

بزم امکاں ہے سجی دل سے نکلتی ہے دعا
التجا سنیے تو محبوب مرے بہر خدا
دل تڑپتا ہے بہت آج چلے آؤ ذرا
بے حجابانہ درآ از در کاشانۂ ما
کہ کسے نیست بجز دردِ تو در خانہ ما

میری آنکھوں میں نہیں ہے ترے جلووں کی تاب
ترا ثانی ہے کہاں تیرا نہیں کوئی جواب
ہر طرف اتنے جمالات نہیں جن کا حساب
مرغ باغ ملکوتیم دریں دیر خراب
می شود نور تجلائے خدا دانۂ ما

اے بت سنگ دلے ناز عجب ہے تیرا
ہے نظر فتنۂ جاں اور ادا حشر بپا
مجھ کو غمزے نہ دکھا لاج بچانے آجا
فتنہ انگیز مشو کاکل مشکیں مکشا
تابِ زنجیر ندارد دل دیوانۂ ما

سوختہ جان ضیاؔ تجھ پہ ہے قرباں اے دوست
طعن اغیار کا اس کو نہیں ہوتا ہے کوفت
جان و دل تیرے لیے کرتا ہے ہر روز فروخت
محی بر شمع تجلائے جمالش می سوخت
دوست می گفت زہے ہمت مردانۂ ما

شیخ ابوسعیدچشتی

کل عالم کثرت ہے تصوف کا رسالہ

وہ کوہ ہمالہ ہو کہ ورق گل و لالہ
کل عالم کثرت ہے تصوف کا رسالہ

کس درجہ جنوں خیز ہے حسن گل و لالہ
بلبل نہ کرے دیکھ کے کیوں شورش و نالہ

دل بیٹھنے لگتا ہے یہاں صبر سے پہلے
وہ شوخ خفا ہوتا ہے کرتا ہوں جو نالہ

عشوؤں کی وہ نیرنگ ادائی ہے کہ واللہ
زندہ ہوں مگر کشتۂ دو چشم غزالہ

کہتا نہ تھا میں پی نہ بہت مست خرابات
مغلوب نہ کردے نشۂ خمر دو سالہ

اک شاہد زیبا کی تبسم کی ادا پر
قربان میری زندگیِ بست دو سالہ

حیران ہوں کس قوم کی تقلید کروں میں
ہر قوم دیا کرتی ہے قرآں کا حوالہ

آفت ہو کہ راحت ہو جہاں تیری بلا سے
ساقی تو پلائے جا پیالے پہ پیالہ

کیوں صاحب عرفان نہ ہوں بے خود و سرشار
ہر شعر ہے گویا کہ تصوف کا رسالہ

گر طالب صادق ہے تو پڑھ غور سے اس کو
کل عالم کثرت ہے تصوف کا رسالہ

نا دیدہ سعیدؔ اس بت کافر پہ فدا ہوں
توبہ کی طرح توڑ کے تحقیق کا آلہ

فصیح اکمل قادری

شعلہ میرے اندر سے اٹھا

ہو کہ پامال طلب میں جو ترے در سے اٹھا
ایک شعلہ سا قدم بوسی کو پتھر سے اٹھا

میری آنکھوں کو تو اک خوابِ طلب کافی ہے
اے خرد! اپنا یہ سامان مرے گھر سے اٹھا

راستہ بھول گئیں آنکھیں خود اپنے گھر کا
دیکھ کر اس کو وہ شعلہ مرے اندر سے اٹھا

زین للناس حب الشهوات من النساء و البنین و القناطیر المقنطرة من الذهب و الفضة و الخیل المسومة و الانعام و الحرث. ذٰلک متاع الحیوٰة الدنیا واللّٰه عنده حسن المآب. (سورة آل عمران: ۱۴)

عورتیں، بچے، سونے اور چاندی کے خزانے، نشان دار گھوڑے، چوپائے اور کھیتیاں، ان دنیاوی لذتوں کی محبت لوگوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ اس دنیاوی زندگی کی پونجی ہے۔ انجام کار بہتر ٹھکانہ تو صرف اللہ کے پاس ہے۔

احوال

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد
من از سرِ نو زندہ کنم دار و رسن را
(سرمدشہید)

ابتدائیہ

۱۸/ جون ۲۰۰۹ء کو خانقاہ عالیہ عارفیہ/ جامعہ عارفیہ سید سرواں الہ آباد میں تیسرا جشن یوم غزالی تھا، جس میں ''امام غزالی اور تصوف'' کے موضوع پر پروفیسر اختر الواسع صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئ دہلی کا توسیعی خطاب ہوا، جب کہ مہمان خصوصی کے طور پر مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری شریک جشن تھے۔ خانقاہ کی طرف سے تصوف پر مجلّہ شائع کرنے کے تعلق سے قریب سال بھر پہلے سے غور وخوض چل رہا تھا، اس جشن میں اس کا باضابطہ اعلان کر دیا گیا اور یہ امید ظاہر کی گئی کہ اگلے سال جشن یوم غزالی میں اس کا پہلا شمارہ منظر عام پر آ جائے گا۔ اس کے بعد اس کے لیے ملک و بیرون ملک کے بہت سے علما وصوفیہ اور ناقدین و محققین سے رابطہ کیا گیا- اکثر نے اپنی نیک دعاؤں سے نوازتے ہوئے ہماری حوصلہ افزائی کی- کچھ نے اپنی روزہ مرہ کی مصروفیات کی وجہ سے قلمی تعاون کرنے سے معذرت کر لی، اس کے باوجود صاحب قلم محققین کی ایک جماعت نے بروقت اپنی قیمتی نگارشات سے نوازا- ہماری ادارتی ٹیم نے اول دن ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ رسالہ کی ضخامت تین سے چار سو صفحات کے بیچ ہوگی، مواد مکرر نہ ہوگا اور غیر مطبوعہ مقالات ہی شامل اشاعت ہوں گے- افسوس کہ ان اصولوں پر عمل کرنے کی وجہ سے کچھ اچھے مقالات شائع ہونے سے رہ گئے- جن حضرات کے مقالات ہم شائع نہ کر سکے ان سے معذرت کرتے ہوئے ان تمام لوگوں کا ہم اپنی ٹیم کی طرف سے شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے ہماری زبانی، قلمی، مالی اور فکری معاونت کی-

---

جن نفوس قدسیہ نے دعوت وتبلیغ اور رشد و ہدایت کا کام انجام دیا اور انسانی قلوب کو تمام تر آلائشوں سے پاک کر کے خالق و مالک کے نور کا مسکن بنایا اور پیکر عمل بن کر صدائے غیب کی

طرح عملی زندگی گزارنے کی انسانیت کو دعوت دی، افسوس کہ آج انھی نفوس قدسیہ کی درگاہوں کو تجارت گاہ بنالیا گیا ہے اوران کی روحانی تعلیمات کو مسخ کرکے پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے- موافقین ومخالفین دونوں افراط وتفریط کا شکار ہوکر حق کو ناحق اور ناحق کو حق سمجھ کر راہ اعتدال سے دور چلے جارہے ہیں- ایک طرف اکثر موافقین تصوف، روح تصوف اور حقیقت تصوف سے ناآشنا نظر آتے ہیں، بلکہ طرفہ تماشہ یہ کہ بے جا رسومات اورخرافات کی اس قدر پابندی کرتے ہیں جیسے کہ یہی روح تصوف ہواور دوسری طرف موافقین کی بے راہ روی کو دیکھ کر اور کچھ تعصب وعناد کی وجہ سے بعض اہل قلم تصوف،صوفیہ اوران کی تعلیمات کو اسلام سے خارج کرتے نظر آتے ہیں- ایسے میں اہل علم کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ جانبین کو افراط وتفریط سے بچانے اورصوفیہ اوران کی تعلیمات، درگاہیت وخانقاہیت کے مابین فرق اور خانقاہی نظام کی مقصدیت ومعنویت کو علمی و دعوتی اسلوب و انداز میں موافقین ومخالفین تک پہنچانے کی پرخلوص کوشش کریں تاکہ دل و دماغ اور عقل و روح کو روشن کرنے والا علمی و روحانی چراغ ''تصوف'' اپنے اور پرائے تمام کے ظاہر و باطن کو روشن کرکے معاشرے کو امن وسکون اور محبت و بھائی چارگی کا گہوارہ بنا سکے-

---

تصوف کی حمایت ومخالفت میں ماضی میں بھی بہت کچھ لکھا گیا اور آج بھی بہت کچھ لکھا جارہا ہے۔تصوف کے موضوع پر بعض رسائل و جرائد بھی کبھی نظر سے گزرتے ہیں۔لیکن ان تمام تحریروں میں قدر مشترک یہ ہے کہ وہ تمام تحریریں یک طرفہ ہیں۔ یا تو تصوف کی حمایت میں یا مخالفت میں۔ ہر شخص تصوف کی موافقت یا مخالفت میں صرف اپنی بات کہتا ہے،فریق مخالف کی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔کہیں کوئی ایسا اسٹیج نظر نہیں آیا جہاں فریقین ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کررہے ہوں۔ جب کہ جدید دور ایک علمی دور ہے جس میں کسی بھی مسئلے کے دونوں پہلوؤں کو سامنے لانا علمی دیانت کا تقاضا ہے، تاکہ مسئلے کا ہر پہلو عام قارئین کے سامنے آسکے۔اس لیے یہ خیال آیا کہ کیوں نہیں تصوف پر کوئی ایسا مجلّہ سامنے آئے جس میں تصوف کے موافقین ومخالفین کھل کر مگر شائستگی کے ساتھ اپنی بات کہہ سکیں تاکہ تصوف کے حوالے سے جو غلط فہمیاں راہ پاگئی ہیں، ان کا علمی انداز میں ازالہ ہو،تصوف کے حوالے سے لوگوں کا ذہن صاف

ہواوراس کے بعد عملی تصوف کی راہ کھل سکے۔زیر نظر مجلّہ ''الاحسان'' اسی خیال کا عملی پیکر ہے۔ اپنے خیال کو زمین پر اتارنے میں ہم کس حدتک کامیاب ہو سکے ہیں، اس کا فیصلہ اہل علم اور باذوق قارئین کے حوالے ہے۔

''الاحسان'' کے مشمولات کو مفید سے مفید تر بنانے کی کوشش کی گئی ہے-مشمولات کو درج ذیل ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے: 1- بادہ وساغر، 2- احوال، 3، بادۂ کہنہ، 4، تذکیر، 5، تحقیق و تنقید، 6- بحث ونظر، 7، شناسائی، 8-صوفی ادب، 9- زاویہ، 10- پیمانہ اور 11-مکتوبات-تمام مشمولات الگ الگ لطف و چاشنی کے حامل ہیں-ممکن ہے قارئین ''بادہ وساغر'' میں کچھ تشنگی محسوس کریں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ آج صوفی شاعری کا چلن بہت کم ہوگیا ہے۔ہم آئندہ اسے اور بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔ہمیں امید ہے کہ وہ شعرائے کرام جو آج صوفیانہ شاعری کرتے ہیں وہ ''الاحسان'' کے توسط سے اپنی آواز عام قارئین تک پہنچائیں گے۔''تحقیق وتنقید'' کا حصہ شمارہ کا سب سے زیادہ گراں قدر، باوقار اور توجہ طلب ہے۔اس میں شامل تقریباً تمام مقالات/مضامین علمی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔خصوصاً پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، پروفیسر مسعود انور علوی، مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی اور مولانا امام الدین سعیدی کی تحریریں خاص توجہ کی طالب ہیں۔ پروفیسر علی احسان ایتک کی تحریر معاصر ترکی کی صوفیانہ تحریکات کے حوالے سے بیش قیمت معلومات کی حامل ہے۔''بحث و نظر'' کے کالم میں تین گراں قدر تحریریں شامل ہیں۔مولانا یٰسین اختر مصباحی اور پروفیسر اختر الواسع کی تحریروں کے بارے میں تو کچھ کہنا ہی نہیں ہے لیکن مولانا فیضان المصطفیٰ قادری کی تحریر میں جو صفائی اورحق گوئی ہے اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ان کی یہ تیکھی رائے کہ ''آج تصوف کا نام رہ گیا ہے اور روح نکل چکی ہے۔'' ان کے اپنے مشاہدے کی حدتک یقیناً درست ہوگی۔

ہندوستان کی بے شمار خانقاہیں ایسی ہیں جن کی اپنی تاریخی اہمیت ہے۔اپنے دور میں وہ مرجع خواص وعوام تھیں،مگر بعد میں حالات نے ان کی شہرت ومقبولیت کو پردے میں ڈال دیا۔ ''الاحسان'' کے ارباب حل وعقد نے یہ فیصلہ لیا ہے کہ ہر شمارے میں ایسی کسی ایک خانقاہ کو سامنے لانا ہے۔اس پر ایک تفصیلی معلوماتی تحریر شائع کرنی ہے جس کی حیثیت دستاویزی ہو اور ساتھ ہی اس خانقاہ کے صاحب سجادہ کا انٹرویو بھی شائع کرنا ہے۔اس کالم کے لیے ''شناسائی'' کا

لفظ لایا گیا اور پیش نظر اس پہلے شمارے میں سلسلہ چشتیہ نظامیہ کی ایک قدیم مرکزی خانقاہ آستانہ عالیہ صفویہ، صفی پور شریف (یوپی) کا تفصیلی تعارف اور صاحب سجادہ حضرت شاہ اعزاز محمد عرف شمو میاں صاحب کا مصاحبہ شامل اشاعت کیا گیا ہے، یہ وہی خانقاہ ہے جس کا چشتی فیضان حضرت میر عبدالواحد بلگرامی علیہ الرحمہ کے توسط سے مارہرہ، بدایوں اور بریلی تک پہنچا۔ یقین ہے کہ اہل علم اس سلسلے کو پسند فرمائیں گے۔

مجلّے کا ایک خاص گوشہ ''زاویہ'' کے نام سے ہے جس کا مقصد کسی عظیم صوفی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے قارئین کو آگاہ کرنا ہے۔ پہلا ''زاویہ'' تاریخ اسلام کے عظیم اصولی، فقیہ، متکلم، فلسفی، مفکر، صوفی حجۃ الاسلام امام محمد غزالی کی علمی وتجدیدی خدمات کے نام ہے۔ پہلے شمارے میں امام موصوف کے انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ یہ موصوف ہی کا تاریخی کارنامہ ہے کہ انھوں نے تصوف کو ایک باضابطہ فن کا درجہ دیا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم امام موصوف کی شخصیت پر ان کے مقام ومرتبے کے شایان شان گوشہ پیش کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بہت سے قیمتی مقالات ومضامین اس میں شامل ہوگئے ہیں جو علم وفکر کے بہت سے بند دریچے وا کرتے ہیں۔ خصوصاً ڈاکٹر حمید نسیم رفیع آبادی کی تحریر جو امام غزالی اور شاہ ولی اللہ میں تقابل و تناظر کے حوالے سے ہے، بہت ہی فکر انگیز ہے۔ مولانا منظر الاسلام ازہری نے بھی امام غزالی کی شخصیت کے ایک ایسے پہلو کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے جس پر بہت کم لکھا گیا ہے۔

آخر میں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ تصوف کے تعلق سے اس قدر علمی وفکری مجلّہ کی تحریک و اشاعت میں بنیادی کردار شیخ طریقت حضرت شاہ ابوسعید احسان اللہ چشتی صفوی محمدی دام ظلہ العالی کا ہے۔ انہی کی صحبت میں ہمیں فکر تصوف کے احیا وتجدید اور اس کی عام اشاعت کا خیال آیا اور اس کے تعلق سے جب ان کے حضور میں منصوبہ پیش کیا گیا تو آپ نے نہ صرف اس کی حمایت کی بلکہ اپنی سرپرستی میں اسے نکالنے کا پروانہ بھی جاری کر دیا اور اس کے لیے وہ نام تجویز کیا جو قرآنی و حدیثی لفظ ہے یعنی ''الاحسان''، جس کے بعد ''تصوف'' کو ''بدعت'' اور ''غیر منصوص'' کہہ کر اسے مورد الزام ٹھہرانے کی گنجائش ہی ختم ہوجاتی ہے۔

حسن سعید چشتی

واردات

تصوف کیا ہے؟ عصر حاضر کا ایک بہت بڑا سوال ہے، ان ذہنوں کا جو ہر بات کتاب و سنت سے سمجھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ یہ لفظ کتاب اللہ میں نہیں ہے، عام کتب حدیث میں اس کا وجود نہیں ملتا، پھر یہ لفظ کہاں سے آیا؟ ماضی میں بھی اس پر بڑی تفصیلی بحثیں ہوئی ہیں اور آج بھی ہورہی ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی سوالات کا سلسلہ دراز ہے۔ ایک سوال یہی ہے کہ اگر تصوف اسلام سے الگ کوئی شے ہے، تو مسلمان اس کا اتباع کیوں کرتے ہیں؟ اور اگر یہ عین اسلام ہے تو اس کے لیے الگ سے ایک نئے لفظ کے استعمال کی ضرورت کیا ہے؟ اسلام کے استعمال پر ہی اکتفا کیوں نہیں کیا جاتا؟

ایک صحیح حدیث، جو حدیث جبرئیل کے نام سے مشہور ہے، بخاری و مسلم اور دیگر معروف کتب حدیث میں موجود ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بارگاہ نبوت میں ایک اجنبی شخص حاضر ہوا، اس نے ایمان، پھر اسلام، پھر احسان کے بارے میں سوال کیا۔ پھر قیامت کے بارے میں سوال کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے بڑے اختصار، جامعیت اور متانت سے اس کے ہر سوال کا جواب دیا۔ وہ شخص رخصت ہوا۔ اس کے بعد پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ''یہ جبرئیل تھے جو تمہیں تمھارا دین سکھانے آئے تھے''— اس سے واضح اشارہ یہ ملتا ہے کہ دین کے خاص تین اجزا ہیں، ایمان، اسلام اور احسان۔ اور اس کے ساتھ بطور خاص قیامت پر یقین لازمی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ مسلم معاشرے میں جس طرح اسلام اور ایمان کے الفاظ متعارف اور مروج ہوئے آخر ''احسان'' کا لفظ اس معنی میں مروج کیوں نہیں ہوا جو معنی حدیث مذکور میں بتائے گئے ہیں؟

احسان کی تشریح حدیث جبرئیل میں ان الفاظ میں کی گئی ہے:

ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ و ان لم تکن تراہ فانہ یراک.

اللہ کی عبادت اس کیفیت کے ساتھ کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو یا کم از کم اس کیفیت کے ساتھ کہ اس بات کا یقین ہو کہ وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں احسان کی تشریح ''کیفیت حضوری'' ہے۔ یعنی عبادت کے دوران خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا احساس۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ علما کا وہ گروپ جسے متکلمین کہا جاتا ہے، اس نے ایمانیات کی تفصیلات تو بتا دیں اور علما کا وہ دوسرا گروپ جسے فقہا کہا جاتا ہے، اس نے اسلامیات کو واضح اور مفصل انداز میں تو بتا دیا، لیکن معروف معنوں میں جنہیں علما کہا جاتا ہے، ان میں ایسا کوئی گروپ نہیں جس نے ''احسانیات'' کی تفصیل کی ہو۔ ہاں! اسی دور سے جس دور میں علم الکلام اور علم الفقہ کا آغاز ہوتا ہے، مسلم معاشرے میں ایک طبقہ ایسا ضرور پایا گیا ہے، جس نے ''کیفیت حضوری'' پر زور دیا ہے، جو گفتار کا نہیں کردار کا غازی تھا، اس طبقہ کو مسلم معاشرہ نے صوفی کا لقب دیا اور اس کے کردار کو تصوف سے موسوم کیا۔ حالاں کہ یہی وہ لوگ تھے، جنہیں قرآنی اور حدیثی اصطلاح میں ''محسنین'' کہنا چاہیے، کیوں کہ ان کا ارتکاز ہمیشہ سے احسان اور کیفیت حضوری پر رہا ہے۔ لیکن انھیں صوفی اور ان کے عمل کو تصوف کہا گیا۔ اگر یہ معاملہ صرف اصطلاح تک ہے تو اس پر بہت زیادہ بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ اہل فن نے **لا مناقضۃ فی الاصطلاح** اصطلاح سازی میں کوئی جھگڑا نہیں، کہہ کر اس طرح کے تنازعات کو بہت پہلے ختم کر دیا ہے— ہاں! یہ ضرور ہے کہ تصوف کو احسان کا بدل کہہ کر تمام تر خرافات کو تصوف کے نام پر چلایا نہیں جا سکتا۔

ہم نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں، وہاں ہر طرف صوفیہ اور اہل اللہ کا ذکر ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ پلے بڑھے اور دنیا دیکھی۔ تعلیم بھی اسی ماحول میں ہوئی جو اولیاء اللہ اور رجال الغیب کے ذکر و فکر سے گرم تھا۔ علما و مشائخ کی زیارتیں ہوتی رہیں، آستانوں اور خانقاہوں کی حاضری ہوتی رہی لیکن دل کا معاملہ بدلتا گیا۔ عقیدت کی گرمی سرد پڑتی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تصوف کے جس رنگ اور صوفیہ و اولیاء اللہ کے جس انداز کو ہم کتابوں میں پڑھتے تھے یا اپنے بڑوں سے سنتے تھے، اس کا عکس ہمیں باہر کی دنیا میں نظر نہیں آتا تھا۔ بلکہ اکثر درگاہوں کے خیرہ کن مناظر اور دنیا

پرست زہاد کے حالات دیکھنے کے بعد اس بات کا یقین ہونے لگا کہ تصوف اور صوفیہ کی مخالفت جو موجودہ دور میں زبان و قلم سے ہو رہی ہے، وہ بے جا نہیں ہے۔ ناقدین کے پاس بعض ٹھوس بنیادیں بھی ہیں جن کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

زندگی کے سفر میں کچھ ایسے تجربات پیش آئے جن کے بعد سوچ کا زاویہ بدلا، تصوف سے محبت ہوئی، صوفیہ سے عقیدت بڑھی اور پھر اس نتیجے تک پہنچے کہ آج تصوف کی حمایت و مخالفت میں بولنے یا لکھنے والے دونوں طبقات بعض غلط فہمیوں اور بے احتیاطیوں کا شکار ہیں۔ تصوف کے حامی اپنی دلائل سے جس تصوف کو پیش کرتے ہیں وہ اس تصوف سے قطعاً مختلف ہے جسے وہ اپنے عمل سے پیش کرتے ہیں اور اسی طرح تصوف کے مخالف اپنی دلائل سے جس تصوف کو رد کرتے ہیں وہ حقیقت تصوف سے کوسوں دور ہے۔ کیوں کہ جس طرح آج کے کسی مسلمان کے غلط رویہ کو دیکھ کر اسلام کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا اسی طرح کسی نام نہاد صوفی کی غلط روش حقیقت تصوف کو ٹھکرانے کا جواز فراہم نہیں کر سکتی۔

موجودہ دور روحانی بحران (Spritual Crisis) کا دور ہے۔ مشینوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے انسان بھی خود کو مشین کا ایک حصہ تصور کرنے لگا ہے جو اس کی روح کے لیے سب سے زیادہ باعث آزار ہے۔ انسان کا روبوٹ بن جانا اور ریموٹ پر دوڑتے رہنا انسانیت کی توہین اور انسان کی خودی کے سامنے سب سے بڑا چیلنج ہے۔ انسان اس چیلنج کو Face کر رہا ہے اور اس کی روح اسے اس قید سے باہر لانے کے لیے بے چین ہے۔ دوسری طرف گلوب پر یہ عجیب نیا ظاہرہ سامنے آیا ہے کہ مشرق مغرب کی چکا چوندھ روشنی کی طرف بھاگ رہا ہے جب کہ مغرب مشرقی صحراؤں اور کھنڈروں میں سکون کی تلاش میں سرگرداں ہے اور یہی چیز کچھ چھوٹی سطح پر ہندوستان میں ہمارے گرد و پیش بھی نظر آ رہی ہے۔ مذہب پڑھنے والے مذہب بیزار ہو رہے ہیں جب کہ سائنس کے طالب علم دین داری میں سخت ہوتے جا رہے ہیں، کیوں کہ وہ قریب سے محسوس کر رہے ہیں کہ جدید ٹیکنالوجی جسم کو خواہ جتنا راحت پہنچا سکے، اس میں روح کی آسودگی کا کوئی سامان نہیں ہے۔ ایسے میں پوری دنیا میں یہ صورت حال ہے کہ لوگ ایئر کنڈیشنڈ مکانوں سے نکل

کر خانقاہوں، درگاہوں، مٹھوں، آشرموں اور صوفیوں، باباؤں اور پاکھنڈیوں کا رخ کر رہے ہیں۔ اب ایسے میں یہ فیصلہ کرنا ان کے لیے مشکل ہے کہ اصل روحانیت کیا ہے؟ روحانیت کے تعلق سے علمی دنیا میں بھی اور عملی دنیا میں بھی سخت بے اعتدالیاں اور گمراہیاں رائج ہیں خصوصاً پوری دنیا میں جس انداز سے روحانیت کی بات کی جا رہی ہے اس سے یہ تاثر عام ہو رہا ہے کہ سارے مذاہب کی روحانیت برحق ہے اور اسلامی تصوف کے حوالے سے بھی یہ یقین دلایا جا رہا ہے کہ وہ سارے ادیان کی روحانیت کو برحق سمجھتا ہے، وحدت ادیان کے نمائندے کے طور پر پیش کی جانے والی اسلامی تصوف کی اس تصویر کو بہرصورت مسترد کیا جانا بے حد ضروری ہے۔ آج اہل حق کی ذمہ داری ہے کہ پوری دنیا کو اس حقیقت سے آشنا کرائیں کہ اسلام محمد رسول اللہ ﷺ کا لایا ہوا وہ نظام ہے جس میں سارے مذاہب کی اچھائیوں کا عطر موجود ہے اور جس میں روحانیت کا وہ آب زلال ہے جس سے سیراب ہو کر دنیا اپنی روحانی پیاس بجھا سکتی ہے۔ دہشت گردی اور ظلم و بربریت کی مار جھیل رہی دنیا کو ایسے وقت میں جب کہ لوگ اسلام کی ایسی تعبیر و تشریح پیش کر رہے ہیں جس سے دنیا میں امن و سلامتی، اخوت و رواداری کا پیغام پہنچنے کے بجائے اسلام کی مکروہ شکل سامنے آ رہی ہے اور مذہب اسلام کو تشدد پسند اور امن و بھائی چارگی کے دشمن مذہب کے طور پر دیکھا جا رہا ہے، اس بات کی بے حد ضرورت ہے کہ دنیا کو یہ پیغام دیا جائے کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو امن اور شانتی قائم کر سکتا ہے اور اسلام کی تعبیرات و تشریحات میں احسانی نظام فکر جسے ہم صوفیانہ نظام فکر سے جانتے ہیں، ہی دنیا کو امن کا گلستان اور روحانیت کا مسکن بنا سکتا ہے، اور کراہتی انسانیت کے درد کا مداوا بن سکتا ہے۔

اکیسویں صدی میں یہ کام اگر انفرادی طور پر نہ سہی اجتماعی طور پر بھی ہو جاتا ہے تو انسانیت کی یہ بہت بڑی خدمت ہوگی۔ چوں کہ یہ گلوبلائزیشن کا دور ہے، اس لیے اگر صحیح اور درست روحانیت کی تفتیش و تعیین میں علمائے حق کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس پاک شراب سے پوری انسانیت اپنی روحانی پیاس بجھا سکے گی۔ نیز یہ احیائے تصوف کے باب میں ایک تاریخی اقدام ہوگا— کاش یہ کام ''الاحسان'' کے توسط سے ہو جاتا!

ذیشان احمد مصباحی

انما الحیوٰۃ الدنیا لعب و لھو و زینۃ و تفاخر بینکم و تکاثر فی الاموال و الاولاد کمثل غیث اعجب الکفار نباتہ ثم یھیج فتراہ مصفرا ثم یکون حطاماً و فی الآخرۃ عذاب شدید و مغفرۃ من اللّٰہ و رضوان و ما الحیوٰۃ الدنیا الا متاع الغرور. (سورۃ الحدید، آیت: ۲۰)

دنیا کی زندگی صرف کھیل تماشہ، زینت، فخر و مباہات اور مال و اولاد میں ایک دوسرے پر خود کو بڑھانا ہے۔ اس کی مثال بارش کی ہے جس کی پیداوار کسانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے، پھر جب وہ خشک ہو جاتی ہے تو تمہیں زرد نظر آتی ہے۔ پھر وہ بالکل چورا چورا ہو جاتی ہے۔ آخرت میں اللہ کا سخت عذاب اور اس کی مغفرت و خوش نودی ہے۔ دنیاوی زندگی بس ایک فریب ہے۔

بادۂ کہنہ

شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری
ترجمہ: شاہ نجم الدین احمد فردوسی

توحید اور اس کے درجات

میرے عزیز بھائی شمس الدین! تم کو اللہ تعالیٰ دونوں جہاں میں عزت دے- معلوم ہونا چاہیے کہ بزرگوں کے نزدیک ازروئے شریعت و طریقت و حقیقت اور معرفت اجمالاً توحید کے چار درجے ہیں اور ہر درجہ میں اہل توحید کی مختلف حالت ہوا کرتی ہے-

توحید کا پہلا درجہ: یہ ہے کہ ایک گروہ فقط زبان سے **لاالـٰـه الاالـلـه** کہتا ہے مگر دل سے رسالت و توحید کا منکر ہے- ایسے لوگ زبان شرع میں منافق کہے جاتے ہیں- یہ توحید مرنے کے وقت یا قیامت کے دن کچھ فائدہ بخش نہ ہوگی، سراسر وبال اور نکال آخرت کا باعث ہوگی - خدا محفوظ رکھے-

توحید کا دوسرا درجہ: اس کی دو شاخیں ہیں - ایک گروہ زبان سے بھی **لاالـٰـه الاالله** کہتا ہے اور دل میں بھی تقلیداً اعتقاد رکھتا ہے کہ اللہ ایک ہی ہے، کوئی اس کا شریک نہیں- جیسا کہ ماں باپ وغیرہ سے اس نے سنا ہے اسی پر ثابت قدم ہے- اس جماعت کے لوگ عام مسلمانوں میں ہیں- دوسرا گروہ زبان سے بھی **لاالہ الاالله** کہتا ہے اور دل میں اعتقاد صحیح رکھتا ہے- علاوہ اس کے علم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر سیکڑوں دلیلیں بھی رکھتا ہے- اس جماعت کے لوگ متکلمین، یعنی علماء ظواہر کہلاتے ہیں- (بیت کا ترجمہ)

(یعنی جاؤ آنکھیں حاصل کرو- خاک کا ہر ذرہ ایک ایسا پیالہ ہے جس میں سارا جہاں دکھائی دیتا ہے-)

عام مسلمان و متکلمین یعنی علمائے ظاہر کی توحید وہ توحید ہے کہ شرک جلی سے نجات پانا اس

سے وابستہ ہے- خلوددوزخ سے رہائی، بہشت میں داخل ہونا اسی کا ثمرہ ہے- البتہ اس توحید میں مشاہدہ نہیں ہے- اس لیے ارباب طریقت کے نزدیک اس توحید سے ترقی نہ کرنا، ادنی درجہ پر قناعت کرنا ہے- **علیکم بدین العجائز** (یعنی بوڑھی عورتوں کے دین کو اختیار کرنا لازم سمجھو) ایسے ہی موقع پر کہا کرتے ہیں-

توحید کا تیسرا درجہ: موحّد مومن بہ اتباع پیر طریقت، مجاہدہ وریاضت میں مشغول ہے- رفتہ رفتہ یہ ترقی اس نے کی ہے کہ نور بصیرت دل میں پیدا ہوگیا ہے- اس نور سے اس کو اس کا مشاہدہ ہے کہ فاعل حقیقی وہی ایک ذات ہے- سارا عالم گویا کٹھ پتلی کی طرح ہے- کسی کو کوئی اختیار نہیں ہے- ایسا موحّد کسی فعل کی نسبت کسی دوسری طرف نہیں کرسکتا- کیوں کہ وہ دیکھ رہا ہے کہ فاعل حقیقی کے سوا دوسرے کا فعل نہیں ہے ؎

دریں نوع ہم شرک پوشیدہ است   کہ زیدم بیازرد و عمرم بکشت

(یعنی اس میں بھی شرک چھپا ہوا ہے کہ اگر کوئی کہے کہ مجھ کو زید نے ستایا اور عمرو نے مار ڈالا)-

اب ہم ایک مثال دیتے ہیں اس سے توحید عامیانہ، توحید متکلمانہ اور توحید عارفانہ سبھوں کے مراتب کا فرق صاف صاف ظاہر ہوجائے گا-

مثال: کسی سرائے میں ایک سوداگر اترا- اس کی شہرت ہوئی - لوگ اس کا مال واسباب دیکھنے کو چلے اور ملاقات کے خواہاں ہوئے-

ایک شخص نے زید سے پوچھا - بھائی! تم کچھ جانتے ہو- فلاں سوداگر آیا ہے زید نے کہا- ہاں صحیح خبر ہے- کیوں کہ معتبر ذرائع سے مجھے معلوم ہوا ہے- یہ توحید عامیانہ کی مثال ہے-

دوسرے نے عمرو سے دریافت کیا- اجی حضرت آپ کو اس سوداگر کا حال معلوم ہے- عمرو نے کہا - خوب، ابھی ابھی میں اسی طرف سے آرہا ہوں- سوداگر سے ملاقات تو نہ ہوئی، مگر اس کے نوکروں کو دیکھا، اس کے گھوڑے دیکھے- اسباب وغیرہ دیکھنے میں آئے- اس کے آنے میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے- یہ توحید متکلمانہ ہے-

تیسرے شخص نے خالد سے استفسار کیا - جناب اس کی خبر رکھتے ہیں کہ سوداگر صاحب سرائے میں تشریف رکھتے ہیں- خالد نے جواب دیا- بے شک میں تو ابھی ابھی انھیں کے پاس

سے آرہا ہوں مجھ سے اچھی طرح ملاقات ہوگئی ہے- یہ توحید عارفانہ ہے-

دیکھو زید نے سنی سنائی پر اعتقاد کیا - عمرو نے اسپ واسباب وغیرہ دیکھ کر دلیل قائم کی- خالد نے خود سوداگر کو دیکھ کر یقین کیا- تینوں میں جو فرق مراتب ہے اس کے بیان کی اب حاجت نہ رہی - اہل طریقت کے نزدیک جس توحید میں مشاہدہ نہ ہو وہ توحید کی صورت اور توحید کا قالب ہے- مشاہد ہ سے اعتقاد کو کوئی نسبت نہیں- کیوں کہ اعتقاد دل کو خواہ مخواہ ایک چیز کا پابند کرلیتا ہے- اور مشاہدہ ہر بند کو کھول دیتا ہے- اور مشاہدہ سے استدلال کو بھی کوئی مناسبت نہیں- کیوں کہ ؎

پائے استدلالیاں چوبیں بود   پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

(یعنی دلیلیں لانے والوں کا پاؤں لکڑی کا بنا ہوتا ہے- اور لکڑی کا پاؤں دیر تک قائم نہیں رہ سکتا)

توحید کا چوتھا درجہ: کثرت اذکار واشغال وریاضت ومجاہدہ کے بعد ترقی کرتے کرتے یہاں تک سالک ترقی کرتا ہے کہ بعض بعض وقت شش جہت میں اللہ تعالیٰ کے سوا اس کو کچھ نظر نہیں آتا- تجلیات صفاتی کا ظہور اس شدت سے سالک کے دل پر ہوتا ہے کہ ساری ہستیاں اُس کی نظر میں گم ہو جاتی ہیں- جس طرح ذرّے آفتاب کی پھیلی ہوئی روشنی میں نظر نہیں آتے - دھوپ میں جو ذرہ دکھائی نہیں دیتا اس کا سبب یہ نہیں کہ ذرہ نیست ہو جاتا ہے یا ذرّہ آفتاب ہو جاتا ہے، بلکہ جہاں آفتاب کی پوری روشنی ہوگی ذرّوں کو چھپ جانے کے سوا چارہ ہی کیا ہے- جس وقت روشن دان تاب دان وغیرہ سے دھوپ کوٹھری یا سائبان میں آتی ہے- اس وقت ذرّوں کا تماشا دیکھو، صاف نظر آتے ہیں- پھر آنگن میں نکل کر دیکھو غائب ہو جاتے ہیں- اسی طرح بندہ خدا نہیں ہوتا **تعالٰی اللہ عن ذالک علواً کبیراً** (یعنی اللہ اس سے بہت بلند تر ہے)- اور نہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ درحقیقت نیست و نابود ہو جاتا ہے، نیست و نابود ہونا اور چیز ہے اور نہ دیکھا جانا اور شے ہے-

نظم

پیشِ توحیدِ او نہ کہنہ نہ نو ست   ہمہ ہیچ اند ہیچ او ست کہ اوست

کے بود ما ز ما جدا ماندہ   من و تو رفتہ و خدا ماندہ

یعنی اس کی توحید کے سامنے نیا اور پرُانا کیا سب ہیچ ہی ہیچ ہے- وہ وہی ہے جیسا کہ وہ

ہے- لفظ ما سے ما کب تک الگ رہے گا من وتو بیچ سے اٹھ گیا اور خدا باقی رہ گیا) یا یوں سمجھوں کہ عالم ایک آئینۂ ہے- اس آئینہ میں سالک کو بعض بعض وقت خدا ہی خدا نظر آتا ہے- خدا کے مشاہدے میں سالک ایسا مستغرق ہو جاتا ہے کہ عالم جو آئینۂ حیرت ہے اُس کو نظر نہیں آتا- اس سے اور آسان مثال سنو! تم خود آئینہ دیکھو اور اپنے جمال پر محو ہو جاؤ پھر دیکھو تو سہی آئینہ تمہاری نظر سے ساقط ہو جاتا ہے یا نہیں ضرور ساقط ہوگا -ایسے موقع میں کیا تم کو یہ کہنے کا حق حاصل ہوگا کہ آئینہ نیست ہوگیا، یا آئینہ جمال ہوگیا ہرگز نہیں نیست ہونا اور ہے اور نہیں دکھائی دینا اور ہے جس کی نظر میں آفتابِ انوارِ حق اس شان سے ظہور کرے گا اُس کی نظر میں ساری ہستیاں نہ ہوں گی تو کیا ہوں گی- قدرت کے مقدورات میں دیکھنا بلا فرق اسی طرح پر ہوتا ہے- صوفیہ کے یہاں اس مقام کا نام ''**الفناء فی التوحید**'' یعنی توحید میں فنا ہوجانا ہے ؎

گویند آں کس دریں مقام فضول　　　که تجلی نه داند او ز حلول

(یعنی وہ شخص یہاں فضول بکتا ہے- کیوں کہ وہ تجلی اور حلول کا فرق نہیں پہچانتا)

اس مقام میں اگر شطحیات سالک سے سرزد ہوں گے تو اس کی خامی سمجھی جائے گی اس میں شک نہیں کہ خدا کی تجلی ہوتی ہے- اور خدا اپنا جلوہ دکھاتا ہے- مگر انسان میں حلول نہیں کرتا- اس مقام میں پہنچ کر سیکڑوں سالک پھسل کر گر چکے ہیں- اس خوفناک جنگل سے جان سلامت لے جانا بغیر تائیدِ غیبی وعنایت ازلی ناممکن ہے- اور پیر کی مدد بھی ضروری ہے- جو پیر حق رسیدہ ہو، صاحب بصیرت ہو، نشیب وفراز سے واقف ہو، شربتِ قہرِ جلال اور لطفِ جمال کا مزہ چکھ چکا ہو- تا کہ اس ورطۂ ہلاکت سے مرید کو نکال سکے- دیکھو حضرت خواجہ ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ جو مقام توکل کے بادشاہ ہیں- ایک دفعہ حضرت منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو دیکھا کہ بے زاد وراحلہ بادیۂ خونخوار میں گشت کر رہے ہیں- پوچھا، یہاں آپ کیا کر رہے ہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ مقام توکل میں ثابت قدمی کا امتحان دے رہا ہوں- چوں کہ اہل توحید کے نزدیک مقام توکل توحید کے مقامات میں سے ایک ادنیٰ درجہ کا مقام ہے- بتقاضائے خلوص آپ کو ہمدردانہ جلال آگیا- اور اس عبارت لطیف کے ساتھ اس مقام توکل سے ترقی کرنے کی یوں ہمت دلائی: ''**ضیعت عمرک في عمران باطنک فاین الفناء في التوحید**'' (یعنی اگر عمر اسی مقام توکل کی داد دینے میں

تمام ہوگئی تو درجہ کمال توحید کب حاصل ہوگا)

اب تم سمجھ سکتے ہو کہ راہ توحید میں یار موافق اور پیر مشفق کی کس وقت تک کس درجہ ضرورت ہے؟

بہرکیف درجہ چہارم کی توحید میں سالکوں کے احوال مختلف ہیں -کسی پر ہفتہ میں ایک ساعت کے لیے فنائیت طاری ہوتی ہے کسی پر ہر روز ایک ساعت یاد وساعت کسی پر بیشتر اوقات عالم استغراق رہتا ہے-

فنافی التوحید کے بعد ایک اور مرتبہ ہے جس کا نام ''**الفناء عن الفناء**'' ہے- اس مرتبہ کو بھی تعلق درجۂ چہارم سے ہے- یعنی اس درجہ کا نام مرتبۂ اکمل میں ''**الفناء عن الفناء**'' ہے- اسی لیے اس کو درجۂ پنجم نہیں کہا گیا -اس مرتبہ میں سالک کی حالت یہ ہوتی ہے کہ کمال استغراق کی وجہ سے اس کے احساس کو اپنی فنائیت کی خبر نہیں ہوتی -اور نہ اس کی آگاہی باقی رہتی ہے- کہ ہم فنا ہوئے -یہاں تک کہ جمالی کو جلالی تجلی کا فرق بھی نظر نہیں آتا- ایک جنبش میں سب باتیں غائب ہوجاتی ہیں- کیوں کہ کسی قسم کا علم باقی نہیں رہتا- اہل طریقت کے نزدیک تفرقہ کی دلیل ہے- مقام **عین الجمع و جمع الجمع** جب ہی حاصل ہوگا کہ سالک اپنے کو اور کل کائنات کو ظہور حق کے دریائے نور میں گم کردے اور اس کی خبر بھی نہ رکھے کہ گم کون ہوا ؎

تو درو گم شود که توحید ایں بود　　　گم شدن گم کن که تفرید ایں بود

(تو اس میں کھو جا یہی توحید ہے اور اس کھو جانے کو بھی بھول جا اس کا نام تفرید ہے-)

اس مقام تفرید میں پہنچ کر حقیقت وحدت الوجود اس طرح پر منکشف ہوتی ہے کہ سالک محو ہوجاتا ہے- تجلی ذاتی کل قصوں کو طے کردیتی ہے- اسم ورسم، وجود وعدم، عبارت واشارت، عرش وفرش، اثر وخبر اس عالم اور اس دیار میں کچھ نہ پاؤ گے- **کل من علیها فان** (یعنی یہاں ہر چیز کو فنا ہے) اس مقام کے سوا اور کہیں جلوہ گر نہیں ہوتا- **کل شئی ھالک الا وجھه** (یعنی ہر چیز مٹ جانے والی ہے مگر اس کی ذات) اس جگہ کے سوا اور کہیں صورت نہیں دکھاتا- **انا الحق وسبحاني مآ اعظم شاني** (یعنی پاک ہوں اور میری شان بہت بڑی ہے) یہاں کے سوا اور کہیں اس کا نشان ظاہر نہیں ہوتا- توحید بے شرک مطلق جو تم نے سنا ہے، وہ اس دارالملک کے

سوااور کہیں نہ دیکھنے پاؤ گے ۔

خیال کژ مپز ایں جاو بشناش   ہر آں کو دَر خدا گم شد خدا نیست

(یعنی یہاں دل میں الٹا خیال نہ لاؤ ،اور سمجھو کہ ،جوخدا کی ذات میں کھوگیا،وہ خدانہیں ہے-)

توحید وجودی علم کے درجہ میں ہو،یا شہود کے ابتدائی درجہ سے انتہائی درجہ تک پہنچے ہرمرتبہ میں بندہ بندہ ہے،خداخدا ہے-اسی لیے **انا الحق** اور **سبحانی ما اعظم شانی** وغیرہ کہنا اگرصدق حال نہ ہوتو خود اہل طریقت کے نزدیک یہ کلمات کفریہ ہیں-اور جہاں صدق حال ہے بے شک وہاں کمال ایمان کی دلیل ہے- ۔

روا باشد **انا اللہ** از درختے   چرا نبود روا از نیک بختے

(یعنی ایک درخت سے انااللہ کی صدا نکلنا جب درست ہے تو اگر کسی نیک بخت کے منھ سے یہی آواز نکلے تو کیوں صحیح نہ ہوگی)

خیر اس کوتو ہم پہلے ہی کہہ چکے کہ آئینہ وصورت کے درمیان نہ اتحاد کا دعویٰ صحیح نہ حلول کا زعم درست- اب تم چاروں درجوں کی توحید میں جوفرق ہے وہ اس مثال سے سمجھ سکتے ہو- اخروٹ میں دوقسم کے پوست اور ایک قسم کا مغز ہوتا ہے- پھر مغز میں روغن ہے-

1- منافقوں کی توحید پہلے چھلکے کے درجہ میں ہے- کیوں کہ وہ چھلکا کسی کام کا نہیں ہوتا-

2- عام مسلمانوں اور متکلموں کی توحید دوسرے چھلکے کے درجہ میں ہے یہ کچھ کارآمد ہوتا ہے-

3- عارفانہ توحید مغز کے درجہ میں ہے-اس کا فائدہ اوراس کی خوبی ظاہر ہے-

4- موحّدانہ توحید روغن کے درجہ میں ہے -اس کی تعریف کی حاجت نہیں -دیکھو اخروٹ توپورے مجموعہ کوکہتے ہیں -مگر پہلے چھلکے سے روغن تک جوفرق ہے وہ صاف روشن ہے-اسی طرح توحید تو ہر توحید کو کہتے ہیں -مگر درجات ،ثمرات ،قاعدے وضابطے میں تفاوت ہزاروہزار ہیں-

اے بھائی! یہ مکتوب معمولی نہیں -اسی میں غور وفکر کی ضرورت ہے، اچھی طرح اس کو دیکھواوراس کی تہ کو پہنچو-کیوں کہ یہ مکتوب تمام مقامات واحوال اور معاملات ومکاشفات کی جڑ

ہے- جب تم مشائخ کے کلمات دیکھو یاان کے اشارات پر تمہاری نظر پڑے، یاان کی کتابیں دیکھنے میں آئیں -اگر اس مکتوب کے اصول کوملحوظ رکھو گے تو مطالب آسانی سے حل ہوں گے، کہیں پر مغالطہ نہ ہوگا-اورتمہیں غلط فہمی نہ ہوگی -ٹھیک ٹھیک سمجھ لوگے-اشعار توحید یہ مشائخ طریقت رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جو اپنے درجہ کے اعتبار سے نظم فرمائے ہیں وہ بھی اسی اصول وقانون کی روسے سمجھے جائیں گے-اورکہیں سے کسر نہ ہوگی-

اے برادر عزیز! بہت ممکن ہے کہ اہل توحید کی حالتوں کو دیکھ اورسن کر تمہیں غبطہ ہواور حسرت نایافت بے کل کردے اورشکستہ خاطر ہوکرتم ناامید ہوجاؤ -نہیں نہیں بلند ہمّتی سے کام لو-ہم نے مانا کہ تم چیونٹی کی طرح خاکسار سہی ،مگر دل حضرت سلیمان کے ایسا پیدا کرو-اوراس راہ میں قدم رکھو-ہم نے فرض کیا کہ مچھر کی طرح مختنی ہو،لیکن جگر شیر کا بنا ڈالواورمنزل مقصود کی تلاش میں گام زن-تم دیکھتے نہیں کہ کیا سے کیا ہوا اور کیا ہورہا ہے- سات سات لاکھ برس کی طاعت وعبادت کو بادِ بے نیازی نے اس طرح اڑا پھینکا ہے کہ **ھباءً منثورا** ہوکر رہ گئی -اپنی خرابیوں کوتم نہ دیکھواس بات کودیکھو کہ آب خاک بے مقدار سے حضرت آدم صفی اللہ کیسے پیدا ہوگئے -ایک یتیم ہستی جس کے کفیل ابوطالب تھے وہ محمد رسول اللہ کیوں کر ہوگئی -آزر بت تراش کے گھر میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا وجود کس طرح ظہور پذیر ہوا-**سبحان اللہ و بحمدہ** اوراس بات کا تماشا دیکھو کہ مشرکوں سے موحدین ،کافروں سے مؤمنین ،عاصیوں سے مطیعین ،مفسدوں سے مصلحین ہوا کرتے ہیں-قدرت کسی کی طاعت پر نظر نہیں کرتی -لطف کسی کی معصیت کونہیں دیکھتا-

نقل ہے کہ ایک زنّار دار اپنے کوآراستہ کررہا تھا-غیب سے ایک بھید ظاہر ہواجس سے زنّار کی حقیقت اس پرکھل گئی-گھر سے نکل کھڑا ہوا-حالت یہ تھی کہ دوڑتا جاتا تھا اورنعرہ مارتا تھا"**این اللہ**"؟ اللہ کہاں ہے؟ اس انکشاف راز کے باعث ایسا سوز دروں پیدا تھا کہ اس کو ذرا قرار نہ تھا- یہاں سے وہاں اس شہر سے اس شہر مارامارا پھرتا تھا-اسی طرح گرتا پڑتا ملک شام میں جبل لبنان پرپہنچا-اس پہاڑ پر غوث ،قطب ،ابدال ،اوتاد وغیرہم رہا کرتے ہیں-جاکر کیا دیکھتا ہے کہ چھ آدمی کھڑے ہیں-اورایک جنازہ سامنے رکھا ہے-

یہ غریب بدحال ان لوگوں سے واقعہ دریافت کرنے لگا-ان لوگوں نے کہاواقعہ پیچھے پوچھئے گا پہلے نماز جنازہ کی امامت تو کیجئے-خدا کی شان وہ بے تکلف آگے بڑھ گیا-اور نماز پڑھا دی -جب نماز پڑھا چکا تو لوگ کہنے لگے کہ ہم لوگ ان سات آدمیوں میں سے ہیں جن پر سارے عالم کے کل کاروبار کا دار ومدار ہے-اور جس میت پر آپ نے نماز پڑھی ہے وہ ہمارے روشن ضمیر پیر تھے-قطب عالم کے عہدے پر فائز تھے-وقت انتقال یہ وصیت فرمائی تھی کہ غسل وغیرہ سے جب فراغت ہوجائے تو جنازہ رکھ کر تھوڑا انتظار کرنا-ایک صاحب اس گوشے سے آئیں گے -ان سے کہنا کہ نماز آپ پڑھائیں -کیوں کہ ہمارے بعد قطبیت کا درجہ اِنہیں حضرت سلامت کو ملے گا-والسلام

(مکتوبات صدی،مکتوب اول)

○○○

شیخ شہاب الدین سہروردی
ترجمہ وتلخیص: محمد ذکی اللہ مصباحی

تصوف کی حقیقت و ماہیت

حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے: **لكل شيء مفتاح ومفتاح الجنة حب المساكين والفقراء والصبرُ، هم جلساء اللّٰه تعالیٰ يوم القيمة**- (ہر چیز کی ایک کنجی ہے اور جنت کی کنجی فقراء ومساکین سے محبت اور صبر کرنا ہے وہ قیامت کے دن اللہ کے ہم نشیں ہوں گے-)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فقر تصوف کی حقیقت و ماہیت میں داخل ہے بلکہ اسی پر اس کا قوام اور دار ومدار ہے-حضرت رویم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: تصوف کی بنیاد تین خصلتوں پر ہے- 1 -فقر کا دامن مضبوطی سے تھامے رہنا، 2- ایثار اور خرچ کرنا، 3- خود سپردگی کرنا-

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے تصوف کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: تصوف یہ ہے کہ آپ بلا تعلق غیر، اللہ کے ساتھ ہوجائیں-

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں تصوف کا مطلب ہے: حقائق کو اپنا لینا اور مخلوق کی چیزوں سے مایوس ہوجانا -اس لیے جس کے پاس فقر نہ ہو وہ صوفی بھی نہیں ہے-

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے فقر کی حقیقت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: فقر وہ ہے جو حق کے علاوہ ہر چیز سے بے نیاز کردے-

حضرت ابوالحسین نوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: فقیر کی حقیقت یہ ہے کہ کچھ بھی نہ ہونے کے باوجود مطمئن ہو اور ہونے کی صورت میں خرچ کردیتا ہو- کچھ صوفیہ کا کہنا ہے کہ سچا فقیر مالداری سے اس خوف سے بچتا ہے کہ مالداری آنے کی صورت میں ہوسکتا ہے کہ اس کی فقیری میں فساد آجائے- یونہی مالدار کو فقیری سے بچنا چاہیے کہ فقر آنے کی صورت میں کہیں اس کی بے نیازی نہ ختم

ہوجائے-

حضرت ابوعبد الرحمٰن رازی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے مظفر القرمیسینی کو فرماتے ہوئے سنا کہ: فقیر وہ ہے جس کو اللہ کی بارگاہ سے کسی چیز کی طلب نہ ہو- راوی کہتے کہ میں نے آپ (ابوعبدالرحمٰن رازی) کو یہ بھی کہتے ہوئے سنا کہ میں نے ابوبکر مصری سے فقیر کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ فقیر وہ ہے جو نہ مالک ہو اور نہ دوسروں کو مالک بنائے- ''**لایکون له إلى الله حاجة**'' (اس کو اللہ کی بارگاہ سے کسی چیز کی حاجت نہ ہو) کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی بندگی کے کاموں میں مشغول ہو، اپنے رب پر مکمل اعتماد رکھتا ہو اور وہ یہ جانتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کی بہتر حفاظت فرمائے گا جس کی وجہ سے اس کو رب کی بارگاہ میں اپنی ضرورت کے لیے فریاد نہ کرنا پڑے کیونکہ اس کو بخوبی معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے احوال کا خوب علم ہے، اس لیے وہ اپنے اور رب کے درمیان سوال کو ایک زیادتی تصور کرتا ہو- مشائخ کے اقوال میں کبھی فقر سے زہد کی طرف اشارہ ملتا ہے اور کبھی تصوف کی جانب- اس صورت میں روحانیت کے طلبگار کو فقر کا حقیقی معنی معلوم نہیں ہو پائے گا- ان اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ تصوف، فقر اور زہد کا اسم جامع ہے لیکن اس کے اندر کچھ اور مزید اوصاف وکمالات ہونے چاہئیں کہ ان کے بغیر کوئی شخص صوفی نہیں ہوسکتا اگرچہ وہ زاہد اور فقیر ہو-

حضرت ابوحفص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: پورا تصوف آداب کا نام ہے، ہر وقت کے لیے ایک ادب ہے، ہر حال کے لیے ایک ادب ہے اور ہر مقام کے لیے ایک ادب ہے- لہٰذا جو اوقات کے آداب کا لحاظ رکھے گا وہ مردان خدا کے رتبے تک پہنچ جائے گا اور جو آداب کو ضائع کر دے گا وہ دور رہے گا، جب کہ وہ قرب کا گمان کر رہا ہے اور وہ مردود ہے جب کہ وہ قبولیت کی امید کر رہا ہے- انہوں نے مزید فرمایا کہ ظاہری ادب کا حسن، باطنی ادب کے حسن کا مظہر اور عنوان ہے- کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لو خشع قلبه لخشعت جوارحه** (اگر دل خشوع وخضوع اختیار کرے گا تو اس کے تمام اعضا وجوارح پر خشوع طاری ہوگا-)

حضرت ابومحمد جریری رحمۃ اللہ علیہ سے تصوف کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ہر اچھی عادت میں داخل ہونا اور ہر اوچھی عادت سے نکل جانا تصوف ہے- جب کوئی تصوف کا یہ معنی جان لیتا ہے کہ یہ حصول اخلاق حسنہ اور تبدیلی عادات رذیلہ کا نام ہے اور اس کی حقیقت کو

سمجھ لیتا ہے تو اس کو یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ تصوف زہد اور فقر سے بڑھ کر ہے- ایک قول کے مطابق شرف فقر کی انتہا تصوف کی ابتدا کا نام ہے-

اہل شام تصوف اور فقر میں فرق نہیں کرتے- وہ کہتے ہیں: اللہ کا ارشاد ہے: **للفقراء الذين أحصروا في سبيل الله** (۲/ ۲۷۳) ان فقیروں کے لیے جو راہ خدا میں روکے گئے- یہی صوفیہ کا وصف ہے اور انہیں کو اللہ نے فقراء کہا ہے- تصوف وفقر کے درمیان فرق اس طرح بھی واضح کیا جاسکتا ہے کہ فقیر وہ ہے جو فقر کے باوجود اس سے لگا رہے، اس کی فضیلت سے متصف ہو اور خود کو مالدار پر ترجیح دیتا ہو اور اللہ کی طرف سے ملنے والے عوض کا امیدوار ہو- کیوں کہ اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **يدخل فقراء أمتي الجنة قبل الأغنياء بنصف يوم: و هو خمس مائة عام** (میری امت کے فقیر جنت میں مالدار سے آدھے دن پہلے داخل ہوں گے وہ آدھا دن پانچ سو سال کے برابر ہوگا) اس لیے فقیر جب باقی رہنے والے انعام کو دیکھتا ہے تو حاصل ہونے والے فانی انعام سے رک جاتا ہے، فقر کو گلے لگا لیتا ہے اور فضیلت فقر اور اس کے انعام کے فوت ہوجانے کے خوف سے فقر کے زوال سے ڈرتا ہے، لیکن یہ طریق صوفیہ میں ایک مرض ہے۔ اس لیے کہ (فقیر) نے انعامات کی آس لگایا اور اسی کی خاطر سب کچھ چھوڑا - جب کہ صوفی چیزوں کو، ملنے والی نعمتوں کی خاطر نہیں چھوڑتا ہے، بلکہ موجودہ احوال کی خاطر، اس طرح وہ ابن الوقت ہوا- نیز فقیر کا جلد ملنے والے انعام کو چھوڑنا اور اس کا فقر کو غنیمت سمجھنا اس کی جانب سے ایک ارادہ اور اختیار ہے- اور اختیار وارادہ صوفی کے یہاں بیماری ہے- کیوں کہ صوفی اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے ساتھ ہوتا ہے نہ کہ اپنے ارادے کے ساتھ- اس لیے وہ فقر کی صورت میں کوئی فضیلت نہیں دیکھتا اور نہ مالداری کی صورت میں- بلکہ وہ تو صرف اس حالت میں فضیلت دیکھتا ہے جس حالت میں اسے حق پہنچا دیتا ہے اور کسی بھی حالت میں داخل ہونے میں وہ اللہ کا اذن دیکھتا ہے- کبھی وہ اذن الٰہی سے فقر وکشادگی کی حالت میں داخل ہوتا ہے اور اس وقت وہ وسعت میں اذن الٰہی کے سبب فضیلت سمجھتا ہے اور صادقین کے لیے وسعت وکشادگی کی حالت میں داخل ہونے کی گنجائش اسی وقت ہوتی ہے جب کہ وہ اس میں اذن الٰہی سمجھتا ہے- اس مقام پر قدم کے پھسلنے اور ڈگمگانے کا امکان رہتا ہے اور یہیں سے مدعیین کے دعویٰ کا باب وا ہوتا ہے- اور پھر صاحب حال پر جو بھی حال طاری ہوتا ہے موجود شخص

اسے بیان کرتا ہے-**لیهلک من هلک عن بینة و یحیا من حي عن بینة** (۴۲/۸) کہ جو ہلاک ہو دلیل سے ہلاک ہو اور جو جیے دلیل سے جیے-جب یہ واضح ہوگیا تو فقر وتصوف کے درمیان فرق بھی واضح ہوگیا- اور معلوم ہوا کہ فقر تصوف کا اساس ہے اور اسی پر اس کا دار ومدار ہے اس کا معنی یہ ہے کہ تصوف کے مرتبہ تک پہنچنے کا راستہ فقر ہی ہے نہ کہ اس معنی میں کہ تصوف کے وجود سے فقر کا وجود لازم ہے-

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: تصوف یہ ہے کہ حق آپ کو مردہ بھی بنادے اور زندہ بھی کردے- اس کا یہی مطلب ہے کہ صوفی اللہ تعالیٰ کی خاطر نہ کہ اپنی خاطر اشیاء کے ساتھ ہو-فقیر وزاہد خود اپنے وجود کے ساتھ اشیاء میں ہوتے ہیں، وہ اپنے ارادے کے ساتھ اور اپنے علم کی حد تک اجتہاد کرنے والے ہوتے ہیں- جب کہ صوفی خود پر الزام لگانے والا ہوتا ہے، اپنے علم کو کم سمجھتا ہے، اپنی معلومات کی طرف مائل نہیں ہوتا، اور اپنے رب کی مراد کے ساتھ قائم ہوتا ہے-

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: صوفی وہ ہے جس کو طلب نہ تھکائے اور نہ سلب (اشیاء کا نہ ہونا) اس کو پریشان کرے- انہوں نے مزید فرمایا: صوفیہ نے اللہ کو ہر چیز پر ترجیح دی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر چیز پر ترجیح دیا- ان کا ترجیح دینا یہ ہے کہ انھوں نے علم الٰہی کو اپنے علم کے اوپر اور ارادۂ الٰہی کو اپنے ارادے پر ترجیح دیا-

کسی شیخ سے پوچھا گیا: میں کس جماعت کی صحبت اختیار کروں؟ انہوں نے فرمایا: صوفیہ کی، کیونکہ ان کے یہاں بری چیز کے لیے بھی کوئی نہ کوئی عذر رہے- ان کے یہاں بڑے عمل کی بھی وقعت نہیں- وہ تجھے اسی (بری چیز) سے بلند وبالا کریں گے تو تم تعجب میں پڑ جاؤ گے- اور یہ ایک ایسا علم ہے جو فقیر وزاہد کے یہاں نہیں پایا جاتا - کیوں کہ زاہد ترک دنیا کو بڑا سمجھتا ہے اور حصول دنیا کو برا سمجھتا ہے، یہی حال فقیر کا ہے- ایسا اس لیے ہے کہ ان کا ظرف تنگ ہے اور وہ اپنے علم کی حد پر ٹھہرے ہوئے ہیں-

کسی شیخ نے کہا: صوفی وہ ہے جب اسے دو اچھے حالات یا دو اچھی خصلتوں کا سامنا کرنا پڑے تو وہ بہتر کے ساتھ ہو اور فقیر وزاہد دو اچھی خصلتوں کے درمیان بالکل فرق نہیں کر پاتے- بلکہ وہ ہر اس اچھی عادت کو اپنا لیتے ہیں جو ترک دنیا اور امور دنیوی سے نکلنے کا سبب بنے- اس

میں وہ اپنے علم کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں جب کہ صوفی اللہ کے نزدیک جو بہتر ہو، اس کو اللہ سے خوب التجا کر کے، اچھی طرح لو لگا کر، قرب الٰہی سے شرف یاب ہو کر اور ذات الٰہی کی طرف رجوع کر کے معلوم کرنے والا ہوتا ہے کیوں کہ وہ اپنے رب کو جانتا ہے اور محادثہ ومکالمۂ الٰہی سے اس کو حصہ ملتا ہے-

حضرت رویم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: نفس کو اللہ کے ساتھ اس کی رضا کے مطابق چھوڑ دینے کا نام تصوف ہے- حضرت عمرو بن عثمان مکی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تصوف یہ ہے کہ بندہ ہر وقت اس کام میں مشغول ہو جو اس وقت میں زیادہ اولیٰ ہو- کسی شیخ نے کہا: تصوف کا آغاز علم ہے، اس کا درمیان عمل ہے اور اس کی انتہا اللہ تعالیٰ کی جانب سے نوازش ہے-ایک قول کے مطابق تصوف اجتماع میں ذکر، سماع کے ساتھ وجد اور اتباع کے ساتھ عمل کا نام ہے -جب کہ ایک دوسرے قول میں تکلف کو چھوڑنا اور روح کو قربان کرنا تصوف ہے-حضرت سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: صوفی وہ ہے جو کدورتوں سے پاک ہو، فکر سے پُر ہو، لوگوں سے علیحدہ ہو کر اللہ کی طرف مکمل رجوع کرنے والا ہو اور اس کے نزدیک سونا اور ڈھیلا برابر ہو-

تصوف کے بارے میں کسی شیخ سے پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: مخلوق کی موافقت سے دل کو صاف کرنے، طبعی اخلاق کو چھوڑنے، انسانی صفات کو ختم کرنے، نفسانی اسباب سے بچنے، روحانی صفات سے متصف ہونے، حقیقت کے علوم سے متعلق ہونے اور شریعت میں رسول کی پیروی کرنے کا نام تصوف ہے-

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میں نے شام کے کسی ساحلی علاقہ میں ایک عورت کو دیکھا تو میں نے اس سے پوچھا: کہاں سے آئی ہو؟ اس نے کہا: اس قوم کے یہاں سے جن کے پہلو خواب گاہوں سے جدا رہتے ہیں، میں نے کہا: تمہاری مراد کیا ہے؟ جواب دیا: میری مراد وہ لوگ ہیں جن کو تجارت اور نہ لین دین، یاد الٰہی سے غافل بناتا ہے- تو میں نے کہا: ان کا حلیہ مجھ سے بیان کرو تو اس نے درج ذیل اشعار پڑھ کر سنائے:

قوم همومهم بالله قد علقت — فما لهم همم تسمو إلى أحد
فمطلب القوم مولاهم وسيدهم — يا حسن مطلبهم للواحد الصمد
ما إن تنازعهم دنيا لاشرف — من المطاعم واللذات والولد

ولـــلبـــــس ثيـــاب فـــائـــق أنـــق	ولا لـــروح ســـرور حـــل في بـلـد
إلا مســـــارعة فـــي إثـــر مــــنــــزلة	قـد قـارب الـخـطو فيهـا بـاعد الأبد
فهــم رهـــــائـــن غـــدران وأودية	و فـي الشـوامـخ تـلـقـاهم مع العدد

''وہ لوگ ایسے ہیں جن کو اللہ کی فکر لگی رہتی ہے،انہیں کسی اور سے مطلب نہیں- ان کا مقصد ان کا آقا و مولیٰ ہے ، یکتا اور بے نیاز ذات، ان کا کیا خوب مقصد ہے-انہیں نہ دنیا سے غرض اور نہ جاہ وجلال مقصود،کھانے ،لذت وآسائش اور نہ اولاد کی فکر- نہ پہننے کے لیے ان کو عمدہ لباس کی تلاش، اور نہ ان کو روح کا سرور مطلوب- انہیں صرف ایک درجے کے بعد دوسرے درجے کی جلدی ہوتی ہے ،اس میں ہمیشہ ان کے قدم جلدی پڑتے ہیں- وہ تالابوں اور وادیوں کے مکین ہوتے ہیں ،اور پہاڑ پر وہ مجاہدے کا ساز وسامان لیے ملیں گے-

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: صوفی اس زمین کی مانند ہے جس پر ہر بری چیز ڈالی جاتی ہے اور اس سے صرف عمدہ اور اچھی چیز ہی پیدا ہوتی ہے- انھوں نے مزید فرمایا: وہ اس زمین کی مانند ہے جس پر بدکار اور نیکوکار سبھی چلتے ہیں اور وہ اس بادل کی طرح ہے جو ہر چیز پر سایہ کرتا ہے اور اس بارش کی طرح ہے جو ہر چیز کو سیراب کرتی ہے-''

حقیقت تصوف کے بارے میں مشائخ کے ایک ہزار سے زائد اقوال ہیں- اس لیے تمام کا ذکر طوالت سے خالی نہ ہوگا مگر ہم اس مقام پر ایک جامع ضابطہ بیان کرتے ہیں کہ صوفی وہ ہے جو ہمیشہ تصفیہ وتزکیہ کرنے والا ہو ،وہ ہر وقت قلب کو کدورت کے شائبے سے اور دل کو نفس کے شائبے سے پاک کرتا ہو اور اسے اس قسم کے تصفیہ پر ہمیشہ مولیٰ تعالیٰ کی جانب اس کا احتیاج مدد کرتا رہتا ہو، کیوں کہ ہمیشہ رب تعالیٰ کا محتاج ہونے کی وجہ سے وہ کدورت سے بچتا رہے گا اور جب نفس حرکت میں آئے اور وہ کسی اپنی صفت کے ساتھ ظاہر ہو تو وہ اپنی بصیرت سے اس کا ادراک کر سکے اور اسے چھوڑ کر اپنے رب کی طرف رجوع کرے، کیوں کہ ہمیشہ قلب کے تصفیہ میں صوفی کو اطمینان ملتا ہے اور حرکت نفس اور اس کی کدورت سے وہ نعمت زائل ہو جاتی ہے اور اس میں کدورت آ جاتی ہے- اپنے رب کے ساتھ دل پر اس کا قابو ہے اور اپنے دل کے ساتھ نفس پر اس کا کنٹرول ہے-اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **كونوا قوامين لله شهداء بالقسط** (۸/۵) اللہ کے حکم پر خوب قائم ہو جاؤ انصاف کے ساتھ گواہی دیتے- اور نفس پر اللہ کے لیے قابو پانے کا

مطلب تصوف سے آراستہ ہو جانا ہے- بعض مشائخ نے فرمایا: تصوف اضطراب کا نام ہے ،اس لیے جب سکون ہو جائے تو پھر تصوف نہیں-اس میں راز یہ ہے کہ روح کا جناب الٰہی کی جانب ایک انجذاب ہوتا ہے یعنی صوفی کی روح قرب الٰہی کے مقامات کی مشتاق اور اس کے لیے بے تاب رہتی ہے-نفس کو پست کرنے میں اس کے لیے ناکامی ہے اور اس میں پیچھے کی جانب پلٹنا ہے، اس لیے صوفی کو ہمیشہ حرکت میں رہنا چاہئے - ساتھ ہی اسے رب کا ہمیشہ محتاج اور اسی کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور نفس جن چیزوں کی وجہ سے غالب آ سکتا ہے اسے اس کی اچھی طرح سے جانچ کرتے رہنا چاہئے-

(عوارف المعارف، الباب الخامس في ماهية التصوف)

❍❍❍

تذکیر

افادات: شیخ ابو سعید چشتی
ترتیب: ذیشان احمد مصباحی

تصوف اور اس کے درجات

تصوف کے تین درجے ہیں- پہلا درجہ تزکیہ کا ہے جس کا حکم قرآن میں اس طرح آیا "**قد افلح من زکّٰھا**" - تزکیہ تصوف کا پہلا زینہ ہے-تصوف کا دوسرا درجہ اخلاق ہے، وہ اخلاق جس کے بارے میں ارشاد ہے "**انک لعلیٰ خلق عظیم**" - یہ وہ اخلاق ہے جس کی وضاحت حدیث رسول میں ملتی ہے کہ جو تمہیں نہ دے اس کو دو اور جو تم پر ظلم کرے اس کے ساتھ احسان کرو اور جو تمہارے ساتھ برا چاہے اس کے ساتھ بھلا چاہو-اخلاق کی انتہا مکمل طمانینت اور صبر ہے، کہ پورے اختیار ہونے کے ساتھ، انتقام اور بدلے کا کوئی خوف نہ ہونے کے باوجود آپ اپنی جانی دشمنوں کو کہہ سکیں "**لاتثریب علیکم الیوم- اللھم اھدقومی**" - اور تصوف کا تیسرا درجہ ہے احسان، کہ عبادت ایسے کریں گویا آپ خدا کو دیکھ رہے ہیں اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم یہ کیفیت ضرور ہو کہ خدا آپ کو دیکھ رہا ہے-

یہ کیفیت دو طرح سے حاصل ہوتی ہے- ایک راستہ تو یہ ہے کہ کوئی کھڑا ہوا اور اچانک جناب الٰہی میں حاضر ہو گیا اور دنیا و مافیھا سے بے خبر ہو گیا- یہ جذب کا راستہ ہے- اللہ کسی کسی کو یہ کیفیت عطا کرتا ہے اور یہ کیفیت جسے عطا ہوتی ہے کوئی ضروری نہیں کہ ایسا بندہ بہت بڑا عالم یا عابد ہو- اللہ کا کرم جس کو اس کے لیے چن لے- دوسرا راستہ سلوک اور مجاہدے کا ہے کہ بار بار یہ خیال لانے کی کوشش کرے کہ میرا مولیٰ مجھے دیکھ رہا ہے- یہ خیال دو طرح کا ہو سکتا ہے- ایک عابدانہ و مجرمانہ انداز سے اور دوسرا عاشقانہ انداز سے- یہ کیفیت بڑھ کر اس حد تک بندے کو پہنچا دیتی ہے کہ وہ زبان حال سے گویا ہوتا ہے ؎

اسی کے نور سے اس کو بلا چون و چرا دیکھوں
وہ ایک نور مجسم ہے وہاں چون و چرا کیسا

○○○

مولاناعبدالمبین نعمانی

آفات لسان اوران سے بچنے کی تدبیریں

زبان اللہ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے، بندہ جس کا کماحقہ شکرنہیں ادا کرسکتا ،زبان ہی آدمی کو سربلند کرتی ہے اور وہی سبب ذلّت بھی بنتی ہے حتّی کہ زبان ہی سے آدمی جنّت کا مستحق بنتا ہے اور زبان ہی سے دوزخ کا بھی مستحق بن جاتا ہے- اس لیے زبان کی بڑی اہمیت ہے اور ہر اہم چیز کی حفاظت کرنی پڑتی ہے ورنہ وہ اپنی اہمیت وعظمت کو کھوبیٹھتی ہے، زبان بھی ایسی ہی چیز ہے جس کی حفاظت اور اس کا صحیح استعمال نہایت ضروری ہے- اسی لیے قرآن پاک اوراحادیث رسول میں زبان کی حفاظت اور اس کے صحیح استعمال کی بڑی تاکیدیں آئی ہیں ،صحابہ کرام اورصوفیہ عظام نے بھی حفظ لسان کو خوب خوب اہمیت دی ہے اور کسب حلال وصدق مقال کو تزکیہ نفوس کے لیے لازم قرار دیا ہے-

نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آج کے دور میں زبان کی قدر وقیمت گھٹتی جا رہی ہے اوراس کے صحیح استعمال سے غفلت بالکل عام ہے بلکہ بہت سے لوگ تو زبان کے غلط استعمال کو قابل فخر گردانتے ہیں- عوام الناس میں ،دنیاوی کچہریوں میں ،اور دنیادار حکام کے درباروں میں تو جھوٹ اور زبان کی دوسری برائیاں عام ہیں- زیادہ قابل افسوس بات یہ ہے کہ اب اہل علم، دین کے ذمہ دار حضرات اور بیشتر ارباب خانقاہ بھی اس سلسے میں بے توجہی کا شکار ہیں، جس کی وجہ سے عوام کی نصیحت ،امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ،اور اصلاح وتزکیہ کا عمل بے اثر ہوتا جارہا ہے، اولاً تو اصلاح ودعوت کا کام ہی بہت کم ہوتا ہے اور جو کچھ ہوتا ہے وہ قرآنی ارشاد (**یـا ایھـا الـذیـن امـنـو ا لـم تـقـولـون مالا تفعلون کبر مقتاً عند اللہ ان تقولو ا مالا تفعلون** – (الصّف-۶۱/۲-۳) اے ایمان والو، کیوں کہتے ہو وہ جونہیں کرتے -کتنی سخت ناپسند ہے اللہ کو وہ بات کہ وہ کہو جو نہ کرو ،(کنزالایمان) کو پیش نظر رکھ کرنہیں ہوتا ،اس آیت کریمہ میں بھی زبان

کوعمل کا پابند بنایا گیا ہے اور یہ کہ خالی زبانی جمع خرچ کی اہمیت نہیں ، زبان کی آفات بے شمار ہیں اور سب سے بچنے کی تاکید آئی ہے- ذیل میں ان کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے تاکہ اہل ایمان اپنا اپنا جائزہ لیں اور اس نعمت عظیمہ کی قدر کریں-

گناہ کی باتوں سے بچنا: زبان کو بات چیت، بیان واحکام میں ہمیشہ گناہوں کی باتوں سے بچانا ضروری ہے- مثلاً غلط مسئلہ بتادینا -حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دے دینا، کسی کو تکلیف پہنچانا- قرآن پاک کا ارشاد ہے :

ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھذا حلٰل وھذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب انّ الذین یفترون علی اللّٰہ الکذب لا یفلحون(النحل: ۱۶/۱۱۶)

اور نہ کہو اسے جوتمہاری زبانیں جھوٹ بیان کرتی ہیں یہ حلال ہے یہ حرام ہے کہ اللہ پر جھوٹ باندھو- بے شک جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں ان کا بھلا نہ ہوگا- (کنزالایمان)

آج جولوگ حلال چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں مثلاً بزرگان دین کے اعراس (جب کہ شرعی حدود میں ہوں)فاتحہ کی شیرنی اور ایصال ثواب کے مختلف طریقے، قرآن خوانی وغیرہ، ذکر میلاد شریف کی محافل کو جولوگ ناجائز وبدعت وحرام قرار دیتے ہیں- ان کو اس آیت کے پیش نظر اپنا حکم معلوم کرلینا چاہئے کیوں کہ قرآن پاک اور حدیث پاک میں کہیں بھی ان چیزوں کو حرام نہیں قرار دیا گیا ہے تو اب لوگوں کو یہ حق کہاں سے مل گیا کہ اللہ پر افترا کرکے حلال چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں، یوں ہی آج بہت سے لوگ حرام چیزوں کو حلال قرار دے کر بھی بہت بڑا گناہ کرتے ہیں اور اللہ پر افترا باندھتے ہیں مثلاً ،سود، رشوت ،شراب، جوا، ناجائزکھیل تماشے، بغیر ضرورت شرعیہ کے فوٹو بازی وتصویر کشی وغیرہ کہ آج ان سب کا بازار خوب گرم ہے اور گرفت کرنے پر طرح طرح کے حیلے بہانے تراشے جاتے ہیں، ایسے لوگ بھی مذکورہ آیت میں داخل ہیں-

سنی سنائی بات: بعض لوگ تو سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے جو سمجھ میں آتا ہے کہہ ڈالتے ہیں، اس کے انجام پر نظر نہیں رکھتے ،جیسا کہ واقعہ افک میں بعض حضرات سے ہوا، اس کا ذکر کرتے ہوئے قرآن پاک ارشاد وتنبیہ فرماتا ہے: **اذتـلـقّونہ بالسنتکم و تقولون بافواھکم ما لیس لکم بہ علم وتحسبو نہ ھیّناً و ھو عند اللّٰہ عظیم**– (النور:۲۴/۱۵)

جب تم ایسی بات اپنی زبانوں پر ایک دوسرے سے سن کر لاتے تھے اور اپنے منہ سے وہ

نکالتے تھے جس کا تمہیں علم نہیں اور اسے سہل (ہلکا) سمجھتے تھے اور وہ اللہ کے نزدیک بڑی بات ہے (یعنی بڑا گناہ ہے)۔ (کنز الایمان)

اس سے معلوم ہوا کہ محض سنی سنائی باتوں پر کان دھرنا اوران کو یقین کے سانچے میں ڈھال کرکوئی کاروائی کرنا کسی طرح جائز نہیں اور یہ کہ ایسا کرنے والے اسے کوئی ہلکا جرم نہ سمجھیں بلکہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا جرم ہے۔اسی لیے حدیث پاک میں ارشادفرمایا گیا:

كفىٰ بالمرء كذبا ان يحدّث بكلّ ما سمع-عن ابي هريرة رضي اللّٰه عنه،

(الجامع الصغیر ص ۳۸۹ ۔للسیوطی)

آدمی کو جھوٹا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ہر سنی ہوئی بات بیان کر دے۔

یعنی کوئی بات بیان کرنے کے لیے صرف سننا کافی نہیں ، اس کی حقیقت سے واقفیت ضروری ہے ، اور بیان کرنے کی بھی کوئی حاجت ہو، ورنہ بلا حاجت کسی بات کو پھیلانا ایک عبث کام ہے جس سے بچنا چاہیے۔ بات وہ پہنچائی جائے کہ سچ ہو اوراس کی کچھ حاجت بھی ہو۔

زبان اور دل میں ہم آہنگی: زبان اور دل کے اندر ہم آہنگی ضروری ہے، دل میں کچھ ہو اور زبان پر کچھ، تو اس کی کوئی قیمت نہیں بلکہ یہ منافقت ہے ،عام لوگوں کو تو اس سے دھوکہ دیا جاسکتا ہے لیکن خدا ورسول کے نزدیک ایسے لوگوں کی کوئی قیمت نہیں اور نہ ان کی باتوں کا کچھ اعتبار ہے ، بلکہ ان کے لیے وعید آئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يـقـولـون بـالسنتهم ما ليس في قلو بهم قل فمن يملك لكم من اللّٰه شيئاً ان ارادبكم ضرّااو ارادبكم نفعاًبل كان اللّٰه بما تعملون خبيرا- (الفتح:۴۸: ۱۱)

اپنی زبانوں سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں، فرماؤ! تو اللہ کے سامنے کیسے تمہارا کچھ اختیار ہے اگر وہ تمہارا برا چاہے یا تمہاری بھلائی کا ارادہ فرمائے بلکہ اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے۔ (کنز الایمان)

یعنی اللہ اگر تمہارے گناہوں کی سزا دینا چاہے تو کوئی اس کو ٹال نہیں سکتا اور نہ اگر وہ اہل ایمان وعمل کو اپنی رحمتوں سے نہال کرنا چاہے تو کوئی روک سکتا ہے،اور اسے جب تمہارے ہر عمل کی خبر بھی ہے تو پھر جھوٹ بولنے یا غلط عذر خواہی سے تمہیں کیا ملنے والا ہے۔ لہٰذا آدمی کو چاہئے سچائی کا دامن تھامے رہے اور ہر سود وزیاں سے بے پرواہ ہو کر صدق وصداقت کو اپنا شیوہ بنائے

اس میں اس کی بھلائی ہے دنیا کی بھی اور آخرت کی بھی اور زبانوں کا غلط استعمال کرنے والے یہ سمجھیں کہ دنیا کی طرح آخرت میں بھی جھوٹ بول کر چھوٹ جائیں گے، ایسے لوگ سن لیں رب عزوجل کا کیا ارشاد ہے:

یو م تشهد عليهم السنتهم و ايديهم و ارجلهم بما كا نو يعملون -

(النور:۲۴/۲۴)

جس دن (یعنی قیامت کے دن) ان پر گواہی دیں گی ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں جو کچھ کرتے تھے۔ (کنز الایمان)

جو لوگ غلط بیانی کے عادی ہیں اور اپنی چرب زبانی سے غلط باتوں کی تاویلیں کر کے نکل جاتے ہیں ذرا وہ اس دن کو بھی یاد کریں جب ان کی زبانیں ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے اور وہ انکار کرنے کی جرأت نہ کرسکیں گے ،مفسرین فرماتے ہیں پہلے زبان بولنے والے کے خلاف گواہی دے گی ، پھر اس پر مہر کر دی جائے گی اور ہاتھ پاؤں بولیں گے اور جو غلط کام ان سے کیا گیا تھا اس کی گواہی دیں گے، اتنی صاف صریح آیات کے بعد بھی اگر ہم نے اپنی زبان کی حفاظت نہیں کی تو اس کا مطلب یہی ہے کہ ہم خود اپنی ہلاکت کا گڈھا کھود رہے ہیں اور شوق سے جہنم میں جانے کے لیے تیار ہیں ، اور اس کے جان کاہ عذاب کی کچھ پرواہ نہیں رکھتے ، حالاں کہ دنیا میں ذرا سی مشکلات کا سامنا ہونے پر بلبلا اٹھتے ہیں اور برداشت کی ساری صلاحتیں کھو بیٹھتے ہیں۔

اب آیئے ذرا احادیث کریمہ کی سیر کرتے چلیں اور دیکھیں کہ حضور نبی رحمت ﷺ نے زبان کی حفاظت کی کس طرح تاکیدیں فرمائی ہیں۔

زبان کی حفاظت: حضرت سہیل ابن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا:

من يضمن لي ما بين لحييه وما بين رجليه اضمن له الجنّة - (رواه البخاری)

جو شخص مجھے اس چیز کی ضمانت دے دے جو اس دونوں جبڑوں اور دونوں ٹانگوں کے درمیان ہے تو میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں (مشکوٰۃ باب حفظ اللسان ص ۴۱۱)

دونوں جبڑوں کے درمیان سے مراد منہ اور زبان ہے کہ ان کو حرام بات اور حرام غذا سے

بچانا جنت کی ضمانت ہے، اوردونوں پاؤں کے درمیان سے مرادشرم گاہ ہے کہ اس کوبھی برائیوں سے بچانا جنت میں جانے کا سبب ہے اور ان سب کوآزاد چھوڑ دینا جہنم میں جانے کا سبب ہے -زبان ہی سبب ہلاکت اورزبان ہی سے نجات ملتی ہے-

عقبہ ابن عامر روایت کرتے ہیں کہ میں نے سرکار ﷺ سے عرض کیا نجات کیا ہے یعنی نجات کیسے ملتی ہے :فرمایا -زبان کوحفاظت میں رکھو، اور اپنے گھر کو کافی سمجھو یعنی گھر میں بیٹھ رہو،اوراپنے گناہوں پرآنسو بہاؤ- (مشکوٰۃ ص۴۱۳)

زبان کی خوبیوں اور خامیوں کے تعلق سے ایک اور ایمان افروز حدیث ملاحظہ کریں اور اپنے اعمال کا محاسبہ بھی کرتے چلیں-

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا:

بندہ رضائے الٰہی کا کوئی کلمہ بول دیتا ہے جس کا اسے احساس بھی نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے درجات بلندفرمادیتا ہے-اور بے شک بندہ کوئی ایسا کلمہ بول دیتا ہے جس میں اللہ کی ناراضی ہوتی ہے اور رب کی اس کو کچھ پرواہ نہیں ہوتی ہے تو اس کی وجہ سے وہ جہنم میں گر جاتا ہے- اوردوسری مسلم شریف میں ہے کہ اس آگ میں گرجاتا ہے جس کا فاصلہ مشرق ومغرب کے درمیان فاصلے کے برابر ہے- (بخاری ومسلم،مشکوٰۃ :ص ۴۱۱)

اس حدیث پاک سے پتا چلا کہ زبان بڑی مفید بھی ہے اور مضر بھی ،کبھی اچھی بات جو بہت معمولی ہوتی ہے لیکن رضائے الٰہی کے لیے بولی جاتی ہے تو جنت میں لے جاتی ہے اور درجات بلند ہوتے ہیں اور کبھی بے خیالی میں کوئی بری بات زبان سے نکل جاتی ہے تو وہ باعث جہنم ہو جاتی ہے اس لیے زبان کو بہت سنبھال کر رکھنا چاہیے اور کچھ بولنے سے پہلے خوب سوچ سمجھ لینا چاہیے تاکہ بے خیالی میں کوئی ایسا کلمہ نہ صادر ہو جائے جو ہلاکت کا سبب ہوجائے-

کسی پر کفریافسق کا حکم لگانا: زبان کی آفتوں میں ایک آفت یہ ہے کہ بندہ کبھی اپنے علاوہ کسی دوسرے کوکفر وفسق سے متصف کرتا ہے اور وہ ویسا ہوتا نہیں تو پھر یہ حکم قائل پر ہی لوٹ جاتا ہے یعنی یہ کہنے اور حکم لگانے والے ہی پر لوٹ جاتا ہے، فاسق کہا تو فاسق ہوگیا کافر کہا تو کافر ہوگیا ،کیوں کہ اس میں عدالت کوفسق اور ایمان کوکفر سے تعبیر کرنا پایا جاتا ہے- جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیث سے واضح ہے:

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

ایما رجل قال لاخیه کافر فقد باء بها احدهما- (متفق علیہ)

جوشخص اپنے بھائی کوکافر کہےتو وہ کفران دونوں میں سے ایک پرلوٹے گا- (مشکوٰۃ:۴۱۱)

یعنی اگر واقعی جس کو کہا وہ کافر ہےتو وہ اس کے مصداق ہی ہے اور اگر جس کو کہا وہ کافر نہیں ہے یا اس پرکفر ثابت نہیں ہوسکا ہے یہ کہنے والا خود کافر ہو جائے گا -

بخاری کی دوسری روایت حضرت ابوذر سے بھی ہے جس میں کفر کے ساتھ فسق کا بھی تذکرہ ہے ،یعنی فاسق کہا اور جس کو کہا وہ فاسق نہیں تو یہ حکم خود کہنے والے پرلوٹ جائے گا، اور ایک متفق علیہ روایت میں کفر کے ساتھ عدّ واللہ کہنے کا بھی ذکر ہے،یعنی جس نے کسی کوعدّ واللہ کہا اور وہ ایسا نہیں ہےتو یہ حکم قائل پرلوٹ جائے گا- ان احادیث سے معلوم ہوا کہ جولوگ بلا دلیل کسی کو کافر یا فاسق یا عدوّ اللہ (اللہ کا دشمن) کہتے ہیں وہ شریعت کے نظر میں بڑا جرم کرتے ہیں بلکہ وہ خود ان خطابات کے مستحق ٹھہرتے ہیں-

جولوگ اس سلسلے میں بے احتیاطی کا عمل جاری رکھے ہوئے ہیں ان کوسبق لینا اور اس سنگین صورت حال کا احساس کرنا چاہیے،آدمی اگر بظاہر مسلمان ہے تو اصل اس کا مسلمان ہونا ہے جب تک کہ صریح کفر سرزد نہ ہو، اس کو کافر نہیں کہہ سکتے، یا کفر تو صریح ہے لیکن قائل کی طرف اس کا انتساب قطعی نہیں تو اس صورت میں بھی کافر کہنا صحیح نہیں-

یوں ہی بعض لوگ اپنی زبان کو بے لگام چھوڑ دیتے ہیں پھر جس کو چاہا فاسق کہہ دیا جس پر چاہا لعنت کردی جس کو چاہا سور کہہ دیا اور حرامی و بے ایمان کہنا تو بالکل عام سی بات ہوگئی ہے جب کہ دونوں کا معنی بہت ہی سخت ہے ،ہاں جب کسی کا فسق وفجور متحقق ہوجائے اور اس کو ظاہر کرنے کی کوئی حاجت ہوتو ظاہر کرسکتے ہیں بلکہ ضروری ہے اور کوئی حاجت وضرورت نہ ہوتو ایک فضول کام ہے اور کبھی یہ چیز غیبت میں بھی تبدیل ہو جاتی ہے لہٰذا بچنا ہی بہتر ہے-

گالی دینا: زبان کی آفات میں ایک یہ بھی ہے کہ ایک مسلمان دوسرے کسی مسلمان مرد یا عورت کو گالی سے یاد کرے ،یہ فسق ہے اور گناہ، حدیث پاک میں آیا رسول پاک ﷺ نے ارشادفرمایا:

سباب المسلم فسوق و قتاله کفر -عن ابن مسعود رضي الله تعالیٰ عنه -

(متفق علیہ)

مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس کو قتل کرنا کفر ہے- (یعنی اسے حلال جان کے)

(مشکوٰۃ:ص ۴۱۱،حفظ اللسان)

دوسری روایت مسلم کی ہے حضرت انس اور ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا- **المستابان ما قا لا فعلی البادی ما لم یعتد المظلوم** -(رواہ المسلم)

آپس میں دو گالی دینے والے جو کچھ کہتے ہیں اس کا وبال ابتدا کرنے والے پر ہے جب تک مظلوم زیادتی نہ کرے- (مشکوٰۃ،ص:۴۱۱)

ان روایات سے گالی گلوج کی مذمت خوب واضح ہے، گالی ہی کی طرح فحش گوئی بھی شرعاً ممنوع ہے، اور گالی خود بھی فحش میں شامل و داخل ہے،اس لیے اس سلسلے میں روایات ملاحظہ کرتے ہیں:

فحش گوئی: زبان کو گندے کلمات سے آلودہ کرنا فحش ہے، اگر یہ بدکلامی کسی کی طرف منسوب کر کے یا کسی کو مخاطب کر کے ہو تو اس کو گالی کہتے ہیں، جس کا ذکر اوپر ہو چکا، گویا فحش عام ہے اور گالی خاص ہے- فحش بکنے کی بھی اسلام میں بڑی مذمت آئی ہے، کیوں کہ بدکلامی بدباطنی کی علامت ہے، جس کا باطن صاف اور پاک ہوگا اس کی زبان پر فحش آ ہی نہیں سکتا، لہٰذا جو لوگ گالی اور فحش کلامی کے عادی ہوں ان کو چاہیے کہ توبہ کریں اور ذیل کی احادیث کا مطالعہ کریں:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ایک حدیث میں ہے:

ان شر الناس عنداللّٰہ منزلۃ یوم القیامۃ من ترکہ الناس اتقاء شرہ ،و فی روایۃ اتقاء فحشہ (متفق علیہ)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین درجہ پانے والا قیامت کے دن وہ ہوگا جس کے شر سے بچنے کے لیے لوگ اس سے بھاگ بھاگ جائیں، اور ایک روایت میں ہے کہ لوگ اس کی بدگوئی سے بچنے کے لیے بھاگ جائیں- (مشکوٰۃ،ص:۴۱۲، حفظ اللسان)

فحش نثر میں ہو یا نظم اور گیت میں ہر طرح برا ہے: اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہٗ فحش گوئی کی مذمت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

الجنۃ حرام علی کل فاحش ان یدخلھا –

جنت میں داخلہ ہر فحش بکنے والے پر حرام ہے-

(اس حدیث پاک کو ابن ابی الدنیا نے **فضل الصمت** میں نقل فرمایا اور ابونعیم نے **حلیۃ الاولیاء** میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہما)

یوں ہی بے ضرورت و حاجت شرعیہ لوگوں سے فحش کلامی بھی ناجائز و خلاف حیا ہے

رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم فرماتے ہیں:

الحیاء من الایمان والایمان فی الجنۃ والبذاء من الجفاء والجفاء فی النار –

حیا ایمان سے ہے اور ایمان جنت میں ہے اور فحش بکنا بے ادبی ہے اور بے ادبی دوزخ میں ہے-

اس کو امام ترمذی و حاکم نے روایت کیا اور بیہقی نے شعب الایمان میں عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا- اور فرماتے ہیں رسول ﷺ!

الحیاء والعی شعبتان من الایمان والبذاء والبیان شعبتان من النفاق –

شرم اور کم سخنی ایمان کی دو شاخیں ہیں اور فحش بکنا اور زبان کا طرار ہونا نفاق کے دو شعبے ہیں-

اس کو امام احمد اور ترمذی نے روایت کیا اور امام ترمذی نے اس کو حسن بتایا اور حاکم نے ابوامامہ باہلی رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت کیا اور اس کو صحیح بتایا-

اور فرماتے ہیں ﷺ : **ماکان الفحش فی شئی قط الاشانہ وما کان الحیاء فی شئی قط الا زانہ –**

فحش جب کسی چیز میں داخل ہوگا اسے عیب دار کردے گا- اور حیا جب جب کسی چیز میں شامل ہوگی اس کا سنگار کردے گی-

اس کو امام احمد اور امام بخاری نے ادب المفرد میں روایت کیا اور ترمذی و ابن ماجہ نے انس بن مالک رضی اللہ تعالی عنہ سے بسند حسن روایت کیا- اس کی تخریج امام طبرانی نے کی ابوالدردا رضی اللہ تعالی عنہ سے سند حسن کے ساتھ-

حضرت یحییٰ بن خالد نے کہا:

اذا رأیت الرجل بذی اللسان وقاحا دل علی انہ مدخول فی نسبہ –

جب تو کسی کو دیکھے کہ فحش بکنے والا بے حیا ہے تو جان لے کہ اس کی اصل میں خطا ہے-

اس کو امام مناوی نے تیسیر (شرح جامع صغیر میں بیان کیا،) بچوں کو فحش سے بچانے کی تاکید کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں-

بچوں کو ایسی نا پاکیوں سے نہ روکنا ان کے لیے معاذ اللہ جہنم کا سامان تیار کرنا اور خود سخت گناہ میں گرفتار ہونا ہے- اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

یاایها الذین امنوا قوا انفسکم و اهلیکم نارًا وقودها الناس والحجارة علیها ملئکة غلاظ شداد لا یعصون اللّٰه ما امر هم و یفعلون ما یؤمرون – (التحریم ۶۶/۶)

اے ایمان والو، اپنی جانوں اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہیں- اس پر سخت درشت خو فرشتے موکل ہیں کہ اللہ کا حکم نہیں ٹالتے اور جو انہیں فرمایا جائے وہی کرتے ہیں- اللہ عزوجل مسلمانوں کو توفیق دے اور بری باتوں بری عادتوں سے پناہ بخشے آمین، **واللّٰه سبحنهٗ و تعالی اعلم**- (فتاوی رضویہ ج ۹/۱۸۲- رضا اکیڈمی ممبئی)

حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ حدیث نقل کرتے ہیں:

حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا،، دوزخ میں کچھ لوگ ایسے ہوں گے جن کے منہ سے نجاست نکلے گی اور اس کی بدبو سے تمام دوزخی فریاد کریں گے اور دریافت کریں گے کہ یہ کون لوگ ہیں، ان کو بتایا جائے گا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو فحش گفتاری کو پسند کرتے تھے اور فحش بکتے تھے-

شیخ ابراہیم بن مرہ نے کہا ہے کہ جو کوئی فحش بات کہے گا قیامت میں اس کا منہ کتے کا ہوگا-

امام غزالی فرماتے ہیں، جب کوئی مرض میں مبتلا ہو جائے اختناق الرحم (ہسٹریا) جذام وغیرہ- تو اس کو صرف بیماری کہے، ایسے الفاظ میں بھی ادب ملحوظ رکھے- اگر برے الفاظ استعمال کرے گا تو یہ بھی ایک قسم کی فحش گوئی ہوگی، (اکسیر ہدایت ترجمہ کیمیائے سعادت ص ۹: ۵-۵۸ مطبوعہ ادبی دنیا، دہلی-)

کذب بیانی: جھوٹ بولنا اور جھوٹی گواہی دینا بہت بڑا گناہ ہے اور اس کا تعلق بھی زبان ہی سے ہے- اللہ تعالیٰ اپنے خاص اور محبوب بندوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

والذین لا یشهدون الزور واذا مروا باللغو مروا کراما – (الفرقان: ۲۵/۷۲)

اور جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے، اور جب بے ہودہ پر گزرتے ہیں اپنی عزت سنبھالے گزر جاتے ہیں- (کنزالایمان)

اور فرماتا ہے:

فاجتنبوا الرجس من الآوثان واجتنبوا قول الزور – (الحج: ۲۲/۳۰)

تو دور ہو بتوں کی گندگی سے اور بچو جھوٹی بات سے- (کنز الایمان)

اس آیت میں یہ بات قابل غور ہے کہ جھوٹ کو بت پرستی کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جس سے جھوٹ کی مزید قباحت واضح ہو جاتی ہے-

جھوٹ کی مذمت میں احادیث بہت ہیں، چند یہاں ذکر کی جاتی ہے:

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا گناہ کبیرہ میں سے زیادہ بڑے بڑے گناہوں کی خبر نہ دے دوں!؟ لوگوں نے عرض کیا کیوں نہیں، ہم کو ضرور بتا دیجئے! آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

بڑے گناہوں میں سے زیادہ بڑے گناہ یہ ہیں:

- خدا کے ساتھ شرک کرنا-
- ماں باپ کی نافرمانی کرنا اور انہیں ایذا دینا-

یہ فرماتے وقت حضور ﷺ مسند لگا کر بیٹھے تھے پھر اک دم اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا:

- "**الاوقول الزور**" سن لو! اور جھوٹی بات پھر اسی لفظ کو اتنی دیر تک بار بار دہراتے رہے کہ ہم لوگوں نے اپنے دل میں کہا کہ کاش حضور اس بات کے فرمانے سے خاموش ہو جاتے اور اس کے آگے کوئی دوسری بات فرماتے- (بخاری: ۱/۶۲۳ مجلس برکات مبارک پور)

حضرت صفوان بن سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کسی نے کہا: کیا مومن بزدل ہوتا ہے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہاں! پھر کسی نے عرض کیا کیا مومن بخیل ہوتا ہے؟ فرمایا: ہاں! پھر کسی نے کہا: مومن جھوٹا ہوتا ہے؟ سرکار نے فرمایا: نہیں! (مشکوٰۃ ص: ۴۱۴)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

تم لوگ سچ بولنے کو لازم کرلو، کیوں کہ سچ نیکوکاری کا راستہ بتاتا ہے اور نیکوکاری جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے- آدمی ہمیشہ سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک

''صدیق'' لکھ دیا جاتا ہے-اورتم لوگ جھوٹ بولنے سے بچتے رہو کیوں کہ جھوٹ بدکاری کا راستہ بتاتا ہے اور بدکاری جہنم کی طرف لے جاتی ہے اور آدمی ہمیشہ جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کذاب لکھ دیا جاتا ہے-(مشکوٰۃ ص:۴۱۲/ترمذی۱۹/۲)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ اس سے ایک میل دور چلا جاتا ہے اس کے جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے (مشکوٰۃ ص:۴۱۳،ترمذی:۱۹/۲)

تذکیر: واضح رہے کہ جھوٹ بہت بڑا گناہ ہے کہ شرک کے ساتھ اس کو بیان کیا گیا، پھر حضور نے مذمت بیان کی تو اس کو بار بار دہراتے رہے-اور ایک حدیث میں گزرا کہ سرکار نے فرمایا مومن جھوٹا نہیں ہوتا،لیکن جھوٹ میں بدترین جھوٹ وہ ہے جو جھوٹی گواہی کے ساتھ بولا جائے، کہ اس کا گناہ تو بڑا ہے ہی ساتھ ہی دنیا ہی میں اس کا نقصان بہت بڑھ جاتا ہے کہ کسی کا حق مارا جاتا ہے کسی کو بلاقصور پھانسی دی جاتی ہے یا قید کیا جاتا ہے، لہٰذا ہر طرح کے جھوٹ سے بچنے کی پوری کوشش ہونی چاہیے اور جھوٹ کی نحوست کے لیے یہی کیا کم ہے کہ جھوٹ بولنے والے کے پاس سے رحمت کے فرشتے دور ہو جاتے ہیں- یہی وجہ ہے کہ آج جس قدر لوگ جھوٹ بولنے لگے ہیں اس قدر رحمت خداوندی سے دور بھی رہنے لگے ہیں، خدا عزوجل مسلمانوں کو جھوٹ کی لعنت سے دور رہنے کی توفیق دے-آمین

ہنسی میں جھوٹ: ہنسی مذاق میں بہت سے لوگ جھوٹ بولنے کو گناہ نہیں سمجھتے حالانکہ ایسا نہیں، ہنسی میں بھی جھوٹ جائز نہیں، چنانچہ حضرت بہز بن حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس شخص کے لیے خرابی ہے جو بات کرتے ہوئے لوگوں کو ہنسانے کے لیے جھوٹ بولتا ہے، اس کے لیے خرابی ہے اس کے لیے خرابی ہے (مشکوٰۃ ص:۴۱۳)

غیبت: کسی کا کوئی غائبانہ عیب بیان کرنا یا پیٹھ پیچھے اس کو برا کہنا یہی غیبت ہے چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے خود صحابہ کرام سے فرمایا: تم جانتے ہو غیبت کیا چیز ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جاننے والے ہیں تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہارا اپنے بھائی کی ان باتوں کو بیان کرنا جن کو وہ ناپسند رکھتا ہے-صحابہ نے عرض کیا اگر وہ بات اس کے اندر ہو تو کیا اس

وقت بھی اس کو کہنا غیبت ہے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر اس کے اندر وہ باتیں ہوں گی جبھی تو تم اس کی غیبت کرنے والے ہوئے اور اگر اس میں وہ باتیں نہ ہوں تو بہتان ہے- (مشکوٰۃ ص:۴۱۲)

غیبت بھی بڑا گناہ اور سخت حرام ہے اور آفات لسان میں اس کا درجہ سب سے بڑھا ہوا ہے-اس سے بچنا بہت مشکل ہوتا ہے بڑے بڑے اس گڈھے سے نکل نہیں پاتے، اس لیے اس سے بچنے کا اہتمام کچھ زیادہ ہی ہونا چاہئیے، قرآن پاک میں بھی اس کی مذمت آئی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ولایغتب بعضکم بعضاًایحب احدکم ان یأ کل لحم اخیہ میتاً فکرھتموہ واتقوااللّٰہ ان اللّٰہ تواب رحیم- (الحجرات:۴۹/۱۲)

اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو کیا تم میں کوئی پسند رکھے گا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے تو یہ تمہیں گوارا نہ ہوگا، اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے- (کنزالایمان)

غیبت کی برائی کے لیے قرآن پاک کا یہ ارشاد ایک مومن کو لرزا دینے والا ہے کہ غیبت کرنا مردار بھائی کے گوشت کھانے کے برابر ہے-

احادیث میں بھی اس کی بہت مذمت آئی ہے-احادیث میں سب سے سخت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

غیبت زنا سے سخت تر ہے-لوگوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ غیبت زنا سے سخت کیسے ہے؟ فرمایا: آدمی زنا کرتا ہے پھر توبہ کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے اور غیبت کرنے والے کو اس وقت تک معاف نہیں کرتا جب تک کہ وہ معاف نہ کردے جس کی غیبت کی ہے-(مشکوٰۃ ص:۴۱۵/بحوالہ بیہقی)

میں سمجھتا ہوں ایک مومن کے لیے یہی کافی ہے، ورنہ نقل کرنے کے لیے بہت سی احادیث ہیں- ان مذکورہ آیات اور احادیث پر اگر سچے دل سے غور کیا جائے تو بہ آسانی غیبت سے بچا جا سکتا ہے-

چغلی: چغلی بھی کبیرہ گناہوں میں ہے اور اس سے بڑے بڑے فساد رونما ہوتے ہیں لہٰذا

اس سے بھی اپنی زبان کو بچانا ضروری ہے-حدیث میں ہے:

لایدخل الجنة قتات (چغل خور جنت میں نہیں داخل ہوگا) (مشکوٰۃ ص:۴۱۱)

چغل خوری کی اس کے بعد کیا مذمت ہوگی اوراس سے بڑااور کیا نقصان ہوگا کہ چغل خور جنت میں نہیں جائے گا، کاش چغلی کرنے والے اس پر غور کرتے، اوراس حرکت سے باز آتے-

❍❍❍

نیاز حسن (ہری نارائن سنگھ)

بت پرستی سے حق پرستی تک

نیاز حسن صاحب 1956 میں ضلع غازی پور یو. پی کے ٹھاکر گھرانے میں پیدا ہوئے- آپ کا پیدائشی نام ہری نارائن سنگھ ہے- ابتدائی تعلیم غازی پور ہی میں حاصل کی- تقریباً 1978 میں یونیورسٹی آف الہ آباد سے بی.اے. کیا اور ایل.ایل. بی. میں داخلہ لیا- ایل.ایل. بی. کرنے کے زمانے میں ہی اسلام کے دامن سے وابستہ ہوگئے- آپ کے بیوی بچے موجود ہیں جو غازی پور میں رہتے ہیں- آپ سے محبت کرتے ہیں، اسلام کا احترام کرتے ہیں- اللہ ان کو بھی اسلام کی دولت سے سرفراز فرمائے- آپ اس وقت احرام پوش رہتے ہیں، اور اجمیر، سید سراواں اور پنجاب زیادہ تر ان ہی مقامات پر قیام کرتے ہیں اور دعوت وتبلیغ میں مصروف ہیں-(**ادارہ**)

یہ میرے وہم وخیال میں بھی نہیں تھا کہ میں اپنے آبائی مذہب سے برگشتہ ہوکر مذہب اسلام سے وابستہ ہوجاؤں گا اور میرا نام ہری نارائن سنگھ سے نیاز حسن ہوجائے گا-

میرے اسلام قبول کرنے کی داستان یہ ہے کہ میں جب بچپن میں چھٹی یا ساتویں جماعت میں تھا تو مجھے اتفاق سے خواجہ معین الدین حسن چشتی اجمیری سنجری کی زندگی سے متعلق ایک پرانی سی کتاب اپنے گھر سے ملی- جس کے پڑھنے سے میرے دل ودماغ میں اس آستانہ پر جانے کی طلب پیدا ہوئی اور وہاں کی حقیقت اور مذہب اسلام کی جانکاری کی آرزو پیدا ہوئی-

سوچتے سوچتے وقت گزرتا گیا، آخر کافی لمبے عرصے کے بعد میں وہاں پہنچا- اس دوران میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی.اے. پورا کرکے وکالت کی دوسری جماعت میں تھا- اجمیر صرف تین دن کے لیے گیا تھا، مذہب اسلام کی جانکاری کی غرض سے، وہاں تین دن گزارنے کے بعد جب

میں واپسی کے لیے ریلوے اسٹیشن پر آیا تو اچانک دل کا کھینچاؤ آستانۂ خواجہ کی طرف بڑھنے لگا اور دل میں یہ خیال آیا کہ ایک ہفتے اور رہیں- اس لیے وہیں سے آستانہ واپس چلا گیا اور ایک ہفتے گزار کر جب لوٹا تو پیسہ ختم ہو چکا تھا اس لیے میں نے اسٹیشن پہنچ کر ایک کانٹین (ہوٹل کے نوکر) سے کہا کہ میرا سوٹ کیس اور کوٹ لے لو اور مجھے کرایہ کے لیے پیسے دے دو تو اس نے لے کر دو سو روپیہ دے دیا لیکن ونڈو (ٹکٹ کھڑکی) پر آنے کے بعد پھر آستانہ کی طرف کھینچاؤ پیدا ہوا اور دل میں آیا کہ ابھی کچھ دن اور رہیں- لہٰذا میں واپس چلا گیا-

پھر ایک دن غسل کے لیے اَنا ساگر پر گیا تھا جہاں میری ملاقات غلام مصطفیٰ نام کے ایک شخص سے ہوئی جو بنگال کے بردوان ضلع کے رہنے والے تھے- ان سے اسلام کے بارے میں تھوڑی گفتگو ہوئی اور وہ مجھے اپنے پیر کے پاس لے گئے جہاں اسلام دھرم پر چرچا کے بعد مجھ کو اسلام سے دلچسپی ہوگئی- اور میں کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگیا- اسی وقت انھوں نے مجھے بیعت کرلیا-

پھر وہاں میں نے سات مہینے گزارنے کے بعد واپسی کا ارادہ کیا اور گھر چلا آیا لیکن دل ہمیشہ اجمیر شریف ہی کی طرف کھینچتا رہا-

پھر کچھ دنوں بعد دوبارہ میں اجمیر چلا گیا اور لگاتار تین سال کا عرصہ گزارا اور اسلامی Philosophy (قانون اور طور طریقے) کا مجھ پر کافی اثر پڑا اور میں اسلامی طور طریقے پر چلنے کی کوشش کرنے لگا- اور اسلام کی خوبیوں کا گرویدہ ہوتا چلا گیا- حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام ایسا دھرم ہے جو انسان کے دل میں اپنی جگہ خود بنا لیتا ہے اور انسان جب اسلام سے وابستہ ہو جاتا ہے تو وہ پھر اس سے باہر نہیں آسکتا-

حاصل یہ کہ میرے اسلام قبول کرنے میں سب سے زیادہ باثر حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے احوال و کوائف اور آپ کی نظر عنایت کا ہے-

اجمیر میں وقت گزرتا گیا، ایک دن رمضان کے مہینے میں میں خواجہ صاحب کے آستانہ میں ایک پیر بھائی کے حجرے میں ڈاکٹر اصغر مرحوم صاحب سے ملا تو انھوں نے سید سراواں شریف کے شیخ طریقت پیر شریعت حضرت ابوسعید قبلہ ادام اللہ ظلہ علینا کا تذکرہ کیا اور یہاں آنے کی دعوت دی- لہٰذا چند دنوں بعد میں ان کے ساتھ سید سراواں آیا اور شیخ کے احوال و کوائف سے متاثر ہو کر ''طلب بیعت'' ہوا، اور پھر یہیں قیام پذیر ہوگیا، اور صحبت شیخ میں

رہتے رہتے میں نے ہندی زبان میں قرآن شریف کی تلاوت شروع کی، جس کا میرے دل پر بہت زیادہ اثر پڑا اور مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ اسلام میں انسانی زندگی کا کوئی اخلاقی پہلو باقی نہیں جس کے بارے میں قرآن مجید نے انسان کو ہدایت نہ دی ہو، اس کے علاوہ عبادت کا ایک خاص نظام قرآن مجید نے مسلمانوں کو عطا کیا ہے جیسا کہ اللہ نے فرمایا: ''میں نے انسان کو پیدا کیا اپنی عبادت کے لیے'' نیز قرآن مجید میں عبادت کے پورے نظام کو بہت اچھی طرح درشایا (اجاگر) کیا گیا ہے-

○○○

تحقیق وتنقید

پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی

حقیقت تصوف - ایک تحقیقی وتنقیدی جائزہ

احسان تصوف کا قرآنی اور حدیثی نام ہے-متعدد آیات کریمہ میں احسان اور محسنین کا ذکر خیر آیا ہے-(۱) حدیث جبرئیل علیہ السلام میں احسان کی نہایت خوب صورت تعریف بھی آئی ہے- ''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ ایک دن ہم رسول اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر تھے کہ ایک شخص انتہائی سفید وشفاف لباس میں ملبوس اور بہت ہی سیاہ بالوں والا جس پر سفر کا اثر نظر آتا تھا اور وہ ہم لوگوں کے لیے اجنبی تھا حاضر خدمت ہوا اور رسول اکرم ﷺ کے پاس آپ ﷺ کے زانوئے مبارک سے اپنے زانو ملا کر بیٹھ گیا اور اپنی دونوں ہتھیلیاں اپنی رانوں پر رکھ لیں اور پھر عرض گزار ہوا: ''یا محمد! مجھ کو اسلام کے بارے میں بتایئے-رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں- اور تم نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو، اگر اس تک جانے کی تم میں استطاعت ہو-اس شخص نے کہا: آپ نے سچ فرمایا -حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی حدیث کا بیان ہے کہ ہم کو اس پر تعجب ہوا کہ آپ ﷺ سے سوال بھی کرتا ہے اور آپ ﷺ کی تصدیق بھی کرتا ہے- پھر اس شخص نے پوچھا: اب مجھے ایمان کے بارے میں بتایئے: آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر، اس کے ملائکہ پر، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان لاؤ اور تقدیر پر، اس کے خیر وشر پر ایمان لاؤ-اس شخص نے کہا: آپ ﷺ نے سچ فرمایا- پھر اس نے کہا: اب مجھے احسان کے بارے میں خبر دیجئے -آپ ﷺ نے فرمایا: تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو لیکن تم اگر اسے نہیں دیکھ سکتے تو وہ تو تمہیں دیکھتا ہی ہے-''اس حدیث جبرئیل میں اس کے بعد قیامت اور اس کی نشانیوں کے بارے میں سوال وجواب ہے -پھر اس شخص کے مجلس سے چلے جانے کا ذکر

ہے- پھر یہ فرمان ملتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے حضرت عمر سے فرمایا کہ وہ سائل حضرت جبرئیل علیہ السلام تھے جو تمہارے پاس آئے تھے تاکہ تم کو تمہارا دین سکھائیں (۲) (مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الایمان والاسلام والاحسان الخ؛ نووی، المنہاج، دمشق ۱۹۹۸ء، ۱/۱۳۱، ۱۳۳- کتاب خاکسار، وحی حدیث، دہلی اسلامک بک فاؤنڈیشن، دہلی ۲۰۰۴ء، ۱۸۷/ ۱۸۸ ومابعد: مفصل بحث کے لیے)-

امام مسلم نے اس حدیثِ جبرئیل علیہ السلام کی تخریج حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے بھی کی ہے جس میں بنیادی باتیں یہی ہیں امام نووی اور دوسرے شارحینِ حدیث نے لکھا ہے کہ یہ حدیث شریف تمام اسلامی علوم ومعارف اور آداب ولطائف کی حامل ہے -قاضی عیاض یحصبی اندلسی (م ۵۴۲/ ۱۱۴۷) نے اپنی کتاب میں شرحِ حدیث کرتے ہوئے اس حدیث کو اصل الاسلام کہا ہے اور بلا شبہ وہ ہے بھی اصل اسلام، کیوں کہ اس میں ایمان، اسلام اور احسان تینوں کی روح سمیٹ لی گئی ہے -اسلامی تصوف کا قرآن وحدیث سے استناد کرنے والے اہل علم اسی حدیث جبرئیل علیہ السلام کو بالعموم پیش کرتے ہیں- (۳)

احسانِ قرآنی یا تصوف اسلامی کے اس سر چشمہ کی صحیح تفہیم ضروری ہے ورنہ غلط فہمی پیدا ہوگی -احسان کو اسلام اور ایمان کے بعد تیسرے درجہ پر رکھا گیا ہے-اور اسلام کو ایمان سے بھی پہلے بیان کیا گیا ہے-اس کی حکمت یہ ہے کہ اسلام میں اصل مبادیات کا ظاہری روپ پیش کیا گیا ہے جو خود انسان کو اور دوسروں کو اس کا اسلام بتاتا ہے- زبان سے اللہ کی الوہیت، رسول ﷺ کی نبوت کا اقرار اول چیز ہے اور اسی کلمۂ عالیہ سے اس کے ایمان کی شہادت ملتی ہے- زبان کے علاوہ اعضا وجوارح اور مال ومنال سے نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کی ادائیگی کا ظاہری و پختہ ثبوت ملتا ہے- کیوں کہ ایمان تو دراصل قلب میں رہتا ہے اور اسے صرف صاحب ایمان ہی جان سکتا ہے اور دوسرے اس کے احوالِ قلب کو نہیں جان سکتے - لہٰذا ایمان دوسرے درجہ پر بیان ہوا اور وہ تمام ایمانیات کا جامع ہے- ان دونوں اسلام وایمان کے مجموعہ سے ہی ایک شخص مومن بنتا ہے- جیسا کہ سورۂ حجرات :۱۴، ۱۷ میں ایمان واسلام کا فرق وامتیاز بتایا گیا ہے کہ ایمان جب دل میں راسخ ہو جائے تو مومن ہوتا ہے اور ظواہر کی پابندی صرف اسے مسلم بناتی ہے- ایمان کے دل میں رسوخ اور استحکام کا طریقہ احسان میں بتایا گیا ہے- (۴)

عبادت الٰہی میں یہ جذبہ اور فکر پیدا ہو جائے کہ بندہ اپنے معبود حقیقی کو اپنی آنکھ اور اپنے دل سے دیکھ رہا ہے احسان کا اولین اور اعلیٰ درجہ ہے- لیکن یہ مرتبۂ عالی یا مقام بزرگ ہر شخص کی بات نہیں، اس کے لیے عظیم صفات واحوال ضروری ہیں -البتہ عام لوگ یہ فکر وتصور پیدا کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو ان کو ہر حال میں دیکھ رہا ہے اور ان کی عبادت میں بھی وہ حاضر وناظر ہے- اسلام میں اور اس حدیث میں عبادت کا بہت وسیع مفہوم ہے- وہ صرف نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج تک محدود نہیں ہے اگر چہ یہ چاروں ارکانِ اسلام ہیں اور اصل عبادات ہیں- ان کے علاوہ تمام فرائض کی بجا آوری اور تمام ممنوعات سے پرہیزگاری بھی عبادت ہے- (۵)

تصوف کا مقصد

سلوک یا حقیقت تصوف سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس کا مقصد سمجھا جائے اور اس کی غایت پہچانی جائے -تصوف کا مقصد وغایت اصلِ تصوف (۶) کی طرح مختلف تعبیرات وتشریحات رکھتا ہے- ان میں اختلاف محض لفظی نہیں ہے بلکہ فکر ونظر کا فرق بھی اس کا باعث ہے اور بہت سے دوسرے اختلافات معنوی ہیں- مختلف صوفیہ نے مختلف تعریفیں کی ہیں-

1- **تزکیۂ نفس:** غالبا سب سے واضح مگر ساتھ ہی سب سے وسیع تعریفِ تصوف علماء اور صوفیہ کے ہاں ملتی ہے- مختصرا اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو عمدہ خصائل سے آراستہ کرے اور رذائل سے پاک کرے -صوفیانہ اصطلاح میں یہ خصائل احوال کہلاتے ہیں جیسے صبر، شکر، توکل، غنا، خوف ورجاء، شوق ومحبت، صدق واخلاص، توحید وتوبہ وغیرہ- ان خصائل کے متضاد رذائل ہیں جیسے جزع وفزع، ناشکری، عدم توکل، بے حسی، کذب وبد دیانتی وغیرہ- اسی کو قلب کی صفائی کہتے ہیں کہ اچھے خیالات وخصائل اندرون میں پیدا ہو جائیں اور رذائل سے اس کو پاک کیا جائے-

تزکیۂ نفس یا صفائی قلب کے جو طریقے صوفیہ کرام نے بیان کیے ہیں- ان میں عبادت وریاضت وسیع ترین ہے- اس میں بہت سی چیزیں شامل ہیں جیسے ذکر وشغل کیا جائے اور ذکر الٰہی کی بہت سی اقسام بیان کی ہیں- شغل کا مفہوم یہ ہے کہ ان اذکار واشغال کے ذریعہ سالک اپنے معبود ورب کی طرف متوجہ رہے اور دوسروں سے بے نیاز ہو جائے- اللہ کا تصور وخیال جب اس

حد تک دل میں راسخ ہو جائے کہ زبان کے ذکر سے حرف وصوت بھی ختم ہو جائیں تو مکاشفہ شروع ہوتا ہے جو رفتہ رفتہ مستقل ہو جاتا ہے-مراقبہ بھی اس کی صورت ہے کہ انسان تنہائی اور خلوت میں بیٹھ کر اپنے قلب و ذہن کو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر مرکوز کر دے- محاسبہ اسی کی دوسری صورت ہے کہ خلوت گزینی میں اور مختلف اوقات میں بندہ یہ جائزہ لیتا رہے کہ اس کے کتنے کام، عبادات ، اذکار اور اشغال صرف رضائے الٰہی کے لیے ہیں اور کتنے صرف اپنے نفس کے مطالبات ماننے کے لیے ہیں-تزکیۂ نفس کا پورا نصاب صوفیہ کرام نے تیار کیا ہے جو بنیادی طور سے سب سلاسل میں یکساں ہے،صرف فروع میں مختلف ہے- جیسے ذکر جلی ہو (بآواز بلند) یا ذکر خفی (آہستگی کے ساتھ) ہو،مختلف اذکار بھی اسی وجہ سے ان میں رائج ہوئے ہیں- بہر حال ان نصابات کے ذریعہ صوفیہ کرام مریدین کے اندرون میں تزکیہ اور صفائی قلب پیدا کردیتے ہیں-امام غزالی نے اخلاق کے ظواہر- ظاہری اور محسوس صورتوں کے ساتھ ساتھ اخلاق کے دقائق پر بہت مفصل و علمی بحث کی ہے اور اس کا ایک عنوان مستقل قائم کیا ہے-(۷)

2- صوفی مقاصد وغایات تصوف: صفائی قلب اور تزکیۂ نفس کے عام، وسیع اور عمیق مقصد کے بالمقابل مختلف صوفیہ نے دوسری غایات بتائی ہیں- پہلے ان میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے پھران پر بحث کی جائے گی-یہ بہر حال پیش نظر رہے کہ یہ غایات تصوف مختلف ہیں:

1- فنا و بقا مقصد تصوف ہے: اس کا ذکر مختلف صوفیہ نے اپنی پسندیدہ تعبیرات میں کیا ہے:

- شیخ جنید بغدادی (م ۲۹۷/۹۰۹) کا بیان ہے کہ تصوف یہ ہے کہ اللہ تم کو اپنی ذات میں باقی کر کے تمہیں تمہاری ذات سے فنا کر دے-
- شیخ ابو بکر شبلی (م ۳۳۴/۹۴۶) کی تعریف ہے کہ ''تصوف نام ہے عالم شہود سے بے نیاز ہو جانے کا-''
- شیخ ابوعلی جوزجانی (م تیسری/نویں صدی) کا کہنا ہے کہ ''تصوف میں شخص اپنی ذات/نفس میں فانی ہو جاتا ہے اور اللہ کے ساتھ باقی رہ جاتا ہے-اسے نہ اپنی خبر ہوتی ہے اور نہ کسی دوسرے کی خبر رہتی ہے-''
- شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے بھی یہی کہا ہے: ''تصوف عبارت از فنا و بقاست''(۸)

2- حقائق غیبیہ کی معرفت: متعدد صوفیہ بالخصوص فلسفیانہ تصوف کے ماہرین وحاملین جیسے

ابن عربی شیخ اکبر کے نزدیک تصوف کی آخری غایت غیبی حقائق کی معرفت حاصل کرنا ہے کہ ذات و صفات الٰہی کیا ہیں اور افلاک کیسے ہیں؟ اور وہ کیسے وجود میں آئے بلکہ تمام کائنات کیسے پیدا ہوئی، جنت و جہنم کیا ہیں اور ان جیسے تمام غیبی امور کی حقیقت کیا ہے-(۹)

3- حصول توحید: بعض دوسرے صوفیہ کا خیال ہے کہ تصوف کا آخری مقصد اور آخری غایت توحید کا حصول ہے-اس منزل توحید کا مطلب یہ ہے کہ صرف ذات الٰہی کی وحدانیت کا یقین رہ جائے اور ما سوا کی ذات و وجود سے بے خبر ہو جائے -امام غزالی نے تصوف کو ''قرب الٰہی'' اور ''ذوق'' یعنی راست روحانی مشاہدے سے تعبیر کیا ہے جیسا کہ منقذ میں ان کا بیان ہے- (۱۰)

4- عبدیت کی تکمیل وایقان: بیشتر صوفیہ جن میں شیخ مجدد الف ثانی بھی شامل ہیں کہ تصوف کی اصل غایت یہ ہے کہ بندے کو اپنی عبدیت کا یقین کامل اور اس کی عبدیت کی تکمیل ہو جائے بایں طور کہ وہ صرف ذات الٰہی کو معبود حقیقی سمجھ لے (۱۱)

5- مقامات میں کسی مقام کا حصول: عبدیت ،فنا و بقا،جمع اور جمع الجمع،فرق،فرق مطلق اور عبدیت کی منزل کا سفر (۱۲) صوفی عبد ہونے کی منزل سے شروع کر کے درمیان کے مقامات سے گزرتا ہوا پھر عبدیت پر لوٹ آئے-

تزکیہ اور مقامات کے حصول کے ان دونوں عام وخاص مقاصد میں بڑا فرق ہے، جو تصوف کے مقاصد کو بھی متنوع بناتا ہے-تزکیۂ نفس اور صفائی قلب عام اور سب کے لیے ہے جب کہ صوفی مقاصد وغایات تصوف صرف کاملین اور اعلیٰ افراد کے لیے ہیں- ان سے زیادہ اور عظیم ترین فرق یہ ہے کہ تزکیہ رسول اکرم ﷺ کا طریق نبوت بھی تھا اور وہ تین چیزوں سے متعلق ووابستہ ہے: قرآن مجید نے متعدد آیات کریمہ میں رسول اکرم ﷺ کے کار نبوت/طریق نبوت کا ذکر ان عناصر کی ترتیب کے ساتھ کیا ہے-

اوّل: رسول اکرم ﷺ کا اولین طریق یہ تھا کہ وہ آیات الٰہی لوگوں کے سامنے تلاوت فرماتے تھے-تلاوت سے یہ مراد ومفہوم نہ لیا جائے کہ محض سننے سنانے سے کیا ہوتا ہے، یہ ذہن نشین رہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ کلام کی آیات مبارکہ ہیں اور ان کے الفاظ میں ہی وہ برکات پوشیدہ ہیں جو انسان کے قلب ودماغ پر بلا مفہوم جانے اثر کرتی ہیں- اور اولین مخاطبین جن کے سامنے وہ پڑھی جاتی تھیں وہ تو صاحب زبان وادب تھے، سنتے ہی کلام الٰہی کی برکات پا

لیتے تھے۔

دوم: رسول اکرم ﷺ ان کو کتاب کی تعلیم دیتے تھے۔ یہ تعلیم لفظی قرأت اور معنوی تفہیم دونوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ قرأت وتلاوت کے بعد آیات الٰہی اور کتاب ربانی کے کل معانی کی ترسیل ہو جاتی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہر شخص اپنی بساط کے مطابق ہی ان سے اکتساب فیض کرتا تھا۔

سوم: رسول اکرم ﷺ تلاوت وتعلیم کتاب کے ساتھ ساتھ ان کو حکمت سکھاتے تھے اور یہ حکمت کبھی حدیث وسنت کی صورت میں ہوتی تھی کبھی دوسرے اعمال واشغال کی صورت میں۔ احکام الٰہی اور سنن نبوی کے مقاصد وبرکات کی تعلیم بھی حکمت سکھاتی تھی۔ نبوی حکمت کا ایک طریقہ صرف صحبت نبوی میں بیٹھنا اور مجلس نبوی کی خاموش برکات سے مستفید ہونا تھا۔ اسی کو نظر وعنایت نبوی کہا جاتا ہے کہ اس سے جہان قلب دگر گوں ہو جاتا ہے۔ اور دل وجان میں نور بھر جاتا ہے۔ اسی وجہ سے صحبت نبوی کے برابر اور کوئی فضیلت نہیں اور اسی بنا پر صحابہ کرام کا مقام ومرتبہ افضل ہے جسے بڑے سے بڑا صوفی اور ولی نہیں پا سکتا۔

چہارم: تزکیہ فرماتے تھے۔ یہ تزکیہ دونوں طرح کا تھا۔ جسمانی بھی اور روحانی بھی۔ خصال انبیا اور خصال فطرت وضو، غسل، تیمّم وغیرہ کی طہارت جسمانی کے آداب واحکام کے ذریعہ بھی ہوتا تھا اور روح وقلب میں خصال محمودہ کے رسوخ اور ارتکاز اور دلوں سے بغض وکینہ، حسد وجلن، نفرت وعداوت اور تمام دوسری خباثتوں سے صفائی کے ذریعہ بھی تزکیہ کا رسوخ ہوتا تھا۔ (۱۳)

مقامات صوفیہ کا خاص معاملہ تزکیۂ نفس سے الگ بھی ہے اور خاص بھی اور اس کے علاوہ یقینی بھی نہیں ہے۔ ان تینوں سطحوں یا جہات کے حوالے سے اس کا مختصر تجزیہ حقیقت کو سامنے لائے گا:

(۱) الگ ہونے کا واضح ثبوت اور اس کی حقیقت ان آیات قرآنی اور احادیث نبوی میں ملتی ہے جن میں تزکیۂ کو کار نبوت اور رسول اکرم ﷺ کا ایک بنیادی کام قرار دیا گیا ہے۔ خود صوفیہ کرام نے اس کو تسلیم کیا ہے اور اس پر لکھا بھی ہے۔ شاید ہی کوئی صوفی اور صاحب قلم ہو جس نے تزکیۂ نفس پر زور نہ دیا ہو اور اسے جان وروح اسلام وایمان نہ بتایا ہو۔ احسان کی وہ کیفیت جو حدیث جبرئیل میں بیان کی گئی ہے اس کی شرح میں محدثین نے وضاحت کی ہے کہ یہ کیفیت تزکیہ کے بغیر نہیں ملتی۔ تزکیۂ نفس سے احوال پیدا ہوتے ہیں یا احوال سے تزکیہ، یہ دراصل لازم وملزوم کا دوطرفہ عمل وتفاعل ہے۔ (۱۴)

(۲) مقامات کا معاملہ خاص یوں ہے کہ ہر بندہ یا ہر صوفی کو مقامات سے سرفرازی نہیں ملتی، صرف خاص خاص کو ملتی ہے۔ دراصل اس پر صوفیہ کا اجماع ہے کہ سالک ومرید ہو یا شیخ ومرشد اپنے اکتساب سے کوئی بھی مقام نہیں حاصل کر سکتا کیوں کہ مقامات میں سے کسی مقام سے نوازنا خالص عنایت الٰہی پر مبنی ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے مقام عطا کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نہیں دیتا۔ چنانچہ بہت سے اکابر صوفیہ تک مقامات سے ناآشنا رہے اور ان کو ان میں سے کسی کا ذاتی تجربہ نہیں ہو سکا جب کہ ان سے فروتر مریدوں اور سالکوں کو کسی نہ کسی مقام تک رسائی مل گئی۔ (۱۵)

(۳) ان مقامات صوفیہ کا ایک سلسلہ ہے جو دائرہ کی شکل میں چلتا ہے اور جو عبدیت سے شروع ہوتا ہے اور اس سے آگے بڑھ کر فنا وبقا، جمع اور جمع الجمع تک لے جاتا ہے اور پھر اسی سے ترقی کر کے فرق اور فرق مطلق تک لاتا ہے اور بالآخر عبدیت پر اتار لاتا ہے۔ جمع وجمع الجمع کی دونوں منزلوں یا مقاموں میں صوفی وسالک اپنے آپ، اپنے نفس وذات کو ذات الٰہی میں مدغم پاتا ہے اور الگ نہیں سمجھتا پھر اس کے بعد اس کا روحانی تجربہ اسے بتاتا ہے کہ وہ بندہ ہے اور اللہ اس کا معبود، اور یہ فرق جب کامل ہو جاتا ہے تو فرق مطلق کہلاتا ہے اور اس کے بعد ہی بندہ/سالک کو اپنی کامل عبدیت کا ایقان اور تجربہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ان مقامات کا معاملہ یقینی نہیں رہ جاتا۔ مزید یہ کہ ان مقامات کا حصول غایت بھی نہیں رہ جاتا۔ متعدد صوفیہ ان مقامات میں سے کسی مقام پر اٹک کر رہ گئے جیسے منصور حلاّج وغیرہ اور سلسلہ/دائرہ مقامات کو پورا نہیں کر سکے اور منزل سے بھٹک گئے۔ لہٰذا مقامات، تصوف کی غایت نہیں بن سکتے۔ (۱۶)

طریقت وتصوف کا تعلق شریعت ودین سے

طریقت وتصوف کا اصل مقصد یہ ٹھہرتا ہے کہ اس کے ذریعہ تزکیۂ قلب اور طہارت نفس حاصل کی جائے اور اس کی بنا پر انسان، سالک ومرشد روحانی ترقی حاصل کرے، تقرب الٰہی سے سرفراز ہو اور انعامات الٰہی کا سزاوار بنے۔ طریقت کو کبھی کبھی شریعت کی روح بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ شریعت پر ایمان داری، خلوص اور محبت سے عمل کرنے سے وہ ملتی ہے۔ اور تصوف اسلامی یوں ہے کہ وہ تزکیہ، خلوص، محبت وطہارت کو پیدا کرتا ہے اور انسان کو روحانی ترقی سے آراستہ کرتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طریقت وتصوف کا یہ کام ومقصد ہے تو شریعت کا کیا کام ومقصد ہے اور

دونوں میں کیا رشتہ وعلاقہ ہے؟

اس باہمی تفاعل شریعت وطریقت کے متعدد جوابات دیے گئے ہیں اور دونوں کے باہمی رشتوں کو اجاگر کیا گیا ہے-ان تمام جوابات اور تصریحات کا خلاصہ چند نکات کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے:

- تصوف وطریقت خاص علم وعمل ہے اوروہ شریعت کے وسیع وعام تر علم وعمل سے ہی نکالا گیا ہے-امام غزالی (م۵۰۵/۱۱۱۱) کے مطابق متعدد اکابر صوفیہ نے تصوف کو صرف عمل قرار دیا ہے ،اسے علم نہیں مانا -مگر یہ صحیح نہیں،تصوف وطریقت دونوں ہی ہیں علم بھی اور عمل بھی -اوروہ اس باب میں شریعت کی مانند ہیں-امام غزالی نے دوسری جگہ اسے علم وعمل کا مرکب کہا ہے: ''لیکن یہ فرق ہے کہ شریعت میں علم کے بعد عمل پیدا ہوتا ہے تصوف میں بخلاف اس کے عمل کے بعد علم پیدا ہوتا ہے-'' شبلی نے اس کے بعد اس اجمال کی تفصیل پیش کی ہے-
- شریعت کی ظاہری رسوم ومراسم اور آداب واحکام پر عمل درآمد سے جب اس کی ظاہری شکلیں باقی رہ گئیں اور اس کی روح نکل گئی تو اس روح شریعت کو بیدار کر کے متحرک وفعال بنانے کے لیے صوفیہ نے شریعت کے ساتھ ساتھ طریقت ایجاد کی اور اس کے مختلف نصابات تیار کیے-
- تمام اسلامی صوفیہ کا اس پر اجماع ہے کہ شریعت پر عمل ظاہری اور باطنی دونوں لحاظ سے ہر شخص کے لیے ضروری ہے-تمام صوفیہ بھی شریعت کے احکام وفرامین کے پابند ہیں اور جو ان پر عمل نہ کرے یا معمولی سی معمولی چیز سے بھی گریز کرے وہ صوفی نہیں ہے-
- شریعت پر صحیح اور خالص عمل کا نام ہی طریقت ہے اور اس طریقت کے خاص ارکان ومراسم اور نصابات صرف اس کو محرک کرنے کے واسطے ہیں-(۱۷)

شریعت وطریقت کا اختلاف

شریعت ودین اور طریقت وتصوف میں کچھ چیزیں مشترک ہیں اور وہ ایک دوسرے کی تائید وتوثیق کرتی ہیں-جیسے تزکیۂ نفس اور صفائی قلب کے مختلف نصابات اور دوسرے اشغال واعمال صوفیہ

جن کا ذکر آگے آتا ہے اور ذرا تفصیل سے-متعدد چیزیں دین وشریعت کو طریقت وتصوف سے الگ کرتی ہیں اور وہ خاص دین وشریعت کا حصہ ہیں اور طریقت ان سے قاصر ہے-ان چیزوں کا بہت مختصر ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ان دونوں میں باہمی رشتہ وتفاعل کیا ہے اور ان دونوں میں اختلاف کیا اور کتنا ہے اور وہ طریقت وتصوف کا کیا مقام متعین کرتا ہے-

مآخذ دین وتصوف

تمام اکابر صوفیہ اور ان میں بھی بالخصوص صاحبان تصنیف یہ دعوی کرتے ہیں کہ اسلامی تصوف دین وشریعت سے ماخوذ ومستفاد ہے اور اس لیے اس کے ماخذ بھی وہی ہیں جو دین وشریعت کے ہیں یعنی کتاب وسنت-لیکن صوفیہ کرام کا اس پر بھی اجماع ہے کہ تصوف وطریقت میں علم کے بعض طریقے روحانی تجربات پر بھی مبنی ہوتے ہیں جن کو وہ الہام والقاء کشف وشہود وغیرہ کا نام دیتے ہیں- یہ دوسرا طریقۂ علم خالص انفرادی تجربات روحانی پر مبنی ہوتا ہے اور ہر صوفی کا طریقہ یا ماخذ علم دوسرے سے الگ ہوتا ہے اور مختلف بھی-اسلامی دین وطریقت میں الہام والقا، کشف وشہود وغیرہ کا پختہ ثبوت ملتا ہے-(۱۸)لیکن اس کے بعد ان دونوں طرق علم یا مآخذ تجربہ کا اشتراک ختم ہو جاتا ہے-اس کے اختلاف وفرق سے چند عناوین کے تحت بحث کی جاتی ہے-

وحی الٰہی: دین وشریعت کا اصل ماخذ وحی الٰہی ہے جو رسول آخر الزماں ﷺ پر اور دوسرے انبیاے کرام پر دوصورتوں میں اتری تھی :ایک کتاب کی صورت میں، جو وحی کہ فرشتہ حضرت جبرئیل کے ذریعہ لفظ ومعنی دونوں کے ساتھ قلب نبوی پر نازل ہوتی تھی-دوسری حدیث یا وحی خفی کی صورت میں،جس کے معانی کا القاء مختلف طریقوں سے کیا جاتا تھا جن میں الہام والقاء،رویاء صالحہ /سچے خواب ،کشف وشہود اور فرشتہ کے ذریعہ تنزیل وغیرہ شامل تھے- اس وحی خفی میں بسا اوقات الفاظ زبان رسالت مآب ﷺ کے ہوتے تھے-اور کبھی کبھی الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کے ہوتے تھے جیسے وحی حدیث قدسی وغیرہ مگر ان کا ضبط ویقین زبان نبوی ہی فرماتی تھی-(۱۹)

وحی الٰہی کی یقینی حیثیت: رسول اکرم ﷺ پر اترنے والی وحی الٰہی خواہ جلی ہو یعنی قرآن وکتاب یا وحی خفی ہو یعنی حدیث وسنت دونوں یقینی اور حتمی ذرائع علم ہیں-ان سے پکا علم ملتا تھا اور اس کے اندر کسی قسم کے شک وشبہ یا غلطی کی گنجائش نہیں ہوتی -وحی الٰہی کی اس یقینی حیثیت کا

مشاہدہ بسا اوقات صاحب وحی یعنی رسول اکرم ﷺ کے علاوہ دوسروں کو بھی ہوتا تھا اور ان میں صحابہ کرام یعنی اہل ایمان ویقین کے ساتھ ساتھ معاصرین عہد یعنی مشرکین وکفار دونوں شامل تھے اور دونوں اسے تسلیم بھی کرتے تھے یہ بات دوسری تھی کہ اہل کفر وشرک اور صاحبان نفاق ان کو اپنی نادانی، ضد، عداوت اور سرکشی سے برملا نہیں مانتے تھے-(۲۰)

الہام وکشف صوفیہ: تمام صوفیہ کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ان کا کشف والہام انفرادی ہوتا ہے اور یقینی نہیں- ایک صوفی کا الہام وکشف ایک ہی چیز کے بارے میں دوسرے صوفی کے کشف والہام سے مختلف ہوتا ہے اور مختلف ہوسکتا ہے- ان کے کشف والہام میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوسکتا- وہ خالص ہر شخص/صوفی کا ذاتی اور شخصی روحانی تجربہ ہوتا ہے اور سب سے بڑی بات کہ صوفیہ کرام کا الہام وکشف یقینی ذریعۂ علم نہیں ہے- کیوں کہ وہ صرف وجدان پر مبنی ہوتا ہے اور اس کے لیے کسی خارجی یا بیرونی شہادت، استناد اور استحکام کا پشتہ نہیں لگا ہوتا جیسا کہ وحی الٰہی میں ہوتا ہے-(۲۱)

صوفیہ کا اختلاف: صوفی الہام وکشف کی غیر یقینی یا غیر حتمی صورت پر اتفاق کے بعد صوفیہ کے اندر دو طبقات فکر ملتے ہیں-ایک فکر یہ ہے کہ صوفی الہام وکشف لازمی طور سے صحیح نہیں ہوتا اس میں خطا کا امکان ہے جیسا کہ حضرت مجدد الف ثانی وغیرہ کا خیال ہے- دوسری فکر یہ ہے کہ صوفی الہام وکشف اپنی ذات میں تو بالکل صحیح ہوتا ہے لیکن اس کی تعبیر میں غلطی کا امکان رہتا ہے اور یہ خیال حضرت شاہ ولی اللہ کا ہے-

ایک دوسرا اختلاف یہ بھی نظر آتا ہے کہ صوفی الہام وکشف کے صحیح اور غلط ہونے کے لیے استناد کی ضرورت ہوتی ہے-بعض غیر عالم صوفیہ کا خیال ہے کہ تمام کشوف والہامات صحیح ہوتے ہیں اور ان کے لیے کسی دوسرے ذریعہ سے استناد کی ضرورت نہیں ہوتی مگر اصحاب فکر وعلم صوفیہ کا خیال ونظریہ ہے کہ کشوف والہامات کا وحی قرآنی وحدیثی یعنی شریعت کے مطابق ہونا ضروری ہے یعنی ان کی صحت مشروط ہے، اگر قرآن وحدیث یا دین کے مطابق ہیں تو صحیح اور اگر ان کے خلاف ہیں تو غلط-تیسری صورت یہ ہے کہ وہ دین وشریعت کے مطابق ہیں اور نہ ان کے خلاف تو ایسی نئی صورت میں ان کا حکم واطلاق بھی مختلف فیہ ہے-(۲۲)

اطلاق وحی والہام صوفیہ: دونوں شریعت وطریقت کے مآخذ علم کے اطلاق و نفاذ میں بھی

فرق وامتیاز پایا جاتا ہے- وحی الٰہی جسے طریق نبوت بھی کہا جاتا ہے کا اطلاق ونفاذ لازمی ہے اور سب کے لیے ہے یعنی صاحب وحی کے لیے بھی اس پر عمل کرنا لازم ہے اور صاحب وحی کے مخاطبین کے لیے بھی وہ لازمی ہے- لہٰذا کتاب وسنت کے تمام احکام وآداب رسول اکرم ﷺ کے ساتھ ساتھ تمام اہل ایمان اور امتیوں کے تمام طبقات وافراد کے لیے لازمی اور ضروری اور فرض ہیں- اس طرح وحی کا اطلاق عام بھی ہے اور لازمی بھی-(۲۳)

الہام صوفیہ کا معاملہ مختلف ہے-اس طریق ولایت کے مآخذ علم کا لازمی اور حتمی اور یقینی ہونا ممکن نہیں ہے-اس لیے وہ اپنے اطلاق ونفاذ میں بھی اختلاف رکھتا ہے-یہ اختلاف صوفیہ کرام کے دو طبقات اہل فکر کے نتائج کا ورثہ ہے- ایک طبقۂ فکر کا خیال ہے کہ جس صاحب الہام وکشف پر الہام وکشف ہو اور وہ قرآن وسنت کے مطابق ہونے کی وجہ سے صحیح بھی ہو تو اس صاحب کشف والہام پر اس خاص الہام ذاتی اور کشف شخصی پر عمل کرنا ضروری ہے کیوں کہ وہ خاص عنایت الٰہی سے ملا ہے -دوسرے طبقۂ فکر کے مطابق صاحب الہام وکشف پر اپنے کشف والہام پر عمل کرنا ضروری نہیں ہے- اسے اختیار ہے کہ وہ چاہے تو اس پر عمل کرے- اسے تسلیم کرے اور اس کے مطابق اقدامات کرے، اس کا اظہار واعلان کرے اور چاہے تو عمل نہ کرے-(۲۴)

احوال ومقامات صوفیہ کا معاملہ کشف والہام شخصی پر مبنی ہوتا ہے- خاص کر مقامات کے بارے میں ان کے تجربات روحانی بالکل ذاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ بیشتر اکابر صوفیہ کے الہامات و کشوف، مقامات، فنا وبقا، جمع وجمع الجمع، فرق وفرق مطلق، عبدیت وتوحید کے بارے میں نہ صرف مختلف ہیں بلکہ ان کے اطلاقات ونفاذات بھی مختلف ہیں -صدیقیت، مجددیت، خلافت دوراں، قطبیت، قیومیت اور ان سے وابستہ متعدد ومتنوع سلوک کے معاملات سب اکابر صوفیہ کے ہاں مختلف ہیں اور خاصے انتشار کا باعث بھی-صرف ایک دو مثالوں سے بات واضح کی جاتی ہے- فنا وبقا کے مقام پر شیخ منصور حلاّج کے قیام اور ٹھہراؤ کو بہت سے صوفیہ نے صحیح سمجھا لیکن متعدد اکابر صوفیہ نے ان کے اس قیام ومقام کو غلطی سے تعبیر کیا کہ وہ دائرہ سلوک پورا کرنے سے قاصر رہے اور فروتر مقام پر اٹک گئے- اسی طرح وحدۃ الوجود کے فلسفیانہ فکر وتصوف کو متعدد اکابر صوفیہ نے صحیح قرار دیا اور حضرت ابن عربی کو اس کی تعبیر کی بنا پر شیخ اکبر قرار دیا -جب کہ اکابر صوفیہ کا ایک بڑا طبقہ جن میں حضرت مجدد الف ثانی بھی شامل ہیں، اس کو بالکل صحیح نہیں مانتا اور

اس کی جگہ وحدۃ الشہود کا نظریہ پیش کرتا ہے-اس باب خاص میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا
نظریہ تیسرا مکتب فکر سامنے لاتا ہے جو ان دونوں نظریات میں تطبیق دیتا ہے- (۲۵)

شریعت وطریقت کا عظیم ترین فرق

اکابر صوفیہ نے بالعموم اور حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے بالخصوص ان
دونوں میں فرق عظیم کا ذکر کیا ہے- وہ بہت وضاحت سے فرماتے ہیں کہ طریق ولایت اور طریق
نبوت میں بہر حال طریق نبوت کو طریق ولایت پر فوقیت وبرتری حاصل ہے- بلکہ وہ یہاں تک
جاتے ہیں کہ طریق نبوت لازمی طور سے سلوک الی اللہ کا یقینی، حتمی اور اچوک ذریعہ اور طریقہ ہے
اور اس کے بالمقابل طریق ولایت سلوک کا ذریعہ وطریقہ ضرور ہے، لیکن وہ یقینی، حتمی اور اچوک
نہیں، بلکہ اس میں خطرات بھی پائے جاتے ہیں-اس فرق عظیم کا ایک ذکر حضرت مجدد کے نظریہ
قرب ولایت اور قرب نبوت کے حوالے سے کیا جاتا ہے:

- قرب نبوت میں اللہ تعالیٰ اور بندے/صوفی وسالک کے درمیان جو دوئی (اثنیت) قائم
رہتی ہے-وہ دو طرح کی ہے :ایک قرب نبوت میں انسان رسول اکرم ﷺ اور کتاب
وسنت کا پابند ہونے کے باعث ان کے ذریعہ اللہ کا تقرب حاصل کرتا ہے-دوسرے یہ کہ
اس قرب نبوت میں بندہ بندہ رہتا ہے اور اللہ معبود ورب رہتا ہے اور ان دونوں میں یہی
رشتہ اتحاد وتقرب ہوتا ہے-
- قرب ولایت میں دوئی اور اثنیت ختم ہو جاتی ہے کیوں کہ سالک وصوفی براہ راست اپنے
روحانی تجربات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اور اپنے رب ومعبود سے رشتہ استوار کرتا ہے-اللہ
وبندے کے درمیان کوئی دوسرا فرد، شخص، ذریعہ یا واسطہ نہیں حائل ہوتا-دوسرے یہ کہ وہ
بندہ اور صوفی اللہ تعالیٰ کے ساتھ بلکہ اس کی ذات میں اپنے کو گم اور اس کے ساتھ اپنے کو
متحد پاتا ہے-(۲۶)

صحو وسکر کا فرق: قرب نبوت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ سالک وصوفی ہمیشہ اپنے ہوش وحواس میں
رہتا ہے اور خرد سے بے گانہ نہیں ہوتا-وہ جو کچھ سوچتا، کرتا اور بجالاتا ہے اس کا شعور وادراک رکھتا
ہے اور اسے اصطلاح صوفیہ میں صحو کہا جاتا ہے-اس کے ذریعہ یا زیر اثر تمام اکابر صوفیہ ارباب صحو

تھے اور کبھی بھی دین وشریعت کے خلاف کوئی کلمہ زبان سے نکالتے تھے نہ اعضاء سے کوئی کام خلاف
شریعت کرتے تھے-ایسے تمام صوفیہ نے صحو کا مقام یا حال ہی نہیں پایا بلکہ اسے صوفی وسالک کے
لیے ضروری قرار دیا-اس کے برخلاف قرب ولایت کے طریقہ میں اللہ سے اتحاد ووصال کے
خیال خاطر کے سبب صوفی وسالک پر ایک نشہ (سکر) طاری ہوتا ہے-اس عالم سکر میں صوفی یا
سالک اپنے ہوش وخرد سے بے گانہ ہوجاتا ہے اور وہ اپنی زبان سے بعض ایسے کلمات کہہ اٹھتا ہے
جو ناروا ہوتے ہیں ان کو شطحات کہا جاتا ہے اور اکثر اصحاب سکر جیسے منصور حلاج نے "**اناالحق**" اور
شیخ بسطامی نے "**سبحانی مااعظم شانی**" جیسے کلمات کہے، وہ بسااوقات اپنے وجد وسرمستی میں
ایسے اعمال وافعال کے بھی مرتکب ہوتے ہیں جو شریعت کی نگاہ میں ناروا ٹھہرتے ہیں-(۲۷)

سکر کے بعد صحو کی حالت میں بعض صوفیہ کرام نے جب عود کیا تو ان کو اپنے سکر پر اور سکر کی
حالت میں کہے گئے کلمات پر اور کردہ اعمال پر ندامت ہوئی ہے اور وہ ان سے توبہ کرتے ہیں-
لیکن پھر سکر کا عالم طاری ہونے پر وہی کچھ کہتے اور کرتے ہیں جو ندامت وتوبہ سے قبل کرتے
رہے تھے-اصحاب سکر کا یہ المیہ ہے کہ وہ اس کے چکر سے بالکل نہیں نکل پاتے-

نفس ارادہ یا بشری صفات کا ازالہ: قرب ولایت یا طریق ولایت میں ایک خاص مقصد یہ
موجود ہوتا ہے کہ انسان کے نفس ارادہ کا بالکل خاتمہ کر دیا جائے- اسی کی ترجمانی شیخ بایزید
بسطامی (م۲۶۱/۸۷۵) کا مشہور قول کرتا ہے "**ارید ان لا ارید**" (میرا ارادہ یہ ہے کہ ارادہ نہ
کروں) حالاں کہ حضرت شیخ کے اس قول میں ارادہ کا اثبات موجود ہے کہ وہ ارادہ نہ کرنے کا
ارادہ کر رہے تھے جو نفی کا اثبات ہے-دراصل اس طریق میں بندے، صوفی اور سالک سے انسانی
بشری صفات کو ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو غیر فطری ہے-وہ انسان کے عمدہ خصائل اور
رذائل میں فرق نہیں کرتا اور سب کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے، لیکن یہ صرف بعض شیوخ وطبقات کا خیال
ہے-حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی جیسے صوفیہ کرام قوت بہیمیہ کی بھی فنا نہیں چاہتے کہ وہ فی نفسہ مفید
ہیں اور بندے کے کام آتی ہیں البتہ ان کو قوت ملکیہ کے ماتحت کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان کے
ذریعہ ان بری قوتوں کا صحیح مقامات پر صحیح ومفید تر استعمال کیا جاسکے-

قرب نبوت اور طریق نبوت میں نفس کے ارادہ، قوت بہیمیہ کی کارفرمائی اور بشری صفات
کا ازالہ مقصود نہیں ہوتا-اس طریق نبوت میں برے ارادہ، قوت بہیمیہ کی برتری وچالاکی اور بری

بشری صفات پر قابو اور ان کو صحیح ارادہ کے تابع بنانے کی کوشش کی جاتی ہے- حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنے مباحث میں اس طریق نبوت کو بہت مفصل ومدلل انداز سے پیش کیا ہے اور اسی کو انھوں نے اپنے تصوف وطریقت میں بھی اختیار کیا ہے- اس لیے وہ شیخ بسطامی، حضرت داؤد طائی (م ۱۶۶/۷۸۲) حضرت رابعہ بصریہ (م ۱۸۵/۸۰۲) وغیرہ قرب ولایت کے انتہا پسندانہ نظریہ سے اختلاف کر کے اسے مجذوب صوفیہ کا طریقہ بتاتے ہیں اور وہ تمام دوسرے صوفیہ بالخصوص اصحاب صحو کا طریقۂ ولایت / قرب ولایت نہیں رہ جاتا- یہی طریقۂ نبوت بھی ہے-

اعتدال وتوازن: دین وشریعت کے تمام احکام وآداب اور تعلیمات میں سب سے نمایاں اور موثر ومثبت عنصر اعتدال وتوازن کا ہے- قرآنی آیات، حدیثی ارشادات اور مسنون تعلیمات نے کثرت سے یہ واضح کیا ہے کہ افراط وتفریط کسی بھی باب میں پسندیدہ نہیں حتی کہ عبادات جیسے نماز، روزہ، صدقہ وزکوۃ، حج، نذر ونیاز، اعتکاف وجوار، مراقبہ ومحاسبہ وغیرہ میں بھی اعتدال کا حکم ہے- متعدد واقعات عہد نبوی نے ثابت کیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے دین میں شدت اختیار کرنے والوں کو روکا کہ اللہ نہیں تھکے گا، تم تھک جاؤ گے چنانچہ رات رات بھر نمازیں پڑھنے، دن بھر روزہ رکھنے، مسلسل عبادت کرنے، جسم وبدن پر تنگی کر کے صدقہ وحج کرنے سے روکا گیا- اس تعلیم و تربیت میں بالخصوص رسول اکرم ﷺ کے ارشاد مذکورہ بالا میں انسانی فطرت کی رعایت کی گئی ہے کہ اس کے جسم وبدن پر بھی اس کا حق اسی طرح ہے جس طرح جسم وبدن کا اس کی ذات پر اور اللہ کے حق کے ساتھ ساتھ اس کو بھی اس کا حق دینا چاہیے- اس شخصی اعتدال کے ساتھ دین وشریعت، معاشرہ میں بھی توازن وتوافق اور عدل وانصاف اور اعتدال ومیانہ روی پیدا کرنا چاہتے ہیں- انسان صرف ایک اکائی نہیں جو خلا میں رہ رہا ہو وہ انسانوں کے معاشرہ میں رہتا ہے اور اس میں حقوق العباد ہوتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے حق کو ادا کرنے کا تقاضا کرتے ہیں جیسے والدین کے حقوق، بیوی اولاد کے حقوق اور خاندان کے باہر پڑوسی وغیرہ کے حقوق- دینی تشدد یا شدت پسندی ان تمام شخصی اور معاشرتی حقوق کے اتلاف یا ان کی صحیح ادائیگی میں حارج ہو جاتی ہے-(۳۰)

متعدد اصحاب صحو صوفیہ کرام نے اس اعتدال ومیانہ روی کو اپنے تصوف وطریقت میں بھی رہنما اصول بنایا- عبادات وریاضات انھوں نے بھی کیں، مراقبے ومحاسبے بھی، اذکار واوراد کا اہتمام کیا اور تمام حقوق اللہ کو بھی ادا کیا- اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے شخص وبدن کے

مطالبات بھی شریعت ودین کے مطابق ادا اور معاشرے کے فرائض وواجبات بھی پوری طرح سے انجام دیے- یہی وہ عظیم نفوس وشخصیات ہیں جنہوں نے تصوف وطریقت کے ذریعہ معاشرہ میں اصلاح وتربیت کا کام کیا- انھوں نے شادی بیاہ کی، ازدواجی تعلقات بنائے، والدین وخاندان کے حقوق ادا اور معاشرہ میں تمام حقوق العباد کو بھی پوری فراست وحکمت کے ساتھ ادا کیا- ان کے تمام کاموں میں اسی اعتدال ومیانہ روی کا عنصر پوری طرح کارفرما تھا-(۳۱)

افراط وتفریط: مجذوب صوفیہ کے نظریہ وعمل قرب ولایت میں نفس ارادہ اور بشری خصائل کی نفی نے افراط وتفریط کا رویہ پیدا کیا- چونکہ اس نظریہ وعمل میں فطرت انسانی سے بغاوت موجود تھی لہٰذا ان کے افکار اور اعمال دونوں میں افراط وتفریط پیدا ہو گئی ان دونوں کی چند مثالیں برائے عبرت وتأمل پیش ہیں-

افکار میں شدت: مجذوب صوفیہ کے بہت سے افکار واقوال پر سر دھنا جاتا ہے اور انسانی شدت پسندی اسے پسند کر کے سر دھننا بھی چاہتی ہے- بظاہر وہ اقوال وافکار سب کو پسند آتے ہیں لیکن ان میں خطرناک مضمرات موجود ہوتے ہیں-

ترک دنیا اور ترک آخرت کا تصور: صرف صاحبان جذب ہی نہیں بعض اوقات اصحاب صحو بھی ترک دنیا کی بات کرتے ہیں- تصوف وطریقت میں بالعموم ترک دنیا پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا ہے- اسلام اور دین وشریعت میں ترک دنیا مطلوب نہیں کیوں کہ یہی دنیا آخرت کی کھیتی ہے اور اسی کے اعمال خیر وافعال شر پر آخرت میں اجر وثواب اور سزا وعقاب ملیں گے- رسول اکرم ﷺ اور تمام انبیاے کرام اسی دنیائے دنی میں آئے تھے اور انھوں نے اسلامی معاشرے اور اسلامی ریاستیں قائم کی تھیں- دین وشریعت میں دنیا کی محبت، مال ودولت سے بے جا شغف اور کاروبار دنیا سے ایسی لذّت اندوزی جو آخرت کو بھلا دے مذموم ہے-

یہی وجہ ہے کہ اصحاب صحو اور صاحبان فکر صوفیہ کرام نے ترک دنیا کا راہبانہ تصور کبھی قبول کیا اور نہ اس کی اشاعت کی- تمام اکابر صوفیہ اپنے اپنے معاشروں میں دین وشریعت اور تصوف وطریقت کے اسی متوازن جادے پر گامزن واستوار رہے- حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنے ایک تنقیدی تبصرہ میں بجا طور سے لکھا ہے کہ اگر ترک دنیا کے اس نظریہ وعمل کو قبول کر لیا جائے تو یہ دنیا ایک خرابہ بن جائے، معاشرہ وتمدن کے تمام ادارے سوکھ جائیں اور تہذیب ومعاشرت کا

جنازہ نکل جائے-(۳۲)

لیکن صاحبان جذب اور افراط وتفریط کے مارے بزرگوں نے ترک دنیا کا راہبانہ تصور و عمل دیا اور خود خانقاہوں میں جا بیٹھے- ان کے افکار وتصورات اس سے بھی زیادہ غیر متوازن وغیر معتدل ہیں-

شیخ داؤد طائی کا قول ہے کہ اگر تم محفوظ رہنا چاہتے ہو تو دنیا ترک کردو اور عزت چاہتے ہو تو آخرت کو بھی ترک کردو-حضرت رابعہ بصریہ کا ارشاد ہے کہ جو شخص طلب آخرت یا طلب جنت میں عبادت کرتا ہے وہ غیر اللہ کو طلب کرتا ہے اور اسی بنا پر وہ جنت کو بھی جلا ڈالنے کی بات کرتی ہیں کہ عبادت الٰہی کسی لالچ میں نہ ہو،صرف خالصا لوجہ اللہ ہو-(۳۳)

استغراق اور عبادت میں اللہ تعالٰی کے خیال وتصور پر یہ تمام خیالات ونظریات طریقۂ نبوی اور طریقۂ صحابہ سے میل نہیں کھاتے-قرآن کی متعدد آیات کریمہ اور احادیث وسوانح کی روایات ثابت کرتی ہیں کہ جنت کی طلب اور دوزخ سے خوف عبادت الٰہی کا ایک باعث ومحرک بھی تھا اور مطلوب بھی- ترک آخرت کا یہ نظریہ خالص غیر اسلامی ہے اور اسے بعض اکابر صوفیہ کی تائید بھی حاصل نہیں ہے-

اعمال وعبادات وریاضات میں شدت :شدت افکار ونظریات نے ان صوفیہ کرام کے اعمال وعبادات وریاضات میں شدت پیدا کی- اور بسا اوقات وہ دینی تشدد پسندی بن گئی اور اس کا دین وشریعت سے رشتہ ٹوٹ گیا-انھوں نے بسا اوقات تجرد کی زندگی اختیار کی اور نکاح وزواج ،اولاد حتی کہ ماں باپ کی خدمت کو بھی روحانی ترقی اور سلوک میں حارج سمجھا-صوفیہ میں بہر حال دو طبقات ہیں :ایک خاندانی/خانگی زندگی اور نکاح وغیرہ کے قائل ہیں اور دوسرے نکاح پر تجرد کو فضیلت دیتے ہیں-ان میں اکابر تک شامل ہیں-

خانقاہی زندگی: ایسے صوفیہ کرام اور ان کے مریدین صرف اپنی خانقاہوں کے اسیر بن گئے اور معاشرہ سے کٹ گئے-وہ عام لوگوں سے تو کیا ملتے ملاتے اپنے مریدوں اور شاگردوں سے ملاقات سے بھی احتراز کرنے لگے اور ان پر بے جا شرطیں عائد کر دیں-

حضرت ابوبکر شبلی (م۹۴۶/۳۳۴) نے اپنے ایک شاگرد مرید کو ہدایت کی کہ اگلے جمعہ کی ملاقات وزیارت سے قبل اگر ان میں اللہ کے سوا کسی اور کا بھی خیال آجائے تو ان کی ملاقات کو نہ

آئیں-ذکر ویاد الٰہی میں استغراق کا یہ تصور ہی مبالغہ آمیز ہے-(۳۴)

ذکر واذکار کی شدت میں امام غزالی جیسے صاحبان فکر بھی مبتلا ہوگئے-سالک کے چار جمع چار مراحل طے کرنے کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ جب سالک سلوک کا یہ مرحلہ طے کر لے تو ہمہ تن ذکر وفکر میں لگ جائے اور اس دوران صرف فرائض اور رواتب سنت مؤکدہ رکعات کے علاوہ اور کچھ عبادت ونماز نہ کرے حتی کہ اس دوران وہ قرآن مجید کی تلاوت بھی نہ کرے-(۳۵) ذکر وفکر کی اس شدت میں حضرت امام اور ان کے ہم نوا بھول گئے کہ ان رواتب کے علاوہ بھی متعدد نمازیں مسنون ہیں جن کی تاکید آئی ہے اور قرآن مجید کی تلاوت تو بقول حضرت شاہ ولی اللہ اور دیگر اکابر صوفیہ سب سے بڑا ذکر ہے، اس لیے وہ روزآنہ تلاوت کو ہر مرید وشیخ وصوفی کے لیے ضروری قرار دیتے تھے اور اس کے ساتھ کم از کم پچاس رکعات روزانہ (فرائض ورواتب ،تہجد و صلاۃ الضحٰی واشراق وغیرہ) پڑھنے کا عمل بتاتے اور سکھاتے تھے-(۳۶)

دین وشریعت کی فرضیت : تمام اکابر صوفیہ اور اسلامی تصوف وطریقت کے قائلین اس حقیقت پر متفق ہیں کہ تمام مسلمانوں کے لیے شریعت ودین تسلیم کرنے فرض ہیں اور ان کے تمام احکام خواہ فرض وواجب ہوں یا مسنون ومندوب، دین ودنیا کی کامیابی پانے کے لیے ضروری ہیں- اکابر صوفیہ بھی دین وشریعت کو سب صوفیہ ،شیوخ،سالکوں ،مریدوں غرض کہ تمام اہل طریقت کے لیے واجب وفرض قرار دیتے ہیں- بلکہ وہ تو بعض مستحبات ومندوبات کو بھی اخروی نجات اور روحانی ترقی کے لیے ضروری مانتے ہیں جب کہ شریعت ان میں رعایت دیتی ہے- کیوں کہ ان کے خیال میں یہ مستحبات ومندوبات تقرب الٰہی کا باعث بنتے ہیں- اس لیے وہ بھی مریدوں اور سالکوں کے لیے لازمی ہیں-(۳۷)

بعض اکابر صوفیہ اور عظیم شیوخ کے بارے میں ایسی روایات وآرا ملتی ہیں جو ان پر شریعت کے احکام وآداب کو لازمی نہیں قرار دیتی ہیں یعنی وہ اپنی عبادات وریاضات کے سبب احکام شریعت کی بجا آوری سے بالاتر ہوگئے تھے اور ان سے بعض شرعی احکام وفرائض اٹھا لیے گئے تھے -حضرت شاہ ولی اللہ کے والد ماجد شیخ عبدالرحیم اور چچا ابو الرضا محمد کے بارے میں بھی ایسی روایت ملتی ہے- تمام بزرگ وپابند شریعت صوفیہ اور شیوخ نے بالکل دوٹوک انداز میں وضاحت کی ہے کہ کوئی بھی صوفی یا شیخ یا مرید وسالک خواہ کتنی ہی عبادت وریاضت کر لے اور چاہے جس

قدر عظیم ترین مقام پر فائز ہو جائے وہ شریعت کے احکام سے آزاد نہیں ہوتا، اس پر تکلیف شرعی باقی رہتی ہے کیوں کہ اس تکلیف شرعی سے خود رسول اکرم ﷺ باوجود صاحب شریعت ہونے کے مستثنیٰ نہیں تھے- ایسے خیالات وآراء یا تو وسوسہ کی دین ہیں جن کا تدارک کیا جانا چاہیے (۳۸) یا ان کی تعبیر دوسری ہے-

حضرت شاہ ولی اللہ نے ان کی انتہائی خوب صورت اور دل پذیر تعبیر کی ہے- وہ محض تطبیق یا حیلہ سازی نہیں ہے- فرماتے ہیں کہ تکلیف شرعی کی پابندی اٹھ جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ شیوخ واکابر دین وشریعت کے احکام سے مستغنی ہو گئے تھے بلکہ دین وشریعت کے یہ تمام احکام وآداب ان کی جبلت وفطرت میں اس طرح پیوست ہو گئے تھے کہ وہ ان کی فطری عادات بن گئے- انھیں وہ احکام وفرائض اور سنن ونوافل خارج سے ان پر مسلط جانے کا خیال بھی نہیں آتا تھا بلکہ وہ ان کے بطون واندرون سے نکلتے تھے- پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ ایسے تمام صوفیہ واکابر طریقت نے کبھی بھی احکام شریعت سے روگردانی نہیں کی بلکہ زیادہ پابندی کی اور دوسروں سے زیادہ ان کی بجا آوری کی- وہ تو مستحبات ونوافل کے بھی خوگر بن گئے تھے اور مریدوں کو بھی بناتے تھے- (۳۹)

تصوف وطریقت کی حیثیت

تصوف وطریقت کو کوئی بھی شریعت ودین کی طرح لازمی اور فرض نہیں بتا سکتا اور نہیں بتاتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ روحانی ترقی، تزکیۂ نفس اور صفائی قلب کے لیے اسے معاون بتاتا ہے اور اس بات کو بلا شبہ تسلیم کیا جا سکتا ہے- دوسرے الفاظ میں دین وشریعت کے انکار سے انسان دائرۂ ایمان سے نکل جاتا ہے اور اسے کافر یا مشرک کہا جاتا ہے- تصوف وطریقت کا منکر نہ غیر مسلم ہوتا ہے اور نہ دائرہ اسلام سے خارج، وہ بہر حال مسلمان، صاحب ایمان بنا رہتا ہے- اسی لیے اکابر صوفیہ اور صاحبان حکمت نے تصوف وطریقت کو صرف سنت کے درجہ میں زیادہ سے زیادہ رکھا ہے- (۴۰)

اسی سے یہ نکتہ نکلتا ہے کہ تصوف وطریقت سب کے لیے نہیں ہے جس طرح دین وشریعت ہر خاص وعام کے لیے ہے- حضرت شاہ ولی اللہ نے بالخصوص اور دوسرے متعدد اکابر صوفیہ نے تصوف وطریقت کو صرف صاحب کمال کے لیے مسنون بتایا ہے- پھر اہل کمال کے درجات مقرر

ہیں کہ ان میں بھی ادنیٰ، اوسط اور اعلیٰ درجہ کے اہل کمال ہوتے ہیں اور وہ اپنی بساط بھر اس سے اکتساب کرتے ہیں- حضرت شاہ نے ایک اور حکیمانہ بات اسی سے متعلق یہ کہی ہے کہ ان طبقات وافراد اہل کمال کے مذاق جدا جدا ہوتے ہیں اس لیے وہ تصوف وطریقت کے مختلف رنگ اختیار کرتے ہیں اور ظاہر ہے وہ رنگہائے تصوف ان کے مذاق وذوق کے مناسب ہوتے ہیں- (۴۱)

حضرت شاہ نے تصوف کے چہار رنگوں کا نظریہ پیش کیا ہے جو ان کے طریقت کے تاریخی ومسلکی تجزیے پر مبنی ہے- وہ اس نظریہ کو مختلف تراکیب کے ساتھ پیش کرتے ہیں: چہار رنگ ہائے تصوف کے علاوہ ادوار، تصوف اور دورات طریقت وغیرہ استعمال کرتے ہیں- ان کے اس نظریہ تصوف اور تجزیۂ طریقت کا صحیح ادراک نہیں کیا گیا اور بیشتر اہل قلم نے اس کو غلط سمجھا ہے- وہ تاریخی ادوار زمانی تصوف کے نہیں ہیں جیسے قدیم تاریخ، متوسط/قرون وسطیٰ یا عہد جدید کی تاریخ، بلکہ وہ اصلا ان کے دورات ہیں- اس پر بحث پھر پیش کی جائے گی- یہاں مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اول رنگ تصوف صرف فرائض وسنن نوافل کی بجا آوری میں ہے اور ان کی ادائیگی سے وہی روحانی ترقی اور قلبی اہتزاز ملتا ہے جو خالص تصوف وطریقت کے رنگوں سے جو اس اول رنگ میں موجود نہ تھے- دوسرا رنگ تصوف سلوک اور ذکر وفکر کا تھا اور تیسرا رنگ تصوف سلوک سے زیادہ جذب پر مبنی ہے اور چوتھا معرفت حقیقت کا ہے- (۴۲)

تصوف کی ضرورت

دین وشریعت کی فرضیت، ان کے ذریعہ روحانی ترقی کی ضمانت اور اخروی سعادت اور عہد نبوی وصحابہ کے رنگ تصوف سے معریٰ ہونے کی حقیقت کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب دین وشریعت کافی ہیں جس طرح خیر القرون میں تھے تو پھر تصوف کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟ عام طور سے ناقدین تصوف اور منکرین طریقت اور سادہ لوح اسلامیان امت یہ سوال اٹھاتے ہیں، بلا شبہ اس سوال کا ایک سیدھا سادہ اور صاف جواب یہ ہے کہ عام وخاص تمام مسلمانوں کے لیے دین وشریعت کافی ہیں اور ان کو تصوف کی ضرورت نہیں- لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی کہا جا سکتا ہے اور کہنا چاہیے کہ اہل کمال کے لیے طریقت کی بھی ضرورت ہے-

حضرت شاہ ولی اللہ تو حکیم شریعت اور ماہر دین کے ساتھ ساتھ تصوف وطریقت کے امام

عالی مقام بھی تھے-لیکن امام ابن تیمیہ (م۷۲۸/۱۳۲۸)صرف شیخ الاسلام اور دین وشریعت کے امام تھے اور تصوف کے بعض امور کے ناقد بھی تھے بایں ہمہ وہ تصوف وطریقت کے منکر اور اس کی افادیت کے انکاری نہ تھے- وہ اکابر صوفیہ کو تسلیم کرتے تھے اور تصوف کے بہت سے نظریات، افکار اور اعمال واشغال کے بھی قائل تھے- ان کے علاوہ متعدد دوسرے مفکرین اسلام اور محققین دین نے بھی طریقت وتصوف کی افادیت تسلیم کی ہے- وہ بہر حال اسلامی فکر اور مسلم تہذیب کا ایک عظیم ترین عطیہ ہے اور اس سے یکسر انکار صحیح نہیں ہے-(۴۳)

طریقت وتصوف کے بارے میں ایک عام غلط فہمی یہ پیدا ہوگئی ہے کہ وہ صرف عمل کی چیز ہے اور علم سے اس کا واسطہ نہیں- تصوف دراصل علم وعمل دونوں کا جامع ہے -تصوف کی امہات الکتب اور اکابر صوفیہ کے بیانات دونوں سے اس کی تصدیق ہوتی ہے -تاریخ تصوف بتاتی ہے کہ عہد نبوی اور دور صحابہ کرام میں طریقت وتصوف کا وجود نہ تھا -اس کا آغاز عہد تابعین میں پہلی صدی ہجری کے بعد ہوا- زہد وورع، فقر وترک دنیا، ذکر وفکر جیسے امور سے اس کا آغاز ہوا اور دھیرے دھیرے تیسری /نویں صدی تک سلوک کے نظریات اور اعمال دونوں وجود میں آ گئے- حضرت حسن بصری (م۱۱۰/۷۲۸) اور ان کے بعض معاصرین نے ان کو مرتب شکل میں پیش کیا- دوسری اور تیسری / آٹھویں نویں صدی میں بیعت وخرقہ مقامات واحوال سماع ووجد اور سکر وصحو اور معارف کا ارتقا ہوا- یہ تصوف کا عملی پہلو تھا اور اس کے بعد خالص نظری ارتقا ہوا جب معرفت حقیقت کے عنوان سے فلسفیانہ تصوف کو پروان چڑھایا گیا، ان دونو ں پر بہت ہی عظیم ومفید ادب تصوف تیار ہوا جو اسلامی فکر وعمل دونوں کو مالا مال بناتا ہے اور اسلامی تہذیب کی دین ہے-(۴۴)

تصوف کے یکسر انکار کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اسلام کی بہت سی عبقریات کا انکار اور ان کے عطایا کی تردید کردیں- اگر صرف ان کے اکابر کا ذکر ہی کیا جائے تو ان کی فہرست بھی ایک تحقیقی دفتر پر مشتمل ہوگی -بلا شبہ ان کی تعداد لاکھوں میں ہوگی -اور پھر مشائخ بھی کیسے کیسے جلیل القدر تھے جن کی عظمت وجلالت ، پاکی وطہارت کے ساتھ ان کی علمیت کے قائل علما تک تھے- ہر صدی میں ایسی ایسی عظیم شخصیات تھیں کہ ان پر کسی کو بھی فخر وناز ہوسکتا ہے اور وہ اسلام کی بھی مایۂ ناز عبقریات تھیں- ان میں زہاد ثمانیہ شامل تھے:اویس قرنی، عامر بن عبداللہ، ہرم بن حیان، ربیع بن

خیثم ،مسروق بن اجدع ،اسود بن یزید نخعی ،ابو مسلم خولانی اور حسن بصری-حضرت فضیل ابن عیاض (م۱۸۷/ ۸۰۲) ابراہیم بن ادہم (م۱۶۰/۷۷۷)،شقیق بلخی (۱۹۴/۸۱۰)،عبداللہ بن سہل تستری (م۱۸۳/ ۷۹۸)، ابو سلیمان دارانی (م۲۱۵/۸۳۱)، معروف کرخی (م۲۰۰ / ۸۱۵)، بشر حافی (۲۲۷ /۸۴۱)، سری سقطی (۲۵۳/۸۷۱)، عمرو بن عثمان مکی (م۲۹۱/ ۹۰۴)، جنید بغدادی (م۲۹۷/۹۱۰)، حارث محاسبی (م۲۴۳/۸۵۷)، حاتم الاصم (۲۳۷/۸۵۱)، ذوالنون ثوبان بن ابراہیم المصری (م۲۴۶ /۸۶۱)، یحی بن معاذ رازی (م۲۵۸/۸۷۲)، ابو یزید بسطامی (م۲۶۱/۸۷۵ یا ۲۶۴/ ۸۷۷)، سہل بن عبداللہ تستری، (م۲۸۳/۸۹۶) ابوالحسین نوری (م۲۹۵/۹۰۷)، ابوبکر شبلی (م۳۳۴/۹۴۶)، ان کے علاوہ سلاسل تصوف کے عظیم بانی ومفکرین کا ایک سلسلۂ درخشاں ہے اور ہر ایک سلسلہ کے عظیم ترین شیوخ واکابر ہیں جیسے شیخ عبد القادر جیلانی (م۵۶۱/۱۱۶۶)، شیخ شہاب الدین سہروردی (م۶۳۲/ ۱۲۳۴)، امام ابو الحسن شاذلی (م۶۵۶ /۱۲۵۸)، خواجہ بہاء الدین نقشبندی (م۶۶۸ / ۱۲۲۹)، خواجہ ابوالاسحاق چشتی (م۳۲۹/۹۴۰)- سلسلہ چشتیہ کے اکابر ہند میں خواجہ معین الدین حسن سنجری ،خواجہ قطب الدین بختیار کا کی ،خواجہ فرید الدین گنج شکر ،شیخ علاء الدین صابر ،شیخ نظام الدین اولیاء اور شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی وغیرہ کی عظیم کہکشاں کے ساتھ سہروردی ،نقشبندی ،شاذلی ،قادری اور دوسرے بہت شیوخ ہیں- ان کے علاوہ دوسرے سلاسل کے اکابر صوفیہ ہیں- ان سب کی خدمات و برکات اور اسلامی عطایا سے صرف نظر کرنا پڑے گا-

عظیم مولفین کتب تصوف میں ایسی عبقریات شامل ہیں جو اسلامی فکر اور دین وشریعت کے ماہرین ومحققین بھی تھے-تفسیر میں بقاعی کی نظم الدرر، مہائمی کی تبصیر الرحمن، سہل تستری کی تفسیر القرآن ،شیخ روز بھان کی عرائس البیان ،شیخ شعرانی وغیرہ کی متعدد کتب قیمتی اثاثہ ہیں- حسین بن منصور حلاج کی کتاب الطواسین ،حکیم ترمذی (م بعد ۲۱۸/۹۳۰) کی ختم الاولیاء وغیرہ ،السراج عبداللہ بن علی (م۳۷۸/۹۸۸) کی کتاب اللمع ،ابوطالب مکی (م۳۸۶/۹۹۶) کی قوت القلوب ،ابوالعباس النووی (م۳۹۶/۱۰۰۵) کی طبقات الصوفیة، امام الکلاباذی ابوبکر محمد بن اسحاق (م۳۸۰/ ۹۹۰ یا بعد) کی کتاب التعرف لمذہب اہل التصوف ،امام سلمی محمد بن حسین (م۴۱۲/۱۰۲۱) کی حقائق التفسیر وغیرہ، ابوالقاسم قشیری

(م۴۶۵/۱۰۷۲) کی **الرسالة القشيرية** اورتفسیر میں **لطائف الاشارات** وغیرہ، امام غزالی کی **احیاء علوم الدین**، کیمیائے سعادت وغیرہ، شہاب الدین سہروردی کی **عوارف المعارف**، امام شاذلی کی **حزب البحر**، ابونعیم اصبہانی کی **حلية الاولياء**، عبدالرحمٰن بدوی کی **شطحات الاولياء/الصوفيه**، عبدالقادرجیلانی کی **غنية الطالبين**، **الفتح الرباني** وغیرہ، عبدالکریم جیلی کی **الانسان الكامل**، حارث محاسبی کی **رسالة المسترشدين**، شیخ سلمی کی **طبقات الصوفية** اور **كتاب الاربعين**، مجددالف ثانی کی مکتوبات امام ربانی، شاہ ولی اللہ دہلوی کی **حجة الله البالغة**، **التفهيمات الالٰهية**، **همعات** وغیرہ ایک درجن کتب تصوف، ابن القیسرانی کی **صفوة التصوف**، عبدالرحمٰن جامی کی لوائح اورنفحات الانس، شیخ علی ہجویری کی کشف المحجوب، شیخ منیری کے مکتوبات صدی اور بہت سے ملفوظات شیوخ واکابر سے ہاتھ دھولینا پڑے گا- (۴۵)

بلا شبہ اکابر ومشائخ تصوف کے ہاں بھی افراط وتفریط ملتی ہے اوران سے زیادہ اصحاب سکر وجذب کے ہاں-لیکن ان عناصر غیرمحمودکونکال کرعمدہ عناصرتصوف ہماری اسلامی فکر ونظریہ کوبھی مالا مال کرتے ہیں اور ہمارے اعمال میں بھی پاکیزگی لاتے ہیں-اسی لیے تمام اکابرصوفیہ نے اسلامی تصوف کے لیے شرط یہ لگائی ہے کہ وہ کتاب وسنت اور دین وشریعت کے مطابق ہوں- تجزیاتی عمل بتاتا ہے کہ اعمال واشغال اورافکار ونظریاتِ تصوف تین قسم کے ہوسکتے ہیں اور ہیں:

1- کتاب وسنت کے مطابق :نوافل عبادات، نماز، روزہ، صدقہ اور دوسرے تمام عبادات واعمال واشغال ان میں شامل ہیں- یہی معاملہ مسنون اذکار واورادکا ہے-ان تمام کا ذکر حدیث وکتاب اور تعامل صحابہ اورسنت نبوی میں ملتا ہے -تصوف میں ان کو اختیار کیا جائے- (۴۶) غیرمسنون عبادات واذکارکوترک کر دیا جائے -اسی طرح نظریات وافکار کا معاملہ ہے- کشف والہام، القاء وغیرہ حدیث سے ثابت ہیں-

2- تجربات صوفیہ پرمبنی افکار واعمال: ان کی دوقسمیں کی جاسکتی ہیں اور کی بھی گئی ہیں- کتاب وسنت کی روح کے مطابق دوسری قسم وہ ہے جس کی سند کتاب وسنت میں نہیں ملتی -دوسری قسم اجتہاد امت وفقہاء کی مانند ہے-اگر وہ دین وشریعت کی مخالف نہیں تو ان کوقبول کرنے میں کوئی مانع نہیں کہ تجربات کی اصل صحیح ہونی چاہیے- ایک صحابی نے سورۂ فاتحہ کوسانپ یا بچھوڈسنے کی جھاڑ پھونک کے طور پر استعمال کیا اور رسول اکرم ﷺ نے ان کے اس عمل کی توثیق فرمادی

-ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں- (۴۷)

3 -غیرمسنون اورمخالف شریعت افکار واعمال: ظاہر ہے کہ قابل رد ہیں بشرطیکہ ان کی غیر اسلامی حیثیت واضح ہو جائے -محض کسی ناواقف فن کے کہنے سے وہ غیر اسلامی نہیں ہو جاتے بالخصوص اس صورت میں جب اکابر علما نے بھی ان کوتسلیم کیا اور مانا ہو-مثلا کشف وشہود، مقامات واحوال، طریقہ ولایت ومقام ولی، قطب ومجددوغیرہ، روحانی تجربات، سلوک وسیر الی اللہ حتیٰ کہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے نظریات وافکار فلسفیانہ کوعظیم ترین علمائے ربانی نے بھی تسلیم کیا ہے اورخود بھی قائل رہے ہیں-اوران کی اشاعت وتشریح بھی کی ہے- اس باب میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ کسی بھی صوفی کے روحانی تجربات کشف وغیرہ کا انکار دوسرا کیسے کرسکتا ہے جب کہ وہ ان کے تجربات کا شریک نہیں رہا اور دل چسپ بات یہ ہے کہ ایسے تجربات کا مزہ ہر عام وخاص بھی چکھتا ہے- (۴۸)

مختصر یہ کہ تصوف وطریقت اسلامی فکر وعمل کا ایک بیش قیمت سرمایہ اور قابل فخر عطیہ ہے لہٰذا اس سے دست برداری محرومی کا باعث ہے - البتہ تصوف وطریقت کے نام پر بدعات وخرافات کا رواج اور غیر اسلامی افکار ونظریات کی تبلیغ قابل نفرت ہی نہیں لائق رد ہے-

حرف آخر : دین وشریعت اورتصوف وطریقت کے باہم تفاعل وارتباط کی آخری بحث یہ ہے کہ ان میں سے کون پورا نظام زندگی ومعاشرت پیش کرتا ہے اورکون صرف ایک پہلو یا چند جہات وابعادکو پیش کرنا اپنا مقصود سمجھتا ہے-ظاہر ہے کہ اسلام بطور دین وشریعت زندگی کا پورا نظام اور معاشرت کا بہت مفصل، معتدل اور دل پذیر انصرام دیتا ہے-جب کہ اس کے مقابلے میں تصوف وطریقت صرف روحانی زندگی کا ایک خاص نظام پیش کرتے ہیں جوسب عام وخاص کے لیے ممکن نہیں- دوسرے ان میں افراط وتفریط کا وہ حصہ نامرضیہ ہے جس کو دین وشریعت کی تائید حاصل نہیں-

روحانی زندگی کا سکون وارتقاء اور مادی حیات کا اطمینان ونشو ونما صرف اسلامی نظام حیات میں ہے-وہ صرف رسول اکرم ﷺ اورصحابہ کرام کے طریقۂ اسلامی میں پایا جاتا ہے-اسی سے اس دنیا کی حسنہ ملتی ہے اور آخرت کی حسنہ بھی-صرف اسلامی نظام میں عبادات، اخلاق، اقتصاد، معاشرہ، سیاست اورتمام دوسری جہات کی تفصیل پائی جاتی ہے-یہ وہی نظام افکار واعمال تھا جسے

رسول اکرم ﷺ نے اول اول قائم فرمایا اور جسے خلافت راشدہ اسلامیہ میں پروان چڑھایا گیا- اسی نظام میں بقول حضرت شاہ ''دنیا وآخرت کی سعادتیں'' مضمر ہیں اور اسی کو روبہ عمل لانے سے وہ مل سکتی ہیں-

تصوف وطریقت کے عادلانہ نظام اور معتدل ومبنی بر شریعت افکار واعمال سے اس اسلامی نظام کو قائم کرنے میں مدد لی جاسکتی ہے اور شخصی اور نجی زندگی میں سکون وطمانیت لائی جاسکتی ہے اور معاشرتی زندگی میں توازن پیدا کیا جا سکتا ہے-تصوف وطریقت کے حسین وجمیل عطایا اور اکابر صوفیہ کی تعلیمات واعمال اور طریقے، رہنما خطوط وہدایت کے چراغ ضرور ہیں لیکن ان سے اسلامی نظام بر پا نہیں کیا جاسکتا- جہاں دنیا وآخرت دونوں کی سعادت انفرادی کے ساتھ امت اسلامی کی اجتماعی حیات اور اس کی نشأۃ ثانیہ کی ضمانت مل سکے-بقول امام مالک امت اسلامی کے تمام دکھوں کا مداوااور اس کے تمام ضروریات کی تکمیل اسی نسخۂ کیمیا میں ہے جو رسول اکرم ﷺ لائے تھے اور جس کے ذریعہ صحابہ کرام نے اسلامی عالمی امت برپا کی-ہمیشہ کی طرح آج بھی اسلامی امت کی آخری جائے پناہ اسلامی دین وشریعت ہے جس کا ایک حصہ طریقت بھی ہے-

تعلیقات وحواشی

(۱) قرآن مجید میں مصدر ''احسان''، بیشتر مقامات پر حسن سلوک اور حسن عمل کے لیے آیا ہے جیسے بقرہ:۱۸۷، ۲۲۹؛ توبہ:۱۰۰؛ نحل:۹۰، رحمٰن:۶۰؛ وغیرہ مگر اس کے مشتقات بالخصوص ''احسن''، ''احسنوا''، ''یحسنون'' اور اسم فاعل **محسن /محسنین** احسان اصطلاحی کے معانی ومفاہیم بھی رکھتے ہیں جیسے آل عمران:۱۷۲؛ مائدہ:۹۳؛ یونس:۲۶؛ نحل:۳۰؛ زمر:۱۰ وغیرہ- مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: محمد فواد عبدالباقی، **المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم**، مادہ: ح س ن

☆ احسان پر عالمانہ، صوفیانہ اور محققانہ بحث کے لیے ملاحظہ ہو: شاہ ولی اللہ، **حجۃ اللہ البالغۃ**، مکتبہ سلفیہ لاہور غیر مورخہ ۲/۶۶-۸۷: اذکار ودعوات وغیرہ کے علاوہ حضرت شاہ نے چار خصال شریفہ- طہارت، اخبات، سماحت وعدالت کا حصول ضروری بتایا ہے-

(۲) محمد یٰسین مظہر صدیقی، وحی حدیث، اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی ۲۰۰۴ء، ۱۸۷،

۱۸۸ وما بعد: اس بحث میں مسلم کی حدیث کی تشریح کے علاوہ دوسرے مباحث بھی ہیں اور محدثین وشارحین کے بیانات بھی-

(۳) مذکورہ بالا وحی حدیث اسلام کی تعریف وتشریح میں کلمۂ شہادت اور چاروں ارکان اسلام کا ذکر بہت معنی خیز ہے کہ ان کے اقرار اور عمل کے بغیر انسان مسلم نہیں بنتا- یہ ظواہر کا اعلان ہے- اس کے باطن /بواطن کا ذکر ایمان واحسان میں ہے-صوفیہ نے اسی بنا پر دین کے ظہر وبطن کا نظریہ پیش کیا ہے: ملاحظہ ہو: شاہ ولی اللہ، ہمعات اردو ترجمہ، ۴۱، ۴۳

(۴) **سورۂ حجرات: ۱۴، ۱۷: قالت الاعراب آمنا قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم الخ** ایمان اور اسلام کے فرق وامتیاز اور دین کے ظہر وبطن کے نظریہ کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے؟ حضرت شاہ نے اس نظریہ کی خوب تشریح کی ہے-مسلمانوں کے دراصل تین طبقات ہیں جن کا ذکر قرآنی آیات احسان وغیرہ میں بھی ملتا ہے: اول صرف مسلم جو ظواہر کی پابندی کرتے ہیں، دوم مومن جو ظواہر کے ساتھ بواطن کے بھی پابند ہیں اور اسلام ان کے دلوں میں راسخ ہوگیا ہے-تیسرے جو ان تینوں جامع اور اعلیٰ کیفیات ومقامات کے حامل ہوتے ہیں اور وہ محسنین ہیں-

(۵) عبادت پر آیات قرآنی ملاحظہ ہوں: المعجم المفہرس، مادہ ع ب د؛ حضرت شاہ نے احسان کے تین درجات کا ذکر کیا ہے: اول درجہ احسان اصحاب حرفت وشغل اور طلبہ علم کے لیے کہ وہ اذکار لسانیہ جیسے **سبحان اللہ وبحمدہ، لا الہ الا اللہ** اور دوسرے اذکار کریں جو صبح شام کے لیے ہیں اور تہجد ونوافل کا اہتمام کریں- دوسرا درجہ سلوک کے راغبین کے لیے ہے کہ وہ کثرت صوم وبیداری اور ذکر خفی وغیرہ کریں اور حصول فنا وبقا کے لیے ہے: تفہیمات ۱/۱۱۳، ۱۱۶: تفہیم: ۳۴-

(۶) تصوف کا مادہ ص و ف ہے-مقالہ نگار اردو دائرہ معارف اسلامیہ لاہور نے ''تصوف'' کے تحت اس کے معنی لکھے ہیں: ''اپنے آپ کو صوفیانہ زندگی کے لیے وقف کرنا'' پھر اس کے اشتقاق کے بارے میں مختلف آراء کا ذکر کیا ہے کہ وہ صوفی سے وضع کیا گیا ہے یا صوف سے-محض صوف یا اون پوشی کو امام قشیری نے صوفیانہ زندگی یا تصوف کو اہم ترین پہلو نہیں قرار دیا ہے- اس کے علاوہ متعدد دوسرے مآخذ کا ذکر ہے جیسے صفاء (پاکیزگی)، صفو (برگزیدگی)، صفی

(خلوص /خالص ہونا)، صفہ (چبوترہ) اصحاب الصفہ والا وغیرہ- اس مقالہ کے مولف مشہور نومسلم عالم وصوفی ابوبکر سراج الدین ہیں جو پہلے مارٹن لنگر کے نام سے جانے جاتے تھے-

اس ضمن میں شبلی نے امام غزالی پر اپنی عظیم تصنیف ''الغزالی'' میں ایک اہم نکتہ لکھا ہے کہ اصلا صوف/تصوف ''س'' سے ہے یعنی سوف/تسوف جس کے یونانی میں معنی حکمت ودانش کے ہوتے ہیں اور ممکن ہے کہ اس بنا پر صوفیہ کو صوفیہ کہا گیا ہو کہ وہ حکمت ودانش کی باتیں کرتے تھے -عربی میں ''س'' کو ''ص'' سے بدل کر صوف بنا لیا گیا جیسا کہ عربی میں ایک قاعدہ ملتا ہے اور صراط ومصیطر کی ایک قراءت وکتابت سراط اور مسیطر بھی ہے-امام غزالی کے تصوف پر بحث میں شبلی نعمانی نے تصوف کے آغاز وتعریفات کا بھی ایک جامع بیان دیا ہے :الغزالی ،اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء، ۱۵۷، ۱۶۵: سوف پر مختصر بحث بالکل آخر میں ابوریحان البرونی کی تحقیق کے حوالے سے لکھا ہے- بہرحال متعدد صاحبان تصنیف بالخصوص شیخ سہروردی کی عوارف المعارف میں تصوف کی تعریفات کا ایک جامع ذکر ہے کہ وہ صوفیہ کے مذاق خاص کی بنا پر متنوع ومختلف ہیں-

(۷) تزکیہ بھی ایک قرآنی لفظ واصطلاح ہے اور رسول اکرم ﷺ کے چار فرائض خاصہ میں سے ایک -وہ طہارت نفس اور صفائی قلب وجان کے معنی میں استعمال کی گئی ہے جیسا کہ آگے ذکر آتا ہے -معجم مفہرس میں مادہ ''ز ک ی'' کے تحت آیات کریمہ ملاحظہ ہوں :-شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، ۵۰/۱ ومابعد : مبحث السعادۃ میں بھی ان چاروں خصال کا ذکر وشرح ہے-تصوف وطریقت کا ایک مشہور نام سلوک ہے جسے سلوک الی اللہ بھی کہا جاتا ہے-حضرت شاہ نے اس کا ذکر متعدد جگہ کیا ہے-ہمعات اردو ترجمہ ،۱۸۳، ۱۹۳ میں اس پر اور اس کے طبقات پر عمدہ اور مفصل بحث ہے-امام غزالی نے احیاء العلوم کے باب ذکر علم المکاشفہ میں تزکیہ وطہارت کا بھی ذکر کیا ہے جو مکاشفہ پر منتج ہوتا ہے اور جس سے تمام اشیاء کی حقیقت کھل جاتی ہے اور ان میں وحی نبوت ، ملائکہ اور دوسرے امور غیب شامل ہیں -بقول امام غزالی کہ قلب صوفیہ اتنا مجلّا اور صاف ہو جاتا ہے کہ تمام علوم خود اس میں نقش ہو جاتے ہیں -امام غزالی کے فلسفۂ اخلاق پر ملاحظہ ہو شبلی کی بحث: ۶۲، ۹۱؛ شاہ ولی اللہ التفھیمات الالٰھیۃ ،۷۰/۲: تفہیم ،۵۱ وغیرہ-

(۸) مکتوبات امام ربانی ،مرتبہ نور محمد لاہور ۱۹۶۴ء اردو ترجمہ محمد سعید نقشبندی ،اعتقاد پبلیشنگ ہاؤس نئی دہلی ۱۹۹۶ء ۳۰۸/۱ :مکتوب-۱۳۵ نیز مکتوب ۹۷ (آئندہ صرف مکتوب نمبر)-

- ابوالقاسم قشیری ،الرسالۃ القشیریۃ ،قاہرہ ۱۹۷۲ء، ۵۵۴
- عبدالرحمٰن جامی نفحات الانس لکھنؤ غیر مورخہ ص ۴، ومابعد-
- شاہ ولی اللہ ،**التفھیمات الالٰھیۃ**، ۳۷/۲ :تفہیم ،۲۵ :**شرح فناء النفس و صفا تھا** الخ؛ ۵۵/۲ :تفہیم : ۳۹ وغیرہ-تفہیم : ۱۷ میں فنا وبقا پر عمدہ بحث ہے جس میں حضرت شاہ نے اپنی کتاب الخیر الکثیر کی بحث دیکھنے کا حوالہ ومشورہ دیا ہے-

(۹) ابن عربی، الفتوحات المکیہ ،بولاق ۱۲۹۲ھ؛ فصوص الحکم کے مباحث بحوالہ شاہ ولی اللہ ،التفہیمات الالٰہیہ ،مختلف تفاہیم جیسے ۲/ومابعد کی تفہیمات : ۴۰، ۴۱، ۴۴ بالخصوص المکتوب المدنی ،۲۶۱/۲، ۲۷۱ :تفہیم :۲۴۳

(۱۰) ابو حامد محمد غزالی ،المنقذ من الضلال ،لندن ۱۹۵۳ء؛ ۶۰، ۶۹ وما بعد ؛اردو دائرہ معارف اسلامیہ ،تصوف؛ غزالی، مشکوۃ الانوار، مرتبہ ابوالعلاء عفیفی ، قاہرہ ۱۹۶۴ء، ۵۷، ۶۰ ومابعد؛ التفہیمات الالٰہیہ، ۲۵۲/۲ وغیرہ تفہیم :۲۳۵ وغیرہ

(۱۱) مقامات کے دائرہ کے لیے ملاحظہ ہو مذکورہ بالا تفہیمات الٰہیہ اور مکتوبات امام ربانی کے ابواب ومکاتیب

(۱۲) شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ ،۲ /۸۸، ۱۰۲: ''المقامات والاحوال''؛ التفہیمات الالٰہیہ ،۲/ ۲۵۳ ومابعد: تفہیم :۲۳۶

(۱۳) دوسری آیات کریمہ کے علاوہ سورہ بقرہ: ۱۲۹ اہم ترین ہے- **یتلو علیھم آیاتک و یعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم الخ** نیز تفاسیر مفسرین جیسے تفسیر طبری وابن کثیر ورازی وغیرہ-

ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ سورہ بقرہ کی مذکورہ بالا آیت قرآن مجید میں بطور دعائے ابراہیمی نقل ہوئی ہے جو اعمال نبوت آخر الزماں ﷺ گناتی ہے-

(۱۴) حجۃ اللہ البالغہ ۸۸/۲ :حضرت شاہ نے احسان کے ثمرات کے حصول میں مقامات واحوال کو بیان کیا ہے نیز غزالی کی بحث مذکورہ-

(۱۵) مذکورہ بالا؛ مقامات واحوال کے باب حجۃ اللہ البالغہ میں حضرت شاہ نے مختلف مقامات کے حصول ووصولیابی کے ذرائع کا ذکر کیا ہے اوران سب میں یہ وضاحت کی ہے کہ وہ

صرف عنایت الٰہی سے ہی ملتے ہیں- صوفی ان کو اکتساب سے نہیں پا سکتا ،اگرچہ اس کے اکتسابات ان کے حصول کے لیے معاون ہوتے ہیں-یہی وضاحت امام غزالی اور دوسرے صوفیہ کرام کے بیانات میں بھی ملتی ہے-

(۱۶) حجۃ اللہ البالغہ کے علاوہ تمام کتب تصوف میں مقامات واحوال کا باب آتا ہے جیسے الرسالۃالقشیریۃ -

امام غزالی ،میزان العمل ،مرتبہ سلیمان دنیا ،مصر۱۹۶۴ء،۲۲۲،۲۲۴:عنایت /عنایت الٰہی کے عطیۂ الٰہی پر بحث-

(۱۷)شاہ ولی اللہ ،ہمعات ،اردو ترجمہ :سلوک الیٰ اللہ کی دوقسمیں ہیں :شرعی احکام واوامر کی پابندی پراس کا انحصار وقیام ہے-امام قشیری نے لکھا ہے کہ ''شریعت التزام عبودیت کا امر ہے اور حقیقت مشاہدۂ ربوبیت کا،وہ شریعت جوحقیقت سے مؤیدنہ ہو قابل رد ہے اور ہر حقیقت جوشریعت کی پابند نہ ہونامقبول ہے''الرسالۃ القشیریۃ ،۳۱امام غزالی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ہروہ طریقت وحقیقت جس کی تائید شریعت سے نہ ہوتی ہوکفر ہے-امام ابن قیم الجوزیہ اور امام ابن جوزی نے امام غزالی کے ان اقوال وآراء کاذکر کثرت سے کیاہے-شیخ شہاب الدین سہروردی نے عوارف المعارف میں طریقت کوشریعت کا پابند بتایا ہے-شبلی ،الغزالی ،۱۵۹ومابعد نے ابن خلدون کے مقدمہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ تصوف پہلے صرف عمل تھا- امام غزالی نے اس کو مدون کر کے علم تصوف بنادیا -احیاءعلوم الدین کی بحث بیان الفرق بین الالہام والتعلم میں اس کی تفصیل دی ہے-

(۱۸) رسول اکرم ﷺ کے کشف وشہود کے لیے ملاحظہ ہو :وحی حدیث ،۱۳۶،۱۶۰: بخاری ومسلم کی متعدد احادیث میں ان کشوف کا ذکر ہے -بحث کے لیے فتح الباری ،۳۷۸/۱،۱۳/۵۵ وغیرہ مختلف کتب کے ابواب-

(۱۹) بحث کے لیے وحی حدیث کل ابواب -وحی الٰہی پر حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے مباحث بھی ملاحظہ ہوں-

(۲۰)وحی حدیث ؛مختلف ابواب میں قرآن وحدیث کی وحی یقینی اور لازمی حیثیت پر علما وفقہا کے اقوال ومباحث حضرت شاہ نے طریق نبوت اورطریق ولایت میں اول الذکر اسی یقینی

علم کی بناپرفضیلت دی ہے-

(۲۱) کشف وشہود ،الہام والقاءصوفیہ پر حضرت مجدد اور حضرت شاہ کے مباحث ما بعد ملاحظہ ہو ں-شاہ ولی اللہ ،انفاس العارفین اردو ترجمہ ،۵۰ نے حضرت شیخ عبد الرحیم کے شیخ حضرت حافظ صاحب اکثر فرماتے:''کفش برسر کشف (کشف وکرامت کے سر پر جوتے) یعنی صوفیاء کے نزدیک استقامت معتبر ہے نہ کہ کرامت''- بایں ہمہ وہ کشف وکرامت کے قائل تھے،صرف ان کے درجہ فروتر ہیں-حضرت مجدد نے ایک جگہ الہام صوفیہ کوحلال وحرام کا پیمانہ نہیں سمجھا ہےاوراحکام شرعی کی تعیین میں ان کا کوئی کردارنہیں :مکتوب :۵۵،۲/ ۱۰۴-

(۲۲) شاہ ولی اللہ دہلوی،التفہیمات الالٰہیہ، مرتبہ غلام مصطفیٰ قاسمی،حیدرآباد سندھ، ۱۹۹۷ء،۱۹/۱ومابعد شیخ احمد،مکتوبات امام ربانی ،۱/ ۴۲۳ ومابعد مکتوب :۲۱۷

(۲۳)وحی حدیث کے ابواب میں وحی الٰہی کی فرضیت ،قطعیت اور وسعت پر بحث ہے نیزوحی پرمفسرین کرام وغیرہ کے مباحث-

(۲۴)مکتوبات امام ربانی ،۲۹/۲،۳۴وما بعد :مکتوبات :۵۵ الہامات شیخ عبدالرحیم دہلوی اور شیخ ابو الرضا اور دوسرے اکابر واجداد حضرت شاہ کے بارے میں مختلف کتب میں حضرت شاہ نے ان کی حقیقت کھولی ہے- ان کے لیے ملاحظہ ہوں :فیوض الحرمین ،مختلف مشاہدات ؛انفاس العارفین اردوترجمہ:سوانح وحالات شیخ عبدالرحیم وابوالرضا محمد وغیرہ

(۲۵) منصور حلاج پر نقد ابن تیمیہ کا سبب یہ تھا کہ وہ حلول کے قائل تھے جب کہ تمام اکابر صوفیہ بھی اس کے خلاف ہیں کیوں کہ ذات الٰہی میں نہ تو کوئی صوفی وولی حلول کر سکتا ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کسی مظہر ومخلوق میں حلول فرماتا ہے- اس کے علاوہ فنا وبقا کے مقام پر ان کے رہ جانے پربھی نقد ملتا ہے ملاحظہ ہو:ابن تیمیہ، مجموعۃ الرسائل والمسائل ،مرتبہ رشید رضا ،قاہرہ غیر مورخہ ۸۱/۱ ،۸۲وغیرہ -یہ مجموعہ دراصل ابن تیمیہ کے فتاوی پرمبنی ہے-ابن تیمیہ نے ابن عربی کو وحدۃ الوجود کے قائلین میں اسلام سے سب سے زیادہ قریب سمجھتے ہیں اوراس کا ذکرانھوں نے مجموعۃ الرسائل اورفتاوی میں مختلف مقامات پر کیا ہے-

وحدۃ الوجود مشکل ترین فلسفۂ تصوف ہے مگر اس کو کم سمجھا گیا ہے-اور زیادہ تر اس کے بارے میں یہ غلط فہمی ہے کہ شیخ اکبر اور دوسرے قائلین ذات الٰہی اور کائنات دونوں کے وجود کو

ایک قرار دیتے ہیں اور یہ کہ تمام اعیان ثابتہ اسی کے تعینات ہیں-وحدۃ الوجود کا یہ بیان وشرح صحیح نہیں ہے-شیخ اکبر صرف ذات الٰہی کا وجود مانتے ہیں کہ وہی صرف ایک وجود ہے لہٰذا وہ وحدۃالوجود ہے، تمام اعیان ثابتہ /اشیاء ومخلوقات اسی وحدۃالوجود کا ''ظل'' سایہ ہیں اور صرف موجود ہیں ان کا وجودوجود الٰہی کی بنا پر ہے اور وحدۃالوجود کا باعث لہٰذا غیر اللہ کا وجود اصلی نہیں-مزید کے لیے: **الرسالۃالقشیریۃ**،۲۲۶/۱ ومابعد؛مکتوبات امام ربانی مندرجہ ذیل وغیرہ؛ **التفہیمات الالٰہیہ**،۲۶۳/۲

حضرت مجدد الف ثانی کے نظریہ وحدۃالشہود اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے دونوں نظریات میں تطبیق کے لیے ملاحظہ ہو:مکتوبات امام ربانی ۴۲۳/۱،۴۳۵مکتوب:۲۱۷؛شاہ ولی اللہ، التفہیمات الالٰہیہ،۲۲۶/۱ ومابعد-حضرت شاہ نے اس عظیم مسئلہ پر مکتوب مدنی میں بحث کی ہے جو الگ سے چھپ گیا ہے اور اس کا اردو ترجمہ بھی کیا گیا ہے-

التفہیمات الالٰہیہ اور مکتوبات مدنی کی یہ عبارت بہت اہم ہے: **ومعنی وحدۃ الوجود هٰهنا الاستغراق فی معرفۃالحقیقۃ الجامعۃالتی تعین العالم فیها بحیث یسقط عنه احکام التفرقۃوالتمایز ...الخ...ومعنی وحدۃالشهود الجمع بین احکام الجمع والتفرقۃفیعلم ان الاشیاء واحدۃبوجه من الوجوه وکثیرۃ مباینۃ بوجه آخر-وهٰذاالمقام اتم وارفع من الاول-**

(۲۶)مکتوبات امام ربانی ،۴۳۲/۱،۴۳۵ومابعد :حضرت مجدد نے قرب ولایت کو فناوبقا ،سلوک وجذبہ کے ساتھ وابستہ (منوط) قرار دیا ہے جس سے اولیاے امت مشرف ہوتے ہیں جب کہ قرب نبوت سے صحابہ کرام وابستہ ومشرف تھے اور اس میں فنا وبقا تھا اور نہ جذب وسلوک اور یہ قرب نبوت اپنے مراتب میں قرب ولایت سے اعلیٰ وافضل ہے کیوں کہ وہ حقیقی قرب (قرب اصالت) ہے جب کہ قرب ولایت مظہر قرب (قرب ظلی) ہے-

شاہ ولی اللہ نے متعدد مقامات پر ان دونوں کا (قرب نبوت قرب ولایت) کا موازنہ مختلف ناموں سے کیا ہے اور طریق نبوت کو طریق ولایت پر نہ صرف افضل بتایا ہے بلکہ اسی کو رسول اکرم ﷺ کا پسندیدہ ،اسلام کے قریب اور حتمی بھی بتایا ہے: ملاحظہ ہو: فیوض الحرمین، مکتبہ رحیمیہ دیوبند غیر مورخہ،۵۰؛

(۲۷)غزالی ،احیاء علوم الدین ،مذکورہ بالا طبع ،۴۲/۱ومابعد ؛ابن تیمیہ ،مجموعۃالرسائل، ۸۳/۱،۱۶۸؛۲۰/۱۰،۳۴۰وغیرہ؛۵۱۶،۵۱۷ ؛۲۳۳/۱۱؛فتاویٰ۵۱۶/۱۰،۵۱۷ نے اصحاب صحو میں ان صوفیہ کو شامل کیا ہے: فضیل بن عیاض،ابراہیم بن ادہم ،شقیق بلخی ،ابوسلیمان دارانی ،معروف کرخی ،جنید بغدادی وغیرہ- اصحاب سکر صوفیہ میں متعدد اکابر میں سے ابو یزید بسطامی ،ابوالحسین نوری ،ابوبکر شبلی وغیرہ- بہت ممتاز ہیں- ان کی تعداد زیادہ ہے منصور حلاج بھی اصحاب سکر میں شامل تھے-اور متعدد علمائے وقت نے ان کے قتل کے خلاف فتویٰ دیا تھا- کیوں کہ ان کے خیال میں وہ معذور تھے شطحات کے بارے میں تمام کتب تصوف میں ذکر ملتا ہے اور طویل مباحث بھی- ان کا خلاصہ بشکل نکات یہ ہے:

1- وہ شطحات اصحاب سکر کی زبانی عالم بے خودی میں نکلتے ہیں-
2- اس لیے وہ معذور ہیں اور ان شطحات کو بالائے طاق رکھ دینا چاہیے اور ان کے ظاہری معانی پر اصرار نہیں کرنا چاہیے-
3- شطحات دراصل محاکات ہیں جو زبان صوفیہ اصحاب سکر سے اللہ تعالیٰ کی جانب سے نکلتے ہیں-
4- ان کی بنا پر ان پر کسی قسم کا الزام لگانا اور گرفت کرنا صحیح نہیں ہے-

(۲۸)مکتوبات امام ربانی ۹۵/۱ ۷ وما بعد ؛مکتوب :۳۰۲شاہ ولی اللہ دہلوی نے حجۃاللہ البالغہ،تفہیمات الٰہیہ،ہمعات وغیرہ متعدد کتب ورسائل میں مختلف مقامات پر قوت ملکیہ اور قوت بہیمیہ کی کارفرمائی پر بحث کی ہے اور وہ ان کی بہت پسندیدہ اور بنیادی فکر ہے لہٰذا مختلف حوالوں سے باربار آتی ہے ان سب پر ایک پورا تحقیقی دفتر لکھا جا سکتا ہے: مثلا حجۃ اللہ البالغہ کے مقامات ہیں:۱۹/۱،۲۲تا۲۶وغیرہ؛۱۱/۲،۱۵اومابعد ہمعات ،۱۶،۱۷؛۱۶۰،۱۷۴؛

(۲۹)مذکورہ بالا ؛فیوض الحرمین ،مشاہدہ:۲۱؛اردو ترجمہ محمد سرور لاہور سندھ ساگر اکیڈمی طباعت،۱۸۰،۱۸۱ہمعات ،۱۶،۱۷

(۳۰)اعتدال ومیانہ روی کی سب سے نمائندہ حدیث ہے:''**وان لجسدک علیک حقاوان لزوجک علیک حقاالخ**'' نیز ملاحظہ ہو: بخاری ،**الجامع الصحیح**،ابواب **التهجد**،**باب ما یکره من التشدید**؛ ابن حجر عسقلانی ، فتح الباری ،مکتبہ دارالسلام ریاض ۱۹۹۷ء،۳/۴۶ ومابعد اور دوسرے ابواب بخاری جیسے کتاب الصلوٰۃ میں باب **امر من لعن فی**

صلاته وغیرہ-

(۳۱)ان میں بیشتر اصحاب صحو شامل تھے جیسے حضرت جنید بغدادی ،شیخ عبد القادر جیلانی، خواجہ نقشبند،حضرت مجدد الف ثانی ،شیخ معین الدین اجمیری وغیرہ-تمام کتب تصوف بالخصوص رسالہ قشیریہ میں اصحاب صحو پر ایک الگ باب/مبحث ملتا ہے-

(۳۲)ترک دنیا پر اسلامی بحث کے لیے ملاحظہ ہو احادیث میں کتاب الرقاق ،کتاب الادب وغیرہ-

(۳۳)کتب تصوف میں ان صوفیہ کرام کے سوانحی خاکے بالخصوص رسالہ قشیریہ نفحات الانس وغیرہ-

(۳۴)حضرت ابوبکر شبلی کی یہ ہدایت غزالی نے نقل کی ہے :احیاء العلوم،۴/۱۰۴: باب شروط الارادۃ ومقدمات المجاہدۃ شیخ علی ہجویری کا تو بیان ہے کہ طریقت وتصوف کی بنیاد ہی تجرد پر رکھی گئی ہے-حضرات حسن بصری، مالک بن دینار ،ابوسلیمان دارانی ،سفیان ثوری ،ابو یزید بسطامی ،ابوبکر وراق،حتی کہ شیخ جنید بغدادی بھی اس کے افضل ہونے کے قائل تھے-اور ان کے سبب وہ افراط وتفریط کا شکار ہوئے -ملاحظہ ہو: کشف المحجوب ،۳۱۷،۳۱۸ومابعد ؛رسالہ قشیریہ،۲۳۰ وغیرہ؛ عوارف المعارف، باب ششم؛ احیاء العلوم،۳۳،۴۰ و مابعد؛ کتاب اللمع ،۲۶۵ وغیرہ

(۳۵)غزالی، احیاء علوم الدین مذکورہ بالا -اللہ تعالیٰ کا ایسا خیال وتصور ظاہر ہے افراط کثیر کا معاملہ ہے- ایسے ہی مفرطانہ نظریات نے اسلامی شریعت کے اعتدال وتوازن کو درہم برہم کیا تھا- ان سے حدیث وسنت اور قرآن کی تعلیمات کا موازنہ کیا جائے تو پہلی نظر میں ہی ان کے افراط اور غیر اسلامی رویہ وخیال کا اندازہ ہو جاتا ہے-

(۳۶)شاہ ولی اللہ دہلوی نے مختلف کتب میں اس پر بحث کی ہے :ہمعات ،۶۲:''سالک ہر روز.. قرآن کے دو رکوعوں کا ترجمہ سنے''القول الجمیل اردو ترجمہ مذکورہ بالا ،۶۳ و مابعد؛ الانتباہ، مذکورہ بالا اردو ترجمہ،۲۲ ومابعد انھوں نے اپنے والد ماجد کی تلاوت قرآن کے معمولات پر بھی بہت لکھا ہے اور دوسرے سلاسل تصوف میں قرآن کریم کی تلاوت کا ذکر کیا ہے-القول الجمیل،۹۵ ،۱۰۹وغیرہ ہمعات ،۶۱:سالک کو بالجملہ دن رات میں پچاس رکعتیں ضرور پڑھنی چاہیے''اور پھر ان کی تفصیل بیان کی ہے-

(۳۷)مثلا اوپر حضرت شاہ کی ہدایات قرآن کی تلاوت اور نوافل نماز ادا کرنے کے بارے میں-اور حضرت شاہ اس باب میں تنہا نہیں ہیں-تمام اکابر صوفیہ اور ان کی کتابوں میں ان مندوبات ومستحبات پر زور ملتا ہے-

(۳۸)ابو نعیم ،حلیۃ الاولیاء بیروت دارالکتب العربی طباعت ،۱۰/۱۷۸ انے شیخ جنید بغدادی کا واقعہ لکھا ہے کہ کسی شخص نے ان سے اعمال وفرائض کے ساقط ہونے کی بات کہی تو فرمایا:''یہ تو بڑی گمراہی کی بات ہے- وہ کبھی ساقط نہیں ہوتے-''

(۳۹)شاہ ولی اللہ فیوض الحرمین ،مشاہدہ ،۱۰۷؛انفاس العارفین میں بھی حضرت شیخ عبدالرحیم وغیرہ کے بارے میں بعض ایسے الہامات کا ذکر ملتا ہے اور ان پر حضرت شاہ کا نقد بھی اور تاویل بھی-

(۴۰)حضرت شاہ نے القول الجمیل وغیرہ میں صوفی بیعت ،سلوک الی اللہ اور تمام دوسری چیزوں کو یہی درجہ دیا ہے اور دوسرے صوفیہ نے بھی - کوئی بھی تصوف وطریقت کو مسلمان ہونے کی لازمی شرط نہیں بتاتا -

(۴۱)حضرت شاہ کے نظریہ اہل کمال کے لیے ملاحظہ ہو: ہمعات-

(۴۲)ہمعات فارسی ،۱۶،۲۰؛اردو ترجمہ -خاکسار راقم نے تصوف حضرت شاہ پر تین مباحث مرتب ہیں جن میں سے ایک ان رنگہائے تصوف پر ہے-اس کو ان شاءاللہ جلد ہی پیش کیا جائے گا-

(۴۳)شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے ملاحظات تصوف کے لیے ملاحظہ ہو: محمد عبدالحق انصاری ،''مجددین امت اور تصوف''اسلامی اکیڈمی نئی دہلی ۲۰۰۹ء میں شامل ابن تیمیہ پر مقالہ ،۲۳،۳۸ جس سے اس مقالہ میں استفادہ کیا گیا ہے مگر ان کے متعدد افکار وتشریحات سے خاکسار راقم کو اتفاق نہیں -دراصل ان کی یہ کتاب چار مقالات کا مجموعہ ہے جو سمیناروں کے لیے لکھے گئے تھے- ان میں بحث پوری طرح سے نہیں آسکی -دوسرے مصنف موصوف ایک خاص نقطۂ نظر کے حامل ہیں جس میں حضرت مجدد کے تصوف کا غلبہ ہے-

(۴۴)اسلامی تصوف کے ماہرین نے رسول اکرم ﷺ کی حیات مقدسہ اور صحابہ کرام کے تعامل کے علاوہ خود قرآن مجید سے اس کا استناد کیا ہے-تصوف کو رسول اکرم ﷺ کے عہد مبارک سے متصل کرنے کا جذبہ صرف اس بنا پر ہے کہ اس کو یکسر غیر اسلامی نہ سمجھا جائے -ابوبکر سراج

الدین اور متعدد دوسرے قدیم وجدید حامیان تصوف نے پوری فکر اور پورا طریقۂ تصوف بھی عہد نبوی سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے-حضرت شاہ نے اس بارے میں تحقیق وانصاف دونوں کاحق ادا کیا ہے-وہ اسلامی تصوف کا استنادضرور کرتے ہیں لیکن مروجہ علم وعمل تصوف کو تابعین کے عہد سے شروع مانتے ہیں اوراسلام کی ابتدائی دو ڈھائی سو سال کے عرصہ میں اصطلاحی تصوف کا وجودنہیں مانتے جیسا کہ ان کے ادوار/رنگہائے تصوف کے بیان سے واضح ہوتا ہے-

(۴۵) محمد فواد سزکین، تاریخ التراث العربی، عربی ترجمہ محمود فہمی حجازی، ریاض ۱۹۸۳ء، مجلد اول، جزء چہارم کا حصہ تصوف، ۸۹ ومابعد تفاسیر بقاعی، مہائمی اور قشیری پر ایک مقالہ خاکسار بسملہ پر ملاحظہ ہو: نقوش قرآن نمبر لاہور ۴۶/۲، ۱۴۶

(۴۶) صوفی سلاسل میں نقشبندی صوفیہ کتاب وسنت کی پابندی کے لیے ممتاز ہیں- حضرت مجدد اور حضرت شاہ دونوں نے اس کا ذکر کیا ہے-

(۴۷) ملاحظہ خاکسار کا مضمون: ''اسلامی جھاڑ پھوک-احادیث کا مطالعہ''، الصفاء، نئی دہلی، جولائی ۲۰۰۵ء، ۱۰، ۲۰-

(۴۸) وحدۃ الوجود کے حامی علما ومحدثین میں ایک عظیم طبقہ پایا جاتا ہے-حضرت شاہ اوران کے والد ماجد اورعم بزرگوار کے علاوہ بہت سے علمائے ربانی اس میں شامل ہیں-

○○○

مولانا سید محمد اشتیاق عالم شہبازی

صوفیۂ کرام کے احوال ومقامات

الحمد للہ علیٰ احسانہ! تصوف کے موضوع پر انفرادی حیثیت رکھنے والا موضوعاتی رسالہ ''الاحسان'' آسمان صحافت پر طلوع ہونے جارہا ہے-اس کی افادیت واہمیت سے انکار کی گنجائش نہیں-مجھ بے ہنر، ہیچ مداں کو بھی تعمیل حکم میں چند سطور نذر قارئین کرنا ہے-اس کارثواب کے لیے جو ساعت سعید میسر آئی ہے وہ اپنی نسبت کے اعتبار سے اہل تصوف کی ''عید سعید'' ہے یعنی قبلۂ اولیاء، کعبۂ صوفیہ، باب العلم، مرکز طریقت وحقیقت امیر المومنین مولائے کائنات علی مرتضی کرم اللہ وجہہ الکریم کی تاریخ شہادت ہے جسے صوفیہ کے گھرانوں میں ''مجلس بست ویکم'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے-حضرت مولائے کائنات کرم اللہ وجہہ الکریم کی ذات پاک اہل شریعت وطریقت کے مابین ''بحر مواج'' کی حیثیت رکھتی ہے خصوصا طریقت کے اکثر وبیشتر سلسلے آپ ہی کی ذات پر منتہی ہوتے ہیں-آپ کی بارگاہ میں خراج عقیدت کے طور پر حضرت سلطان العارفین مخدوم شہباز محمد قدس اللہ سرہ (ولادت ۹۵۶ھ.... وفات ۱۰۵۰ھ) کے نواسہ صاحب ''کوکب دری'' شارح ''ستین شریف'' مولانا احسن اللہ عباسی دیوروی کی منقبت سے دو بند پیش کررہا ہوں ؎

یا امیر المومنین اولی الولي   یادلیلي في الخفایةوالجلي
انت باب العلم من رب العلي   فضلةمن فضلک لي تمثلي
یا علي یا علي یا علي

احسن الله الذي یرجوعلیک   یا اباالحسنین فضل من لدیک
جملةالحسنات جرت من یدیک   اعتصامي لیس قط الا الیک
یا علي یا علي یا علي (۱)

قرآن واحادیث میں لفظ ''احسان'' کی جوتعبیر وتشریح ملتی ہے اسی کا دوسرا نام ''تصوف''

ہے- قرآن پاک میں لفظ احسان ،محسن،محسنین وغیرہ جگہ جگہ ملتاہے اسی طرح حدیث میں بھی -صوفیہ نے اپنی تصانیف میں ''حدیث جبریل'' کوبطورسند واستشہاد بھی پیش کیاہے ''**الاحسان ان تعبد الله کانک تراه فان لم تکن تراه فانه یراک**''(۲) کا جملہ انہی محسنین ومومنین کے احوال وکیفیات کی نشان دہی کرتاہے جنہیں ہم صوفیۂ کرام کہتے ہیں-اللہ کے وہ خاص بندے جواپنا سب کچھ اللہ ہی کی راہ میں نچھاورکرتے ہیں اوران کی محبت اس کا برملا اعتراف کرتی ہے ''**ان صلاتي ونسکي ومحیاي ومماتي لله رب العلمین**'' (۳) کہ بے شک میری نماز،میری قربانی میرامرنااورجینااللہ رب العلمین ہی کے لیے ہے- یہی فروتنی ،انکساری اور جذبۂ خودسپردگی بارگاہ الٰہی میں سندقبولیت پاتی ہےتو رب کائنات اپنے خاص بندوں کو ان کی خاص خاص کیفیتوں اورحالتوں کے اعتبار سے مختلف ناموں سے یادفرماتاہے-

حضرت شیخ ابوالنصر السراج (متوفی ۳۷۸ھ) نے ''کتاب اللمع'' میں بہت سارے ناموں کا ذکرکیاہے جن میں سے چند نام یہ ہیں....

الصادقین (سچے) الصادقات (سچی عورتیں) القانتین (فرماں بردار) القانتات (فرماں بردارعورتیں) الخاشعین (عاجزی کرنے والے) الموقنین (یقین والے) المخلصین (اخلاص کے ساتھ اللہ کی بندگی کرنے والے) المحسنین (نیکی و احسان کرنے والے) الصابرین (صبر کرنے والے) العابدین(عبادت کرنے والے) الاولیاء (اللہ کے ولی) الابرار (نیکوکار) الراضین (راضی برضائے الٰہی رہنے والے) المتقین (تقویٰ والے) ان ناموں کے علاوہ کچھ اوربھی نام ہیں جنہیں قرآن کی آیتوں سے وضع کیا گیاہے مثلاً مشاہدین، مطمئنین وغیرہ-(۴)

قرآن پاک میں بہت سارے نام تو بعینہ موجود ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جوبعینہ موجود نہیں مگرقرآن سے ثابت ضرور ہیں مثلاً راجین، کہ اسی طرح قرآن میں یہ لفظ بعینہ نہیں آیا لیکن سورۂ بقرہ کی آیت نمبر۲۱۸ ''**یرجون رحمةالله**'' سے مستخرج ہے-

یہ خطابات بذات خود دعوت غور وفکر دیتے نظر آتے ہیں ان اسماء پرغور کرنے سے یہ عقدہ کھلتاہے کہ اللہ پاک کے خاص بندوں کے احوال ومقامات اور صفات وکیفیات مختلف النوع ہوتے رہتے ہیں، اللہ پاک نے جس جس خوبی کوجس جس بندے کے اندر بحد وافر پایا اسے اسی خطاب سے مخاطب بنایا-صوفیۂ کرام کی تمام تر زندگی حب الٰہی،اطاعت رسول،رضائے

حق،اخلاص نیت ،مشقت عبادت وریاضت اور اخلاق حسنہ سے عبارت رہی-وہ ذکر وفکر،خوف وخشیت،توکل وقناعت،عبادت واستعانت،فکرآخرت ،طلب ہدایت،شفقت ورافت کا پیکرجمیل دکھائی دیتے تھے-صوفیہ کے احوال ومقامات کوسمجھنے کے لیے حضرت حارثہ سے مروی حدیث پاک کوذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ یہ ہادیٔ اسلام، آیۂ رحمت ﷺ کے ساتھ بالمشافہ ہونے والی گفتگو ہے اوراسے بارگاہ رسالت کی تائید وتصدیق حاصل ہے-حضرت داتا گنج بخش ہجویری ''کشف المحجوب''میں اورشاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی حجۃ اللہ البالغہ میں حضرت حارثہ کے اس قول کوبطوراستشہاد پیش کیاہے-

بیان واقعہ یہ ہے کہ حضرت حارثہ حضور کی خدمت عالی میں حاضر ہوئے تو حضور نے ازراہ شفقت آپ سے دریافت فرمایا:

کیف اصبحت یا حارثة! قال اصبحت مومنا بالله حقا فقال انظر ماتقول یا حارثة ان لکل شئی حقیقةً فما حقیقةایمانک فقال صرفتُ نفسي عن الدنیا فاستویٰ عندي حجر ها وذهبهاوفضتهاومدرهافاسهرت لیلي واظمات نهاری حتی سرت کاني انظر الیٰ عرش ربي بارزاً وکاني انظر الی اهل الجنة فیتزاورون فیها وکاني انظر إلی اهل النار یتعاودون وفي روایة یتغاوزون (۵) یعنی اے حارثہ! تونے صبح کس حال میں کی؟ کہا: میں نے ایسی حالت میں صبح کی کہ میں مومن تھا اس پررسول ﷺ نے جواباً فرمایااے حارثہ !اپنے کلام پرغورکروکہ کیا کہہ رہے ہو؟ ہر بیان حق کے لیے ایک نہ ایک حقیقت اور برہان ہواکرتی ہے اور تیری اس بات کی دلیل کیاہے؟ حارثہ نے عرض کیا (بطور دلیل میری کیفیت) یہ ہے کہ میں اس دنیا سے رشتۂ حیات منقطع کرلوں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ سونا چاندی پتھر اور ڈھیلا سب میرے نزدیک یکساں ہیں اورجب میں دنیا سے جدا ہوگیا تو عقبی میں مل گیا یہاں تک کہ میں عرش الٰہی کوصاف دیکھ رہاہوں اورمیں دیکھ رہاہوں جنت کواور اہل جنت کوکہ آپس میں ملاقات کررہے ہیں اورمیں اہل جہنم کوبھی دیکھ رہاہوں کہ آپس میں واویلا مچارہے ہیں، اس پر حضوراقدس ﷺ نے فرمایا: تونے معرفت حاصل کرلی ''**فالزم! قالها ثلاثا**'' اب اسی کولازم پکڑلے تین مرتبہ فرمایا-

مذکورہ بالا حدیث صوفیہ کے احوال وکیفیات اور حالات وواقعات کے لیے روشن دلیل

ہے،اس سے فہم وفکر کی ساری گتھیاں سلجھ جاتی ہیں اور راہ حق کا متلاشی عقل عیار کی بھول بھلیاں سے نکل کر معرفت خداوندی کی شاہراہ پر آ کھڑا ہوتا ہے۔اسی طرح ایک اور مشہور حدیث اللہ کے خاص بندوں یعنی صوفیۂ کرام کے احوال ومقامات کی نشان دہی کراتی ہے،جس کا ذکر آیۂ رحمت ﷺ نے فرمایا ہے:

جو بندہ اپنی طاعتوں سے میری نزدیکی تلاش کرتا رہتا ہے تو میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، یعنی اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، میں ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔(۶)

احوال ومقامات صوفیہ کی حقیقت کیا ہے؟ اور ان کی عبادات ،ریاضات اور مجاہدات میں مکمل انہماک ہونے کے لحاظ سے عنداللہ ان کا مقام اوران کی حیثیت کیا ہے؟اس سلسلے میں قرآن کی طرف سے ہمیں یہ جواب ملتا ہے **''ذالک لمن خاف مقامی وخاف وعید''**۔(۷)

یعنی یہ اس کے لیے ہے جو میرے حضور کھڑے ہونے سے ڈرے اور میں نے عذاب کا جو حکم سنایا ہے اس سے خوف کرے اور فرمایا گیا **''وما منا الا له مقام معلوم ''** اور فرشتے کہتے ہیں ہم میں سے ہر ایک کا ایک مقام معلوم ہے۔(۸)

حضرت ابوبکر واسطی علیہ الرحمہ نے قول رسول اللہ ﷺ ''ارواح مجندہ'' کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ مراد اس قول سے یہ ہے کہ ارواح اپنے اپنے مقامات کے اعتبار سے جمع ہوں گی اور مقامات سے مراد ہیں مثلاً توبہ، ورع، زہد، فقر، صبر ورضا اور توکل وغیرہ۔

صوفیہ کے یہاں اذکار کے ذریعہ جو کیفیتیں دلوں میں جاگزیں ہوتی ہیں، یا دل اس میں مقام اختیار کرتے ہیں ''احوال'' کہے جاتے ہیں۔سیدالطائفہ حضرت جنید بغدادی علیہ الرحمہ کا قول ہے ''حال دل پر نزول کرتا ہے مگر ہمیشہ اس میں نہیں رہتا'' (یعنی کیفیتیں بدلتی ہیں تو مقامات بھی بدلتے رہتے ہیں) ایک قول یہ بھی ملتا ہے کہ ''حال ذکر خفی کو کہتے ہیں کہ رسول ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:بہترین ذکر ''ذکر خفی '' ہے۔ (۹) گویا حال مجاہدات،ریاضات اور عبادات کے طریق پر نہیں ہوتا بلکہ وہ مراقبہ،قرب،محبت،خوف،رجا،شوق،انس،طمانیت،مشاہدہ اور یقین وغیرہ کی طرح ہے۔

احوال ومقامات کے ضمن میں شیوخ عظام اور صوفیۂ کرام کے بے شمار اقوال وجوابات ہیں اور اسی طرح احوال کے متعلق بھی۔ زیر نظر مضمون میں اس تفصیل کی گنجائش نہیں۔ بالاختصار چند مقامات کی نشان دہی کی جارہی ہے۔

توبہ: اہل شریعت ہوں کہ اہل طریقت ہر ایک کے لیے یہی پہلا زینہ ہے۔اللہ تعالیٰ نے ''یُحِبُّ التَّوَّابِینَ'' فرما کر تائبین کو بڑا حوصلہ بخشا ہے ورنہ گناہوں میں پھنسا، دھنسا انسان کب کا ٹوٹ کر بکھر گیا ہوتا، خدائے غفار کی بے پایاں رحمت اگر دستگیری نہ کرتی ۔ابویعقوب یوسف بن ہمدان علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''اللہ کی جانب متوجہ ہونے والوں کا پہلا مقام توبہ ہے اور توبہ ہر اس چیز سے جس کو علم شریعت نے برا بتایا ہو، ہر اس شئی کی طرف پلٹنے کو کہتے ہیں جسے شریعت نے اچھا قرار دیا ہو''(۱۰)

اس سلسلے میں عرفا کے الگ الگ اقوال ہیں اور الگ الگ نظریات ہیں مگر مقصود سب کا ایک ہی ہے کہ بندہ اخلاص نیت کے ساتھ اس طرح توبہ کرے کہ دوبارہ پلٹ کر گناہ کی طرف نہ جائے ۔اس کی مثال یوں بھی دی جاتی ہے کہ جس طرح تھن سے دودھ دوہ کر دوبارہ تھن میں کسی صورت داخل نہیں کیا جاسکتا ہے بندہ کی یہی کیفیت ہونی چاہئے کہ توبہ کے بعد دوبارہ اس گناہ کی طرف قدم نہ بڑھے۔

سہیل بن عبداللہ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''توبہ یہ ہے کہ گناہوں کو بھلایا نہ جائے''(۱۱)

حضرت جنید علیہ الرحمہ نے کہا کہ:

''توبہ یہی ہے کہ تو اپنے گناہوں کو بھول جائے''(۱۲)

بظاہر یہ دو متضاد باتیں ہیں لیکن حضرت ابونصر سراج علیہ الرحمہ نے ان اقوال کی توجیہ کی ہے وہ کہتے ہیں کہ ابویعقوب السوسی اور سہل بن عبداللہ علیہ الرحمہ نے توبہ کی جو تعریف فرمائی ہے اس کا تعلق مریدین ،طالبین اور سالکین کی توبہ سے ہے اور حضرت جنید بغدادی علیہ الرحمہ کی تعریف کہ توبہ ''گناہوں کو بھلا دینا چاہیے'' محققین کی توبہ ہے، کیوں کہ یہ وہ بندے ہوتے ہیں جن کے قلوب پر خدا کی عظمت اور اس کے دائمی ذکر کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ گناہوں کو بھول ہی جاتے ہیں۔

اسی مفہوم کو حضرت رویم علیہ الرحمہ نے اس طرح ادا فرمایا ہے:

''توبہ سے توبہ کرنا ہی توبہ ہے''(۱۳)

اس طرح ذوالنون مصری نے فرمایا:

''عوام گناہوں سے توبہ کرتے ہیں اور خواص غفلت سے''(۱۴)

ورع:-یعنی پرہیزگاری، یہ ایک بلند مقام سلوک ہے- رسول ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ''تمہارے دین کا سرمایہ ورع ہے''نیز رسالہ قشیریہ میں شیخ ابوالقاسم القشیری نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے''ہم ستر قسم کے حلال اور جائز باتوں کو اس خوف سے چھوڑ دیا کرتے تھے کہ کہیں کسی حرام بات میں پھنس نہ جائیں''(۱۳) کہا گیا ہے کہ اہل ورع کے تین طبقات ہیں-

(۱) پہلا طبقہ شبہات سے اجتناب کرتا ہے اور یہ شبہات حلال وحرام کے واضح احکامات یا مبہم احکامات سے تعلق رکھتے ہیں-

(۲) دوسرا طبقہ ہر اس شئی سے اجتناب کرتا ہے جس سے ان کا قلب دوری چاہے اور جسے اختیار کرنا اسے ناگوار ہو-یہ مقام صرف اہل تصدیق اور ارباب قلوب (اہل دل) کو حاصل ہوتا ہے جیسا کہ حضور رسالت مآب ﷺ نے فرمایا کہ:

''گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے''(۱۵)

حارث محاسبی علیہ الرحمہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا ہاتھ ساری زندگی کبھی مشکوک طعام کی طرف نہ اٹھا-جعفر خلدی کہتے ہیں کہ محاسبی علیہ الرحمہ مشتبہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے تو ان کی انگشت شہادت کی رگ زور زور سے پھڑکنے لگتی اور اس طرح وہ مشکوک طعام سے خبردار ہوجاتے -حضرت سلطان العارفین مولانا شہباز محمد قدس اللہ سرہ العزیز کے ورع کی کیفیت اس سے بخوبی معلوم ہوتی ہے کہ ساری زندگی آپ کی زبان مبارک پر کبھی ''صراحی'' کا لفظ نہیں آیا اور آپ نے اسے بولنا پسند نہ فرمایا کہ عام طور پر اس لفظ کا استعمال شراب کے ساتھ ہوتا ہے-

جس چیز میں معصیت خدا کا اندیشہ ہو اس کے بارے میں فقط اشارۂ قلب ہی سے جانا جاسکتا ہے، اس کی دلیل میں حضور ﷺ کی حدیث شیخ ابونصر سراج نے بطور استشہاد پیش کی ہے کہ آپ نے حضرت وابصہ سے فرمایا کہ''اپنے دل ہی سے پوچھ لیا کرو لوگ تو جو چاہیں گے کہیں گے''اور مزید فرمایا کہ''گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے''-

حضور اقدس ﷺ کے مذکورہ دونوں اقوال سے بخوبی جان سکتے ہیں کہ جائز اور ناجائز معلوم کرنے کے لیے قلبی اشارے کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کی گئی ہے-

(۳) تیسرا طبقہ عارفین و واجدین کا ہے، ان کے ورع کے تعلق سے ابوسلیمان دارانی کہتے ہیں کہ:

''ورع یہ ہے کہ تو ہر اس چیز کو برا سمجھے جو تجھے اللہ سے دور کردے''(۱۶)

مختصر یہ کہ تینوں طبقات اہل ورع کو قسموں میں بیان کیا جائے تو پہلی عام، دوسری خاص اور تیسری خاص الخاص ورع کہی جائے گی-

زہد: زہد کا اصطلاحی مفہوم دنیوی خواہشات ترک کرتے ہوئے، اپنی امیدوں کو چھوٹی اور کم کرکے خود کو عبادت خداوندی کے لیے فارغ کرلینا ہے اور ایسا کرنے والے کو''زاہد'' کہتے ہیں مقامات تصوف میں سے زہد وہ مقام رفیع ہے جسے احوال و مقامات بلند کی اساس کہا گیا ہے -بلا شک وشبہ اللہ کا قرب حاصل کرنے والوں، اس پر توکل کرنے والوں اور ہر حال میں راضی بہ رضا رہنے والوں کے لیے جادۂ الفت کا پہلا قدم ہے-جس نے اس مقام پر فائز ہوکر استقامت کے ساتھ اپنا قدم نہ جمایا وہ بعد میں آنے والے مقامات کی طرف بھی ترقی نا پاسکا چونکہ دنیا کی محبت ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے-اس سے چھٹکارا پانا ہی ہر بھلائی اور اطاعت کی بنیاد ہے-

باعتبار طبقات زہاد کے تین درجے ہیں

(۱) پہلے طبقے کے زہاد دنیوی ملکیت و دولت نہیں رکھتے اور جس چیز سے ان کے ہاتھ خالی ہوتے ہیں اس چیز سے ان کے دل بھی خالی ہوتے ہیں یعنی وہ دل میں کسی دنیاوی مال وجاہ کی خواہش نہیں رکھتے -جیسا کہ حضرت جنید بغدادی علیہ الرحمہ کا قول ہے:

''زہد ہاتھوں اور دلوں کا طمع سے پاک ہونا ہے''

(۲) دوسرے طبقے میں وہ زہاد شامل ہیں جنہیں مقام زہد میں انتہائی رسوخ اور استقلال حاصل ہوتا ہے-رویم علیہ الرحمہ اس بارے میں کہتے ہیں:

''دنیا میں جو کچھ ہے اس کی خواہش سے نفس کو روکنا صرف زہد میں راسخ و ماہر صوفیہ ہی کا حصہ ہے-کیوں کہ خود ترک دنیا میں بھی زاہد کو ایک طرح کی نفسانی لذت محسوس ہوتی ہے وہ اس طرح کہ لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں، اس کی بزرگی و پاک بازی کے چرچے ہوتے ہیں

،اس کو قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اوراسے شہرت حاصل ہوتی ہے‘‘-الغرض جس نے دل کی گہرائیوں سے ان تمام لذات سے کنارہ کشی کی یعنی زہد اختیار کیا وہی راسخ وماہر زہاد میں شمار کیا جاسکتا ہے-

(۳) تیسرا طبقہ ان صوفیہ پر مشتمل ہے جس کو اس بات کا علم اوریقین ہوتا ہے کہ اگر ساری دنیا ان کی ملکیت اوران کے لیے حلال قرار دے دی جائے اورانہیں اس پر کسی طرح کے محاسبے کا بھی خطرہ نہ ہواوروہ بھی اس بات کو جان لیں کہ ایسی حالت میں اللہ کے یہاں ان کے مقام میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی تب بھی وہ دنیا میں زہد پیشہ ہی رہیں گویا ان کے زہد کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جب سے دنیا کی چیز پیدا کی گئی تب سے انہوں نے اس طرف نگاہ التفات نہیں کیا اوراگر اللہ کی نظر میں اس دنیا کی وقعت پر پشہ کے برابر بھی ہوتی تو وہ اس دنیا سے زہد اختیار کرنے کو بھی ترک کردیتے اورایسا کرنے سے تائب ہوجاتے -یحیٰی بن معاذ علیہ الرحمہ نے فرمایا:

’’دنیا ایک دلہن کے مانند ہے جس نے ایک باراس کا قرب حاصل کیا ،پھراس سے دور نہیں ہوامگر زاہد کی پہچان یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے وہ اس عروس جہاں کے چہرے کو مسخ کرتا ہے،اس کے بال نوچتا ہے اور اس کے کپڑے پھاڑتا ہے،مگر اس کامل وراسخ زاہد کا مقام یہ ہے کہ وہ اپنے محبوب حقیقی جل جلالہ کی محبت میں اس قدر محو وبے خود ہوتا ہے کہ وہ اس کی آراستہ وپیراستہ صورت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا ہے‘‘(۱۷)

فقر: مقام فقر کی اہمیت قرآن کی مندرجہ ذیل آیت مبارکہ میں بیان کی گئی ہے:’’**للفقراء الذین احصروا في سبیل اللہ لایستطیعون ضربا في الارض**‘‘ (۱۸) (تمہارے صدقات) ان فقیروں کے لیے ہیں جوراہ خدا میں رکے ہوئے ہیں اور وہ زمین میں کاروبار کر نے کے لیے سفر نہیں کر سکتے ہیں حضور اقدس ﷺ نے اس مقام فقر پر فخر ومباہات فرمایا ہے- ’’**الفقر فخری**‘‘ آپ کا مشہور قول ہے- نیز حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

’’بندے کے لیے فقر کے زیور سے بڑھ کر کوئی خوبصورت زیور نہیں‘‘

مقام فقر کے تعلق سے ابراہیم بن احمد الخواص علیہ الرحمہ کا قول ’’صاحب اللمع‘‘ نے نقل فرمایا ہے وہ نہایت خوبصورت جامع ترین اور بلند پایہ ہے حضرت خواص فرماتے ہیں:

’’فقر عزت کا لباس ،انبیا علیہم السلام کا پہناوا ،صالحین کا پیراہن ،متقین کا تاج ،مومنین

کا جمال ،عارفین کا سرمایہ،مریدین کی آرزو ،اطاعت گزاروں کا قلعہ ،گنہگاروں کا زنداں ، گناہوں کو مٹانے والا ،نیکیوں کا بڑھانے والا ،درجات کو بلند کرنے والا ،منزل تک پہنچانے والا ، اللہ کی خوشنودی کا باعث اور بندوں کی عزت کا سبب ہے‘‘-

فقراء کے بھی کئی اقسام ہیں عام طور پر ان کے تین درجات بیان گئے ہیں:

(۱) پہلے تو وہ جس کے پاس دنیوی ساز وسامان میں سے کچھ بھی نہیں ہوتا،وہ نہ تو کسی سے کچھ ظاہراً طلب کرتے ہیں نہ تو باطناً،کسی چیز کے ملنے کی توقع بھی نہیں رکھتے اورنہ ہی کسی سے کچھ لینے کی لالچ رکھتے ہیں- کہتے ہیں یہ مقام مقربین کا ہے-

(۲) دوسرے طبقے کے وہ صوفیہ کہ وہ پاس کچھ نہ رکھتے ہوئے بھی کسی سے کچھ نہیں مانگتے ،نہ توبراہ راست ،نہ ہی بالواسطہ،کوئی کچھ دے دے تواسے رد بھی نہیں کرتے ،قبول کرلیتے ہیں-

(۳) تیسرا طبقہ فقراء کا وہ ہے جو اسباب دنیوی تو پاس رکھتا ہی نہیں البتہ کسی چیز کی ضرورت پڑ جائے تو اپنے ہی کسی ہم مسلک بھائی سے مانگ لیتا ہے،کیوں کہ انہیں معلوم ہے کہ ان کا ہم مسلک بھائی ان کے اس فعل سے خوش ہوگا، اس طبقے کے فقراء اپنے ہم مسلک بھائیوں سے طلب کرنے کا کفارہ خلوص کی صورت میں ادا کرتے ہیں-

صبر: راہ سلوک میں صبر کا مقام انتہائی ارفع واعلیٰ ہے،اللہ تعالیٰ نے جس کا ذکر قرآن پاک میں اس طرح فرمایا ہے-**انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب** (۱۹) صابروں کو بھرپور اور بے حساب اجر دیا جائے گا-

حضرت جنید علیہ الرحمہ صبر کے بارے میں کہتے ہیں:

’’تکلیف کا فقط اللہ کے لیے اس وقت تک برداشت کرتے رہنا کہ وہ ٹل جائے ’’صبر‘‘ ہے-صبر کرنے والوں کی بھی بہت ساری قسمیں ہیں-ابن سالم علیہ الرحمہ کے نزدیک صبر کرنے والے تین طرح کے ہوتے ہیں:

(۱) پہلا متصبر جو بتکلف صبر کرتے ہیں-

(۲) دوسرے صابر جو واقعۃً صبر اختیار کرتے ہیں-

(۳) تیسرے صبار جو بہت زیادہ صبر کرنے والے ہوتے ہیں-

بہ تکلف صبر کرنے والا بعض اوقات تو صبر اختیار کرتا ہے اوربعض اوقات اکتا کر صبر کا دامن

چھوڑ دیتا ہے-صابر کی یہ علامت ہے کہ وہ للہ، فی اللہ صبر اختیار کرتا ہے- وہ کسی حال میں بھی
مصیبتوں پر غم کا اظہار نہیں کرتا مگر توقع اس سے بھی یہ کی جاسکتی ہے کہ شاید وہ فریاد کرے، جیسا کہ
حضرت ذوالنون مصری نے اپنے ساتھ گزرے ہوئے واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ آپ ایک صوفی کی
عیادت کو گئے، دوران گفتگو اس مریض صوفی نے ایک دل دوز چیخ ماری یہ سن کر آپ نے فرمایا وہ
محبت میں صادق نہیں جس نے مصیبت اور دکھ میں صبر نہ کیا ہو، جواباً اس نے کہا نہیں ذوالنون
یوں نہ کہیے بلکہ یوں کہیے کہ وہ شخص سچا محبّ ہی نہیں جس نے دکھ سے لذت حاصل نہیں کی-

اسی ضمن میں حضرت شبلی علیہ الرحمہ کا مشہور واقعہ ہے کہ جب انہیں شفا خانہ پہنچایا گیا، تو کچھ
احباب ان کی عیادت کو گئے تو انہیں دیکھ کر آپ نے پوچھا تم لوگ کون ہو؟ ان لوگوں نے کہا آپ
کے چاہنے والے ہیں- یہ سن کر حضرت شبلی ان کی جانب پتھر پھینکنے لگے وہ لوگ وہاں سے بھاگ
کھڑے ہوئے یہ دیکھ کر آپ نے ان کو پکارا اے محبت کے جھوٹے دعوے دارو! کیا تم مجھ سے محبت
کا بلند دعویٰ کرتے ہو اور حال یہ ہے کہ میرے دیے ہوئے ذرا سی دکھ پر صبر تک نہیں کرسکتے-

صابرین میں سے صنف صبّار کا جہاں تک تعلق ہے تو یہ درجہ اسی کو حاصل ہوسکتا ہے جس نے
اللہ کے ذریعہ اللہ ہی کے لیے اور اللہ ہی کو اپنا جاننے پر صبر اختیار کرلیا ہو- یہ انتہائی درجے کے صابر
لوگ ہیں، ان پر مصائب وآلام کے جتنے پہاڑ بھی ٹوٹ پڑیں ان کے ہاتھوں سے صبر کا دامن چھو
ٹنے نہیں پاتا، ظاہر و باطن دونوں لحاظ سے غیر متزلزل رہتا ہے- واقعہ کربلا اس کی بہترین نظیر ہے-
حضر سیدنا امام حسین علیہ السلام اور ان کے رفقا نے صنف صبار کی بہترین تعبیر پیش کی ہے-

مقام رضا: قران پاک میں اللہ تعالیٰ نے مقام رضا اور اہل رضا دونوں کا ذکر فرمایا ہے- ارشا
گرامی ہے- "رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ" (۲۰) اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی-
اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

" و رضوان من اللہ اکبر" (۲۱) اور اللہ کی رضا سب سے بڑی ہے

قابل توجہ بات یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے بندوں سے راضی رہنے
کے ذکر کو بندوں کے اس سے راضی رہنے ذکر پر اولیت دی ہے، یعنی بندوں کی رضا پر اپنی رضا کو
فوقیت دی ہے اور اس طرح اسے اہم ترین بتایا ہے- رضا کیا ہے؟ اللہ کی جانب سے ایک فتح باب
ہے اور دنیا میں ایک جنت کے برابر ہے- رضا یہ ہے کہ بندہ اللہ کے حکم پر راضی رہے- بقول کسے

غم رلائے کہ تری یاد ستائے محبوب
ہم کو ہر حال میں راضی برضا رہنا ہے

رضا کے تعلق سے صوفیہ کے بہت سارے اقوال ہیں جن سے ان کی واقعیت واہمیت
کا اندازہ ہوتا ہے:

بقول جنید بغدادی علیہ الرحمہ:

''رضا اپنے اختیار سے دست بردار ہونے کا نام ہے''

قناد علیہ الرحمہ:

''اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر سکون واطمینان اختیار کرنے کو رضا کہتے ہیں''

ذوالنون مصری علیہ الرحمہ:

''اللہ کی قضا پر قلب کا مسرور ہوجانا رضا ہے'' (۲۲)

اہل رضا کے بھی تین درجے بتائے جاتے ہیں:

(۱) پہلے درجہ میں وہ لوگ ہیں جو اپنے دکھ درد کو بھی ظاہر نہیں کرتے اور اس کے اظہار کو
یکسر ختم کرتے رہتے ہیں - ان کے دل اللہ کی جانب سے بخشے ہوئے ہر دکھ درد غم وآلام
، آزمائش وآسائش اور منع وعطا کو قبول کرتے ہیں-

(۲) دوسرے درجہ میں وہ لوگ ہیں کہ وہ خود اللہ سے راضی رہنے کے احساس کو چھوڑ کر
اللہ کے اس سے راضی رہنے کو ترجیح دیتے ہیں اور ان کی یہ خواہش اللہ پاک کے قول کے عین
مطابق ہے 'رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ' اور چاہے غم وخوشی، تنگ دستی، خوشحالی جیسے بھی
حالات ان پر آجائیں وہ اللہ کے اس سے راضی رہنے پر اپنی رضا کو ترجیح نہیں دیتے -

(۳) تیسرا درجہ اہل رضا کا بیان کردہ حدود سے بھی کہیں آگے نظر آتا ہے اس طبقے کے
صوفیہ نے تو دائمی عنایت کو رضائے بندہ اور رضائے مولیٰ کی بنیاد ٹھہرایا ہے-

ابوسلیمان دارانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''خلق کے اعمال ہی اللہ کو راضی یا ناراض نہیں کرتے بلکہ وہ جس سے راضی ہوجائے پھر
اس سے ایسے کام لے لیتا ہے کہ اس کی رضا کا باعث بن جاتے ہیں''

توکل: توکل کی اعلیٰ مقامی کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ پاک نے قرآن مجید
میں جہاں ایمان کا ذکر کیا وہاں توکل بھی اس کے ساتھ بیان فرمایا ہے- وعلی اللہ فتوکلوا ان

کنتم مومنین (۲۳)(اور اللہ ہی پر بھروسہ کرو اگر تم مومن ہو) دوسری جگہ ارشاد فرمایا: **وعلیٰ الله فلیتوکل المتوکلون** (۲۴) اور بھروسہ کرنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

مذکورہ دونوں آیتوں میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے متوکلین کے توکل کو مومنین کے توکل سے مخصوص کیا ہے۔ پھر ایک دوسرے مقام پر خاص الخاص توکل کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "**ومن یتوکل علی الله فهو حسبه**" (۲۵)(اور جو اللہ پر بھروسہ کرے تو وہ اسے کافی ہے۔)

اللہ تعالیٰ کی غیرت یہ گوارہ نہیں کرتی کہ اس کے بندے کسی اور پر بھروسہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنے سوا کسی اور پر بھروسہ کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا جیسا کہ اس نے اپنے محبوب سید المرسلین، امام المتوکلین، آئینۂ رحمت ﷺ سے خطاب فرمایا:

"**وتوکل علیٰ الحي الذي لایموت وکفی به**" (۲۶)(اور بھروسہ کرو اس زندہ پر جو کبھی نہیں مرے گا اور اس کو سراہتے اس کی پاکی بیان کرو اور وہی کافی ہے۔) اور فرمایا" **وتوکل علی العزیز الرحیم الذي یراک حین تقوم**" (۲۷)(اور اس پر بھروسہ کرو جو عزت والا اور مہربانی والا ہے جو تمہیں دیکھتا ہے (جب تم نماز کے لیے) کھڑے ہوتے ہو) توکل کے بھی متعدد درجات ہیں جن کی درجہ بندی اس طرح کی گئی ہے: (۱) توکل عام (۲) توکل خاص (۳) توکل خاص الخاص۔

پہلے درجے کی تعریف ابوتراب نخشی علیہ الرحمہ کے لفظوں میں یوں کی جاسکتی ہے: توکل جسم کو عبودیت کا عادی بنانے اور قلب کو ربوبیت وکفایت پر مطمئن رکھنے کا نام ہے۔ یعنی بندے کو اگر کچھ عطا ہوا تو شکر خداوندی بجالائے اور اگر محروم رکھا جائے تو قضائے قادر پر صبر وشکر کے ساتھ اطمینان سے بیٹھا رہے۔ ہر درجے کے تعلق سے صوفیہ کے بہت سارے اقوال ہیں۔

توکل عام: توکل عام سے متعلق حضرت سہل بن عبداللہ علیہ الرحمہ کا یہ قول گاگر میں ساگر مترادف ہے: "تمام معاملات اللہ پر چھوڑ دینا ہی توکل ہے"

توکل خاص: توکل خاص صوفیہ کے اقوال کے آئینے میں اپنے مفہوم کے اعتبار سے "اسباب دنیا وآخرت کی ساری لذتوں سے محرومی اور نفس کی موت کا نام ہے" یہی نظریہ ابوایوب نہرجوری علیہ الرحمہ کا ہے۔

توکل خاص الخاص: خاص الخاص توکل کا معاملہ اس سے بھی زیادہ سخت ہے جیسا کہ ابوبکر شبلی علیہ الرحمہ کے اس قول سے ظاہر ہے: "اللہ کے لیے خود کو اس طرح وقف کردو کہ تمہارا اپنا

وجود باقی نہ رہے فقط ذات الٰہی باقی رہ جائے جس کو زوال نہیں"

اس مقام کی سنگینی کا تو حال یہ ہے کہ اس کے تعلق سے تو بعض صوفیہ نے یہاں تک کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں کوئی بھی حقیقت توکل کے اعلیٰ درجے تک نہیں پہنچ سکتا کیوں کہ کمال میں کمال حاصل کرنا فقط ذات حق تعالیٰ کا حصہ ہے۔

الغرض مقام توکل اور اس کی حقیقتوں کا نچوڑ اور خلاصہ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی علیہ الرحمہ کے قول سے عیاں ہے کہ: "ہر حال میں اللہ پر بھروسہ کرنا توکل ہے" شیخ نظام الدین اولیاء علیہ الرحمہ فرماتے تھے: "اعتماد برحق باید کرد ونظر برہیچ کس نہ باید داشت" (۲۶)

توکل کے معانی مشائخ کی نظر میں یہ نہ تھے کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے چنانچہ روشن چراغ دہلوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: "کسب کرنا مانع توکل نہیں ہے اگر کوئی عیال دار کچھ کسب کرے اور نظر اس کے دل کی اس کسب پر نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو وہ متوکل ہے"۔ (۲۷)

زیر نظر مضمون کو صوفیہ کے افادات اور علماء کے اشارات سے مزین کر کے حضرت سنائی علیہ الرحمہ کے اس شعر پر تمام کرتا ہوں جس کو حضرت نظام الدین اولیاء علیہ الرحمہ اکثر پڑھا کرتے تھے اور شیخ سیف الدین باخرزی یہ قول اکثر بیان کرتے تھے "میں سنائی کا ایک قصیدہ پڑھ کر مسلمان ہوا ہوں" اسی قصیدے کا ایک شعر یہ ہے جو شیخ کو بہت پسند تھا ؎

برسر طور ہوا طنبور شہوت می زنی
عشق مردلن ترانی رابدیں خواری مجو (۲۸)

حوالہ جات

۱- بیاض قلمی مولانا احسن اللہ عباسی .....مخزونہ کتب خانہ شہبازیہ، ملا چک، بھاگلپور، بہار
۲- بخاری شریف جلد: ۱، کتاب الایمان
۳- سورہ انعام آیت (۱۶۳)
۴- کتاب اللمع ترجمہ صفحہ ۴۴
۵- کشف المحجوب ص: ۲۶/۲۷ مصنفہ حضرت داتا گنج بخش ہجویری- حجۃ اللہ البالغہ جلد: ۲/ص: ۱۶۸/ از شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

۶- بخاری شریف، کتاب الرقاق، باب التواضع

۷- سورۂ ابراہیم، آیت/۱۴

۸- سورۂ صافات، آیت/۶۴

۹- مسند امام احمد بن حنبل، جلد: اول، صفحہ/ ۱۸۷

۱۰- کتاب اللمع، صفحہ/ ۸۰

۱۱- کتاب اللمع، صفحہ/ ۸۰

۱۲- کتاب اللمع، صفحہ/ ۸۰

۱۳- کتاب اللمع، صفحہ/ ۸۰

۱۴- کتاب اللمع، صفحہ/ ۸۰

۱۵- کتاب اللمع، صفحہ/ ۸۱

۱۶- کتاب اللمع، صفحہ/ ۸۱

۱۷- کتاب اللمع، صفحہ/ ۸۴

۱۸- سورۂ بقرہ، آیت/ ۲۷۳

۱۹- سورۂ زمر، آیت/ ۱۰۷

۲۰- سورۂ مائدہ، آیت/ ۱۱۹

۲۱- سورۂ توبہ آیت/ ۲/۷

۲۲- کتاب اللمع، صفحہ/ ۸۵

۲۳- سورۂ مائدہ، آیت/ ۲۳

۲۴- سورۂ ابراہیم، آیت/ ۱۲

۲۵- سورۂ طلاق، آیت/ ۳

۲۶- سورۂ فرقان، آیت/ ۵۸

۲۷- سورۂ شعراء، آیت/ ۲۱۶، ۲۱۷

۲۸- فوائد الفواد، صفحہ/ ۲۵۲

○○○

پروفیسر مسعود انور علوی کاکوروی

عصر حاضر میں تصوف اور خانقاہ کی ضرورت

موجودہ دور انسانی ترقی کے عروج نیز علم و ہنر کے صبر آزما مراحل سے گزر کر بین الاقوامی ٹیکنالوجی، برق رفتار مواصلاتی نظام اور سود مند اقتصادیات کا دور بن چکا ہے جس میں فانی انسان خود کو تمام صلاحیتوں اور اختیارات کا جامع و مالک سمجھنے لگا ہے- وہ اس زعم باطل اور تکبر میں اس درجہ غرق ہے کہ اس کو اپنی بے مائے گی، بے وقعتی اور کم حیثیتی کا مطلق احساس نہیں حالاں کہ اس کی حاصل کردہ ترقی کا ہر ستون ہر لمحہ کمزور ہوتا رہتا ہے اور اس کے علم ناقص کی بظاہر پر شکوہ عمارت کو ہلاتا رہتا ہے- ترقی کی آڑ میں پوشیدہ تنزل، علم کے دھوکہ میں جہل اور اختیار کے فریب کی تہوں میں لپٹی کمزوری اکثر و بیشتر اس ہلتی عمارت کے کسی ستون کو منہدم بھی کر دیتے ہیں جس کی لاتعداد مثالیں ہمیں آئے دن ہر سطح اور ہر شعبہ میں نظر آتی ہیں- چاہے وہ اخلاقی پستی ہو یا متحد خاندانوں کا منتشر اور بکھر جانا، خواہ ملکوں کے درمیان برتری کی جنگ ہو یا مذہب کی آڑ میں نفرت کا جذبہ-

آج ٹیکنالوجی کے جن مرحلوں کو ترقی کی شان اور پہچان سمجھا جارہا ہے وہ کبھی نہ کبھی اپنی اصل ظاہر کرتے رہتے ہیں اور انسان کے لیے رحمت کے بجائے زحمت کے عفریت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں- باوجود ہر قسم کی دنیاوی ترقی کے، روح انسانی اعمال زشت کی کثافت سے بری طرح مجروح ہو چکی ہے- تمام عالم میدان حشر کا نمونہ بنا جارہا ہے جہاں ہر نفس اپنی ذات میں گم اور مطلب و مفاد پرستی میں سرتا پا غرق ہو رہا ہے- انسانیت ہر وقت ایک انجانے خوف اور کیمیائی وایٹمی جنگ کے مہلک اثرات سے لرزاں و ترساں ہے- اس دور ابتلا میں کیا کوئی ایسی شی ہے جو انسان کو اس آگ کے دریا کے پار لے جا سکتی ہے، اسے ذہنی و قلبی سکون عطا کر سکتی ہے اور اسے انسان ہونے کے ناطے عبدیت و بندگی اور انسانیت کے ہنر سکھا کر کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کر سکتی ہے؟

اسلامی تاریخ کے اس پورے دور پر جو تقریباً چودہ سو سال پر محیط ہے نظر ڈالیے تو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ جب جب اس قسم کے ناگفتہ بہ حالات پیدا ہوئے، انسانیت بہیمیت کے دہانے پر اور اس کے اعلیٰ اقدار کی پامالی نقطۂ عروج پر پہنچنے لگے تو ہمیشہ تصوف اور ارباب تصوف نے آگے بڑھ کر ان کا مقابلہ کیا۔

قرآن حکیم جو تمام اجزائے کائنات کے لیے حکمت وموعظت کا سرچشمہ ہے۔وہ ہر زمانہ میں ہر مرض کے لیے نسخۂ کیمیا اور اکسیر ہدایت ہے۔وہ تمام علوم کا منبع اور تمام انسانوں کے لیے رشد وہدایت کا سرچشمہ ہے۔وہ حیات انسانی کی کامرانی کے لیے جس حکمت عملی کو اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے اس کا تعلق نہ کسی ٹیکنالوجی سے ہے نہ مادیت واقتصادیات سے۔جو بظاہر بے قیمت ہوتے ہوئے بھی انسان کے لیے سب سے بیش قیمت شئ ہے اور جو مجرب اور تیر بہدف ہونے کے ساتھ ساتھ باعث رضا اور موجب جزا بھی ہے اور جس کا نام تزکیہ ہے۔

یہی وہ صفت ہے جو نبیین، مُقَرَّبین، صادقین، صابرین اور عارفین کا خاصہ رہی ہے۔جس پر عمل پیرا ہونے والوں نے اپنے لیے نہ صرف ثمرات ابدی کے خزانے جمع کیے بلکہ ان کے فیوض وبرکات جملہ خلائق کے لیے ہدایت ونجات کا سبب ہیں۔یہی وہ لوگ ہیں جن کو ارباب تصوف کہا جاتا ہے اور جن کے لیے ارشاد ہے "**ھم قوم لا یشقی جلیسھم ولا یخیب انیسھم**" وہ تو ایسے ہیں جن کے ہمنشیں نہ بدبخت ہوتے ہیں اور نہ ان کے اہل مودت نامراد ونا کام۔

تصوف ابن آدم کی سرشت کا گراں مایہ راز سربستہ ہے جس کا حصول مادیت اور ظاہری چکا چوند کو شکست دینے کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔وہ کوئی سائنس وفلسفہ نہیں ہے جس کی تعبیریں اور مفہوم زمانے کے نشیب وفراز کے ساتھ بدلتے رہیں۔محسن انسانیت، انسان کامل **اروا حنا فداہ** ﷺ کے عہد مبارک میں بھی اس کی وہی تعریف تھی جو آج ہے۔وہ ایک مکمل طرز حیات اور ناقابل تردید حقیقت ہے جس سے ہمارے قول وفعل کا تضاد ختم ہوتا ہے اور ہم جیسے ہوتے ہیں ویسے نظر آتے ہیں۔وہ سراپا صدق وحقیقت اور سعی وعمل نیز سرتاپا جدوجہد ہے۔

تصوف کا راستہ اختیار کرنے والے قرآن وسنت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔کیوں کہ اس کا سرچشمہ یہی دو چیزیں ہیں۔ابتدا میں اس کے لیے ایک اصطلاح "**احسان**" رائج ہوئی تھی "**الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک**" (احسان تو در

حقیقت یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر یہ ممکن نہ ہو سکے تو کم از کم یہ یقین کرو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے) گویا **ھو الاول و الآخر و الظاھر و الباطن** پر تمہارا ایمان مکمل ہو جائے اور جب ایسا ہوگا تو اخلاص اور سچائی پیدا ہوگی اور خلوت وجلوت ہر جگہ تم کو **فاینما تولوا فثم وجہ اللہ** (تم جدھر منہ پھیرو ادھر وجہ اللہ ہے) **وھو معکم اینما کنتم** (تم جہاں کہیں ہو وہ تمہارے ہمراہ ہے) **وفی انفسکم افلا تبصرون** ۔ (وہ تمہارے نفوس میں ہے کیا تم دیکھتے نہیں) اور **الم یعلم بان اللہ یری** (کیا نہیں معلوم کہ اللہ دیکھ رہا ہے) کا مشاہدہ ہوگا اور وہ سب تمہارا حال بن جائے گا۔

ارباب تصوف دنیا اور دنیا داری کو اپنا میدان عمل بناتے ہیں کیوں کہ ان کا واسطہ صرف اپنی ذات سے نہیں بلکہ مخلوق خدا سے ہوتا ہے۔مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

چیست دنیا از خدا غافل بدن　　نے قماش ونقرہ وفرزند وزن

(دنیا صرف اللہ تعالیٰ سے غافل ہونے کا نام ہے نہ کہ دنیاوی اسباب، مال وزر اور اہل وعیال کو اختیار کرنے کا)

اصل چیز فراغت قلبی اور تعلق مع اللٰہی ہے۔

بگیر رسم تعلق دلا ز مرغابی　　کہ او ز آب چو برخاست خشک پر برخاست

(اے دل تجھے تعلق کی رسم وریت اگر سیکھنا ہے تو مرغابی سے سیکھ کہ وہ پانی میں رہنے کے باوجود جب اس سے باہر آتی ہے تو اس کے پروں پر پانی کا مطلق اثر نہیں ہوتا)

دنیا میں رہ کر، دنیا کی ہر کشش سے بے نیازی اور نفس سے ہر لحہ نبرد آزما رہنے کا معاملہ ہر ایک کے بس کی بات بھی نہیں یقیناً کوئی دوسری عظیم ترکشش ہے جو ان عارفین کو مقناطیس کے مانند اپنی جانب کھینچتی ہے اور وہ ہے ذات باری کی رضا وقربت۔**یریدون وجھہ** وہ وجہ رب کے طالب ہیں۔**یریدون وجہ اللہ واولئک ھم المفلحون** (روم/۳۸) (وہ وجہ اللہ چاہتے ہیں وہی حقیقتاً کامیاب ہیں) ؎

من نہ شادی خواہم ونے خسروی　　انچہ می خواہم من از تو ہم توئی

(نہ مجھے خوشی چاہیے نہ بادشاہت، تجھ سے جو چیز مجھے چاہیے وہ صرف تو ہے۔)

مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

از زندگیم بندگی تست ہوس   بر زندہ دلاں بے تو حرام است نفس
خواجہ زتو مقصود دل خود ہرکس   جامی زتو ہمیں ترا می خواہد بس

(اپنی زندگی سے میری آرزو صرف تیری بندگی ہے زندہ دل لوگوں پر تیرے بغیر سانس لینا بھی حرام ہے-خواجہ تجھ سے ہر شخص اپنا مقصود ومطلوب چاہتا ہے مگر جامی تجھ سے صرف تجھ ہی کو چاہتا ہے اور بس ''من ازتو تراخواہم'' -صرف یہی وہ جذبہ اور طاقت ہے جو آدمی کو گہری سے گہری خندق عبور کرنے اور بلند سے بلند پہاڑ کی چوٹی سر کرنے کی ہمت اور وسعت بخشتی ہے- اس کے سب سے کامل نمونے انبیاء علیہم السلام ہیں - قرآن کریم میں بے شمار واقعات نبیوں ورسولوں کے زہدوتقوی اور تسلیم ورضا کے ذریعہ قائم کردہ تصوف کے سلسلہ کی نشان دہی کرتے ہیں -حضرت آدم صفی اللہ علیہ السلام کی تضرع وانابت ،حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حق کی تلاش ،حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی تسلیم ورضا،حضرت خضر علیہ السلام کے باطن اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ظاہر کا حیرت انگیز واقعہ،حکیم لقمان کا اپنے بیٹے کو نصیحت، حضرت یونس علیہ السلام کا ایک ادنیٰ مخلوق کے پیٹ میں قید ہونا ،حضرت ایوب علیہ السلام کا بے مثال صبر کا مظاہرہ وغیرہ جیسی بکثرت مثالیں موجود ہیں-

قرآن مجید نے تو خواتین کو بھی تصوف کے راستے کا راہی بنایا ہے -بے آب وگیاہ وادی غربت میں حضرت ہاجرہ کی تنہائی،اس تنہائی میں توکل کی دولت اور اس کے بدولت ایک ابدی چشمے کا پھوٹنا اور قیامت تک اس فیض باری کا جاری رہنا -مادیت کے گہوارہ میں رہ کر حضرت آسیہ کے ذریعہ ایک نبی کی پرورش وپرداخت ،حضرت مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عفت و پاکیزگی اور اس جیسے متعدد واقعات اس کے گواہ ہیں-

انبیا علیھم السلام کی مقدس ذاتوں کے علاوہ بھی قرآن مجید نے تصوف کے سلسلہ کو جاری رکھاہے-سورۂ کہف میں غار والوں (**اصحاب الکھف والرقیم**) کا معاملہ،سورۃ الصّف آیت ۴ میں **کانھم بنیان مرصوص** یعنی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند صف آرا ہونے والوں کی مثال،صوفیۂ کرام کے عمل اور طریقہ سے مناسبت رکھتی ہے - اصحاب صفہ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا رویہ،اور ان سب سے بڑھ کر خود آں حضرت **ارو حنا فداہ** ﷺ کی ذات مبارکہ تصوف کا جیتا جاگتا نمونہ ہے-

ارشاد باری تعالیٰ ہے: **ولا تطرد الذین یدعون ربھم بالغداوۃ والعشی یریدون وجھہ** (سورہ انعام ۵۲) آپ ﷺ ان لوگوں کو مت دھتکاریے جو اپنے پروردگار کو صبح وشام پکارتے ہیں اور اس کی رضامندی کے خواہاں ہیں-

واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغداوۃ والعشی (سورہ کہف ۲۸) آپ ان لوگوں کے ساتھ صبر اختیار کیجئے جو اپنے پروردگار کو صبح وشام پکارتے ہیں

عہد نبوی ﷺ کے بعد تصوف کا یہ سلسلہ صحابہ کرام وتابعین اور تبع تابعین کے ذریعہ آگے بڑھتا رہا -یہ سلسلہ ہر زمانہ میں موجود رہا اور موجود رہے گا کیوں کہ یہی بندے اور حضرت حق کے درمیان تعلق اور ارتباط کا ذریعہ ہے-تصوف کا چوں کہ بہت گہرا تعلق تفکر سے ہے اس لیے یہ عین قرآنی حکمت کا بیّن ثبوت ہے-قرآن کریم جہاں ایک طرف ذکر ودعا کی ترغیب دیتا ہے وہاں اس سے کہیں زیادہ غور وفکر اور تدبیر وتعمق کی بھی -سنت نبوی ﷺ کی سب سے پہلی مثال غار حرا میں ملتی ہے جو اسلام کی سب سے پہلی خانقاہ تھی-

یہ امر حقیقی ہے کہ بغیر غور وفکر کے کسی بھی عمل کو خارجی اور نمائشی طور پر تو اختیار کیا جا سکتا ہے لیکن باطنی وروحانی لحاظ سے بے عملی ہی رہے گی - یہ فانی دنیا اور مٹنے والی زندگی صرف اور صرف میدان عمل ہیں- اگر زندگی کی حشر سامانیوں اور دل فریبیوں میں اس بات کو فراموش بھی کر دیا جائے تو بھی میدان عمل کی نہ ہیئت بدلے گی اور نہ ہر چیز کا انجام روکا جا سکتا ہے- تصوف اسی انجام کی تیاری، اس تیاری کی تربیت اور اس تربیت میں دیانت داری کا نام ہے-

چونکہ دنیا کی ہیئت ،فنا کے عمل اور انجام کار منزل مقصود کی وحدانیت میں مکمل یکسانیت ہے، اس لیے تصوف کا دائرہ حکمت الٰہیہ کے گرد پھیلا ہوا ہے-اس دائرہ میں تفریق اور اختلاف کی گنجائش نہیں- یہی بات تصوف کو ایک اکائی بناتی ہے جس میں اقوام عالم ایک نقطے میں سمٹ آئے ہیں ؎

داستان شوق جب پھیلی تو لا محدود تھی   اور جب سمٹی تو تیرا نام بن کر رہ گئی

رسول اکرم ﷺ کی ذات مبارکہ اسی نقطہ کا نام ہے جو انھیں انسان کامل ہونے کے ناطے رحمۃ للعالمین بناتی ہے-لہٰذا یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ تصوف کا دائرہ رحمت وبخشش کا دائرہ ہے- اسی لیے ارباب تصوف صرف اپنے کو نجات یافتہ اور دوسروں کو گمراہ اور گم گشتہ نہیں سمجھتے - وہ تو تواضع وانکسار،خوش خلقی وملنساری ،اخلاص،علم باعمل ،دوسروں کے عیب کی پردہ پوشی

اور اپنے کردار وعمل سے دوسروں کو اپنا بناتے ہیں اور دوسروں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بزرگ وبرتر اور افضل نہیں سمجھتے-

دنیا آج جس افراتفری، شخصی بغض وعناد، معاشرتی بے ترتیبی، اخلاقی تنزلی، خودغرضی ومفاد پرستی اور ہر ممکنہ بدعملی کا شکار اور برائیوں میں گرفتار ہے اس میں اگر اسے کوئی چیز درکار ہے تو وہ ہے رحمت وعافیت- رسول اکرم ﷺ نے آنے والے زمانہ کی بابت فرمایا تھا کہ" عنقریب ایسے فتنے بپا ہوں گے جن میں بیٹھنے والا چلنے والے سے بہتر ہوگا، چلنے والا دوڑنے والے سے، جوان فتنوں کی طرف جھانکے گا وہ اس کی طرف آئیں گے لہٰذا جو شخص بھی کوئی پناہ گاہ پائے اس میں چھپ جائے'' یہ اس طرف اشارہ ہے کہ کوئی ایسا فتنہ برپا ہوگا جو لوگوں کو اپنے دام تزویر میں اسیر کرنے کے لیے خوب زور لگائے گا، لالچ دے گا یا مجبور کرے گا لیکن تم اس میں نہ پڑنا بلکہ کم پر قانع رہنا اور دین سے چمٹے رہنا-

صاف طور پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ فتنہ فتنۂ مال ہوگا اور موجودہ صورت حال میں تو اس فتنہ نے اپنے آہنی شکنجہ میں دنیا کے ہر خطہ اور ہر حصہ کو جکڑ لیا ہے-تزکیۂ نفس وتصفیہ قلب اور تجلیہ باطن کا دور دور تک پتہ نہیں- ارباب تصوف تضحیک وتمسخر کا نشانہ بن رہے ہیں-ایسے ہی وقت کے لیے ہادی برحق ﷺ نے تلقین فرمائی تھی کہ بکریوں والے اپنے بکریوں میں اور اونٹوں والے اپنے اونٹوں میں چلے جائیں- اس سے یہ بات واضح ہو چکی اور پایہ تحقیق کو پہنچ گئی ہے کہ تصوف اور اس کے ادارہ خانقاہ کی ضرورت آج کے دور میں شدید تر ہو چکی ہے-تصوف کی نظر میں تمام مخلوق، باری تعالیٰ کی مخلوق ہونے کی وجہ سے یکساں طور پر رحمت کی مستحق ہے-

حدیث شریف ہے "**الخلق کلھم عیال اللہ فاحبھم الیہ انفعھم لعیالہ**'' تمام مخلوق اللہ تبارک وتعالیٰ کا کنبہ ہے اس کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہی شخص ہے جو اس مخلوق کے لیے سب سے زیادہ نفع بخش ہو-

لہٰذا تصوف ہی تفریق وانتشار کو ختم کرسکتا ہے-تاریخ اس کی گواہ بھی ہے-حجر اسود نصب کرنے والا واقعہ اس کا واضح ثبوت پیش کرتا ہے، یہ واقعہ دراصل اسلام نیز تصوف کے روحانی پیغام کا علم بردار ہے-اگر ذرا سی حکمت عملی سے کام لیا جائے تو اس واقعہ کی روشنی میں آج کے بہت سے اختلافی مسائل کے حل نکل سکتے ہیں-

خانقاہ کا وجود صرف پناہ گاہ کے تصور کو ہی نمایاں نہیں کرتا بلکہ ٹھہرنے، قیام کرنے، غور وفکر کرنے کی ترغیب دیتا ہے-خانقاہ اور خانقاہی نظام کی اہمیت وضرورت آج کے دور میں سب سے زیادہ ہے کیوں کہ جس قسم کے معاشرہ اور افراد کی ضرورت ہے، ان کی تعمیر وتشکیل خانقاہی حدود کے باہر اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے-

خانقاہی زندگی کلام پاک کی اس آیت کی تفسیر ہے-"**یا ایھا الذین آمنو ااتقوا اللہ وکونو امع الصادقین**'' (سورہ توبہ آیت ۱۱۹) اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور صادقین (صادق العمل وصادق القول) کے ساتھ ہو جاؤ اور ان کی ہم نشینی اختیار کرو)-

خانقاہی نظام سے خوش خلقی وتواضع، فتوت وجواں مردی، اتحاد واتفاق اور ایثار وقربانی کا مزاج بنتا ہے-اور اخلاص وبے نفسی اور اخلاقی اقدار کو اپنی شخصیت کا ایک لا ینفک حصہ بنانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے-مقصد حیات سے ناواقف اس راز سے آگاہ ہوتے ہیں اور خالق ومخلوق کے رشتہ سے آشنا ہوتے ہیں-وہ ظاہر وباطن میں یکسانیت پر سختی سے عمل کرتے ہیں اور الفت ومحبت کے ساتھ اجتماعی زندگی گزارتے ہیں-کلام مجید میں وارد ہوا ہے "**ویوثرون علیٰ انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ**'' (سورہ حشر آیت:۹) اگر چہ ان کو خود ضرورت ہوتی ہے مگر اس کے باوجود وہ دوسروں کی ضرورتوں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں-حضرات صوفیہ کے یہاں صبر وشکر اور ایثار کی جیسی مثالیں ملتی ہیں ان کی نظیر ملنا مشکل ہے-

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ سے بلخ کے ایک نوجوان صوفی نے توکل اور زہد کی بابت سوال کیا، آپ نے جواب میں فرمایا کہ جب نہ ہو تو صبر اور ہو تو شکر-وہ ہنسا اور کہا یہ کون سا کام ہے ہمارے یہاں بلخ کے کتے بھی یہی کرتے ہیں مگر ہمارا یہ حال ہے کہ نہیں ہوتا ہے تو شکر کرتے ہیں اور ہوتا ہے تو سب کا سب ایثار کر دیتے ہیں-

صوفیہ سے بغض وعناد رکھنے والے ایک شخص نے کسی زمانہ میں ان کے خلاف خلیفۂ وقت کے کان بھرے کہ یہ زندیقوں اور گمراہوں کی ٹولی ہے اگر ان کو قتل کر دیا جائے تو دین محفوظ ہو جائے گا-اس نے اپنے دار الحکومت کے صوفیہ کو خانقاہوں سے پکڑوا کر جلاد کے سپرد کیا کہ سب کی گردن مار دے-جلاد نے ایک کو پکڑ کر چاہا کہ گردن مار دے کہ دوسرا فوراً آ گیا اور اپنے کو پیش کیا، اس نے پہلے کو چھوڑ کر دوسرے پر تلوار اٹھائی کہ تیسرا آ گیا، اس نے دوسرے کو چھوڑ کر

تیسرے کو پکڑا کہ چوتھا آڑے آ گیا -بالآخر وہ عاجز آ گیا کہ عجب لوگ ہیں -خلیفہ سے سارا ماجرا بیان کیا اس نے کہا ایسے لوگ گمراہ اور ضرر رساں نہیں ہو سکتے -حضرت شیخ ابو الحسن شاذلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خوب سمجھ لو کہ اگر حق تعالیٰ تم کو کوئی چیز عطا نہیں کرتا تو بخل نہیں بلکہ عین رحمت و بخشش ہے، اس کا نہ دینا ہی دینا ہے-لیکن نہ دینے میں دینا وہی سمجھتا ہے جو صدیق ہے- اصل چیز فراغت قلبی ہے ؎

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے   دل بے مدعا دیا تونے

جیسا کہ عرض کیا ہے کہ خانقاہی نظام اور ماحول میں غور وفکر اور تعمق کی بھی عادت پڑتی ہے اور اس میں وہ برکات پوشیدہ ہیں جو غم وغصہ کو عفو ودرگزر میں ،محرومی و شکستگی کو رضا وعطا میں ، بے سروسامانی کو ثمرات ابدی کی امید میں اور خلوت وتنہائی کو یاد اور ذکر دوام میں تبدیل کر دیتی ہیں -دیکھا جائے تو خانقاہ اصحاب کہف کا غار بھی ہے اور اصحاب صفہ کا چبوترہ بھی ،غار حرا بھی اور بکریوں واونٹوں والی پناہ گاہ بھی -کیوں کہ اب انسان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ واپس اپنی جڑوں کی طرف جائے-جو وقت آنے والا ہے وہ اس سے بھی زیادہ سخت ہوگا -لوگ حشر سے پہلے ہی اپنوں کی پہچان سے کترانے لگے ہیں، دین کی رسی ہاتھوں سے چھوٹ رہی ہے -اور افراتفری و نفسی نفسی کا عالم ہے-

آخر میں اتنا اور عرض کروں گا کہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر یہ بات طے ہو چکی ہے کہ صالح وصحت مند معاشرہ کی تشکیل وتعمیر ،امن عالم اور آپسی میل محبت اور اتحاد کے لیے ناگزیر ہے کہ صوفیائے کرام ،ان کی تعلیمات وخدمات اور افکار کی عمومی طور پر اشاعت وترویج کی جائے اور ان کے مسلک وطریق کو رائج کیا جائے تا کہ اکیسویں صدی کی دنیا انسان وانسانیت کے صحیح مفہوم اور تخلیق کے اصلی مقصد سے روشناس ہو سکے-

تصوف اپنی ہمہ گیری اور افادیت کی وجہ سے آج مغربی دنیا کا بھی مقبول ومحبوب موضوع بن چکا ہے -برصغیر ہند وپاک سے زیادہ اہل مغرب اس کی اہمیت کو محسوس کر کے اپنی اپنی سطح پر اس کی اشاعت وترویج میں کوشاں ہیں- کیوں کہ ہر ایک کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ انسانیت کی بقا وسلامتی ہے اور اس کے حل کا واحد ذریعہ تصوف اور خانقاہوں کا وجود ہے-

○○○

مولانا امام الدین سعیدی

مشائخ کے شطحیات و ہفوات: ایک علمی و تحقیقی جائزہ

معتبر محققین اور بالغ نظر ناقدین کی تحقیقات اور زبردست چھان بین کے بعد یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ تصوف اسلام کے اندر کوئی جدید یا گمراہ مسلک نہیں بلکہ عین اسلام وایمان ہے-اس کے نظریات وافکار ،مبادیات ومسائل کسی غیر اسلامی فلسفہ سے ماخوذ نہیں بلکہ سب کا سر چشمہ کتاب وسنت ہے، نیز اکابر صوفیا کی مستند کتابوں میں یہ بات کھلے لفظوں میں تحریر ہے کہ صوفی کی کامیابی کے لیے اول شرط یہ ہے کہ وہ کتاب وسنت کے ارشادات پر عمل پیرا ہو- سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی قدس سرہ ارشاد فرماتے ہیں:

''ایں راہ کس یابد کہ کتاب بردست راست گرفتہ باشد وسنت مصطفیٰ ﷺ بر دست چپ-در روشنائی ایں دو شمع می رود تا نہ در مغاک شبہت افتد نہ در ظلمت بدعت''(۱)

(ترجمہ) ''یہ راہ وہی شخص حاصل کر سکتا ہے جس کے دائیں ہاتھ میں قرآن مقدس اور بائیں ہاتھ میں سنت مصطفیٰ ﷺ ہو اور ان دونوں چراغوں کی روشنی میں قدم بڑھاتا رہے تا کہ ورطۂ شبہات میں نہ گرے اور بدعت کی تاریکی میں نہ پھنسے''

نیز انہیں سے منقول ہے فرماتے ہیں:

''بنائے طریقت ما بر کتاب وسنت است وہر چہ مخالف کتاب وسنت وخارج از آں است مردود وباطل است''(۲)

(ترجمہ) ہمارے طریقہ کی بنیاد کتاب وسنت پر ہے اور جو بھی کتاب وسنت کے خلاف اور اس سے باہر ہے وہ مردود وباطل ہے-

ماہر علوم کثیرہ شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ صوفیا کے تعلق سے اپنے اعتقاد کا اظہار یوں کرتے ہیں:''ونعتقد ان طریق الجنید وصحبہ طریق مقوم (ہمارا اعتقاد ہے

کہ جنید اور ان کے اصحاب کا طریقہ مستحکم طریقہ ہے۔'' (۳)

مشائخ فرماتے ہیں کہ ''**کل حقیقة ردتها الشریعة فهی زندقة**'' (جو حقیقت خلاف شریعت ہو وہ بے دینی ہے'' (۴)

غرضیکہ اس طرح کے اور بھی بہت سے اقوال ہیں جن سے اس بات کی مکمل تائید وتوثیق ہوجاتی ہے کہ تصوف کا اصل ماخذ کتاب وسنت کے علاوہ کچھ بھی نہیں مگر ارباب تصوف ہی میں سے بعض حضرات ایسے ہیں جن سے غلبۂ حال او روجد ومستی میں کچھ ایسے کلمات واشارات اور افعال وحرکات صادر ہوئے جو بظاہر مخالف شریعت ہیں، جنہیں اصطلاح صوفیا میں شطحیات، ہفوات اور مبہمات وموہمات بھی کہتے ہیں-ان اقوال وافعال کو لے کر بعض حضرات تصوف اور صوفیا کے تعلق سے سخت بدگمان ہوگئے اور یہ نتیجہ اخذ کرلیا کہ تصوف غیر اسلامی نظریات وافکار کی پیداوار ہے مگر یہ نتیجہ مبنی برحقیقت نہیں-

سب سے پہلے ہم شطحیات وہفوات کی حقیقت اور نوعیت کا ذکر کرتے ہیں پھر اس کا علمی وتحقیقی تجزیہ کریں گے تاکہ لوگوں کے اذہان وقلوب میں جو اضطراب ہے ایک جانب اس کا ازالہ ہوجائے اور ساتھ ہی اس کی حقیقت اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ بے نقاب ہوجائے -

شطحیات وہفوات کا لغوی معنی: لغت کی مشہور کتاب المعجم الوسیط میں ہے ''**شطح فی السیر او القول :تباعدو استرسل**''-

الشطحة:یقال لفلان الصوفی له احوال وشطحیات '' کہاجاتا ہے کہ فلاں صوفی کے احوال وشطحیات ہیں-

ہفوات یہ ہفوة کی جمع ہے المعجم الوسیط میں ہے **الهفوة : السقطة والزلة**، اردو میں ٹھوکر اور لغزش کے معنی میں مستعمل ہے-(۵)

اصطلاحی مفہوم: شیخ ابونصر سراج قدس سرہ (متوفی ۳۷۸ھ) فرماتے ہیں شطحیات وہ عجیب وغریب عبارات جو صوفیائے کرام سے وجد ومستی کی انتہائی کیفیت میں صادر ہوتی ہیں-(۶)

لطائف اشرفی میں حضرت مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی قدس سرہ سے جو تعریف منقول ہے وہ یہ ہے:

''**الشطح هو افاضة ماء العرفان عن ظرف استعداد العارفين حين**

الامتیان''(۷)

ترجمہ: خداشناشوں کے ظرف استعداد پر ہوجانے پر عرفان کا پانی چھلک جانا-

سید ذوقی شاہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں وہ کلمات جو صوفیائے کرام کے زبان سے غلبہ حال مستی وشوق میں بے اختیار صادر ہوجاتے ہیں - بہ ظاہر خلاف شرع ہوتے ہیں مگر باطناً کسی سر کی جانب اشارہ ہوتا ہے-(۸)

دیگر مشائخ کرام وعلمائے عظام سے جو تعریف منقول ہے وہ قدرے تفاوت کے ساتھ تقریباً یکساں ہے، تھوڑی سی اور وضاحت سے اس کا خلاصہ یہ ہوگا - غلبۂ حال میں جو اقوال بظاہر خلاف شرع صادر ہوں انہیں شطحیات کہتے ہیں اور جو افعال وحرکات مخالف شرع صادر ہوں انہیں ہفوات کہتے ہیں-کلمات شطحیات کی مثال حضرت منصور حلاج کا ''**انا الحق**'' کہنا حضرت بایزید بسطامی قدس سرہ کا ''**سبحانی مااعظم شانی**'' اور ''**لیس فی جبتی سوی الله**'' کا قول کرنا- ہفوات کی مثال شیخ شبلی قدس سرہ کا بیٹے کی وفات پر داڑھی حلق کرالینا اور درہم ودینار کو دریا میں ڈال دینا وغیرہ-

شطحیات وہفوات کے باب میں علماء ومشائخ کے مواقف ونظریات: شیخ ابونصر سراج قدس سرہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی نے اپنے اولیا کے قلوب کھول دیئے ہیں ،انہیں بلندی کی طرف جانے والے درجات کی طرف جانے کی اجازت دے دی اور اللہ تعالی نے اپنے منتخب بندوں کو اپنی طرف آنے ،متوجہ ہونے اور مراتب خواص پر مطلع ہونے کی صلاحیت بخش دی -لهذا ان منتخب اولیا میں سے ہر ایک اس حقیقت کو بیان کرتا ہے جسے وہ پالیتا ہے،وہ اپنے حال اور قلب پر وارد ہونے والے انوار وحقائق ہی سے متعلق گفتگو کو زبان پر لاتے ہیں کیوں کہ وہ اپنے ارادوں سے اعلی ترین مقام پر فائز ہوجاتے ہیں اور وہ اس مقام پر ہوتے ہیں جہاں تمام احوال ومقامات اور راستے آکر ختم ہوجاتے ہیں-

ارشاد باری ہے:

وفوق کل ذی علم علیم- (سورہ یوسف آیت:۷۶)

اور فرمایا:

ورفعنا بعضهم فوق بعض درجٰت- (زخرف:۳۲)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

انظر کیف فضلنابعضھم علی بعض- (بنی اسرائیل:۲۱)

کسی کو نہ چاہیے کہ وہ اولیاء اللہ کے بارے میں زبان غیبت کھولے اور پھر اپنے قیاس کے ذریعہ ان کے کلام کے مطالب اخذ کرے، کیوں کہ اولیاء اپنے اوقات میں مختلف اور احوال میں ایک دوسرے کے مقابلے میں فضیلت رکھتے ہیں -اس طرح وہ احوال میں باہم ایک جیسے بھی ہوتے ہیں، اب اگر ان میں سے کوئی اپنے ساتھیوں سے زیادہ صاحب فضیلت ہو اور وسعت معرفت کا حامل ہو تو وہ اس بات کا اہل ہے کہ وہ شطحیات صوفیہ کے متعلق گفتگو کرے یا اس کے درست و نادرست ہونے کے بارے میں کچھ کہے- اگر کوئی شخص ایسے صاحب مقام صوفیہ کے راستہ پر چلا ہی نہ ہو تو اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ اس طرح کے کلمات سے انکار ختم کردے اور انہیں اللہ پر چھوڑ دے- اس کے علاوہ اگر اس نے صوفیہ کے تعلق سے کوئی غلط ریمارکس کیا ہو تو اس کے غلط ہونے کا اعتراف کرے- (۹) (ص:۶۲۵/۶۲۶)

تصوف کی مستند کتاب **کشف المحجوب** میں حضرت شیخ علی ہجویری عرف داتا گنج بخش قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں کہ ''اہل بصیرت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اہل سنت والجماعت سے تعلق رکھنے والا شخص ساحر و خاسر نہیں ہوسکتا اور کافر قابل تعظیم نہیں ہوسکتا، کیوں کہ اس سے اجتماع ضدین لازم آتا ہے اور حضرت حسین ابن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ کا یہ حال تھا کہ پابندی صلوٰۃ، کثرت ذکر و مناجات اور مسلسل روزوں کا اہتمام کرتے تھے اس لیے وہ بہت ہی نیک تھے مگر ان کے کلام (اناالحق) کی اقتدا نہیں کرنی چاہیے کیوں کہ وہ مغلوب الحال تھے متمکن نہیں اور قابل تقلید کلام صرف صاحب تمکین مشائخ کا ہی ہوتا ہے-(کشف المحجوب)،(۱۰)

حضرت مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ قاعدۂ مستمرہ یہ ہے کہ شطحیات مشائخ کو نہ رد کرنا چاہیے نہ قبول کیوں کہ یہ مقام وصول کا ایک مشرب ہے جو عقل و خرد کی دسترس سے بالاتر ہے-(۱۱)

نیز آپ کا ارشاد ہے کہ اکثر اصحاب عرفان اہل صحو ہوئے ہیں اور بہت سے صوفیہ اہل سکر بھی ہیں -(۱۲)

دوسرے مقام پہ آپ فرماتے ہیں کہ اگر چہ بعض صوفیہ نے کلمات شطحیات کا محمل پیدا کیا

ہے اور لطیف عبارتوں میں ان کی تشریح فرمائی ہیں جس سے اس کی گہرائی تک پہنچنا آسان ہو گیا ہے-(۱۳) (لطائف اشرفی)

محقق علی الاطلاق شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ رسالہ مرج البحرین میں رقم طراز ہیں:

''وبالجملہ مردم درغلبۂ احوال مشائخ وشطحیات ایشاں سہ فرقہ اند''(۱۴)

اس باب میں مجموعی طور سے تین فرقے ہیں:

فرقۂ اول: فقہائے محض اور علمائے ظاہر ہیں جن کا موقف تردید وانکار ہے جو ایسے مشائخ کے تعلق سے کوئی بھی نرم گوشہ نہیں رکھتے نہ ہی انہیں معذور جانتے ہیں، اس فرقہ میں دو قسم کے لوگ ہیں: ایک وہ جو حقیقی طور سے منکر و تردید پسند ہیں، وہ ایسے اقوال وافعال کو جہل وجنون سے تعبیر کرتے ہیں، انکار و تردید کی وجہ ان کی طبیعت کا جمود اور باطن کی خرابی ہے جو ان کے لیے رحمت و برکات سے محرومی کا سبب بن سکتی ہے اور سوء خاتمہ کا بھی-دوسرے وہ حضرات ہیں جو بظاہر سدِّ ذرائع کے لیے تردید وانکار کی روش اختیار کرتے ہیں مگر نفس الامر میں اندرونی طور سے موافق و حامی ہوتے ہیں-

فرقۂ دوم: یہ جماعت نہایت غلو پسند ہے ان کا اعتقاد ایسے مشائخ کے تعلق سے نہایت گمراہ کن ہے ان کا خیال ہے کہ مشائخ کرام جو بھی کہتے ہیں یا کرتے ہیں وہ حق بجانب ہوتے ہیں اگر چہ صریحاً مخالف شرع ہوں بلکہ وہ یہاں تک عقیدہ رکھتے ہیں کہ شریعت وہی ہے جو یہ کرتے ہیں علماء وفقہا کے اقوال وفتاویٰ کا کوئی اعتبار نہیں ایسی جماعت کو جاہل صوفیہ کہا جاتا ہے-

مذکورہ دونوں فرقوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ ایک حقیقت کا ادراک نہ کرنے اور شدت جمود کی وجہ سے بے عرفان ہے اور دوسرا ظاہر شریعت کے منکر ہونے کی وجہ سے بے ایمان ہے-

فرقۂ سوم: وہ حضرات جو افراط وتفریط سے الگ راہ اعتدال پر گامزن ہیں، ان کا موقف یہ ہے کہ ایسے اقوال وافعال درحقیقت درست ہیں مگر شرعاً قبیح ہیں- اس شرعی قباحت کی وجہ ضبط واختیار کا فقدان اور غلبۂ حال ہے، اس کی مثال عالم ظاہر میں ایسے ہی ہے جیسے جب کسی ذی ہوش اور عقل مند آدمی کے اوپر فرحت وغضب کی حالت طاری ہوتی ہے تو اختیار کھو بیٹھتا ہے اور بے خودی میں عجیب وغریب حرکتیں کرنے لگتا ہے لہٰذا ایسے اقوال وافعال کو فقط تسلیم کیا جائے

جیسا کہ کہا گیا ہے-اسلم تسلم-(۱۵)

شیخ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے دوسرے رسالہ "**تحصیل التعرف فی معرفۃ الفقہ والتصوف**" میں ایسے صاحبان وجدوحال کومجنوں کے حکم میں قرار دیتے ہیں جومرفوع القلم ہوتے ہیں-چنانچہ وہ قاعدہ نمبر ۲۴ر کے تحت لکھتے ہیں کہ صاحب وجد اپنے حال میں خود پر اختیار نہیں رکھتا وہ مجنوں کے حکم میں ہوتا ہے اس حال میں صادر ہونے والے امور نا قابل اقتدا ہیں-

جیسے حضرت ابوالحسین نوری قدس سرہ کا حالت وجد میں اپنے آپ کو جلاد کے سامنے پیش کر دینا، شیخ ابوحمزہ کا کنویں میں گر کر کسی کو مدد کے لیے آواز نہ دینا، شیخ شبلی کا حلق ریش اور درہم ودینار کا دریا میں پھینک دیناوغیرہ ایسے بہت سے واقعات ہیں جوغلبہ وجد وحال میں صوفیہ سے صادر ہوئے-ابن جوزی اوران کے ہم خیال علماء نے ایسے افعال پر اعتراض کیا ہے-(۱۶)

شیخ زروق نے یہ دعوی کیا ہے کہ جس مغلوب الحال کا اپنے افعال پر قابو نہیں، ضبط کی قدرت نہیں وہ معذور ہے- بطور استدلال یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ ایک عورت بے ہوش ہوجایا کرتی تھی ایک دن نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور آپ سے اپنا حال بیان کیا کہ وہ بے ہوش ہو جایا کرتی ہے اور برہنہ ہوجاتی ہے لہٰذا آپ میرے لیے دعافرمائیں تاکہ اس سے شفا حاصل ہوجائے (یا اسی طرح کچھ الفاظ کہے) تو رسول اکرم ﷺ نے ارشادفرمایا کہ اگر تو صبر کرے تو تیرے لیے جنت ہے، یا نہیں تو میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی تجھے شفا بخشے وہ عورت راضی ہوگئی کہ اسے جنت منظور ہے-

گویا آپ کا اس عورت کوصبر کرنے اور اس حالت کے برداشت کرنے کی تلقین کرنا جس میں وہ برہنہ ہوجایا کرتی تھی اس بات کی دلیل ہے کہ بے اختیار شخص کا عذر مقبول ہے-(۱۷)

(تلخیص از تحصیل التعرف فی معرفۃ الفقہ والتصوف)

عقائد العزیز میں حضرت شیخ منشی محمد عزیز اللہ شاہ صفی پوری قدس سرہ (متوفی ۱۳۴۷ھ) رقم طراز ہیں:

میں عقیدہ رکھتا ہوں کہ اولیاء کے کلمات شطحیات جن کو ہفوات مشائخ بھی کہتے ہیں، جس حکمت وعلت کے پیش نظر صادر ہوئے، وہ اپنی جگہ حق بجانب ہیں جیسے حضرت بایزید کا قول "**سبحانی مااعظم شانی**" یا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا فرمانا کہ "**انامقیم القیامۃ**" اور "**انا**

باعث من فی القبور" اسی طرح" **انا الحی الذی لایموت**.(۱۸)

ایسے اقوال کے بارے میں جہاں تک ممکن ہوسکے شریعت کے مطابق تاویل کرنی چاہئے-

حضرت مخدوم شیخ سعد الدین خیرآبادی قدس سرہ (متوفی ۹۲۲ھ) نے ایسے اقوال کو قرأت کی تاویل پر محمول فرمایا ہے-یعنی جس طرح قرآن کی تلاوت کرنے والا اس آیت کو پڑھے "**اننی انا اللہ لاالہ الاانا**" یا کوئی اس حدیث قدسی کو پڑھے "**من شھدنی بالوحدانیۃ و اقر بالرسالۃ دخل الجنۃ علی ماکان من العمل**"(۱۹)

نیز ایسے اقوال کی ایک یہ بھی تاویل ممکن ہے کہ جس طرح اللہ جل شانہ نے سورۃ فاتحہ کو بندوں کی زبان سے ارشادفرمایا، اسی طرح اہل شوق ومحبت اور مخلصین بندوں کا زبان حق سے بولنا درست ہے جیسا کہ حدیث قدسی میں ارشاد ہے "**بی ینطق بی یبصر**" اور حضرت علی نے فرمایا "**ھٰذاقرآن صامت وانا قرآن ناطق**"-

بعض شطحیات ایسے ہیں کہ وہاں اس طرح کی تاویل کی گنجائش نہیں جیسے "**لیس فی جبتی سوی اللہ**" یہاں یہ توجیہ ہوسکتی ہے کہ جبہ کے اندر جسم ہے اور جسم میں روح ہے اور مراد یہ ہے کہ میرے جسم کا ہرعضو مثلاً آنکھ، کان، منہ وغیرہ اور میری روح یہ سب اللہ جل شانہ کی یاد اور اس کے ذوق وشوق میں محو ومستغرق ہیں، فنا ہوگئے ہیں اور ذات حق کے سوا کچھ بھی باقی نہیں ؎

تن سوکھ پنجر بھیو، رگیں بھئیں سب تار　　روئیں روئیں دھن اٹھت باجت نام تہار

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے جو بھی کلمات میں نے ذکر کیے ہیں انہیں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحفہ اثناعشریہ کے آغاز میں نقل کیا ہے اور تسلیم کیا ہے کہ آپ نے حالت سکر میں اس طرح کے کلمات کہے ہیں، اسی کے مانند اور بھی اقوال ہیں جو کتابوں میں منقول ہیں-

جن اقوال کی تاویل ممکن نہ ہوتو اس کی وجہ سے مشائخ کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنانا اور ان کی شان میں گستاخی کرنا خلاف ادب ہے، اولیاء کی بے ادبی خدا کی شان بے ادبی ہے-

نہ ہی ہر شخص کے لیے تسلیم واقرار ضروری ہے-جس کے فہم میں نہ آئے وہ سکوت کرے-(۲۰)

ان تمام اقوال ونظریات سے مسلک اعتدال کی جو راہ نکلتی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شطحیات وہفوات نہ قابل تقلید ہوتے ہیں نہ قابل تردید، بلکہ فقط انہیں تسلیم کیا جائے اور اسی میں

سلامتی ہے۔

اب ان اقوال واحوال میں سے بعض کی پرحکمت تاویلات وتوجیہات اور حقائق ومضمرات بھی پیش کردی جائیں تاکہ اہل بصیرت کو ایک اشارہ مل جائے جس سے وہ ایسے مقامات پر اپنے آپ کو صحیح فکر کا حامل بنا سکیں۔

شطحیات کے باب میں سب سے زیادہ حضرت منصور حلاج کے نعرۂ انا الحق کو لے کر قلق وبے چینی ہے اس لیے اس کی تفصیلی وضاحت ضروری ہے۔

ابن منصور کے بارے میں علماومشائخ کے اقوال وآرا

شیوۂ منصور تھا اہل نظر پر بھی گراں
پھر بھی کس حسرت سے سب دار ورسن دیکھا کیے
(اصغر گونڈوی علیہ الرحمہ)

شیخ علی ہجویری قدس سرہ فرماتے ہیں کہ:

’’حضرت ابوالمغیث حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ کا شمار مشتاقان الٰہی اور مستان طریقت میں ہوتا ہے، آپ کا حال نہایت قوی اور ہمت بلند تھی، آپ کے مقام کے متعلق مشائخ طریقت کا اختلاف ہے، ایک گروہ کے نزدیک آپ مقبول بارگاہ ہیں اور ایک کے نزدیک مطعون بارگاہ۔ وہ طبقہ جو آپ کو مردود بارگاہ سمجھتا ہے ان میں حضرت عمرو بن عثمان مکی، ابویعقوب نہرجوری، ابویعقوب اقطع، اور علی بن سہل اصفہانی وغیرھم ہیں۔

جنھوں نے آپ کو مقبول بارگاہ قرار دیا ان میں حضرت ابن عطا، محمد بن خفیف، ابوالقاسم نصرآبادی اور جملہ مشائخ متاخرین ہیں۔

ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس نے آپ کے بارے میں سکوت اختیار کیا ان میں حضرت جنید، حضرت شبلی اور حصری وغیرھم ہیں۔ نیز وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانہ کے مشائخ مثلاً حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیر، شیخ ابوالقاسم گرگانی، شیخ ابوالعباس شقانی قدست اسرارھم جیسے عظیم المرتبت حضرات اپنے آپ کو حضرت ابن منصور کا ہمراز سمجھتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں۔

’’استاد ابوالقاسم قشیری قدس سرہ ان کے تعلق سے فرماتے ہیں کہ اگر وہ اہل حقیقت میں

سے تھے تو خلق کی طعن وتشنیع کی وجہ سے بارگاہ حق سے محروم ومسترد نہیں ہوسکتے، اگر وہ مہجور طریقت تھے تو قبول خلق کی وجہ سے مقبول بارگاہ نہیں ہوسکتے، ہم ان کو ان کے حال پر چھوڑتے ہیں، لیکن ہم نے ان کے اندر جو نشان حق پایا اس کی وجہ سے ان کا احترام کرتے ہیں‘‘

حقیقت یہ ہے کہ ان کے مخالفین کی تعداد بہت کم اور موافقین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔(۲۱)

علمائے ظاہر میں بعض لوگ ان کی تکفیر کرتے ہیں، ان کے کمالات کے منکر ہیں اور ان کے کشف وکرامات کو حیلہ وجادو سے منسوب کرتے ہیں، مگر شاید انہیں علم نہیں کہ یہ منصور حلاج وہ بے دین شخص نہیں جو محمد بن زکریا کا استاد اور ابوسعید قرامطی کا رفیق تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ منصور حلاج جن کے بارے میں مشائخ کا اختلاف پایا جاتا ہے وہ کوئی اور ہیں جو فارس کے شہر بیضاء کے باشندہ تھے اور عمر بن عثمان مکی کے مرید تھے۔ ان کو مشائخ نے اس لیے نہیں رد کیا کہ ان کے عقائد درست نہیں تھے۔ بلکہ وہ اپنے عجیب وغریب حالات کی بنا پر قابل ملامت اور ہدف تنقید بنے تھے۔

اسی منصور حلاج کے تعلق سے شیخ ابوبکر شبلی قدس سرہ فرماتے ہیں: ’’**انا والحلاج فی شئ واحد فخلصنی جنونی واھلکه عقله**‘‘ اگر ان کے عقائد میں کوئی خرابی ہوتی تو شیخ شبلی یہ کلمات نہیں ارشاد فرماتے۔

حضرت محمد بن خفیف فرماتے ہیں کہ ’’**ھو عالم ربانی**‘‘(۲۲)

حضرت مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی قدس سرہ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ حسین ابن منصور حلاج کے سلسلے میں اختلاف ہے، اکثر ان کی تائید کرتے ہیں بعض تردید۔ ان کے حامیوں میں شیخ ابوالعباس عطا، حضرت عطاء، شیخ شبلی، شیخ ابوعبداللہ خفیف، شیخ ابوالقاسم وغیرھم مذکورہ حضرات ان کے قتل پر راضی نہیں تھے۔

شیخ ابوسعید ابوالخیر قدس سرہ فرماتے ہیں کہ مشرق ومغرب میں احوال کی بلندی کے اعتبار سے وہ لاثانی ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ نہ میں ان کو قبول کرتا ہوں اور نہ ان کی تردید کرتا ہوں تم لوگ بھی ایسا ہی کرو البتہ ان کی تائید کرنے والوں کو تردید کرنے والوں سے زیادہ پسند کرتا ہوں

-وہ امام ہیں ہر شخص کوان کے بارے میں گفتگو کا حق نہیں-(۲۳)

امام المتکلمین حضرت فخرالدین رازی رحمۃ اللہ علیہ کی چند توجیہات بھی انھوں نے ذکر کی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۱)فرماتے ہیں کہ اللہ حق ہے اوراس کی معرفت معرفتِ حق، اورمعرفت حق کی مثال ایسی ہے جیسے اکسیر کہ جب وہ تانبہ پر پڑتی ہے تو اسے سونا بنادیتی ہے- اسی کے مانند جب معرفت الٰہی کی اکسیر روح کے تانبہ پر پڑتی ہے تو اسے باطلیت سے حقیقت کی طرف لے آتی ہے-

حضرت منصور کے اناالحق کہنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ موجود حقیقی بس حق تعالی شانہ کی ذات ہے اس کے سواسب فانی وباطل ہے، اس لیے کہ منصور حلاج وہ شخص تھے جن پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی تھی کہ ماسوائے ذات حق کچھ بھی نہیں، حتی کہ خود ان کی ذات بھی فنا ہوچکی تھی ان کے مشاہدہ ویقین میں یہ بات راسخ ہوچکی تھی کہ حق تعالی کے سواموجود بالذات کوئی نہیں- اس کیفیت میں اگرانہوں نے اناالحق کہا تو درحقیقت قائل وہ نہیں ہیں بلکہ اللہ نے یہ کلمہ ان کی زبان پر جاری فرمایا تھا-خود ان کی ذات تجلیات ربانی میں مستغرق ومحوتھی-اسی لیے جب ان سے کہاجاتا کہ انابالحق کہوتوان کی زبان سے اناالحق ہی نکلتا اس لیے کہ اگر وہ انابالحق کہتے تولفظ انا سے اشارہ ان کی ذات کی طرف ہوتا حالانکہ وہ مقام محویت میں تھے-

(۲)ومنها ماقال الامام ایضاًان من غلب علیه شئ یقال انه هو ذلک الشئ علی سبیل المجاز کمایقال فلان کرم فلماکان الرجل مستغرقاًبالحق لاجرم قال اناالحق"-

نیز امام رازی نے فرمایا کہ جب کوئی چیز کسی پرغالب ہوجاتی ہے توبطورمجاز کہاجاتا ہے کہ یہ وہی چیز ہے جیسے کہ فلاں سراپا سخاوت ہے-

اسی لیے جب کسی کے اوپر حق کی تجلیات کا غلبہ ہوجائے اور وہ مستغرق وفنا ہوجائے تویقینی طورسے اناالحق کہے گا-مثل مشہور ہے"ہرکہ درکان نمک رفت نمک شد"

(۳)اس تاویل کے تحت فرماتے ہیں کہ اس قول کامحمل یہ ہے کہ یہاں مضاف محذوف ہے اصل میں **اناعابد الحق یاذاکرالحق** ہےمگرخود کہتے ہیں کہ یہ ضعیف تاویل ہے، اس لیے کہ حذف مضاف اس جگہ جائز ہے جہاں التباس نہ ہومثلاً **واسئل القریۃ** اصل میں **اھل**

القریۃ ہے مگر جہاں التباس سے محفوظ نہ ہو وہاں حذف جائز نہیں جیسے کہا جائے **رأیت زیداً** اور مرادلیاجائے **غلام زیدٍ**-(۲۴)

حضرت مخدوم سمنانی قدس سرہ اس قول کی توجیہہ میں ارشادفرماتے ہیں کہ لوگوں کا یہ گمان ہے کہ دعویٰ اناالحق دعویٰ الوہیت ہے حالانکہ وہ اس سے بے خبر ہیں کہ **اناالعبد** کہنا اس سے بڑادعوی ہے کیوں کہ **اناالحق** کہنے میں بے انتہا تواضع ہے اس لیے کہ قائل اپنے کومٹا کر، رخت ہستی کودروازۂ فنا پہ پہنچا کر اناالحق کہتا ہے یعنی میں نہیں ہوں بس وہی ہے-(۲۵) ؎

سعیدؔ! اللہ ہے اب میں کہاں ہوں
مرانام ونشاں وہم وگماں ہے

اور جو انا **العبد** کہتا ہے وہ دوہستی کا اثبات کرتا ہے ایک اپنی، دوسرے خدا کی ؎

دوئی کا وسوسہ **استغفراللہ**
طریق عشق میں بدعت یہی ہے

(منشی عزیزاللہ شاہ صفی پوری قدس سرہ)

غیرمسلم محققین وناقدین کی رائے: فرانس کے مایۂ ناز ادیب لوئی مسینو نے حضرت حسین ابن منصورحلاج کی شخصیت پر بڑی جانفشانی سے ریسرچ کیا، بغداد جاکر قدیم صوفیا کی کتابوں کامطالعہ کیاخود ابن منصور کی کتابیں بھی پڑھیں پھر اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کیانیز آپ کی سوانح حیات بھی لکھی-

عام محققین سے ان کا تحقیقی مزاج الگ رہاانہوں نے دوسرے اور تیسرے درجہ کی معلومات پراعتماد کرنے کے بجائے اول درجہ کی تحقیقات حاصل کیں اوراس نتیجہ پر پہنچے کہ تصوف کی ہر چیز حتی کہ شطحیات بھی قرآن وحدیث پر مبنی ہے-

حضرت ابن منصور حلاج کے اوپر جو کتاب انہوں نے تحریر فرمائی ہے اس کا نام "لاپیشن ڈی الحلاج"(La passion De Alhallaj)ہے-(۲۶)

ڈاکٹر نکلسن جوابتدائی ایام میں تصوف اورصوفیاء کے تعلق سے نہایت متعصبانہ رویہ رکھتے تھے مگراخیرزمانہ میں وہ حامی ہوگئے تھے -اپنی اخیر زمانہ کی تصنیف "تصوف میں نظریۂ شخصیت"(Idea of personalty in sufism)میں حسین ابن منصور حلاج کے نعرۂ اناالحق کا ذکر

کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

''حلاج کے اناالحق کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں خدا ہوں بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ میں حق یعنی سچ ہوں- یہ نظریہ ہمہ اوست کے سراسر خلاف ہے کیوں کہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان خدا کا مظہر ہے- یہ نظریہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ان کلمات کے تقریباً مطابق ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ جس نے مجھے دیکھا خدا کو دیکھا لیکن وہ نظریہ جسے حلول کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اسلام میں جڑ نہ پکڑ سکا اسے حلاج اور ان کے مریدین ہی نے ختم کر دیا تھا- صوفیا کا بیان ہے کہ حلاج کو اس لیے نہیں شہید کیا گیا کہ وہ حلولی تھے بلکہ اس لیے کہ انہوں نے حق تعالیٰ کا راز فاش کر دیا''(۲۷)

ڈاکٹر نکلسن کتاب مذکور میں حضرت حلاج کی پابندیٔ شریعت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب حسین بن منصور حلاج کو پھانسی دینے کے لیے لایا گیا تو انہوں نے دار و رسن کو دیکھ کر قہقہہ لگایا اور اس قدر ہنسے کہ آنکھوں سے پانی بہنے لگا اس کے بعد انہوں نے لوگوں کی طرف نگاہ کی اور اپنے پیر بھائی دوست حضرت ابوبکر شبلی قدس سرہ کو دیکھ کر دریافت کیا کہ کیا آپ کے پاس مصلیٰ ہے؟ انہوں نے جواب دیا جی ہاں یا شیخ! انہوں نے کہا اسے بچھا دو اس کے بعد حلاج نے آگے بڑھ کر دو رکعت نماز ادا کی شبلی فرماتے ہیں کہ میں ان کے پاس کھڑا تھا پہلی رکعت میں انہوں نے سورۂ فاتحہ کے بعد یہ آیات پڑھیں ''**کل نفس ذئقةالموت الخ** دوسری رکعت میں ''**ولنبلونکم بشئ من الخوف والجوع ونقص من الاموال الخ**''(۲۸)

حضرت سلطان العارفین قدس سرہ کے قول ''سبحانی مااعظم شانی'' پر مشائخ کا تبصرہ

لطائف اشرفی میں مذکور ہے:

''سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی قدس سرہ نے فرمایا ''**انی وجدت سبعین ولیایعبدون الله با لوهم والخیال واخی بایزید منهم**'' (۲۹)

حضرت مخدوم اشرف سمنانی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ سلطان العارفین کا یہ قول حالت تلون سے ہے، مقام تمکین سے نہیں، حضرت سلطان العارفین قدس سرہ نے جو کہا اس کی حقیقت اس راہ کے اہل تجربہ ہی جانتے ہیں کیوں کہ یہ قول حضرت بایزید کی زبان پر بلاقصد جاری ہوا جیسا کہ قلب

میں ذکر بلاارادہ پیدا ہوتا ہے- نیز خود حضرت بایزید فرماتے ہیں کہ الٰہی اگر میں نے کسی دن **سبحانی مااعظم شانی** کہا ہو تو میں کافر و مجوسی ہوں میں اپنی زنّار توڑتا ہوں اور کہتا ہوں **اشهد ان لااله الا الله واشهد ان محمد اعبده ورسوله**- (۳۰)

بعض لوگوں نے کہا کہ حضرت بایزید سے جب اس بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس وقت میں بعض اوراد میں مشغول تھا اور فقرہ **سبحا نی ما اعظم شانی** ربّ العالمین کے قول کی حکایت تھی جیسا کہ کوئی سورۂ طٰہٰ میں پڑھے **انّی انا ربّک** اس طرح آپ کے بارے میں منقول ہے کہ غلبۂ حال میں اگر چہ ان کی زبان پہ کلمات جاری ہوئے مگر جب ہوش وحواس درست ہوئے تو آپ کے رفقاء و مریدین نے اس تعلّق سے آپ کو بتایا کہ آپ ایسا ایسا لفظ کہہ رہے تھے آپ نے ارشاد فرمایا کہ ٹھیک ہے اگر تم لوگ مجھ سے ایسے الفاظ دوبارہ سننا تو میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا اور سب کو ایک ایک چھری تھما دی چنانچہ آپ پر پھر غلبۂ حال طاری ہوا اور آپ نے اسی لفظ کو دہرایا- آپ کے حسب ارشاد رفقا و مریدین نے آپ کو کاٹنے کا ارادہ کیا، پہلے دیکھا کہ پورا کمرہ آپ کے وجود سے بھرا ہوا ہے مگر جیسے ہی چھری ان کے جسم کے قریب لے گئے تو وہ صورت چھوٹی ہوگئی اور حضرت بایزید نمودار ہو گئے- لوگوں نے ماجرا دریافت کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ بایزید یہ ہے اس سے پہلے بایزید نہیں تھا- (۳۱)

اس باب میں دوسری توجیہات: شطحیات کے باب میں اور دوسرے اعتبارات و توجیہات بھی ہیں - مثلاً یہ کہ ممکن ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنا کلمہ منصور و بایزید کی زبان سے ظاہر کیا ایسے کلمات کی نسبت ان کی طرف نہیں ہوگی کیوں کہ اس حالت میں ان حضرات کی حیثیت محض آلہ کی ہے اور قائل ذات حق ہے- اس سے کوئی اعتراض لازم نہیں آتا کیوں کہ جب درخت سے صدائے **اننی انا الله** جاری ہو سکتی ہے تو کسی انسان کی زبان سے **اناالحق** یا **سبحانی مااعظم شانی** کا جاری ہو جانا بدرجۂ اولی درست ہے- ؎

روا باشد انا اللہ از درختے
چرا نبود روا از نیک بختے

(مثنوی گلشن راز)

مگر واضح رہے کہ یہ سب بہت دقیق اور لطیف توجیہات ہیں جو عام فہم نہیں اور کوئی بھی

تاویل وتشریح ان کلمات کا مستند ومکمل محمل نہیں اس لیے اس کی صراحت ووضاحت میں زیادہ سرکھپانااور اس کی حقیقت کو کریدنا خلجان واضطراب سے خالی نہیں جیسا کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ ''شطحیات کی جزئیات کی تفصیل کرنا مناسب نہیں کیوں کہ یہ رموزواشارات ،فناوتوحید کے قبیل سے ہیں- قیل وقال درآں جامناسب حال نہ باشد-(۳۲)

واللہ اعلم بالصواب-

ہفوات مشائخ

ہفوات کا تعلق مشائخ کے افعال وحرکات سے ہوتا ہے جیسے شیخ شبلی کا داڑھی حلق کرالینا،درہم ودینار کو دریامیں ڈال دینا،حضرت ابوحمزہ خراسانی کا کنویں میں گرنے کے بعد کسی کوآواز نہ دیناوغیرہ-

صحیح موقف : ان افعال وحرکات کی علت بھی غلبۂ حال اور وجد ومستی ہے اورظاہر ہے جوقول وفعل غلبۂ حال میں صادرہووہ قابل تقلید نہیں ہوتا- اگر چہ وہ اپنی جگہ درست ہے اس لیے ہفوات مشائخ کی تقلید جائزنہیں لیکن تردید بھی جائزنہیں-

اسباب ومضمرات: ہفوات کے صدورکا سبب چونکہ ایک خاص حالت وکیفیت کا غلبہ ہے جس میں ضبط واختیارختم ہو جاتا ہے، بے خودی طاری ہوجاتی ہےاورجوبھی عجیب وغریب حرکات ان سے صادرہوتے ہیں وہ ان کے مقتضائے حال کے مطابق ہوتے ہیں- وہ ایسا کرنے میں معذور ہیں -مگرساتھ ہی ان افعال کے پیچھے ایسی لطیف اور بلیغ حکمت کارفرما ہوتی ہےجس کے آگے ظاہری قباحت بے حیثیت نظرآتی ہےاس کاباطن جمال معنوی کا ایسا حسین پیکر ہوتا ہے جسے ظاہر کی خراب شباہت معیوب نہیں کرسکتی ، بطورتمثیل ایک واقعہ کی تفصیل بیان کی جاتی ہے شایدحق واضح ہوجائے اورمقصودتک پہنچنے میں کفایت کرے-

لوگوں نے بیان کیاہے کہ جب حضرت شبلی کالڑکا فوت ہوگیاتواس صدمہ میں آپ کی اہلیہ نے اپنے سر کے بال کٹوالیےاورخودحضرت شبلی قدس سرہ نے اپنی داڑھی حلق کروالی اورگھرمیں بیٹھ گئے، اہل بغداد کو جب شبلی کی اس حالت کاعلم ہواتووہ آپ سے بدظن ہوگئے اورتعزیت کاارادہ ترک کرلیے -شیخ کے احباب میں سے کسی نے دریافت کیا کہ اے شبلی ! آپ نے ایسی حرکت

کیوں کی ؟آپ نے جواباً فرمایا:اپنی اہلیہ کی موافقت میں-لیکن انہوں نے کہاکہ یہ جواب تسلی بخش نہیں آپ حقیقت حال سے آگاہ کریں کیوں کہ آپ اپنے اہل وعیال کے لیے ایسی حرکت نہیں کرسکتے -اصرارواستفسار کے بعدآپ نے اس کی حکمت وعلت کوکچھ یوں واشگاف کیا-

آپ نے فرمایاکہ نبیٔ اکرم ﷺ کی ایک حدیث مجھ تک پہنچی ہے کہ جولوگ تذکیرحق کرتے ہیں اورخودان کےقلوب اس سے غافل ہوتے ہیں توایسےلوگ مستحق لعنت اوررحمت حق سے دور ہوجاتے ہیں -یہ بات ظاہرہے کہ لوگ میرے پاس تعزیت کے لیےآتے اورحسب عادت رسمی طور سے انا للہ و انا الیہ راجعون کہہ کرتذکیرحق کرتے حالانکہ خودان کےقلوب اس سے غافل ہوتے اس طرح وہ مستحق لعنت ہوجاتے ،اسی وجہ سے میں نے اپنی ڈاڑھی حلق کروالی تاکہ لوگ میری اس حرکت سے بےزار ہوکر میرےقریب نہ آئیں- میرے اس فعل نے خلق خدا کوورطۂ ہلاکت میں گرنے سے بچالیا.

ملاحظہ کیجئے کہ اس حرکت میں کیسی دوراندیشی اور دقت نظری ہے ،ان کی نیت میں کس قدر صدق وخلوص مضمرہے،آیت ربانی اورحدیث رسالت پناہی ﷺ کی کیسی قدروتعظیم ہے-(۳۳)

بظاہران افعال میں شرعی قباحت ہےمگران کی حکمت وعلت کی رفعت شان کودیکھ کر یہ کہنا پڑتاہے کہ ؎

بلند اس درجہ ہے ایوان مستی
کہ منہ تکتی ہے پرواز زمانہ

اوربقول مولائے روم ؏

ایں خطاازصدصواب اولی تراست

حرف آخر : شطحیات وہفوات مشائخ کے باب میں مذکورہ اقوال وارشادات ،تشریحات وتحقیقات،توجیہات وتاویلات، حقائق ومضمرات کی روشنی میں یہ رائے قائم کرنا شاید غلط نہ ہوکہ ایسے اقوال وافعال بنفسہا شرعاً قبیح ہیں مگر یہ قباحت قائل وفاعل کی طرف راجع نہ ہوگی یہ سب اصلاً خطاومعصیت ہیں،مگر فاعل عاصی وخاطی نہیں جیسے گھوڑا پاک جانور ہےمگراس کی لید جونجس ہے گھوڑے سے خروج ہونے کے سبب اس پرنجاست کاحکم نہیں لگایا جاتا لہٰذا صاحب قول وفعل پرمعصیت کاحکم صادر کرنادانشمندی نہیں ہے-

نیز یہ نظریہ رکھنا بھی فقدان بصیرت و باطنی خباثت کی دلیل ہے کہ ان کے ہفوات وشطحیات کو لے کر تصوف اور صوفیا کی مقدس جماعت کے خلاف الزام تراشی کی جائے اور اسے غیر شرعی و غیر اسلامی افکار قرار دیا جائے اور نہ یہ چاہیے کہ ان اقوال و افعال و احوال کی تقلید کی جائے- کیوں کہ تاریخی حقائق ومشاہدات سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ اسلام کے حقیقی علم بردار کی حیثیت اگر کسی کو حاصل ہے تو وہ یہی پاکیزہ گروہ ہے جن کی زندگی کا ہر صفحہ شریعت مطہرہ کے ظاہری احکام و باطنی آداب کی پابندی سے عملاً وحالاً عبارت ہے-اسلام کے شرعی و اخلاقی اصولوں کی پاسداری واحترام جوان کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے وہ کہیں اور نہیں ،معرفت خداوندی جیسی بے بہا نعمت سے جو وافر حصہ انہوں نے حاصل کیا وہ دوسرے لوگ نہ پا سکے-

درحقیقت یہی وہ نفوس قدسیہ ہیں جنہوں نے مادیت گزیدہ ماحول میں روحانی قوت کا ایسا سکہ رائج کیا کہ لوگ طاغوتی ونفسانی شکنجوں سے آزاد ہوکر معبود برحق کے مخلص وصادق بندے ہو گئے ،انہوں نے ہی اخلاق وکردار کی عظمت سے تسخیر کائنات کا حسین فلسفہ پیش کیا، ان کی زندگی کا واحد مقصد دین خداوندی کی نشر واشاعت ،اور دعوت وتبلیغ تھا-صفحۂ ہستی پر ان کے انقلابی کارناموں کی دھوم رہی ہے اور ہے، تا قیامت رہے گی - کیوں کہ خلافت ارضی کی مسند عظیم کا حقیقی وارث یہی طبقہ ہے جیسا کہ قرآن مقدس میں مذکور ہے:''ان الارض یرثھا عبادی الصالحون'' (۳۴) (زمین کے وارث میرے مخلص بندے ہیں)

حوالہ جات

۱- تذکرۃ الاولیاء فارسی شیخ عطار ص:۸ (بحوالہ مقالات پیر کرم شاہ ازہری)

۲- مرج البحرین فارسی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص:۳۳ مطبوعہ ایجوکیشنل پریس پاکستان چوک کراچی

۳- ایضاً ص:۳۳

۴- ایضاً ص:۳۴

۵- المعجم الوسیط ص:۴۸۲/۹۸۹ طابع زکریا بکڈپو دیوبند

۶- کتاب اللمع اردو شیخ ابونصر سراج ص:۶۲۴ مترجم سید اسرار بخاری مطبع یونین پرنٹنگ پریس

دہلی

۷- لطائف اشرفی ملفوظات مخدوم اشرف سمنانی ص:۶۴۴ مترجم شمس بریلوی مطبع سہیل پریس پاکستان چوک کراچی

۸- سردلبراں سید ذوقی شاہ ص:۲۳۲ ناشر محفل ذوقیہ فیڈرل بی ایریا کراچی پاکستان

۹- کتاب اللمع اردو شیخ ابونصر سراج ص:۶۲۵/۶۲۶ مترجم سید اسرار بخاری مطبع یونین پرنٹنگ پریس دہلی

۱۰- کشف المحجوب اردو داتا گنج بخش ہجویری ص:۴۶۲/۴۶۴ ترجمہ وتحقیق کپتان واحد بخش سیال چشتی ناشر مکتبہ رضویہ ٹیا محل دہلی

۱۱- لطائف اشرفی ملفوظات مخدوم اشرف سمنانی ص:۶۴۴ مترجم شمس بریلوی مطبع سہیل پریس پاکستان چوک کراچی

۱۲- ایضاً ص۶۴۴

۱۳- ایضاً ص۶۴۴

۱۴- مرج البحرین فارسی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص:۳۳ مطبوعہ ایجوکیشنل پریس پاکستان چوک کراچی

۱۵- ایضاً ص:۳۵/۳۶/۳۷

۱۶- ترجمہ تحصیل التعرف فی الفقہ والتصوف شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص:۱۷۱/۱۷۳ مترجم عبدالحکیم شرف قادری ناشر اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی

۱۷- ایضاً ص:۱۷۳

۱۸- عقائد العزیز مخدوم منشی عزیز اللہ شاہ ص:۶۵ مطبع راجہ راہر کمار لکھنؤ

۱۹- ایضاً ص:۶۵

۲۰- ایضاً ص:۶۵/۶۶

۲۱- کشف المحجوب اردو داتا گنج بخش ہجویری ص:۴۶۵ ترجمہ وتحقیق کپتان واحد بخش سیال چشتی، ناشر مکتبہ رضویہ، ٹیا محل دہلی

۲۲- ایضاً ص:۴۶۵

۲۳- لطائف اشرفی ملفوظات مخدوم اشرف سمنانی ص:۶۵۳/مترجم شمس بریلوی، مطبع سہیل پریس پاکستان چوک کراچی

۲۴- ایضاً ص:۶۵۴/۶۵۵

۲۵- ایضاً ص:۶۵۸

۲۶- مشاہدۂ حق کپتان واحد بخش سیال چشتی ص:۱۴۶/ناشران الفیصل غزنی اسٹریٹ اردو بازار لاہور پاکستان

۲۷- ایضاً ص:۱۵۷/۱۵۸

۲۸- ایضاً ص:۱۵۸/۱۵۹

۲۹- لطائف اشرفی ملفوظات مخدوم اشرف سمنانی ص:۶۷۰/مترجم شمس بریلوی مطبع سہیل پریس پاکستان چوک کراچی

۳۰- ایضاً ص:۶۷۰

۳۱- ایضاً ص:۶۴۵

۳۲- مرج البحرین فارسی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص:۴۸/مطبوعہ ایجوکیشنل پریس پاکستان چوک کراچی

۳۳- ایضاً ص:۴۸/۴۹

۳۴- سورۂ انبیاء پارہ:۱۷ آیت:۱۰۴

○○○

مولانا مظہر حسین علیمی

ضرورت شیخ اور اس کے حقوق و آداب

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بے شمار مخلوقات کو پیدا فرمایا مگر تاج کرامت انسان کے سر پر رکھا - ہر مخلوق ذی روح ہو یا غیر ذی روح، سب کسی نہ کسی مقصد کے تحت پیدا کی گئی ہے-

انسان کا مقصد تخلیق خالق ارض وسما کا عرفان حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے مگر یہ بات ذہن نشین رہے کہ معرفت الٰہی کی دولت آسانی سے حاصل نہیں ہوتی -جس قدر معرفت الٰہی کا حصول ضروری ہے اُسی قدر اس کو حاصل کرنے کی راہ پر چلنا دشوار ہے-کامل رہنما کے بغیر اس پر خار وادی میں قدم رکھنا ایسا ہی ہے جیسے زہر ہلاہل پی کر متاع حیات کو محفوظ سمجھنا -

خالق کائنات جل جلالہ کا ارشاد پاک ہے :

یاایھا الذین آمنو اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلة وجاھدوا فی سبیلہ لعلکم تفلحون-

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف وسیلہ ڈھونڈو اور اس کی راہ میں جہاد کرو اِس اُمید پر کہ فلاح پاؤ-(۱)

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں امام فخرالدین رازی علیہ الرحمہ رقم طراز ہیں :

"دلت الآیة علی انه لا سبیل الی اللہ تعالیٰ الا بمعلم یعلمنا معرفته ومرشد یرشدنا الی العلم به ،وذلک لانه امر بطلب الوسیلة الیه --------(۲)

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ "وابتغوا الیہ الوسیلة "کی تفسیر میں فرماتے ہیں :

"الوسیلة ھی التی یتوصل بھا الی تحصیل المقصود"-(۳)

تفسیر جلالین میں ہے:

"مایقربکم الیه من طاعته"-

مذکورہ تفسیرات کی روشنی میں واضح ہوگیا کہ **الوسیلہ** سے مراد مرشد اور شیخ ہے، جو قرب خداوندی اور انسان کے اصلاح وتزکیہ کا سبب بنتا ہے-

قرآن پاک میں دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ و کونوا مع الصٰدقین (۴)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ-

علامہ ابن کثیر علیہ الرحمہ صادقین کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

وقال الضحاک مع ابي بکر وعمر واصحابھما(۵)

یہ بات ذہن نشین رہے کہ مشائخ طریقت کے مشہور سلاسل اربعہ واسطہ بہ واسطہ حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت سیدنا علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم سے ملتے ہیں -لہٰذا آج کے دور میں صادقین کا مصداق مشائخ عظام ہیں-

ارشاد رب ذوالجلال ہے:

اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں حضرت امام رازی علیہ رحمۃ الباری تحریر فرماتے ہیں:

وھذا یدل علی ان المرید لا سبیل لہ الی الوصول الی مقامات الھدایۃ والمکاشفۃ الا اذا اقتدی بشیخ یھدیہ الیٰ سواء السبیل ویجنبہ عن مواقع الاغالیط والاضالیل ،وذلک لا ن النقص غالب علیٰ اکثر الخلق ،وعقولھم غیر وافیۃ بادراک الحق وتمییز الصواب عن الغلط ،فلابد من کامل یقتدي بہ الناقص حتی یتقوي عقل ذلک الناقص بنور عقل ذلک الکامل ،فحینئذ یصل الی مدارج السعادات ومعارج الکمالات (٦)

یعنی یہ اس بات پر دال ہے کہ مرید کے لیے مقامات ہدایت وکشف تک پہونچنے کی علاوہ اس کی کوئی صورت نہیں کہ وہ ایسے شیخ ورہنما کی اقتدا کرے جو اسے صراط مستقیم پر چلائے اور گمراہیوں اور غلطیوں کے مواقع سے بچائے - اور یہ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اکثر مخلوق پر نقص وکوتاہی غالب ہے اور مخلوق کی عقل تک پہونچنے اور صحیح وغلط کی تمیز کرنے سے قاصر ہے - لہٰذا ایسے کامل کی اقتدا ضروری ہے جو ناقص کی رہنمائی کرے تاکہ ناقص کی عقل کامل کے نور سے

طاقت حاصل کرے -ایسا کرنے سے ناقص انسان سعادتوں کے مدارج اور کمالات کے زینے عبور کر لیتا ہے-

شیخ اور مرشد کی ضرورت واہمیت پر قرآنی آیات وتفاسیر ملاحظہ کر لینے کے بعد آیئے اس تعلق سے احادیث کریمہ کا مطالعہ کریں-

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین وہ خوش نصیب اور خوش قسمت افراد ہیں جن کے سامنے اللہ کا آخری کلام قرآن مجید نازل ہوتا تھا اِس کے باوجود خوف وخشیت الٰہی کی جو کیفیت سیدالمرسلین علیہ التحیۃ والتسلیم کی خدمت اقدس میں موجود رہنے پر ہوتی تھی وہ خلوت وغیبت میں نہیں ہوتی تھی -

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں :

''جس روز رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جلوہ افروزی مدینہ طیبہ میں ہوئی تھی مدینہ کی زمین روشن ہوگئی تھی اور جس دن آپ کا وصال پر ملال ہوا مدینہ کی ہر چیز تاریک ہوگئی تھی ،آپ کی تدفین کے بعد ہم مٹی بھی جھاڑنے نہ پائے تھے کہ ہم نے اپنے قلوب میں تغیر پالیا تھا-

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ صحابہ کرام جیسی مقدس ہستیوں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ ان کی جو کیفیت حضور سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ہوتی تھی وہ دوسرے مواقع پر نہیں ہوتی تھی ،جس طرح حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین مشکوۃ نبوت سے استفاضہ کرتے تھے آج اسی طرح مریدانِ باصفا اپنے مشائخ کی صحبت میں رہ کر اکتساب فیض کیا کرتے ہیں-

ایک مرتبہ حضرت حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھر سے یہ کہتے ہوئے نکلے **''نافق حنظلۃ''** حنظلہ منافق ہوگیا -اسی اثنا میں یار غار رسول حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات ہوگئی -آپ نے فرمایا: **سبحان اللہ!** حنظلہ ! یہ کیا کہہ رہے ہو؟ ایسا نہیں ہوسکتا -حضرت حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی کہ جب ہم لوگ بارگاہ رسول میں ہوتے ہیں اور حضور رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جنت ودوزخ کا ذکر فرماتے ہیں تو ہم لوگ ایسے ہو جاتے ہیں گویا جنت ودوزخ ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں -اور جب ہم گھروں پر ہوتے ہیں تو بیوی بچوں ،مال وجائداد وغیرہ میں پھنس کر جنت ودوزخ کو بھول جاتے ہیں -حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: یہ کیفیت تو ہمیں بھی درپیش ہوتی ہے- پھر دونوں حضرات بارگاہِ رسول صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم میں حاضر ہوئے اور صورت حال عرض کی- تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر تمھارا ہر وقت وہی حال رہے جیسا میرے سامنے ہوتا ہے تو فرشتے تم سے بستروں پر اور راستوں میں مصافحہ کرنے لگیں-

سچ ہے ''اَلصُّحبَۃُ تُوَئِّرُ'' یعنی صحبت اثر انداز ہوتی ہے- مذکورہ بالا حدیث پاک فیضان صحبت کے تعلق سے بہترین مثال ہے-

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **العین حق**'' نظر لگنا برحق ہے-(۷)

غور کیجئے کہ جس نظر میں عداوت، حسد، بغض اور کینہ ہو وہ نظر اپنا اثر دکھا سکتی ہے تو جس نظر میں محبت ہو، شفقت ہو، رحمت ہو، خلوص ہو، وہ نظر کیوں اثر دکھا نہیں سکتی؟ یہ اللہ والوں ہی کی نظر ہوتی ہے جو گناہوں میں لت پت انسان کے اندر احساس ندامت پیدا کر کے اُسے ملکوتی صفات کا حامل بنا دیتی ہے-

اہل اللہ کے اقوال واحوال سے دلائل: شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

میں نے بہت سے اولیا کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ''جس نے کسی فلاح یاب کی زیارت نہ کی وہ فلاح نہ پائے گا اور یہ بھی سنا کہ ''بے پیرے کا پیر شیطان ہے''-

اسی کتاب میں ایک اور جگہ آپ نے لکھا کہ سیدنا بایزید بسطامی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، آپ فرماتے ہیں: جس کا کوئی پیر نہیں اس کا امام شیطان ہے-

امام اجل ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے مبارک رسالہ ''رسالہ قشیریہ'' میں لکھا ہے کہ حضرت ابوعلی دقّاق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو میں نے یہ فرماتے سنا کہ ''پیڑ جب بغیر بونے والے کے آپ سے آپ اُگے تو پتے اور پھول لاتا ہے مگر پھل نہیں دیتا''- بالکل اسی طرح مرید کے لیے اگر کوئی پیر نہ ہو تو ایسا آدمی خواہش نفس کا پجاری ہے وہ راہِ ہدایت نہ پا سکے گا-(۸)

بڑے بڑے اولیائے کرام کی حالات زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کسی نہ کسی کو اپنا شیخ بنایا اور ان کی تعلیم وتربیت میں رہ کر معرفت الٰہی کی دولت حاصل کی اور ولایت کے منصب پر فائز ہوئے-

شرائط شیخ: رشد و ہدایت کا فریضہ بہت اہم فریضہ ہے، ہر کس وناکس اس کا اہل نہیں ہوسکتا- یاد رہے کہ خرقہ وکلاہ اور جبہ ودستار بظاہر ہلکا پھلکا لباس ہے مگر خبردار! یہ کوئی معمولی لباس نہیں بلکہ امانت اور ذمے داریوں کا کوہ ہمالہ ہے- اس راہ کی پر پیچ وادیاں بڑے بڑے سورماؤں کے پائے عزم واستقلال کو ڈگمگا دیتی ہیں- ریاضت اور مجاہدے کی سختیاں، مسند طریقت کی زینت اور فقر وفاقہ کے ساتھ مصائب وابتلا اِس عظیم عہدے کا طرۂ امتیاز ہے-

جب یہ حقیقت عیاں ہوگئی کہ ہر مسلمان کو رہبر طریقت اور شیخ کی ضرورت ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ رہبر ورہنما کون ہو؟ کیسا ہو؟ کن اوصاف کا حامل ہو؟ تو یہ دیکھیے، امام اہل سنت امام احمد رضا خاں محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

پیر میں چار شرطیں لازم ہیں-

اول: سنی صحیح العقیدہ مطابق علمائے حرمین شریفین ہو-

دوسری: اتنا علم رکھتا ہو کہ اپنی ضروریات کے مسائل کتاب سے خود نکال سکے-

تیسری: فاسق معلن نہ ہو-

چوتھی: اس کا سلسلہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک پہنچتا ہو-

اگر کسی شخص میں ان چاروں میں سے کوئی شرط کم ہے اور ناواقفی سے اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا بعد کو ظاہر ہوا کہ وہ بدمذہب یا جاہل یا فاسق معلن یا منقطع السلسلہ ہے تو وہ بیعت صحیح نہیں- اسے دوسری جگہ مرید ہونا چاہئے، جہاں یہ چاروں شرطیں جمع ہوں-(۹)

جب مذکورہ بالا شرائط کا جامع شیخ اور پیر مل جائے تو اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دینا چاہئے، اس کے بہت سے دینی ودنیوی فوائد ہیں-

پیر یا شیخ کے ہاتھ میں ہاتھ دے دینے کے بعد شیخ اور مرید کے باہم ایک دوسرے پر کچھ حقوق عائد ہوتے ہیں جن کی رعایت ہر دو کے لیے کامیابی کا باعث ہیں-

امام احمد رضا خاں محدث بریلوی علیہ الرحمہ اسی قسم کے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''پیر واجبی پیر ہو، چاروں شرائط کا جامع ہو- مذکورہ چاروں شرائط کا جامع پیر حضور سید المرسلین صلوات اللہ علیہم اجمعین کا نائب ہے- اس کے حقوق حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حقوق

کے پرتو ہیں جس سے پورے طور سے عہدہ برآ ہونا محال ہے-مگر اتنا فرض ولازم ہے کہ اپنی حدِّ قدرت تک ان کے ادا کرنے میں عمر بھر ساعی (کوشاں) رہے- پیر کی جو تقصیر رہے گی اللہ ورسول معاف فرماتے ہیں- پیر صادق کہ ان کا نائب ہے یہ بھی معاف کرے گا کہ یہ توان کی رحمت کے ساتھ ہے-ائمۂ دین نے تصریح فرمائی ہے کہ مرشد کے حقوق باپ کے حقوق سے زائد ہیں اور فرمایا ہے کہ کوئی کام اس کے خلافِ مرضی کرنا مرید کو جائز نہیں-اس کے سامنے ہنسا منع ہے،اس کی بغیر اجازت بات کرنا منع ہے،اس کی مجلس میں دوسرے کی طرف متوجہ ہونا منع ہے،اس کی غیبت (عدم موجودگی) میں اس کے بیٹھنے کی جگہ بیٹھنا منع ہے،اس کی اولاد کی تعظیم فرض ہے اگر چہ بے جا حال پر ہوں-اس کے کپڑوں کی تعظیم فرض ہے-اس کے بچھونے کی تعظیم فرض ہے-اس کی چوکھٹ کی تعظیم فرض ہے-اس سے اپنا کوئی حال چھپانے کی اجازت نہیں-اپنے جان ومال کو اسی کا سمجھے-

پیر کو نہ چاہئے کہ بلاضرورت شرعی مریدوں کو مالی تکلیف دے-انہیں (مریدوں) کو جائز نہیں کہ اگر اسے حاجت میں دیکھیں تو اس سے اپنا مال دریغ رکھیں-خلاصہ کلام یہ ہے کہ اپنے آپ کو اس کی مِلک اور بندۂ بے دام سمجھے-اس کے احکام کو جہاں تک بلا تاویل صریح خلافِ حکم خدا نہ ہوں، حکم خدا ورسول جانے-(۱۰)

مرزا محمد فاروق بیگ صاحب رام پوری نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قدس سرہ کی خدمت میں حقوقِ پیر بغرضِ تصحیح وترمیم روانہ کیا تو اعلیٰ حضرت نے ان حقوق کی تصدیق فرمائی اور تحریر فرمایا کہ یہ تمام حقوق صحیح ہیں،ان میں بعض قرآن عظیم اور بعض احادیث شریفہ اور بعض کلمات علما اور بعض ارشادات اولیا سے ثابت ہیں-

افادیت کے پیش نظر آپ بھی ملاحظہ کریں-

۱- یہ اعتقاد کرے کہ میرا مطلب اسی مرشد سے حاصل ہوگا اور اگر دوسری طرف توجہ کرے گا تو مرشد کے فیوض وبرکات سے محروم رہے گا-

۲- ہر طرح مرشد کا مطیع ہو اور جان ومال سے اس کی خدمت کرے کیوں کہ بغیر محبت پیر کے کچھ نہیں ہوتا اور محبت کی پہچان یہی ہے-

۳- مرشد جو کچھ کہے اس کو فوراً بجالائے اور بغیر اجازت اس کے فعل کی اقتدا نہ کرے کیوں کہ

بعض اوقات وہ اپنے حال ومقام کے مناسب ایک کام کرتا ہے کہ مرید کو اس کو کرنا زہر قاتل ہے-

۴- جو ورد اور وظیفہ مرشد تعلیم کرے اس کو پڑھے اور تمام وظیفے چھوڑ دے خواہ اس کو اپنی طرف سے پڑھنا شروع کیا ہو یا کسی دوسرے نے بتایا ہو-

۵- مرشد کی موجودگی میں ہمہ تن اسی کی طرف متوجہ رہنا چاہئے یہاں تک کہ سوائے فرض وسنت کے نماز نفل اور کوئی وظیفہ اس کی اجازت کے بغیر نہ پڑھے-

۶- حتی الامکان ایسی جگہ نہ کھڑا ہو کہ اس کا سایہ مرشد کے سایہ پر یا اس کے کپڑے پر پڑے-

۷- اس کے مصلیٰ پر پیر نہ رکھے-

۸- اس کی طہارت یا وضو کی جگہ طہارت یا وضو نہ کرے-

۹- مرشد کے برتنوں کو استعمال میں نہ لائے-

۱۰- اس کے سامنے نہ کھانا کھائے نہ پانی پیئے اور نہ وضو کرے،ہاں اجازت کے بعد مضائقہ نہیں-

۱۱- اس کے روبرو کسی سے بات نہ کرے بلکہ کسی کی طرف متوجہ بھی نہ ہو-

۱۲- جس جگہ مرشد بیٹھتا ہو اس طرف پیر نہ پھیلائے اگرچہ سامنے نہ ہو-

۱۳- اور اس طرف تھوکے بھی نہیں-

۱۴- جو کچھ مرشد کہے اور کرے اس پر اعتراض نہ کرے کیوں کہ جو کچھ وہ کرتا ہے اور کہتا ہے اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کا قصہ یاد کرے-

۱۵- اپنے مرشد سے کرامت کی خواہش نہ کرے-

۱۶- اگر کوئی شبہہ دل میں گزرے تو فوراً عرض کرے اور اگر وہ شبہہ حل نہ ہو تو اپنے فہم کا نقصان سمجھے اور اگر مرشد اس کا کچھ جواب نہ دے تو جان لے کہ میں اس کے جواب کے لائق نہ تھا-

۱۷- خواب میں جو کچھ دیکھے وہ مرشد سے عرض کرے اور اگر اس کی تعبیر ذہن میں آئے تو اسے بھی عرض کردے-

۱۸- بے ضرورت اور بے اذن،مرشد سے علیحدہ نہ ہو-

۱۹- مرشد کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرے اور با آواز بلند اس سے بات نہ کرے اور بقدر ضرورت مختصر کلام کرے اور نہایت توجہ سے جواب کا منتظر رہے-

۲۰- اور مرشد کے کلام کو دوسرے سے اس قدر بیان کرے جس قدر لوگ سمجھ سکیں اور جس بات کو یہ سمجھے کہ لوگ نہ سمجھیں گے تو اسے بیان نہ کرے-

۲۱- اور مرشد کے کلام کو رد نہ کرے اگر چہ حق مرید ہی کی جانب ہو بلکہ اعتقاد کرے کہ شیخ کی خطا میرے صواب سے بہتر ہے-

۲۲- اور کسی دوسرے کا سلام و پیام شیخ سے نہ کہے-

۲۳- جو کچھ اس کا حال ہو برا یا اچھا اسے مرشد سے عرض کرے کیوں کہ مرشد طبیب قلبی ہے اطلاع کے بعد اس کی اصلاح کرے گا-مرشد کے کشف پر اعتماد کر کے سکوت نہ کرے-

۲۴- اس کے پاس بیٹھ کر وظیفہ میں مشغول نہ ہو اگر کچھ پڑھنا ہو تو اس کی نظر سے پوشیدہ بیٹھ کر پڑھے-

۲۵- جو کچھ فیض باطنی اسے پہونچے اسے مرشد کا طفیل سمجھے اگر چہ خواب یا مراقبہ میں دیکھے کہ دوسرے بزرگ سے پہونچا ہے تب بھی یہ جانے کہ مرشد کا کوئی لطیفہ اس بزرگ کی صورت میں ظاہر ہوا ہے-(کذافی ارشاد رحمانی)

عارف رومی علیہ الرحمہ نے فرمایا:

چوں گرفتی پیر ہیں تسلیم شو　　ہمچو موسیٰ زیرِ حکم خضر رو
صبر کن بر کار خضر اے بے نفاق　　تا نگوید خضر رو ھذا فراق

جب تو نے پیر بنالیا تو خبردار اب سر تسلیم خم کر لے-موسیٰ علیہ السلام کی طرح خضر علیہ السلام کے حکم کے ماتحت چل-اے نفاق سے پاک شخص! حضرت خضر علیہ السلام کے کام پر صبر کر تا کہ خضر علیہ السلام یہ نہ فرمادیں کہ جا یہ جدائی ہے-

شیخ عطّار علیہ الرحمہ نے فرمایا:

گر ہوائے ایں سفر داری دلا　　دامن رہبر بگیر وپس بیا
در ارادت باش صادق اے مرید　　تابیابی گنج عرفاں را کلید
دامن رہبر بگیر اے راہ جو　　ہر چہ داری کن نثار راہ او
گر روی صد سال در راہ طلب　　راہبر نہ بود چہ حاصل زاں تعب
بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق　　عمر بگذشت ونہ شد آگاہ عشق

پیر خود را حکم مطلق بہ شناس　　تا براہ فقر گردی حق شناس
ہر چہ فرماید مطیع امر باش　　طوطیائے دیدہ کن ازخاک پاش
آنچہ می گوید سخن تو گوش باش　　تا نگوید او بگو، خاموش باش

۱- اے دل اگر تو اس سفر کی خواہش رکھتا ہے تو کسی راہ نما کا دامن پکڑ اور مطیع ہو جا-

۲- اے مرید! ارادت میں صادق ہو تا کہ تو معرفت کے خزانے کی چابی پائے-

۳- اے راہ طریقت کے متلاشی! کسی راہ نما کا دامن پکڑ، جو کچھ تو رکھتا ہے اس کی راہ میں قربان کر دے-

۴- اگر تو طلب کی راہ میں سو سال تک چلتا رہے، راہ نما اگر نہیں ہے تو اس مشقت کا کیا فائدہ ہے؟

۵- کسی رفیق کے بغیر جو کوئی عشق کے راستے پر چلا اس کی عمر گزر گئی اور وہ عشق سے آگاہ نہ ہوا-

۶- اپنے پیر کو حاکم مطلق سمجھ تا کہ فقیری کی راہ میں تو حق کو پہچاننے والا ہو جائے-

۷- جو کچھ پیر فرمائے اس کے حکم کی اطاعت کرنے والا ہو جا، اس کی خاکِ پا کو آنکھوں کا سُرمہ بنا-

۸- پیر جب بات کرے تو ہمہ تن گوش ہو جا، جب تک وہ نہ کہے کہ بول، تُو چپ رہ-(۱۱)

صوفیائے کرام نے اپنی تالیفات و تصنیفات میں شیخ کے اور بھی بہت سے آداب بیان ہیں جو تفصیل طلب ہیں، راقم الحروف کو مذکورہ حقوق وآداب میں اختصار اور جامعیت کی خوبی محسوس ہوئی اس لیے انہیں کے ذکر پر اکتفا کیا-اللہ تعالیٰ ہم سب کو اتباع شیخ اور ان کے حقوق و آداب کی پاس داری کی توفیق عطا فرمائے آمین-

حوالہ جات

۱- المآئدہ آیت/۳۵-

۲- التفسیر الکبیر للامام فخر الدین الرازی، ج:۶،ص:۱۸۹،مطبوعہ المکتبۃ التوفیقیہ، قاہرہ

۳- تفسیر القرآن العظیم ج:۳،۴-ص:۵۷،مطبوعہ المکتبۃ التوفیقیہ، قاہرہ

۴- التوبہ، پ۱۱، آیت/۱۱۹-

۵- تفسیر القرآن العظیم ج:۳،۴-ص:۱۶۳-مطبوعہ المکتبۃ التوفیقیہ، قاہرہ

٦- التفسیر الکبیر للامام فخر الدین الرازی، ج:۱،۲-ص:۱۸۵-مطبوعہ المکتبۃ التوفیقیہ، قاہرہ
٧- ابن ماجہ شریف
٨- سلوک تہذیب نفس، ابوالفرمان محمد فضل الرحمٰن شاہ قادری، ص:۲۲۹
٩- فتاوی رضویہ مترجم ج:۲٦-مطبوعہ پور بندر، گجرات
١٠- فتاوی رضویہ مترجم ج:۲٦مطبوعہ پور بندر، گجرات
١١- فتاوی رضویہ مترجم ج:۲٦مطبوعہ پور بندر، گجرات

○○○

ضیاء الرحمٰن علیمی

علامہ ابن جوزی — ناقد تصوف یا محدث صوفی؟

نقد اور تنقید کا مقصود ہی یہ ہے کہ اصلاح کی جائے اور تنقید جس سے متعلق ہے اس کے نظام میں بہتری اور حسن وخوبی پیدا کی جائے، تنقید کا مطلب یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ناقد سرے سے اس چیز کو مسترد کر رہا ہے جس سے اس کی تنقید کا تعلق ہے، اس لیے کہ وہ تنقید جو برائے اصلاح نہ ہو بلکہ عیب جوئی یا بالکلیہ کسی چیز کو رد کرنے کی غرض سے ہو وہ درحقیقت اس بات کی مستحق ہی نہیں ہے کہ اسے تنقید کے دائرے میں شامل کیا جائے۔ عرب کا مقولہ ہے: **نقدت الدارهم** یہ اس وقت اہل عرب بولتے ہیں جب کھرے سکے کو کھوٹے سے الگ اور ممتاز کر دیا جائے اور ظاہر ہے کہ کھرے کو کھوٹے سے نمایاں کرنے کا عمل اسی وقت انجام دیا جائے گا جب کہ اس میں کچھ سکے کھرے اور کچھ کھوٹے ہوں اور وہ باہم مل گئے ہوں، یوں ہی یہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ کسی جماعت، تحریک یا نظریے پر تنقید کا مطلب ضروری طور پر یہ نہیں ہوتا کہ ناقد کسی بھی طرح اس جماعت، تحریک یا نظریے سے جڑا نہیں ہوسکتا۔

یوں تو تصوف اس نظام کا حصہ ہے جسے محسن انسانیت پیغمبر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے اور اس کا حدیثی نام ''احسان'' ہے لیکن بعد کے ادوار میں جب فتنوں نے اپنے پاؤں پسارے، وہ جماعت جس نے اسلام وایمان کو حاصل کرنے کے بعد احسان پر توجہ دی، صوفیہ کے نام سے منسوب ہوگئی اور ''احسان'' تصوف کی اصطلاح سے بدل گیا اور اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں کیوں کہ عصر صحابہ میں فقہ کا اطلاق عین شریعت کے علم پر ہوا کرتا تھا لیکن بعد کے ادوار میں اس کا اطلاق اصطلاحی فقہ جس کی تدوین عصر عباسی میں ہوئی اس پر ہونے لگا۔(۱) چنانچہ مرور ایام کے ساتھ تصوف کا آب زلال بھی گدلا ہونے لگا اور پھر ناقدین کی ایک جماعت اٹھی اور انہوں نے تصوف کو اس کے سرچشمے سے جوڑنے اور اس میں در آنے والی کدورتوں کو

صاف کرنے کی کوشش کی۔

ناقدین تصوف کا اگر جائزہ لیا جائے تو ان کے اپروچ (Approach) کے لحاظ سے ان کے دو گروہ سامنے آئیں گے اور دونوں ہی گروہ ہر زمانے میں موجود رہے ہیں۔ پہلا گروہ وہ ہے جو اصطلاح تصوف کو قبول کرتا ہے اور خود بھی صوفیہ اور تصوف کے طریقے پر قائم ہے لیکن اس کے باوجود تصوف میں بنام تصوف در آنے والے غیر اسلامی عناصر پر نظر رکھتا ہے اور نام نہاد صوفیہ اور ان کے تصوف پر تیشۂ تنقید بھی چلاتا ہے، ایسے ناقدین میں امام غزالی، مجدد الف ثانی، اور شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہم اللہ کے نام سرفہرست ہیں۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو اصطلاح تصوف کو تو قبول نہیں کرتا لیکن چند باتوں سے اختلاف رکھنے کے باوجود متقدمین صوفیہ کا احترام کرتا ہے۔ اس گروہ کے سرکردہ افراد میں حافظ ابن جوزی، حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کا نام آتا ہے۔ اِدھر چند صدیوں سے ایک تیسرا گروہ بھی ابھر کر سامنے آیا ہے، یہ وہ گروہ ہے جو نہ اصطلاح تصوف کو قبول کرتا ہے اور نہ صوفیہ متقدمین ہوں یا متاخرین، کا احترام کرتا ہے بلکہ ان کی بارگاہوں میں دریدہ دہن اور بے باک ہے اور خود ان کی زندگی میں بھی حقیقت احسان وتصوف کا کوئی نام ونشان دکھائی نہیں دیتا بلکہ صرف ظاہری اعمال کو انہوں نے عین شریعت کا نام دے رکھا ہے۔ یہ گروہ سرے سے تمام صوفیہ کو گمراہ اور گمراہ گر قرار دیتا ہے، اور اپنے اس موقف کو جائز ٹھہرانے کے لئے ناقدین تصوف کے دوسرے گروہ، ان کی آرا اور ان کی تصنیفات کا سہارا لیتا ہے۔ یہ تیسرا گروہ در حقیقت وہ ہے جو سلفی یا عرف عام میں وہابی کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ابھی گزر چکا کہ علامہ ابن جوزی کا تعلق ناقدین تصوف کے دوسرے گروہ سے ہے۔ ہم اپنے اس مقالے میں اسی بات کا مطالعہ کریں گے کہ کیا واقعی ابن جوزی کا تعلق دوسرے گروہ سے ہے، یوں ہی ہم ان کی تنقید تصوف کی بنیادوں کو سمجھنے کی کوشش کریں گے لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ ان کی زندگی پر مختصر گفتگو کر لی جائے اور اسلام کے لیے ان کی خدمات کا ایک سرسری تعارف پیش کر دیا جائے۔

علامہ ابن جوزی: حیات وخدمات: ابوالفرج جمال الدین عبدالرحمٰن بن علی بن محمد بن علی بن عبیداللہ ابن جوزی قریشی تیمی بکری بغداد میں ۵۰۸ھ اور ایک قول کے مطابق ۵۱۰ھ میں پیدا ہوئے، ابوالحسن علی بن عبدالواحد دینوری متوفی ۵۴۱ھ، ابوالقاسم ابن الحصین ھبۃ اللہ بن محمد بن

عبدالواحد بن احمد عباسی شیبانی بغدادی متوفی ۵۲۵ھ اور ابوعبد اللہ حسین بن محمد بن عبدالوہاب بارع بغدادی متوفی ۵۲۴ھ سے سماع حدیث کیا، ان کے علاوہ ابوبکر محمد بن حسین بن علی بن ابراھیم مرزقی متوفی ۵۲۷ھ اور موھوب بن احمد جوالیقی متوفی ۵۴۰ھ سے علوم وفنون کی تحصیل کی۔(۲) آپ نے اپنے مشائخ میں ستاسی اشخاص کو ذکر کیا ہے حالانکہ ان کے علاوہ اور بھی کئی علما سے آپ نے شاگردی کا شرف حاصل کیا۔(۳)

تاریخ، حدیث، وعظ، علم جدل وکلام میں علامۂ عصر تھے۔ ابن الجزری نے آپ کو شیخ العراق اور امام الآفاق کے لقب سے یاد کیا ہے۔ علامہ موفق الدین ابن نقط بغدادی (متوفی ۶۲۹ھ) آپ کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کان ابن الجوزی لطیف الصوت، حلو الشمائل، رخیم النغمة، موزون الحرکات، لذیذ المفاکهة یحضر مجلسه مائة الف أو یزیدون لا یضیع من زمانه شیئا".

ترجمہ: ابن جوزی لطیف آواز والے، پیاری عادتوں والے تھے، ان کی آواز میں نغمگی اور حرکت واطوار میں وزن تھا، گفتگو پر لطف ہوا کرتی تھی، ان کی مجلسوں میں ایک لاکھ بلکہ اس سے زیادہ لوگ حاضر ہوا کرتے تھے اور اپنا وقت بلا وجہ ضائع نہیں کرتے تھے-(۴)

پوری زندگی وعظ ونصیحت اور لوگوں کی اصلاح میں گزاری، آپ کے ہاتھ پر ایک لاکھ سے زائد لوگوں نے توبہ کی، آپ نوعمری سے ہی تصنیف وتالیف میں مشغول ہوئے اور تاریخ وحدیث، فقہ وطب اور دوسرے علوم وفنون میں بہ کثرت تالیفات یادگار چھوڑیں۔(۵) علامہ ابن جوزی کی اپنی تیار کردہ فہرست کے مطابق ان تالیفات کی تعداد ۲۶۳ تک پہنچتی ہے۔ (۶) امام ذہبی لکھتے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ کسی عالم نے اتنی تصنیفات کیں جتنی کہ ابن جوزی نے۔(۷) آپ کی چند مشہور مطبوعہ تصانیف کے نام یہ ہیں، **المنتظم فی تاریخ الملوک والامم، المدهش فی المواعظ و غرائب الاخبار، صفة الصفوة، مناقب بغداد، مناقب عمر بن عبدالعزیز، الاذکیا واخبارهم، مناقب احمد بن حنبل.**(۸)

ان کے علاوہ ان کی اور بھی بہت سی کتابیں زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں اور مختلف زبانوں میں ان کے ترجمے کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

وعدۂ الٰہی کے مطابق علوم وفنون کا یہ آفتاب ۵۹۷ھ رمضان المبارک کے مقدس مہینے کی

بارہویں تاریخ شبِ جمعہ کو غروب ہوگیا، انتقال کی خبر پھیلتے ہی بغداد میں کہرام مچ گیا، بازار بند ہوگئے، جامع منصورین میں نماز جنازہ ادا کی گئی جو شرکا کی کثرت کی وجہ سے تنگ ہوگئی، یہ بغداد کی تاریخ کا ایک یادگار دن تھا، ہر طرف غم کے آثار اور گریہ کی آوازیں بلند ہوتی تھیں، لوگوں کو آپ سے ایسی محبت تھی کہ رمضان بھر لوگوں نے راتیں آپ کی قبر کے پاس گزاریں اور قرآن کریم کے ختم کیے۔(۹)

علامہ ابن جوزی کا نقد تصوف: علامہ ابن جوزی کی زندگی پر کی گئی گفتگو سے ان کے منارۂ علم کی بلندی کا اندازہ ہو چکا ہے، اب ہمیں اس بات کا پتا لگانا ہے کہ آخر وہ کون سی تحریریں ہیں جن سے ان کے ناقد تصوف ہونے کا قول کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ان کی مشہور تالیف ہے تلبیس ابلیس، جس میں انہوں نے پوری اسلامی سوسائٹی کے خلاف ابلیسی سیاست اور اس کی دسیسہ کاریوں سے متعلق گفتگو کی ہے اور اس کے دسویں باب میں صوفیہ پر شیطانی تلبیس کا مختلف پہلوؤں سے جایزہ لیا ہے۔ اس کے علاوہ صیدالخاطر اور دوسری کتابوں میں بھی صوفیہ سے متعلق تنقیدی پیرا گراف ملتے ہیں، لیکن صوفیہ کی تنقید سے متعلق ان کا اصل سرمایہ تلبیس ابلیس ہے، بقیہ ان کی دوسری تنقیدی تحریریں تلبیس ابلیس ہی کی طرف لوٹتی ہیں۔

تلبیس ابلیس کے دسویں باب کے مطالعے سے چند باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں ۔۱۔ تصوف ابتدا میں زہد کلی کا نام تھا بعد میں تصوف کی جانب منسوب افراد نے رقص وسماع کی اجازت دے دی۔۲۔ مصنف نے حضرت جنید بغدادی اور حضرت رویم سے نقل کیا ہے کہ برے اخلاق سے نکلنے اور اچھے اخلاق میں داخل ہونے کا نام تصوف ہے، نیز یہ کہ ساری مخلوق تو رسوم پرستی میں لگی رہی اور گروہ صوفیہ حقائق کی تلاش میں سرگرداں رہا، سب نے اپنے نفس سے ظاہر شرع کی درستی چاہی لیکن اس نے اپنے نفس سے حقیقت تقویٰ اور مداومت صدق کا مطالبہ کیا اور پھر مصنف نے یہ اقرار کیا ہے کہ اوائل صوفیہ کا یہی حال تھا البتہ بعد میں شیطان نے چند چیزوں میں ان پر تلبیس کی یہاں تک کہ متاخرین پر اس نے پورا غلبہ حاصل کرلیا۔۳۔ مصنف یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ متقدمین صوفیہ کتاب وسنت پر اعتماد کیا کرتے تھے، بعد میں کم علمی کے سبب شیطان نے انہیں دام فریب میں گرفتار کرلیا۔۴۔ مصنف نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ بعض مشائخ سے جو غلطیاں صادر ہوئی ہیں اگر واقعی صحیح ہیں تو ہم ان کا رد کریں گے ورنہ ہم ایسے

قول سے دور رہنے کی تاکید کرتے ہیں، باقی رہے وہ لوگ جو صوفیہ میں سے نہیں ہیں بلکہ ان کے ساتھ مشابہت کرتے ہیں تو ان کی غلطیاں بکثرت ہیں۔۵۔ اخیر میں وہ یہ بھی واضح کر دیتے ہیں کہ ہمارا مقصود صرف شریعت مطہرہ کو پاک کرنا اور اس کی خاطر لوگوں کو غیرت دلانا اور علمی امانت ادا کرنا ہے۔ آگے وہ مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اطاعت صرف احکام شریعت کی ہوتی ہے لوگوں کی نہیں، بسا اوقات اولیاء اللہ سے نسیان ہوتا ہے، ان سے غلطیاں صادر ہوتی ہیں اور ان کی ان لغزشوں کو ظاہر کرنا ان کے مرتبے کا انکار نہیں۔(۱۰)

تنقید تصوف وصوفیہ کی بنیادیں: ان اعترافات کے بعد چند سرخیوں کے تحت انہوں نے صوفیہ کی کمیوں کو بیان کیا ہے اور قرآن واحادیث کی روشنی میں ان کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ صوفیہ کے استدلال کو ذکر کیا ہے اور پھر اپنی تنقید باوزن انداز میں لکھنے کی کوشش کی ہے، جن باتوں کی وجہ سے انہوں نے صوفیہ پر تنقید کی ہے ان کو نکات کی شکل میں ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں:

(۱) صوفیہ کی بداعتقادی (۲) طہارت کے باب میں صوفیہ پر تلبیس ابلیس، (۳) نماز میں صوفیہ پر تلبیس ابلیس (۴) جائے سکونت کے باب میں صوفیہ پر تلبیس ابلیس (۵) مال کو چھوڑ دینے اور اس سے علیحدہ رہنے کے سلسلے میں تلبیس ابلیس (۶) لباس کے بارے میں صوفیہ پر تلبیس ابلیس (۷) کھانے پینے کے بارے میں صوفیہ پر تلبیس ابلیس (۸) سماع اور رقص کے سلسلے میں صوفیہ پر تلبیس ابلیس (۹) وجد میں صوفیہ پر تلبیس ابلیس (۱۰) نوجوانوں کی صحبت کے سلسلے میں صوفیہ پر تلبیس ابلیس (۱۱) توکل میں اور مال واسباب جمع نہ کرنے میں صوفیہ پر تلبیس ابلیس (۱۲) ترک علاج میں صوفیہ پر تلبیس ابلیس (۱۳) ترک نکاح میں صوفیہ پر تلبیس ابلیس (۱۴) سفر وسیاحت کے سلسلے میں صوفیہ پر تلبیس ابلیس (۱۵) بغیر زاد سفر ویرانوں میں جانے کے سلسلے میں صوفیہ پر تلبیس ابلیس (۱۶) بعض وہ امور جو صوفیہ سے سفر میں خلاف شریعت سرزد ہوئے (۱۷) سفر سے واپسی کے سلسلے میں صوفیہ پر تلبیس ابلیس، (۱۸) کسی کی موت کے سلسلے میں صوفیہ پر تلبیس ابلیس (۱۹) تحصیل علم نہ کرنے کے سلسلے میں صوفیہ پر تلبیس ابلیس (۲۰) علم کی کتابیں دفن کرنے اور انہیں دریا میں بہا دینے کی نسبت صوفیہ پر تلبیس ابلیس (۲۱) علم میں مشغول رہنے والوں پر صوفیہ کا اعتراض (۲۲) صوفیہ کی علمی مسائل میں گفتگو (۲۳) شطحات صوفیہ اور ان کے دعوے (۲۴) صوفیہ کے بعض قبیح افعال۔(۱۱)

تنقید تصوف کا جائزہ: یہ وہ کل ۲۴ نکات ہیں جن کی بنا پر انہوں نے صوفیہ کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے، علامہ ابن جوزی نے صوفیہ پر تنقید کرتے وقت عموماً یا تو صوفیہ کے مستدلات کی روایت کی صحت سے انکار کیا ہے یا پھر ان کی استدلالی کوششوں کو "تخلیط" قرار دیا ہے اور اگر روایت کی صحت کا انکار، کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا تو تاویل کی کوشش کی ہے- صوفیہ نے اپنے نظریات اور اعمال ورسوم کے دفاع میں جو کچھ کہا ہے یا وہ اعمال جو بظاہر برے معلوم ہوتے ان کا کوئی صحیح معنی ومطلب نکالنے کی جو کوشش کی ہے ان سب کو انہوں نے یک لخت جادۂ نبوت سے خارج قرار دیا ہے۔ اگر علامہ ابن جوزی کی تنقیدی بنیادوں کا جائزہ لیا جائے تو پتا چلے گا کہ صوفیہ پر ان کی تنقید یا تو غلط فہمی پر مبنی ہے اور تصوف وصوفیہ کی اصل حقیقت ہی ان پر واضح نہیں ہے یا پھر ان کو ان بعض اصطلاحات سے اختلاف ہے جن کا عصر نبوی میں کوئی وجود نہیں تھا، البتہ ان کی اصل موجود تھی۔ یا پھر انہوں نے احادیث سے ثابت شدہ صوفیہ کے بعض اعمال کا انکار صرف اس لیے کیا ہے کہ اس پر صوفیہ عمل پیرا ہیں جب کہ دوسرے مقام پر انہی چیزوں کی وہ تعریف وتوصیف کرتے نظر آتے ہیں۔

حاصل یہ کہ علامہ ابن جوزی کی تنقید کا دائرہ چند بیانات کے گرد گھومتا ہے۔ (۱) روایت درست نہیں ہے اور صوفیہ موضوع روایتوں سے استدلال کرتے ہیں۔ (۲) اس روایت کا مطلب یہ نہیں ہے، بلکہ یہ ہے۔ (۳) یہ طریقہ یا یہ معنی جادۂ نبوت سے خارج ہے۔ جہاں تک ضعیف وموضوع روایتوں سے استدلال کی بات ہے تو حکم ضعف ووضع لگانے میں ان کے یہاں اعتدال کے فقدان سے قطع نظر خود ان کی حالت یہ ہے کہ وعظ اور دوسرے اس قسم کے موضوعات پر مشتمل ان کی کتابیں ضعیف وموضوع روایات سے پر ہیں۔ (۱۲)

ماسبق میں لکھا جا چکا ہے کہ ان کے عمومی اعتراضات کی نوعیت غلط فہمی ہے کیوں کہ ان کے بعض اعتراضات ایسے ہیں جن سے جماعت صوفیہ بالکلیہ بری ہے ۔ مثلا حلولی ہونے کا الزام، تنہائی اور گوشہ نشینی کے لیے ترک جمعہ کا الزام، ترک نکاح اور ترک طلب اولاد کا الزام اور نوجوانوں کی صحبت میں رہنے کا الزام وغیرہ، اور بعض اعتراضات اس بنا پر کیے گئے ہیں کہ وہ صوفیہ کی مراد اور گفتگو کی حیثیت کو نہیں سمجھ سکے ہیں اور محض غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں مثلا طہارت کے لیے صوفیہ کا پانی زیادہ استعمال کرنا، مال سے دور رہنا اور اس سے دور رہنے کی تاکید کرنا، کھردرے لباس پہننا

وغیرہ، یہ اور اس جیسے دوسرے مسائل ایسے ہیں جس میں دونوں فریق دو الگ الگ حیثیتوں سے حق پرست اور دونوں کی بات اپنی جگہ پر درست ہے لیکن علامہ ابن جوزی کی گفتگو سے ایسا لگتا ہے کہ صوفیہ اس دوسری حیثیت کے منکر ہیں جس کے وہ قائل ہیں حالانکہ ایسا نہیں، یہاں بھی علامہ ابن جوزی محض غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں اور بعض اعتراضات کا تعلق اختلافی مسائل سے ہے مثلا سماع، رقص ووجد وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ سماع کی حلت وحرمت پر متقدمین سے لے کر آج تک بحث جاری ہے یوں ہی رقص ووجد اضطراری کیفیتوں کا نام ہے اور اس کے مذموم ومحمود ہونے کا دار و مدار صدق احوال پر ہے اگر بندہ صادق الحال ہے تو محمود ہوگا ورنہ مذموم لیکن مشکل یہ ہے کہ اس پر یقینی اطلاع ممکن نہیں، محض شواہد وقرائن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اور ایسا بھی نہیں ہے کہ رقص ووجد کے محمود ومذموم ہونے کے سلسلے میں صوفیہ نے ان تفصیلات کا لحاظ نہیں رکھا ہے بلکہ صوفیہ نے اپنی کتابوں میں اس معاملے کے ہر پہلو پر گفتگو کی ہے لیکن اس کے باوجود علامہ ابن جوزی یہاں بھی صوفیہ کے تعلق سے بدگمانی کا شکار ہیں اور وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ رقص ووجد کے سلسلے میں صوفیہ ان تفصیلات کے قائل ہیں اور نہ وہ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں کہ صوفیہ کے یہاں بھی صادق الاحوال ہوسکتے ہیں۔ جب کہ دوسری طرف وہ غنا اور رقص ووجد کے جواز واستحسان کے سلسلے میں امام احمد بن حنبل اور دوسرے ائمہ اعلام سے منقول روایتوں کو اولاتو مسترد کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب رد کردینے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے تو وہ ان کے سماع کو زہد پر ابھارنے والے اشعار، اور رقص ووجد کو صدق احوال پر محمول کرتے ہیں ۔(۱۳) لیکن اسی وسعت قلبی کا مظاہرہ وہ صوفیہ کے لیے نہیں کرتے ہیں اور جہاں تک صوفیہ کی استدلالی کوششوں کو تخلیط قرار دینے کی بات ہے تو حقیقت یہ ہے کہ صوفیہ کے دلائل کی تردید میں خود ان سے تخلیط واشتباہ واقع ہوا ہے(۱۴) اور شطحات کے سلسلے میں صوفیہ کا علمی موقف یہی ہے کہ وہ قابل تقلید نہیں ہیں البتہ وہ ناقدین کی طرح شطحات کی بنا پر سب وشتم نہیں کرتے بلکہ تاویل کرتے ہیں اور جن سے یہ باتیں صادر ہوتی ہیں انہیں معذور جان کر ان کی عیب پوشی کرتے ہیں اور حسن ظن رکھنے کی کوشش کرتے ہیں جو کہ شرعا مطلوب ہے اور جہاں تک جادہ سے منحرف ہونے اور اعتدال پر نہ ہونے کی بات ہے تو اس مقام پر بھی دراصل علامہ ابن جوزی غلط فہمی کے دام میں گرفتار ہیں۔

اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی شدید سردی کے موسم میں آگ کے انتہائی قریب بیٹھا ہو

اب کوئی دوسرا انسان جو اس کیفیت سے دوچار نہیں ہے اس تصویر کو جب بھی دیکھے گا تو اسے اعتدال سے ہٹا ہوا قرار دے گا اور آگ سے اس انسان کی انتہائی قربت کو ''انحراف عن الجادۃ'' کہے گا لیکن کیا واقعتاً ایسا ہی ہے کہ وہ انسان جو شدید سردی کے موسم میں آگ کے انتہائی قریب بیٹھا ہے وہ اعتدال پر نہیں ہے؟ یا پھر یہ دیکھنے والے کا محض فریب اور اس کے گردوپیش سے ناواقفیت کی دلیل ہے؟ (۱۵) اور جہاں تک عدم اعتدال کی بات ہے تو ہر جماعت عدم اعتدال کا شکار ہے، فقہائے ظاہر صرف ظاہری مسائل پر زور دیتے ہیں، اہل حدیث صرف ظواہر حدیث کو دین سمجھ بیٹھے ہیں، اصحاب ثروت نے صرف ذخیرہ اندوزی کو سرمایہ آخرت سمجھ رکھا ہے، ایسے میں صوفیہ احوال قلب کی درستی، دنیا سے یک گونہ بیزاری اور صرف آخرت پر نظر کو اصل مقصود قرار دے رہے ہیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ جبکہ حقیقت یہ بھی ہے کہ صوفیہ جس طرح باطن شریعت پر سختی سے عامل اور اس کی دعوت دینے والے ہیں یوں ہی وہ ظاہر شریعت کے مکمل پابند اور اس کی پابندی کی طرف بلانے والے ہیں وہ نہ دنیا سے محبت کی دعوت دیتے ہیں اور نہ دنیا بیزاری کی بلکہ وہ ہر عمل میں نیت کی درستی پر ابھارنے والے ہیں، وہ اس اعتدال کے داعی ہیں جس کی حدیث میں صراحت کی گئی ہے کہ تم اپنی دنیا ایسے تلاش کرو گویا تم ہمیشہ کے لیے یہاں رہنے والے ہو اور آخرت کی تیاری میں اس طرح مسلسل لگے رہو گویا تم اگلے ہی دن موت سے آملو گے، ان کی نظر میں ہمیشہ وہ حدیث رہتی ہے جس میں فرمایا گیا کہ دنیا تمہارے نفع کے لیے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لیے، البتہ صوفیہ نبی کریم ﷺ کے حقیقی وارث ہیں، نیابت کا کام سند متصل کے ساتھ انجام دے رہے ہیں اس لیے وہ طالبین وسالکین کو ان کے احوال کے لحاظ سے رہنمائی فرماتے ہیں، کوئی اگر دنیا بیزار ہوتا ہے تو اسے دنیا سے حدود شرع میں نفع اٹھانے کی ترغیب دیتے ہیں اور اگر کوئی دنیا کی آلائشوں میں ڈوبا نظر آتا ہے تو اسی شدت کے ساتھ اس سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں، آج چوں کہ طالب دنیا کی کثرت ہے اور صوفیہ کی بارگاہوں میں حاضر ہونے والے عموماً دنیا کی گندگیوں میں سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوتے ہیں، اس لیے صوفیہ اسی شدت کے ساتھ اس سے باز رہنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اب ایک دوسرا شخص جو ان احوال سے واقف نہیں ہے صوفیہ پر دنیا بیزاری کا الزام لگاتا ہے اور ان پر خود غرض جماعت ہونے کا الزام عائد کرتا ہے کہ انہیں صرف اپنی نجات کی فکر ہوتی ہے، حالاں کہ صوفیہ سب سے زیادہ مخلوق کی نجات کی فکر کرنے والے ہوتے ہیں، دنیا اور دنیاوی چیزوں

سے متعلق صوفیہ کے غیر معتدل سمجھے جانے والے سارے اقوال کو مذکورہ احوال کے سیاق میں ہی سمجھا جانا چاہیے ورنہ ویسی ہی غلط فہمی پیدا ہوگی جیسا کہ علامہ ابن جوزی کو ہوئی۔

موجودہ دور کے ناقدین تصوف سے دو باتیں: تعجب تو عدم تقلید کے ان دعوے داروں پر ہے جو مسائل میں بھی متقدمین کے بجائے متاخرین کی تقلید کرتے ہیں اور کسی نظریے یا کسی تحریک پر تنقید بھی تقلیدی طور پر کرتے ہیں۔ حالانکہ تنقیدی عمل کا تقلید سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔ موجودہ دور کے سلفی ناقدین تصوف صدیاں گزرنے کے باوجود تصوف اور صوفیہ کی کوئی اور دوسری خامی نہ پیش کر سکے جسے علامہ ابن جوزی، شیخ ابن تیمیہ وغیرہ نے نہ پیش کی ہو، اب ان حضرات سے چوں کہ غلط فہمیاں ہوئیں اور ان عصر حاضر کے ناقدین نے تقلیدی طور پر تصوف اور صوفیہ پر تنقید کی، اس لیے انہیں اب تک حق کا عرفان حاصل نہیں ہو سکا، اگر انہوں نے واقعی تنقیدی عمل کو اخلاص وانصاف کے ساتھ انجام دیا ہوتا تو انہیں بھی سچائی مل جاتی اور جماعت صوفیہ میں در آنے والی خرابیوں کی بھی اصلاح ہو جاتی، جیسا کہ امام غزالی کے ساتھ پیش آیا کہ وہ اجالوں کے سفیر بھی بنے اور مصلح تصوف بھی شمار کیے گئے۔ اگر موجودہ دور کے ناقدین علامہ ابن جوزی کی طرح صرف کمیوں کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتے، نیت بھی درست رکھتے اور حق پرست و ناحق پرست صوفیہ کے مابین فرق قائم کرتے تو بات کسی حد تک قابل قبول تھی، انہوں نے تو تصوف کو بالکلیہ مسترد کر دیا اور سب وشتم پر بھی اتر آئے اور علامہ ابن جوزی جیسی شخصیتوں کو اپنے لیے ڈھال کے طور پر استعمال کرنے لگے حالانکہ اگر یہ بات درست ہے کہ غیر معصوم کی ہر بات قابل قبول نہیں تو پھر تنقید تصوف کے معاملے میں علامہ ابن جوزی کی تقلید کیوں؟ اور یہاں ''خذ ما صفا ودع ما کدر'' کا اصول کیوں جاری نہیں کیا جاتا اور خود ابن جوزی کی تنقیدات کا تنقیدی مطالعہ کیوں نہیں کیا جاتا؟ دوسری بات یہ ہے اگر علامہ ابن جوزی کی تنقیدیں ان کو اتنی ہی پیاری اور ان کے نزدیک اتنی ہی "معصوم" ہیں تو پھر ان کے ان ریمارکس کو کیوں سینے سے نہیں لگایا جاتا جن کا تعلق سلفیت سے ہے۔ کیوں کہ صید الخاطر میں "سلفیون جہال" کے نام سے مستقل تنقیدی پیراگراف موجود ہے۔ (۱۶) یوں ہی تلبیس ابلیس کے مشمولات اگر اتنے ہی ناقابل تردید ہیں تو کیا ہم یہ مان لیں کہ علامہ ابن جوزی جہاں مخالف تصوف وصوفیہ تھے وہیں فقہ وحدیث اور علم قرأت کے حاملین، والیان سلطنت اور اصحاب زہد وورع کے بھی خلاف تھے؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی اسے تسلیم

کرنے کو تیار نہیں ہوگا، بلکہ ہر بالغ نظر حقیقت پسند تقابلی مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے گا کہ علامہ ابن جوزی اہل سنت کے کسی طبقے کے مخالف نہیں بلکہ محض مصلح اور ہمدرد ہیں، ان کی نظر میں جو باتیں غلط نظر آئیں، چاہے ان کا تعلق اسلامی معاشرہ کے کسی طبقے سے ہو، انہوں نے اصلاح کی کوشش کی، صوفیہ پر ان کی تنقیدات کے مطالعہ سے لب لباب کے طور یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان کی تنقیدوں کا تعلق جاہل صوفیہ یا متصوفین، اور صوفیۃ الرسوم سے ہے اور جہاں تک صوفیۃ الحقائق کی بات ہے تو وہ ان کی عظمتوں کے معترف ہیں اور جاہل صوفیہ کے خلاف اہل حق صوفیہ اور ان کے متبعین ہمیشہ معرکہ آرا رہے ہیں، البتہ لوگوں کی طبیعتوں کے لحاظ سے معرکہ آرائی کا انداز مختلف رہا ہے۔ البتہ یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ علامہ ابن جوزی بھی انسان تھے اور معصوم نہیں تھے اس لیے ان کی تنقیدات کا بھی جائزہ لیا جائے گا اور جو بات درست ہوگی اسے ہی قبول کیا جائے گا اور جو نادرست ہوگی اسے مسترد کر دیا جائے گا۔ یہ سب اللہ کی راہ میں کوشش کرنے والے ہیں، جہاں انہیں درستی نصیب ہوئی اس پر رب تعالیٰ کی جانب سے دوہرے اجر کے مستحق ہیں اور جہاں انہوں نے ٹھوکر کھائی وہاں بھی ایک اجر کے حق دار ہیں اور ان سب کا دار و مدار نیت پر ہوگا۔ اور جہاں تک صوفیۃ الحقائق کا معاملہ ہے تو خود علامہ ابن جوزی اس کے معترف ہیں کہ متقدمین صوفیہ کے یہاں اعتماد کتاب وسنت پر ہوا کرتا تھا، البتہ متاخرین میں خرابیاں در آئیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ افراد کے فساد سے نظریے کا فساد لازم نہیں آتا بلکہ زیادہ سے زیادہ عمل کی خرابی کا دعوی کیا جا سکتا ہے، اور عمل کی خرابی سے کوئی جماعت اور طبقہ مستثنی نہیں ہے، حقیقی صوفیہ آج بھی مشکاۃ نبوت سے سب سے زیادہ روشنی حاصل کرنے والے، اللہ کی راہ میں کوشش کرنے والے، قرآن وسنت کے سب زیادہ حریص اور اسلام، ایمان واحسان کو سب سے زیادہ جمع کرنے والے ہیں، ان کا عقیدہ اہل سنت کا عقیدہ ہے اور وہ اپنے ہر عمل کو میزان شریعت میں سب سے زیادہ تولنے والے اور قرآن و سنت کے خلاف ہر چیز کو سب سے زیادہ مسترد کرنے والے ہیں۔(۱۷) ہاں دوسری جماعتوں کی طرح ان میں بھی اچھے برے لوگ ہیں ان میں فرق و امتیاز کیا جانا چاہئے یوں ہی صوفیہ کا تعلق بھی انسانی جماعت سے ہے، ان سے بھی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، اب جس طرح برائیوں کی بنا پر اور غلطیاں سرزد ہونے کی بنا پر دوسری جماعتوں کو متہم نہیں کیا جاتا، اسی طرح صوفیہ کو بھی طعن وتشنیع کا نشانہ بنانے کے بجائے ان کے ساتھ انصاف سے کام

لیا جانا چاہیے۔

تصویر کا دوسرا رخ: یہاں تک علامہ ابن جوزی کی تنقید صوفیہ وتصوف اور اس سے متعلق گوشوں پر گفتگو کی گئی، اب علامہ ابن جوزی کے تعلق سے تصویر کا دوسرا رخ پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اعتبار الفاظ واصطلاحات کا نہیں ہوتا بلکہ ان کے مدلولات کا ہوا کرتا ہے، چنانچہ اس زاویے سے دیکھا جائے تو علامہ ابن جوزی کی زندگی کے واقعات اور خود ان کی تحریریں ایک ایسے شخص کے قلم سے نکلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں جو بظاہر تو ناقد تصوف ہے لیکن بباطن حقیقت تصوف کی عملی تصویر۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے علامہ ابن جوزی کی ان تحریروں کی جانب اشارہ کیا جائے گا جس میں وہ ایک خالص صوفی نظر آتے ہیں، ثانیا ان باتوں کو پیش کیا جائے جو صوفیانہ خصوصیتوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ پھر ان کے عملی منہج سے ان کے صوفی انداز فکر بتلایا جائے گا اور ثالثا مورخین کے حوالے سے ان کی مجالس وعظ کو پیش کیا جائے جس سے آفتاب نیم روز کی طرح واضح ہو جائے گا کہ علامہ ابن جوزی کی مجلس ایک عام انسان کی مجلس نہیں ہوا کرتی تھی بلکہ ایک صاحب حال صوفی کی مجلس ہوا کرتی تھی۔ لیکن اس سے قبل کہ ان کی زندگی سے احوال تصوف کے نمونے پیش کیے جائیں، ضروری ہے کہ صوفی کسے کہتے ہیں اور طریقہ تصوف کیا ہے اس کی وضاحت کردی جائے تاکہ علامہ ابن جوزی کی زندگی سے پیش کیے جانے والے نمونوں کو ان تعریفات کی روشنی میں پرکھا جا سکے۔

صوفی کون ہے؟

صوفی کی تعریف کرتے ہوئے شیخ ابن عجیبہ فرماتے ہیں: "سہل تستری نے فرمایا:

الصوفی صفا من الکدر و امتلأ من الفکر و انقطع الی اللہ عن البشر و استوی عندہ الذھب و المدر"

ترجمہ: صوفی وہ ہے جو کدورت وآلائش سے دور ہو اور فکر آخرت سے پر ہو اور لوگوں سے کٹ کر اللہ کی طرف متوجہ ہو گیا ہو اور اس کے نزدیک سونا اور مٹی کا ڈھیلا برابر ہو گیا ہو (یعنی اپنے مولیٰ کے علاوہ اسے کسی چیز کی رغبت نہ ہو)۔(۱۸)

امام محی الدین نووی (متوفی ۶۷۶ھ) اپنے رسالہ "**المقاصد السبعۃ فی اصول طریق**

التصوف“ میں فرماتے ہیں:

”راہ تصوف کے اصول پانچ ہیں: ظاہر وباطن میں اللہ کا تقوی اختیار کرنا۔ اقوال وافعال میں سنت کی پیروی کرنا، عروج واقبال اور پستی اور ادبار میں مخلوق سے اعراض کرنا۔(۱۹)

صوفی اور طریقہ تصوف کی اس توضیح کو ذہن نشیں کر کے علامہ ابن جوزی کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے اور فیصلہ کیا جائے کہ وہ صوفی اور تصوف کے مدلول کے لحاظ سے صوفی تھے یا نہیں۔

صیدالخاطر میں تصوف کے نمونے: کسی بھی انسان کی ڈائری اس کی حقیقی زندگی کی بہترین عکاس ہوتی ہے۔ علامہ ابن جوزی کی ایک ایسی ہی تصنیف ہے صیدالخاطر۔ یہ تصنیف کیا ہے ایک کشکول ہے جس میں مصنف نے اپنے قلبی واردات، بے تکلف خیالات واظہارات، زندگی کے مختلف تجربات، بکھرے افکار اور روز مرہ کی زندگی میں پیش آمدہ مسائل وحوادث کو اس طرح سمودیا ہے کہ پوری کتاب پڑھ جائیے کہیں بھی آورد کا شائبہ نہیں ہوگا بلکہ صرف آمد ہی آمد نظر آئے گا۔ اور قاری اس کتاب کے مطالعے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے گا، اس کتاب میں جابجا نفس سے مکالمے ملیں گے۔ سوال وجواب ہوگا، ذہنی کشمکش کی داستان ہوگی، اور معاشرتی مسائل پر کبھی اشاراتی اور کبھی تفصیلی گفتگو ملے گی، اس کتاب کے مطالعے سے علامہ ابن جوزی کا پورا پیکر تراشا جاسکتا ہے۔ کہیں وہ ناقد تصوف نظر آئیں گے اور کہیں ”ناقد سلفیت“، کہیں وہ محدثین کی کمیاں دکھارہے ہوں گے تو کہیں فقہا کی کمزوریاں بیان کرتے نظر آئیں گے، اور کہیں ایک ایسا عاجز ومتواضع انسان نظر آئے گا جو صرف تعلق باللہ کی تلاش میں ہے جو عزلت نشینی چاہتا ہے، جو دنیا سے متنفر ہے، جو بادشاہوں اور والیان سلطنت سے دوری بنائے رکھنا چاہتا ہے، جو ان ساری خوبیوں اور اعلیٰ صفات واحوال سے آراستہ ہے جن سے مشائخ صوفیہ آراستہ ہوا کرتے ہیں اور جو سلوک وتصوف کی ان منزلوں پر ہے جہاں اکابر صوفیہ فائز ہوا کرتے ہیں۔

اس کتاب کی فہرست اٹھا کر دیکھی جائے تو تین سو سے زائد عناوین کے تحت ان کے مختلف افکار وخیالات ملیں گے جن میں اکثریت ان کی ہوگی جن کا تعلق تصوف اور صوفیانہ احوال وصفات سے ہے۔ ہم ذیل میں صرف چند عناوین کو ذکر کریں گے جس سے ان کے عملی اور فکری تصوف کا اندازہ لگانا آسان ہوگا، وہ عناوین جن سے رنگِ تصوف جھلکتا ہے کچھ اس طرح ہیں:

(۱) **روابط النفس بالدنیا** (دنیا سے نفس کے رابطے)(۲۰)(۲) **موت القلوب**

(دلوں کی موت)(۲۱)(۳)**علماء الدنیا وعلماء الآخرة** (علمائے دنیا اور علمائے آخرت)(۲۲)(۴)**التسليم للحكمة العليا** (حکمت عالی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا)(۲۳)(۵)**التبتل الى الله** (دنیا سے کٹ کر صرف اللہ کا ہوجانا)(۲۴)(۶)**فلسفة الصبر والرضا** (صبر ورضا کا فلسفہ)(۲۵)(۷)**دعاء المنكسرين** (منکسرین کی دعا)(۲۶)(۸)**السبب لا ينبغي ان يذهل عن الله** (سبب اللہ سے غافل نہ کرے)(۲۷)(۹)**جهاد الهوى** (خواہش نفس سے جہاد) (۲۸)(۱۰)**سعادة العارفين** (عارفین کی سعادت)(۲۹)(۱۱)**دمعة التائب تطفئى نار الغضب** (تائب کے آنسو غضب الٰہی کو بجھا دیتے ہیں)(۳۰)(۱۲)**تقوى الله على كل حال** (ہر حال میں اللہ سے ڈر)(۳۱)(۱۳)**غلبة الشهوة** (غلبہ شہوت)(۳۲)(۱۴)**العلم النظرى لا يكفى** (علم نظری کافی نہیں)(۳۳)(۱۵)**العزلة النافعة** (نفع بخش عزلت)(۳۴)(۱۶)**الاخلاص التام** (کامل اخلاص)(۳۵)(۱۷)**الحياة مدرسة تخرج للآخرة** (زندگی ایک مدرسہ ہے جہاں آخرت کی تیاری کرائی جاتی ہے)(۳۶)(۱۸)**علماء القشور وعلماء اللباب** (ظاہر پرست اور حقیقت پرست علما)(۳۷)(۱۹)**النفس طامعة اذا اطمعتها** (نفس کو جتنی امید دلاؤ گے اتنی ہی امید باندھے گا)(۳۸)(۲۰)**الوحدة خير من جليس السوء** (برے ہم نشین سے تنہائی بہتر ہے)(۳۹)(۲۱)**آثار الذنوب طويلة المدى** (گناہ کا اثر دیر تک رہتا ہے)(۴۰)(۲۲)**لا استقرار فى الدنيا** (دنیا میں ثبات نہیں)(۴۱)(۲۳)**التسبيح والاستغفار على الحقيقة** (حقیقت میں تسبیح واستغفار)(۴۲)(۲۴)**العزلة دواء** (گوشہ نشینی علاج ہے)(۴۳)(۲۵)**المحافظة على صفاء القلب** (صفائی قلب کی پابندی)(۴۴)(۲۶)**الاستعداد للرحيل** (کوچ کی تیاری)(۴۵)(۲۷)**مخالطة المحجوبين عن الله عشاوة** (غافلین کی صحبت اندھا پن ہے)(۴۶)(۲۸)**حقيقة الحسد** (حسد کی حقیقت)(۴۷) (۲۹)**يوم العيد ويوم القيامة** (یوم عید اور یوم قیامت)(۴۸)(۳۰)**نماذج للعبرة** (عبرت کے نمونے)(۴۹)(۳۱)**اللذات المعنوية** (معنوی لذتیں)(۵۰)

اب تک ہم نے صرف عناوین کے نمونے کو ملاحظ کیا ہے اب ان کی کتاب صیدالخاطر سے ہی چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جن سے ان کے فکری میلان اور طبعی رجحان کا اندازہ ہوجائے گا۔

علماء الدنیا وعلماء الآخرة کے عنوان سے گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”میں نے علما کے باہمی بغض وحسد کے اسباب پر غور کیا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی وجہ دنیا کی محبت ہے، اس لیے کہ آخرت کو نگاہ میں رکھنے والے علما باہم الفت ومحبت رکھتے ہیں نہ کہ بغض وحسد، جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جو انہیں دیا گیا ہے اس کی ضرورت اپنے اندر محسوس نہیں کرتے۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اور جو لوگ ان کے بعد آئے وہ عرض کرتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ایمان کے ساتھ گزر گئے بخش دے اور ایمان والوں کے تعلق سے ہمارے دلوں میں کینہ مت ڈال۔

حضرت ابو درداء ہر رات اپنے دوستوں کے لیے دعا کیا کرتے تھے۔ حضرت امام احمد بن حنبل نے حضرت امام شافعی کے لڑکے سے فرمایا: تمہارے والد ان چھ لوگوں میں سے ہیں جن کے حق میں ہر صبح صادق کے وقت میں دعا کرتا ہوں۔

دونوں گروہوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ دنیا کو محبوب رکھنے والے علما دنیا کی سرداری چاہتے ہیں اور زیادہ مال ودولت اور تعریف وتوصیف کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ جب کہ آخرت سے محبت رکھنے والے علما دنیا سے، مال ودولت سے اور تعریف وتوصیف سے بھاگتے ہیں اور اسے دوسروں کے لیے چھوڑ دیتے ہیں یہ ان باتوں سے بہت ڈرتے ہیں اور جو اس کی آزمائش میں پڑتے ہیں اس کے لیے دعائے رحمت کیا کرتے ہیں۔ حضرت امام نخعی ستون سے ٹیک نہیں لگاتے تھے۔ یہ لوگ فتووں سے دور بھاگتے تھے، گم نامی کو پسند کرتے تھے۔ ان کی مثال ان لوگوں کی ہے جو سمندری سفر پر ہوں اور سمندر میں زبردست موجیں بلند ہو رہی ہوں تو انہیں صرف اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ کیسے وہ کامیابی کے ساتھ اپنا سفر پورا کریں گے، یہاں تک کہ انہیں کامیابی کا یقین ہو جائے، ان میں کا ہر ایک دوسرے کے لیے دعا کرتا ہے اور باہم استفادہ کرتا ہے، اس لیے کہ وہ سب ایک سواری میں بیٹھے مسافر ہیں جو آپس میں محبت والفت سے کام لیتے ہیں۔ گویا یہ روز وشب ان کے لیے سفر جنت کی راہ میں منزلوں کی مانند ہیں۔(۵۱)

اضاعۃ الوقت کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

میں نے عام طور سے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ عجیب وغریب انداز سے اپنی زندگی کے اوقات گزار رہے ہیں، اگر رات لمبی ہو تو بے سود باتوں میں گزرتی ہے یا پھر ایسی کتاب پڑھتے ہوئے گزرتی ہے جس میں جنگ وجدال کی باتیں یا قصے کہانیاں ہوتی ہیں۔ اور اگر لمبا دن ہو تو

سوتے ہوئے گزارتے ہیں۔ یہ لوگ صبح وشام کے وقت یا تو دجلہ کے کنارے ہوتے ہیں یا پھر بازاروں میں، میرے نزدیک یہ لوگ کشتی میں بیٹھے ان لوگوں کی طرح ہیں جو گفتگو میں مشغول ہیں، کشتی انہیں آگے لیے جا رہی ہے لیکن انہیں خبر نہیں۔ بہت کم لوگ ہی اپنے وجود کی اہمیت سمجھتے ہیں اور زاد سفر کی اور کوچ کرنے کی تیاری میں لگے رہتے ہیں۔ البتہ ان میں بھی باہم فرق ہوتا ہے، اور یہ فرق اس علم کی کمی اور زیادتی کی بنا پر ہوتا ہے کہ اسے اس شہر اقامت میں کیا خرچ کرنا چاہیے۔ ہوشیار لوگ وہاں رائج چیزوں کی خبروں پر نظر رکھتے ہیں ان کا ذخیرہ کر کے زیادہ نفع کماتے ہیں۔ اور بے خبر لوگ جو مل جائے وہ لاد لیتے ہیں اور بسا اوقات بغیر کسی محافظ کے ہی نکل پڑتے ہیں۔ بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو راستے میں ہی لوٹ لیا جاتا تو وہ خالی ہاتھ ہی رہ جاتے ہیں۔ زندگی کے موسم بہار میں اللہ سے ڈرو اور وقت نکلنے سے پہلے جلدی کرو۔ علم سے استشہاد کرو۔ حکمت سے استدلال کرو اور زمانے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ لوگوں سے مکالمے کرو اور زاد سفر لے لو، اس لیے کہ حدی خواں جب حدی خوانی کر چکے گا تو حسرت ویاس کے باوجود اس کی پُر تاثیر آواز کی تاثیر سمجھ میں نہیں آئے گی۔(۵۲)

العزلۃ دواء کے تحت گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

عبادت گزاری زہد اور آخرت سے تعلق قائم کرنے کوشش اس وقت تک خالص نہیں ہو سکتی جب تک کہ مخلوق سے کلی طور پر ترک تعلق نہ کر لیا جائے۔ اس طرح کہ نہ انہیں دیکھے، نہ ان کی گفتگو سنے، البتہ ضرورت کے اوقات جیسے نماز جمعہ، وجماعت اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اور ان اوقات میں بھی ان سے اجتناب کرے۔ اگر کوئی عالم مخلوق کو نفع پہنچانا چاہے تو ان کے لیے ایک وقت متعین کر دے اور ان سے گفتگو سے احتراز کرے۔ رہا وہ انسان جو آج کے بازاروں میں گھومتا ہے اور اس تیرہ وتاریک دنیا میں خرید وفروخت کرتا ہے اور بری باتوں کو دیکھتا ہے تو وہ گھر اس حال میں لوٹتا ہے کہ اس کے دل پر تاریکی چھا چکی ہوتی ہے۔ چنانچہ طالب حق کے لیے ضروری ہے کہ وہ جب بھی نکلے تو یا تو جنگلوں کی طرف نکلے یا پھر قبرستان کی طرف، سلف کی ایک جماعت خرید وفروخت کرتی تھی اور اجتناب سے بھی کام لیتی تھی۔ اس کے باوجود جس وقت ان کے دل کی نورانیت ختم ہو گئی انہوں نے بھی مخلوق سے قطع تعلق کر لیا۔ حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میں نے عبادت وتجارت ساتھ ساتھ کرنے کی کوشش کی تو یہ دونوں اکٹھے نہیں ہو سکے، تب میں نے

عبادت کو اختیار کرلیا۔ حدیث میں وارد ہے کہ بازار لہو ولعب میں اور لغو باتوں میں لگاتا ہے، چنانچہ جو شخص نفع رسائی کے ساتھ پرہیز پر قادر ہو اور میل جول اور اپنے بال بچوں اور خاندان کے لیے حصول روزی پر مجبور ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اسے دھیان رکھے اور پرہیز سے کام لے جیسے راہ چلتا انسان کانٹے سے بچتا ہے۔ پھر بھی اس کا بچ نکلنا بہت مشکل ہوگا۔(۵۳)

یہ صوفیہ کا طریقہ ہے کہ وہ واقعات زندگی کی پوری تحلیل کرتے ہیں اور اپنے نفس سے حکیمانہ مکالمے کرتے ہیں اور چھوٹے واقعات سے بڑے نتائج نکالتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ ابن جوزی بھی واقعات زندگی کا تحلیلی مطالعہ کرتے ہیں، حکیمانہ انداز میں اس کے نصیحت وعبرت سے بھرے پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں اور اپنے نفس سے مکالماتی انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے دعا کی، ایک دوسرے صالح بزرگ اس دعا میں شریک تھے۔ دعا قبول ہوگئی، لیکن کس کی دعا قبول ہوتی اس پر انہوں نے اپنے نفس سے مکالمہ کیا جس کا حاصل یہ ہے کہ کبھی کبھی اعتراف گناہ حسن عمل پر بھاری پڑ جاتا ہے اور حسن عمل نہ ہونے کے باوجود اعتراف گناہ کی وجہ سے بھی دعا قبول ہو جاتی ہے۔(۵۴)

یوں ہی وہ چھوٹے چھوٹے واقعات اور روز مرہ کے مشاہدات سے بڑے بڑے نتائج حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے دو مزدوروں کو ایک بھاری شہتیر اٹھا کر لے جاتے ہوئے دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ وہ کچھ گاتے ہوئے جارہے ہیں۔ ایک شخص ایک مصرعہ پڑھتا ہے اور دوسرا اس کا ترنم سے جواب دیتا ہے، اس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ نفس پر شرعی ذمہ داریوں کا جو بوجھ ہے اور اس میں صبر کی جو راہ ہے اس کو نفس کی جائز دلداری سے طے کیا جائے۔(۵۵)

یوں ہی صوفیہ کا طریقہ ہے کہ وہ قلب کی اصلاح اور ذوق وشوق پیدا کرنے کے لیے موثر واقعات اور سلف صالحین کے حالات کے مطالعے پر زور دیتے ہیں۔ علامہ ابن جوزی بھی اسی فکر کے حامل ہیں اور وہ بھی فقہا ومحدثین اور طلبہ وعلما کو مشورہ دیتے ہیں کہ اصلاح قلب کے لیے اور ذوق طاعت وعبادت پیدا کرنے کے لیے صرف فقہ اور سماع حدیث میں مشغولیت ہی کافی نہیں اور نہ صرف اس سے قلب میں رقت پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی صرف حلال وحرام کے علم سے قلب میں صلاح پیدا ہوتا ہے بلکہ اس کے لیے سلف صالحین کے حالات کا مطالعہ ضروری ہے کیوں کہ ان روایات کا جو مقصود ہے وہ انہیں حاصل تھا۔ یوں ہی احکام پر ان کا عمل بھی صرف ظاہری نہیں

تھا بلکہ اس کا اصلی ذوق انہیں حاصل تھا۔(۵۶)

علامہ ابن جوزی نے صرف مشورے ہی نہیں دیے بلکہ سلف صالحین اور صلحائے امت کی سیرتیں بھی لکھیں، جن میں حضرت حسن بصری، عمر بن عبدالعزیز، حضرت سفیان ثوری، حضرت ابراہیم بن ادہم، حضرت بشر حافی، امام احمد بن حنبل اور حضرت معروف کرخی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ صلحائے امت کا ایک جامع تذکرہ انہوں نے "صفة الصفوة" کے نام سے مرتب کیا، جن صلحائے امت کی انہوں نے مختصر سیرتیں لکھی ہیں، ان میں اکثریت ان حضرات کی ہے جو متقدمین صوفیہ میں شمار ہوتے ہیں مثلاً حسن بصری، ابراہیم بن ادہم، معروف کرخی، بشر حافی، رابعہ بصریہ، جنید بغدادی، سری سقطی وغیرہم، یوں ہی انہوں نے اپنی اس کتاب میں بعض مجذوبوں کا بھی تذکرہ کیا ہے اور انہیں المجانین العقلاء (عقل مند پاگل) کے نام سے یاد کیا ہے۔(۵۷)

یوں ہی انہوں نے اپنی کتاب **صیدالخاطر** میں بھی بکثرت متقدمین صوفیہ کا تذکرہ کیا ہے اور ان کی عظمتوں کو بیان کیا ہے(۵۸)

عملی تصوف کے نمونے: ان ساری باتوں سے قطع نظر خود ان کا عمل، ان کا تقوی اور ذوق عبادت ان کے طبعی میلانات اور فکری رجحانات کا پتا دیتے ہیں، ان کے نواسے ابوالمظفر کہتے ہیں کہ وہ ہر ہفتہ ایک قرآن مجید ختم کرتے، انہوں نے کبھی کسی سے مذاق نہیں کیا، بچپن میں کسی بچے کے ساتھ نہیں کھیلا، کبھی کوئی چیز مشتبہ نہیں کھائی۔ ابن النجار کہتے ہیں کہ ان کو پاکیزہ ذوق حاصل تھا۔ مناجات ودعا کی چاشنی سے واقف تھے، ابن الفارسی کا بیان ہے کہ وہ شب بیدار تھے اور کبھی اللہ کے ذکر سے غافل نہیں ہوتے تھے۔(۵۹) خود ان کی تالیفات خصوصاً صیدالخاطر کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ چشم بینا، دل بیدار، جمعیت خاطر، اور تعلق باللہ کو سرمایہ حیات گردانتے اور اس میں کمی آنے سے بے چین ہو جاتے تھے۔

صیدالخاطر میں وہ اپنی ایک حالت کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

ابتدائے عمر ہی سے میرے اندر زہد اختیار کرنے کی خواہش تھی اور نوافل کا اہتمام تھا، تنہائی مرغوب تھی، اس وقت میرے دل کی حالت اچھی تھی، مجھے اللہ کے ساتھ ایک تعلق، اور دعا میں لذت وچاشنی محسوس ہوتی لیکن بعد میں ایسا ہوا کہ بعض حکام، اہل کاران سلطنت میری حسن تقریر سے متاثر ہوئے اور انہوں نے مجھے اپنی طرف مائل کیا اور طبیعت بھی مائل ہوئی اور پھر وہ حلاوت

دعا ومناجات جاتی رہی یہاں تک کہ ایسا محسوس ہوا کہ وہ روشنی بجھ گئی، کوئی علاج ہاتھ نہ آیا آخر میں نے صالحین کی قبروں کی زیارت کی اور ان کے وسیلے سے اصلاح حال کی دعا کی بالآخر اللہ نے میری رہنمائی فرمائی اور مجھے کشاں کشاں خلوت کی طرف مائل کیا جس سے مجھے وحشت تھی اور وہ دل جو میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا پھر قابو میں آ گیا۔(٦٠)

مذکورہ بالا نمونوں کے مطالعے کے بعد کسے انکار کی گنجائش ہوسکتی ہے کہ علامہ ابن جوزی صوفی منہج فکر کے حامل تھے البتہ وہ اپنے زمانہ کے جاہل وگمراہ صوفیہ جن کی اس زمانے میں بھی کثرت تھی اور ہر زمانے میں رہی ہے، ان سے بے حد نالاں تھے اور اس بنا پر وہ اپنے آپ کو اس جماعت سے الگ تھلگ رکھنا چاہتے تھے۔

یہیں پر بات ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اب مشہور عرب سیاح ابن جبیر اندلسی کے حوالے سے ان کی مجالس وعظ کے نمونوں کو پیش کیا جاتا ہے، مطالعہ کیجیے اور فیصلہ دیجئے کہ علامہ ابن جوزی کی مجلس کسی صاحب وجد وحال صوفی کی مجلس ہوا کرتی تھی یا خشک ناقد تصوف کی۔

ابن جبیر اندلسی ان کی ایک مجلس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میں نے شنبہ کے روز شیخ فقیہ، امام اوحد جمال الدین ابوالفضائل بن علی جوزی کی مجلس دیکھی- ان کی بڑی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جب وہ منبر پر جلوہ افروز ہوتے ہیں، بیس سے زیادہ قاری قرآن کریم کی تلاوت طرب وشوق انگیزی اور ترتیب کے ساتھ اس طرح سے کرتے ہیں کہ ان میں سے دو تین قاری ایک آیت کی تلاوت کرتے ہیں پھر جب وہ فارغ ہو جاتے ہیں تو قراء کی دوسری جماعت جو اتنے ہی افراد پر مشتمل ہوتی ہے دوسری آیت کی تلاوت کرتی ہے باری باری مختلف سورتوں سے آیتوں کی تلاوت کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے یہاں تک کہ سلسلہ قراءت مکمل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد حیرت انگیز شخصیت کے مالک امام ابن جوزی خطبہ کا آغاز اس طرح کرتے ہیں کہ کانوں کے سیپ میں الفاظ کے موتی اُنڈیل دیتے ہیں اور تلاوت کی گئی آیتوں کو اپنے خطبے میں تلاوت کی ترتیب کے ساتھ پرو دیتے ہیں پھر دوسرے قافیے کی آیت پر خطبہ مکمل کرتے ہیں، جب وہ اپنے رقت انگیز وعظ وخطابت سے فارغ ہوتے ہیں تو لوگوں کے دل شوق ووجد کی وجہ سے بے اختیار ہو چکے ہوتے ہیں، سوزش اور جلن کی وجہ سے قلب پگھل جاتے ہیں، چیخ بلند ہوتی ہے اور آہ و بکا سے بھری بے تابیوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے، لوگ پکار پکار کر

توبہ کا اعلان کرتے ہیں اور ابن جوزی کے اوپر ایسے گرتے ہیں جیسے کہ پروانے شمع پر، لوگ ان کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہیں، ابن جوزی ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور اس کے حق میں دعا کرتے ہیں، کچھ لوگ تو بیہوش ہو جاتے ہیں اور آہ وبکا کے ساتھ ان کی جانب بڑھتے ہیں، ہم نے دیکھا کہ یہ لوگ انابت وندامت کے جذبات سے سرشار ہوتے ہیں اور ان کی نگاہوں میں قیامت کے ہولناک مناظر ہوتے ہیں، اگر ہم سمندری سفر اور بیابانی راستے صرف اس شخص کی مجلس میں حاضر ہونے کے لئے طے کرتے تب بھی یہ نفع بخش سودا ہوتا، تمام خوبیاں اللہ ہی کے لئے کہ اس نے میری ملاقات اس شخص سے کرائی جس کی فضیلت کی گواہی جمادات دیتے ہیں اور جس کی مثال سے دنیا تنگ ہے۔(٦١)

ان کی ایک دوسری مجلس کا تذکرہ کرتے ہوئے ابن جبیر اندلسی لکھتے ہیں:

ہم نے ان کی دوسری مجلس جمعرات کے روز صبح کے وقت ۱۱/صفر باب بدر کے پاس دیکھی۔ وہ منبر پر آئے قراء نے ترتیب کے ساتھ تلاوت قرآن شروع کیا اور ان سے جس قدر ہوسکا شوق وطرب انگیزی کی، لوگوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، مختلف سورتوں سے کل نو آیتیں پڑھی گئیں پھر ابن جوزی نے شاندار خطبہ دیا اور ابتدائی آیتوں کو اپنے خطبے میں ترتیب کے ساتھ پرو دیا اور آخر آیت پر خطبے کو مکمل کیا، آیت یہ تھی (**اللہ الذی جعل لکم اللیل لتسکنوا فیہ والنھار مبصرا، ان اللہ لذو فضل علی الناس**) آج کا خطاب کل سے بھی حیرت انگیز تھا۔ لوگوں کی آنکھیں ساون بھادوں بہانے لگیں۔ اور دلوں نے اپنے چھپے ہوئے شوق ووجد کو ظاہر کر دیا۔ لوگ اپنے گناہوں کا اعتراف اور توبہ کا اقرار کرنے لگے، ہوش وحواس اڑ گئے۔ یارائے صبر جاتا رہا، بے تابی اور بے ہوشی بکثرت طاری ہونے لگی۔ ابن جوزی اثنائے وعظ میں ہی شوق ووجد کو بھڑکانے والے تشبیب کے اشعار پڑھنے لگے اور پھر اس کو زہدیہ رنگ دینے لگے، سب سے آخر میں انہوں نے دو اشعار گنگنائے، اس وقت تک مجلس پر احترام کی فضا چھا چکی تھی اور کلام کے تیر نے لوگوں کو چھلنی کر دیا تھا۔ وہ دو اشعار یہ تھے۔

این فوادی اذابہ الوجد　　واین قلبی فما صحا بعد

یا سعد زدنی جویً بذکرھم　　باللہ قل لی فدیت یا سعد

(اے سعد! میرا دل کدھر گیا اسے تو وجد نے پگھلا دیا، میرا دل کہاں گیا اسے ابھی تک ہوش

نہیں آیا ،اے سعد! میرے آتش عشق پر دو چار انگارے اور رکھ دو،قسم خدا کی مجھے سناؤ اے سعد میں تجھ پر قربان)

انہی اشعار کو وہ دہراتے رہے اور حالت یہ تھی کہ خود ان اشعار کی تاثیر نے ان کو اپنی پوری گرفت میں لے لیا تھا اور آنسوؤں کی وجہ سے آواز نہیں نکل پا رہی تھی، یہاں تک کہ انہوں نے کچھ نہ بول پانے کی وجہ سے مجلس ختم کردی اور منبر سے اتر آئے ، اسی کی وجہ سے لوگوں کے دل بے تاب ہوگئے اور انہوں نے لوگوں کو بھڑکتے انگارے پر جلتا، روتا گڑگڑا تا، زمین پر تڑپتا چھوڑ دیا ، کیا حسین منظر تھا اور کتنا خوش نصیب ہے وہ جس نے اس منظر کو دیکھا،اللہ ان کی برکتوں سے ہمیں نفع پہنچائے اور ہمیں ان لوگوں میں سے کردے جو اس کے فضل وکرم سے اس کی بارش رحمت سے فیضیاب ہوئے۔(۶۲)

ان کی ایک تیسری مجلس کا تذکرہ کرتے ہوئے ابن جبیر لکھتے ہیں:

ان کی ہم تیسری مجلس میں شنبہ کے روز ۱۳ صفر کو حاضر ہوئے میں نے دیکھا کہ ان کے وعظ کو سن کر لوگ ہچکیاں لے لے کر رو رہے تھے، آنسوؤں کا سیل رواں تھا، اپنی مجلس کے آخر میں تشبیب کے کچھ اشعار دہرانے لگے تا کہ لوگوں میں زہد وشوق وطرب پیدا ہو جائے لیکن رقت قلبی کی وجہ سے وہ خود آگے کچھ نہیں بول سکے اور شوق ووجد کی حالت میں منبر سے اتر آئے اور سب کو اظہار ندامت کرتا آہ وزاری کرتا چھوڑ دیا ،کوئی واحسرتاہ کی صدائیں لگا رہا تھا تو کوئی کچھ اور، آہ وبکا کرنے والوں کا سلسلہ چکّی کی طرح گردش کر رہا تھا اور کوئی بھی ابھی تک اپنے نشے سے ہوش میں نہیں آیا، پاک ہے وہ ذات جس نے ان کی ذات کو عقل مندوں کے لئے عبرت کا باعث اور اپنے بندوں کی توبہ کا مضبوط ترین ذریعہ بنایا، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔(۶۳)

خاتمہ : پوری بحث ہمیں اس نتیجے تک پہنچاتی ہے کہ علامہ ابن جوزی اپنے زمانے کے نمایاں محدث، واعظ اور صوفی منہج فکر اور زاویہ نظر کے مالک تھے البتہ انہوں نے تصوف اور صوفیہ کو اپنی تنقید کا نشانہ اس لیے بنایا کہ ان کے زمانے میں اکثر صوفیہ غفلت اور بے اعتدالیوں کا شکار تھے، اور صرف اسی زمانے کی بات نہیں بلکہ ہر زمانے میں اچھے صوفیہ،صرف صوفیہ ہی نہیں بلکہ ہر طبقے کے اچھے لوگوں کی تعداد کم رہی ہے۔ ان کی ساری تنقیدی تحریروں کے مطالعے کے بعد یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے رائج تصوف کے خلاف تھے اور ان تنقیدوں سے ان کا مقصود

یہ تھا کہ کمیوں کی اصلاح ہوجائے اور صوفیہ اپنی اصل یعنی کتاب وسنت کی طرف رجوع کریں، ان کا یہی مقصد وہاں بھی کارفرما ہے جہاں انہوں نے معاشرے کے دوسرے طبقوں مثلاً متکلمین فقہا،محدثین، واعظین ، اور ملوک وسلاطین پر تنقید کی ہے، وہ چوں کہ محدث پہلے ہیں اس لیے ان پر خصوصیت کے ساتھ سنت کی روشنی میں ہر چیز کو پرکھنے کا مزاج غالب ہونا ایک فطری امر ہے اور ہونا بھی چاہیے جب تک یہ سلسلہ جاری رہے گا مختلف جماعتیں اپنے ناقدین کی تنقیدوں کی روشنی میں اپنا محاسبہ کرتی رہیں گی اور جب یہ سلسلہ بند ہوجائے گا تو یہ جماعتیں بے راہ رو ہوجائیں گی۔لیکن یہ بات ضرور واضح رہے کہ انہوں نے صوفیہ کو گمراہ جماعتوں میں شامل نہیں کیا ہے بلکہ صرف ان کی خامیاں گنائی ہیں اور تنقید ہی نہیں صوفیہ کی تعریف بھی لکھی ہے اگر صرف تنقید کسی جماعت کو گمراہ قرار دینے کے لیے کافی ہے تو پھر علامہ ابن جوزی کے نزدیک فقہا اور محدثین ساری جماعتوں کو گمراہ ماننا پڑے گا کیوں کہ انہوں نے سب پر تنقیدیں کی ہیں۔

اب یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ان کی تنقیدوں کو بنیاد بنا کر جماعت صوفیہ کو گمراہ قرار دیا جائے ، یوں ہی یہ کہاں کا انصاف ہے کہ علامہ کی زندگی کے صرف ایک رخ کو پیش کیا جائے اور ان کی زندگی کے دوسرے رخ کو جو امتیازات تصوف میں رنگی ہوئی ہے، اسے نظر انداز کردیا جائے، اس باب میں میرا مطالعہ اس نتیجے تک پہنچا ہے کہ وہ سب سے پہلے محدث و مصلح ہیں اور بعد میں حقیقت تصوف کے علم بردار،خواہ اصطلاح تصوف کو وہ خود قبول کریں یا نہ کریں، جہاں وہ ناقد تصوف ہیں، وہیں ان کی پوری زندگی صوفیانہ و زاہدانہ رنگ میں رنگی ہوئی ہے، البتہ تنقید تصوف میں ان سے بے اعتدالیاں بھی صادر ہوئی ہیں اور ان دونوں حیثیتوں کے باہم جمع ہوجانے میں کوئی استحالہ نہیں ہے۔ اللہ تعالی ہمیں حق کو حق کہنے، باطل کو باطل لکھنے اور حق پر عمل اور باطل سے اجتناب کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین بجاہ النبی الامین۔

مصادر و مراجع

۱۔ **احیاء علوم الدین، امام غزالی، ج:۱،ص:۳۲ اور مابعد بحوالہ الامام غزالی بین مادحیہ ونا قدیہ، ڈاکٹر یوسف القرضاوی ص:۸۴۔۸۵،موسسة الرسالة بیروت ۱۹۹۴ء**

۲۔ دیکھئے: مقدمہ اخبار الحمقی والمغفلین لابن جوزی اور اس کا حاشیہ ص: ۷، المکتب التجاری، بیروت۔

۳۔ دیکھئے: مقدمہ تلبیس ابلیس لابن جوزی، مترجم: مولانا ابومحمد عبدالحق اعظم گڑھی، دارالکتاب دیوبند ۱۹۹۹ء

۴۔ مصدر سابق ص: ۸

۵۔ نفس مصدر ص: ۸-۱۳

۶۔ مقدمہ تلبیس ابلیس مترجم، ص: ۸ - ۱۲

۷۔ مقدمہ اخبار الحمقی والمغفلین ص: ۱۳

۸۔ نفس مصدر

۹۔ تاریخ دعوت وعزیمت، ابوالحسن علی ندوی، ص: ۲۳۲، مجلس صحافت ونشریات اسلام لکھنو۔

۱۰۔ دیکھئے: تلبیس ابلیس مترجم ص: ۲۲۵-۲۳۳ ملخصا۔

۱۱۔ نفس مصدر باب دہم، ملخصا۔

۱۲۔ دیکھئے: الکامل فی التاریخ لابن اثیر ج: ۱۰، ص: ۶۴۰ بحوالہ مقدمہ اخبار الحمقی والمغفلین، ص ۸۔

۱۳۔ دیکھئے: تلبیس ابلیس مترجم، ص: ۲۸۸، ۲۹۵، ۳۰۱، ۳۰۷، ۳۰۹، ۳۱۲، ۳۱۵

۱۴۔ دیکھئے: تلبیس ابلیس باب دہم، اور مطالعہ کریں تصوف کی بنیادی کتابوں میں متعلقہ بحثیں، دونوں کے مقابلے سے واضح ہو جائیگا کہ علامہ ابن جوزی سے بہت اشتباہ واقع ہوا ہے، ان سے یہ اشتباہ صرف یہاں نہیں بلکہ موضوعات حدیث کے بیان میں بھی واقع ہوا ہے۔

۱۵۔ یہ مثال حضرت احسان اللہ ابوسعید چشتی مدظلہ العالی نے انحراف عن الجادہ کے سوال پر تقریب فہم کے لیے پیش کی تھی۔

۱۶۔ دیکھئے: صیدالخاطر ص: ۸۳

۱۷۔ التصوف والصوفیة فی ضوء الکتاب والسنة، سید یوسف ہاشم رفاعی مترجم: شاہ قادری سید مصطفی رفاعی جیلانی، ص ۱۳-۵۸، الاصلاح بنگلور ملخصا ۲۰۰۴

۱۸۔ معراج التشوف الی حقائق التصوف ص: ۵۔ بحوالہ التصوف والصوفیة فی

ضوء الکتاب و السنة، مترجم ص ۳۶-۳۷

۱۹۔ التصوف والصوفیة فی ضوء الکتاب والسنة مترجم، ص: ۵۴

۲۰۔ صیدالخاطر، ص: ۱۲۔

۲۱۔ نفس مصدر، ص: ۱۴۔

۲۲۔ نفس مصدر، ص: ۱۷۔

۲۳۔ نفس مصدر، ص: ۴۵۔

۲۴۔ نفس مصدر، ص: ۸۷۔

۲۵۔ نفس مصدر، ص: ۹۱۔

۲۶۔ نفس مصدر، ص: ۱۰۷۔

۲۷۔ نفس مصدر، ص: ۱۰۹۔

۲۸۔ نفس مصدر، ص: ۱۲۲۔

۲۹۔ نفس مصدر، ص: ۱۳۸۔

۳۰۔ نفس مصدر، ص: ۱۹۵۔

۳۱۔ نفس مصدر

۳۲۔ نفس مصدر، ص: ۲۱۰۔

۳۳۔ نفس مصدر، ص: ۲۱۶۔

۳۴۔ نفس مصدر، ص: ۲۶۲۔

۳۵۔ نفس مصدر، ص: ۲۷۹۔

۳۶۔ نفس مصدر، ص: ۳۰۵۔

۳۷۔ نفس مصدر، ص: ۳۱۳۔

۳۸۔ نفس مصدر، ص: ۳۲۰۔

۳۹۔ نفس مصدر، ص: ۳۵۸۔

۴۰۔ نفس مصدر، ص: ۳۸۴۔

۴۱۔ نفس مصدر، ص: ۳۸۷۔

۴۲۔ نفس مصدر،ص:۳۹۷۔

۴۳۔ نفس مصدر،ص:۳۹۸۔

۴۴۔ نفس مصدر،ص:۳۹۹۔

۴۵۔ نفس مصدر،ص:۴۱۰۔

۴۶۔ نفس مصدر،ص:۴۱۱۔

۴۷۔ نفس مصدر،ص:۴۲۲۔

۴۸۔ نفس مصدر،ص:۴۶۸۔

۴۹۔ نفس مصدر،ص:۴۷۳۔

۵۰۔ نفس مصدر،ص:۴۷۵۔

۵۱۔ نفس مصدر،ص:۱۷،۱۸۔

۵۲۔ نفس مصدر،ص:۱۴۲۔

۵۳۔ نفس مصدر،ص:۳۹۹۔

۵۴۔ نفس مصدر،عنوان: **دعاء المنكسرين**،ص:۱۰۷۔

۵۵۔ نفس مصدر،عنوان: **تعليل النفس** ،ص:۹۹۔

۵۶۔ نفس مصدر،عنوان: **العلم النظرى لايكفى** ،ص:۲۱۔

۵۷۔ **صفة الصفوة ، مجلس دائرة المعارف العثمانيه** حیدرآباد۔

۵۸۔ دیکھئے: مصدر سابق،عنوان: **تعليل النفس** ۔ص:۹۹،عنوان: **اهل الاشارة** ،ص:۱۴۷،
عنوان: **تفاوت الهمم والآمال** ،ص:۲۳۹۔

۵۹۔ دیکھئے: تاریخ دعوت وعزیمت،ابوالحسن علی ندوی،ص:۲۰۹،مجلس صحافت ونشریات اسلام لکھنؤ۔

۶۰۔ عنوان: **التبتل الى الله**،ص:۷۹

۶۱۔ مقدمہ **اخبار الحمقى والمغفلين**،ص:۱۰-۹۔**المكتب التجارى، بيروت**

۶۲۔ نفس مصدر،ص:۱۱-۱۰

۶۳۔ نفس مصدر،ص:۱۲)

○○○

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد تجاروی

حضرت شقیق بلخی — حیات وافکار

شقیق بلخی ابتدائی عہد کے اجلہ صوفیہ میں شمار ہوتے ہیں- ابوعبدالرحمٰن السلمی نے لکھا ہے کہ خراسان کے علاقے میں سب سے پہلے شقیق بلخی نے علم الاحوال کے بارے میں گفتگو کی، ان کے مریدین کی تعداد بھی بہت تھی، بسا اوقات ان کے ساتھ تین تین سو مرید ہوا کرتے تھے، زہد وعبادت کے ساتھ ساتھ انھوں نے بھرپور سیاسی وسماجی زندگی گزاری، ان کا انتقال بھی ایک جنگ میں بطور شہید ہوا-

مختصر احوال: شقیق بلخی خراساں کے رہنے والے تھے اور قبیلہ ازد سے نسبی تعلق تھا اس لیے الازدی کہلاتے تھے- ابتدا میں بہت دولت مند آدمی تھے- ان کے پوتے علی بن محمد بن شقیق روایت کرتے ہیں کہ ان کے دادا شروع میں بہت امیر تھے- ان کے پاس تین سو گاؤں کی جاگیر تھی- تجارت بھی کرتے تھے اور تجارت کے سلسلے میں مختلف علاقوں کے اسفار بھی کرتے تھے- تصوف اور زہد کی طرف ان کی طبیعت کے میلان کے سلسلے میں کئی واقعات ملتے ہیں ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ وہ تجارت کے سلسلے میں ''ترکوں'' کے علاقے میں گئے ہوئے تھے- جہاں ان کا قیام تھا وہاں کے لوگ بتوں کی پوجا کرتے تھے- شقیق ان کے معبد میں گئے- وہاں دیکھا کہ اس مذہب کا پیشوا سر اور داڑھی کے بال منڈوائے ہوئے سرخ ارغوانی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں- شقیق نے اس سے کہا کہ یہ تم جو کچھ کر رہے ہو وہ غلط ہے ان چیزوں کا بھی اور تمھارا بھی ایک خالق ہے ایک بنانے والا ہے اور کوئی اس جیسا نہیں- دنیا وآخرت اسی کی ہے وہ ہر چیز پر قادر ہے اور ہر چیز کو رزق دینے والا ہے- معبد کے خادم نے کہا کہ تمہارے قول اور عمل میں تضاد ہے- شقیق رحمۃ اللہ نے پوچھا کیسے؟ اس نے جواب دیا کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ تمھارا ایک خالق ورازق ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے- حالاں کہ تم طلب رزق میں یہاں آئے ہوئے ہو- اگر آپ اپنی بات میں صادق ہوتے تو جو تمہیں رزق دے رہا ہے وہ وہاں بھی دیتا اور تم مصیبت سے بچے

رہتے-شقیق فرماتے ہیں کہ میرے زہد کا سبب اس ''ترکی'' کا یہ کلام ہے- اس کے بعد شقیق واپس آئے اور سارا مال ومنال صدقہ کر کے طلب علم میں لگ گئے-(۱)

ایک اور واقعہ ابن ملقن نے لکھا ہے لیکن بظاہر اس روایت کی صحت میں ان کو بھی شک ہے وہ یہ کہ ایک دفعہ قحط کے زمانے میں انھوں نے ایک غلام کو دیکھا جو بہت موج مستی کر رہا تھا- (یلعب و یمرح) شقیق نے اس کو ڈانٹا، اس نے کہا کہ میرے مالک کے پاس ایک گاؤں ہے وہاں سے ضرورت کی ہر چیز آ جاتی ہے-'' شقیق کو اس پر تنبیہ ہوئی اور انھوں نے سوچا کہ اس کا مالک تو مخلوق ہے اور میرا مالک تو تمام غنیوں کا غنی ہے'' جب یہ شخص ایک گاؤں کے مالک آقا پر اتنا بھروسہ کر رہا ہے تو میں سارے عالم کے مالک کی غلامی کا دعویدار کیوں پریشاں پھروں، اس کے بعد اپنا سارا اثاثہ ترک کر دیا اور عبادت میں لگ گئے-(۲)

اس کے علاوہ اسی جیسا ایک اور واقعہ الرسالہ میں لکھا ہے- ان واقعات سے ایک اندازہ یہ ہوتا ہے کہ شقیق بلخی کا رجحان زہد وعبادت کی طرف ایسے واقعات کی بنا پر ہوا تھا جس میں قلب رزق کی خصوصی اہمیت تھی، چنانچہ ان کے یہاں غالب رجحان توکل کا ہے، حتیٰ کہ ان کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ ان کا سارا کلام توکل کے بارے میں ہے-(۳)

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا شقیق بلخی کے بارے میں مختلف اندراجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک مالدار آدمی تھے- امام قشیری نے لکھا ہے کہ وہ کتوں کے بڑے شوقین تھے- بڑے عیش وتعیش میں زندگی بسر کرتے تھے- پھر ان کی زندگی میں انقلاب آیا اور وہ عابد وزاہد بن گئے- امام قشیری نے ابوعبدالرحمٰن السلمی کے حوالے سے لکھا ہے کہ حاتم اصم کہتے ہیں ''شقیق بن ابراہیم مالدار تھے، نوجوان بنتے اور نوجوانوں کی صحبت میں رہتے تھے- اس وقت بلخ کا حاکم علی بن عیسیٰ بن ماہان تھا- جسے شکاری کتوں سے بڑی محبت تھی، ایک بار اس کا ایک شکاری کتا گم ہو گیا کسی نے شکایت کی کہ یہ کتا فلاں شخص کے پاس ہے، یہ شخص شقیق کے پڑوس میں رہتا تھا جب اس شخص کی تلاش ہوئی تو اس نے بھاگ کر شقیق کے گھر میں پناہ لی- شقیق حاکم کے پاس گئے اور کہا کتا تو میرے پاس ہے لہٰذا اس کا پیچھا چھوڑ دو میں تین دن کے اندر کتا تمھیں دے دوں گا- چنانچہ انھوں نے اس شخص کو چھوڑ دیا- شقیق واپس آئے تو بہت فکرمند تھے- یہاں تک کہ تیسرا دن بھی آ گیا- شقیق کا ایک دوست بلخ سے کہیں گیا ہوا تھا اور اب بلخ کو واپس آ رہا تھا- راستے میں اسے ایک کتا ملا

جس کے گلے میں پٹا پڑا ہوا تھا- اس نے اسے پکڑ لیا اس خیال سے کہ وہ شقیق کو بطور تحفہ دے گا کیوں کہ وہ کتوں کے شوقین ہیں- چنانچہ وہ کتا لے آیا جب شقیق نے دیکھا تو وہی امیر کا کتا، انھوں نے وہ کتا امیر کو دے کر اپنی ضمانت چھڑائی-(۴)

شقیق بلخی کے استاد ابراہیم بن ادھم تھے لیکن مصادر کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شقیق نے زہد اور تصوف کی طرف مائل ہونے کے بعد ابراہیم بن ادہم سے صحبت اختیار کی تھی- ابن الملقن نے یہ قصہ اس طرح لکھا ہے کہ ایک مرتبہ شقیق حج کو گئے وہاں ابراہیم سے ملاقات ہوئی- ابراہیم نے ان سے پوچھا کہ آپ نے یہ طریقہ کہاں سے سیکھا شقیق نے بتایا کہ ایک مرتبہ میں تجارت کے لیے جا رہا تھا ایک جگہ میں نے ایک چڑیا دیکھی جس کے پنکھ ٹوٹے ہوئے تھے اور ایک ویران جگہ پڑی تھی- میں نے سوچا کہ میں یہ دیکھوں کہ اس کو کہاں سے کھانا ملتا ہے- اسی اثنا میں ایک دوسری چڑیا آئی اس کی چونچ میں دانا تھا اس نے وہ دانہ اس چڑیا کی چونچ میں رکھ دیا- مجھے اس نظارے سے عبرت حاصل ہوئی اور میں نے کمانا چھوڑ دیا اور عبادت میں لگ گیا- ابراہیم بن ادھم نے یہ سن کر شقیق سے کہا کہ تم نے وہ چڑیا بننا پسند کیوں نہیں کیا جس نے اس پر بریدہ چڑیا کو دانا دیا تھا- اس طرح تم اس سے افضل ہو جاتے- کیا تم نے سنا نہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے افضل ہوتا ہے- (حدیث، مسند احمد) مومن کی علامت یہ ہے کہ وہ ہر معاملہ میں دو درجوں میں سے اعلیٰ درجہ کا انتخاب کرے اس طرح وہ ابرار کے درجے کو پہنچ جاتا ہے- شقیق نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کو بوسہ دے کر کہا کہ آپ ہمارے استاد ہیں-(۵)

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابراہیم بن ادھم سے شقیق کی ملاقات اور صحبت بہت طویل نہ رہی ہوگی چونکہ اس کے بعد ابراہیم بن ادہم شام چلے گئے تھے اور شقیق کے شام جانے کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا- دوسری بات یہ ہے کہ یہ ملاقات اس وقت کی ہے جب شقیق بلخی خود راہ تصوف اختیار کر چکے تھے اور لوگوں میں یک گونہ شہرت بھی حاصل کر چکے تھے-

شقیق بلخی نے اپنی تعلیم وتربیت کے بارے میں خود جو روایت کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے عباد بن کثیر اور اسرائیل سے راہ سلوک کی تربیت حاصل کی- چنانچہ فرماتے ہیں ''میں نے خشوع وخضوع اسرائیل سے اور عبادت کا ذوق عباد بن کثیر سے سیکھا اور فقہ کی تعلیم امام

زفر سے حاصل کی۔'' (۶)

راہ سلوک میں شقیق بلخی نے بڑی مشکلات اٹھائیں ان سے مروی ہے کہ میں تین لاکھ درہم کا اثاثہ چھوڑ کر نکل گیا۔ اونی کپڑے پہنے اور بیس سال تک ایک مدہوشی کی سی کیفیت میں رہا مجھے پتہ نہیں تھا یہاں تک عبدالعزیز بن ابی الرواد سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ اے شقیق جو کی روٹی کھانا اور اون یا بالوں کے کپڑے پہننا کوئی کمال کی بات نہیں ہے۔ کمال کی بات تو معرفت ہے اور یہ کہ تم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ میرے لیے مزید وضاحت فرمائیں۔ انھوں نے فرمایا کہ تم جو کچھ بھی کرو وہ سب خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔ فمن کان یرجو بقاء ربه ... الخ (الکھف،ص:110) (۷) حلیۃ الاولیا میں میں لکھا ہے کہ انھوں نے دوسری شرط اللہ تعالیٰ سے راضی ہونا اور تیسری یہ بتائی کہ تمھارا بھروسہ جو کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے اس پر زیادہ ہونا چاہیے بہ مقابلے اس کے جو لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ (۸)

ذہبی نے اس قصہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ شقیق کہتے ہیں کہ میں پہلے شاعر تھا پھر تصوف کی طرف مائل ہوا۔ (۹)

امام جعفر اور شقیق بلخی: شقیق بلخی کے بارے میں امام قشیری نے ایک واقعہ یہ لکھا ہے کہ انھوں نے امام جعفر سے سوال کیا کہ فتوت کیا ہے انھوں نے فرمایا کہ آپ بتایے آپ کیا کہتے ہیں۔ شقیق نے کہا کہ اگر ہمیں کچھ ملتا ہے تو شکر کرتے ہیں اور نہیں ملتا تو صبر کرتے ہیں۔ امام جعفر صادق نے فرمایا کہ مدینہ میں کتوں کا بھی یہی طریق ہے۔ شقیق نے پوچھا کہ اے رسول اللہ کے نواسے پھر آپ ہی بتایے فتوت کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ اگر ہمیں کچھ مل جائے تو دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔ اور اگر نہ ملے تو شکر کرتے ہیں۔ (۱۰)

یہ واقعہ طبقات الاولیا میں بھی درج ہے لیکن اس میں امام جعفر صادق کی جگہ ابراہیم بن ادہم کا تذکرہ ہے۔ (۱۱)، اگرچہ سند کے اعتبار سے پہلی روایت زیادہ بلند ہے لیکن درایۃً دوسری روایت زیادہ معتبر معلوم ہوتی ہے۔ چونکہ ابراہیم بن ادہم شقیق بلخی کے استاد ہیں اور انھوں نے تربیت کے لیے اس طرح سوال کیا ہوگا جب کہ امام جعفر صادق سے ان کی ملاقات کسی اور ذریعہ سے ثابت نہیں۔ اور اگر ثابت بھی ہو جائے تو ان کے درمیان عمر کا فرق اتنا زیادہ ہے کہ بظاہر اس

قسم کا مکالمہ نہیں ہوسکتا۔ چونکہ امام جعفر صادق کی وفات شقیق بلخی کی وفات سے 46 سال قبل 148 ھ میں ہو چکی تھی۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ الرسالہ میں واقعہ نقل کرتے ہوئے ابراہیم بن ادہم کی جگہ امام جعفر صادق کا نام شامل ہوگیا ہو۔ اور صوفیہ کرام کے تذکروں میں ایسا ہو بھی جاتا ہے خود الرسالہ میں ایسی تصحیف کی ایک مثال آگے آرہی ہے۔

سفیان ثوری اور شقیق بلخی: سفیان ثوری کے بارے میں شقیق بلخی کہتے ہیں کہ میں نے ان سے ملاقات کی اور لباس کی سادگی ان سے سیکھی، انھوں نے ازار پہن رکھا تھا جس کی قیمت چار درہم تھی جب وہ پالتی مار کر بیٹھتے یا اپنے پیر پھیلاتے تو ازار کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے ان کی ستر کھلنے کا اندیشہ ہوتا تھا۔ (۱۲)

اہل بلخ میں سے ایوب بن حسن الزاہد اور علی بن الحسن الافطس وغیرہ نے ان سے روایات نقل کی ہیں۔ ابو صالح مسلم بن عبدالرحمٰن بلخی بن عبدالرحمٰن بلخی نے بھی ان سے روایات نقل کی ہیں۔ (۱۳)

اسناد حدیث: حافظ ذہبی نے **العبر فی خبر من غبر** میں راوی شقیق بلخی کو ضعیف میں لکھا ہے۔ (۱۴) ان کی روایات کو بھی محدثین نے عام طور پر قبول نہیں کیا ہے لیکن چونکہ یہ حضرات زمانہ روایت حدیث سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے صوفیہ کے تذکروں میں ان کی مرویات اور اسناد کے بیان کا اہتمام کیا جاتا ہے، شقیق بلخی کے بارے میں ملقن نے لکھا ہے کہ انھوں نے امام ابوحنیفہ سے حدیث بیان کی۔ (۱۵) ابوعبدالرحمٰن السلمی نے ان کی سند سے دو احادیث روایت کی ہیں۔ ایک روایت عباد بن کثیر الثقفی البصری (متوفی ۱۵۰ھ) سے روایت کی ہے، دوسری حدیث ابوہاشم الابلی سے روایت کی ہے۔ (۱۶) ابو ہاشم سے ہی ایک اور حدیث کی روایت تاریخ الاسلام میں نقل کی گئی ہے۔ (۱۷) ان کے دیگر اساتذہ میں اسرائیل کا نام بھی ذکر کیا گیا ہے۔ (۱۸)

مریدین: شقیق بلخی کے بارے میں عام طور پر تذکرہ نگاروں نے مشاہیر مشائخ خراسان اور کبار مشائخ خراسان جیسے الفاظ لکھے ہیں۔ لیکن ان کے مریدین اور مسترشدین میں حاتم اصم کے علاوہ عبدالصمد بن یزید بن مردیہ محمد بن ابان المستملی اور حسن بن داؤد البلخی وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ (۱۹)

حاکم نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ شقیق تین سو مریدوں کے ساتھ نیشاپور آئے- یہ زمانہ مامون کی امارت کا تھا، مامون نے ان کی خدمت میں حاضر ہونا چاہا لیکن انھوں نے منع کر دیا تو لوگوں نے مامون کی شفارش کی-(۲۰) ابن العماد نے بھی ان کے ایک سفر میں تین سو مریدوں کے ساتھ ہونے کا تذکرہ کیا ہے-(۲۱) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا حلقہ ارادت کافی وسیع تھا- لیکن ان کے اقوال عام طور پر حاتم اصم سے مروی ہیں- طبقات الصوفیہ میں ان کے 27 مقولے نقل کیے ہیں- سب حاتم اصم کی روایت سے ہیں- حاتم اصم ان کے سب سے مشہور شاگرد ہیں- خود بھی بڑے پائے کے صوفی تھے اور شقیق بلخی سے بہت طویل عرصہ تک تعلق رہا- خود کہا ہے کہ میں تیس سال شقیق بلخی کے پاس آتا جاتا رہا- (۲۲) جس جنگ میں شقیق شہید ہوئے اس میں حاتم ان کے ساتھ تھے اور ان کی شہادت کے واقعہ کے راوی بھی وہی ہیں-(۲۳) ان کے پوتے علی بن محمد بن شقیق کے حوالے سے بھی بعض تذکرہ نگاروں نے ان کے بارے میں کچھ معلومات درج کی ہیں-حسن بن داؤد بلخی نے بھی ان کے اقوال روایت کیے ہیں-(۲۴)

وفات: شقیق بلخی کی وفات کے سلسلے میں سبھی تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ کولان کی جنگ میں ترکوں کے خلاف جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے-(۲۵) ابن العماد نے بھی یہی لکھا ہے-(۲۶) ابن الجوزی نے سنہ وفات 153 لکھا ہے- (۲۷) اسی طرح ان خلکان نے بھی ۱۵۳ لکھا ہے-(۲۸) عبدالرحمٰن بدوی نے اس سن کی صحت پر اشکال کا اظہار کیا ہے اور اس کے غلط ہونے کے کچھ دلائل بھی دیے ہیں-

جنگ میں شرکت کا واقعہ حاتم اصم اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ایک جنگ میں میں اور شقیق اکٹھے ترکوں کا مقابلہ کر رہے تھے وہ دن ایسا تھا کہ اس میں سوائے سروں کے اڑنے، تلوراوں کے ٹوٹنے اور نیزوں تقصف کچھ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا اسی دوران ہم دوصفوں کے درمیان تھے کہ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ اے حاتم کیسا لگ رہا ہے کیا تمہیں آج شب زفاف کی لذت نہیں آرہی ہے؟ میں نے کہا بخدا ایسی تو کوئی بات مجھے نہیں محسوس ہو رہی ہے-شقیق نے فرمایا کہ واللہ مجھے تو ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے جیسا اس رات محسوس ہوا تھا جب میں اپنی بیوی کے ساتھ شب زفاف بسر کی تھی، حاتم کہتے ہیں کہ اس کے بعد شقیق دوصفوں کے درمیان سو گئے- ڈھال سرہانے رکھ لی حتی کہ مجھے ان کے خراٹوں کی آواز آنے لگی-(۲۹)

اندازہ ہوتا ہے کہ اس جنگ میں ان کے اور ساتھی بھی شریک تھے چنانچہ حاتم نے اس قصہ میں مزید کہا ہے کہ میں نے اس جنگ میں اپنے اصحاب میں سے ایک کو دیکھا کہ رو رہا ہے میں نے پوچھا کیوں رو رہے ہو- اس نے جواب دیا کہ میرا بھائی شہید ہوگیا-(۳۰)

ابن الملقق کی رائے ہے کہ یہ جنگ کولان کی تھی جس میں وہ شہید ہوئے- (۳۱) عبدالرحمٰن بدوی نے بھی یہی لکھا ہے کہ بظاہر یہ کولان کی جنگ کا قصہ ہے- (۳۲)

اولاد: شقیق بلخی کی اولاد کے بارے میں تفصیلات نہیں معلوم- ان کے ایک بیٹے محمد کا نام تذکروں میں ملتا ہے، وہ دراصل پوتے کے ذکر میں ملتا ہے-ممکن ہے کہ اور بھی اولا د رہی ہوں-

افکار: شقیق بلخی نے اونی کپڑے پہنے، مجذوبانہ تلاش حق میں سرگرداں پھرے- مختلف لوگوں سے روایات لیں- اور مختلف شخصیات کی خدمت میں رہ کر سلوک وتصوف کے رموز سیکھے- وہ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے معروف معنوں میں دنیا دار قسم کے انسان تھے- بڑے دولت مند تھے- شاعری بھی کرتے تھے جوانی کی امنگوں میں مگن رہتے اور کتے پالتے تھے جب فکر آخرت دامن گیر ہوئی تو سب کو ترک کر دیا، دولت صدقہ کر دی اور اطمینان کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے- ان کے افکار و خیالات جو ان کے بعض مریدوں نے خاص طور پر حاتم اصم نے نقل کیے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ عملی باتیں کہتے تھے- فلسفیانہ فکر ان کے یہاں نہیں تھی- بلکہ ان کی اصل فکر یہ تھی کہ عمل کے ذریعہ کس طرح اپنی زندگی کو سنوارا جائے اور آخرت کی فکر کے پیش نظر یہ زندگی کیسے گزاری جائے، اس سلسلے میں ان کی روایات عملی نوعیت کی ہیں- ان کے افکار و کو اس طرح منظّم کیا جا سکتا ہے-

توکل: شقیق بلخی کے یہاں توکل پر بڑا زور تھا غالبًا اپنی ہنگامہ خیز معاشی زندگی کو ترک کرنے کے نتیجہ میں ان کے اندر توکل کی فکر زیادہ بڑھ گئی اور یہ فکر اتنی حاوی ہوئی کہ اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کو اس حوالے سے ذکر کیا ہے- الرسالہ میں لکھا ہے کہ ان کا سارا کلام توکل کے بارے میں ہے- (۳۳)

شقیق بلخی توکل کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں "**التوکل یطمئن قلبک و عود الله**" (توکل یہ ہے کہ تیرا دل اللہ تعالیٰ کے وعدے پر مطمئن ہو جائے) ایک مرتبہ فرمایا کہ اگر تم کو یہ دیکھنا ہو کہ کسی کے بارے میں یہ انسان کیسا ہے تو دیکھ لو کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے اور انسانوں

کے وعدے ان دونوں میں سے کس وعدے پر اس کا دل زیادہ مطمئن ہے-(۳۴)

شقیق بلخی نے توکل کی چار قسمیں بیان کی ہیں:

1- توکل علی المال
2- توکل علی النفس
3- توکل علی الناس
4- توکل علی اللہ

مال پر توکل کی تفسیر یہ ہے کہ تم کہو کہ جب تک یہ مال میرے پاس رہے گا، مجھے کسی کی ضرورت نہیں-نفس پر توکل کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے اوپر بھروسہ کرے اور لوگوں پر توکل کا مطلب یہ ہے کہ ہر ضرورت میں لوگوں پر اعتماد کر اور اللہ تعالیٰ پر توکل مطلب یہ ہے کہ تم یہ جانو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو پیدا کیا ہے-تمہارے رزق کا ضامن اور کفیل وہی ہے- وہ تمہیں کسی کا محتاج نہیں کرے گا اور تم اس بات کو اس کی اپنی زبان میں یوں کہو "والذی یطمعنی و یسقین (سورۃ الشعراء ۷۹) یہ توکل علی اللہ ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وعلی اللہ فتوکلوا ان کنتم مؤمنین- (المائدہ ۲۳) و علی اللہ فلیتوکل المؤمنون (المائدہ ۱۱)-ان اللہ یحب المتوکلین (آل عمران ۱۵۹) (۳۵)

شقیق بلخی کے یہاں توکل پر اتنا زور ہے کہ بسا اوقات وہ ترک وسیلہ تک پہنچ جاتے ہیں اس کی مثال چڑیا کا قصہ ہے جو اوپر گزر چکا ہے-لیکن شاید ابراہیم بن ادہم کی تربیت کے بعد انھوں نے ترک وسیلہ کو چھوڑ دیا ہو- البتہ اس سے ان کے معیار توکل میں کوئی کمی نہیں آئی- وہ فرماتے تھے کہ جو تمھارا رزق ہے وہ ہر حال میں تم کو ہی ملے گا-کسی کو نہیں مل سکتا- (۳۶) اس لیے انسان کو اللہ پر توکل کرنا چاہیے اور انھوں نے بعض قرآنی آیات سے استشہاد کیا ہے کہ توکل ایمان کا تقاضا ہے اور مومنین کی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ بھی ان لوگوں کو محبوب رکھتا ہے جو اس پر توکل کرتے ہیں-

توکل صرف اللہ تعالیٰ پر کرنا چاہیے اور دراصل توکل کی پہچان ہی یہ ہے کہ توکل ہے کس پر-شقیق بلخی فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ دیکھنا چاہے کہ اس کی معرفت الٰہی کس درجہ پر ہے تو یہ دیکھے کہ اس کا دل کس پر زیادہ بھروسہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے کیے ہوئے وعدوں پر یا انسانوں کے

وعدوں پر- (۳۷)

زہد: یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ شقیق بلخی کے عہد میں لفظ تصوف کا رواج نہیں تھا، البتہ اون پہننے کی روایت پڑ چکی تھی- اس عہد میں لفظ زاہد یا محبّ کا استعمال ہوتا تھا، شقیق بلخی نے بھی کہیں لفظ تصوف کا استعمال نہیں کیا ہے بلکہ وہ لفظ زہد کا استعمال کرتے ہیں-

شقیق بلخی کی نظر میں زہد، رغبت کی ضد ہے- فرماتے ہیں زاہد اور راغب کی مثال ان دو آدمیوں کی سی ہے جن میں سے ایک مشرق کی طرف جا رہا ہو اور دوسرا مغرب کی طرف، کیا ان کے درمیان کوئی متفقہ بات ہے- ان کے مقاصد مختلف ہیں- راغب یہ دعا مانگتا ہے کہ اے اللہ مجھے مال، اولاد اور دولت عطا فرما اور مجھے میرے دشمنوں کے مقابلے کامیاب فرما اور ان کے شر اور حسد، زیادتی، مصیبت اور آزمائش مجھ سے دور فرما- زاہد کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اے اللہ مجھے ڈرنے والوں کا علم اور عمل کرنے والوں کا خوف عطا فرما- متوکلین کا علم، مومنین کا توکل، صبر کرنے والوں کا شکر اور شکر کرنے والوں کا صبر، اور مغلوب ہو جانے والوں کی فروتنی اور عاجزی کرنے والوں کی انابت اور سچوں کا زہد عطا فرما- اور مجھے ان شہدا میں شامل فرما یا جو زندہ ہیں ان کو رزق دیا جاتا ہے- یہ اس کی دعا ہے- دونوں کی دعائیں الگ الگ ہیں اور بخدا دونوں کے راستے جدا جدا ہیں-(۳۸) اس طرح شقیق بلخی زاہد یعنی صوفی کو دوسرے تمام گروہوں سے ممتاز کرتے ہیں- یعنی جو شخص زاہد ہوگا اس کی فکر کا محور پورے طور پر اللہ تعالیٰ کی خشیت اس پر توکل، صبر اور انابت ہوگا اور اس کی منزل شہدا میں شامل ہونا ہوگا- یعنی آخرت میں کامیابی ہی اس کی زندگی کا اصل محرک ہوگا- اور اس کی کوشش یہ ہوگی کہ وہ آخرت میں سب سے اعلیٰ مقام حاصل کرے جو مقام ان شہدا کا ہے جن کو قرآن نے کہا ہے کہ وہ زندہ ہیں اور کھلائے پلائے جاتے ہیں-

اس کے مقابلے میں شقیق بلخی راغب کا لفظ استعمال کرتے ہیں جو تتبع ہوا و ہوس کے لیے ہوتا ہے جس کی فکر کا محور اس کی دنیا کی زندگی ہوتی ہے- دنیا میں مال و اولاد کا حصول اور مصیبتوں اور پریشانیوں سے نجات حاصل کرنا ہی اس کی زندگی کا محور ہوتا ہے- آخرت کی فکر اس کے دائرہ فکر میں شامل نہیں ہوتی-

اس طرح شقیق بلخی کے نزدیک جو آخرت میں اعلیٰ درجات حاصل کرنے کی فکر میں یہ زندگی گزارے وہ زاہد ہے اور جس کی فکر کا دائرہ اس دنیا میں ہی محدود ہو وہ راغب ہے-

ایک اہم بات یہ ہے کہ جنت کے لالچ اور جہنم کے خوف سے عبادت کرنے والوں کے بارے میں اس دور میں وہ نقطۂ نظر شروع ہوگیا جو حضرت رابعہ بصریہ کی طرف منسوب ہے کہ میں جنت کو جلا ڈالنا اور جہنم کو بجھا دینا چاہتی ہوں تاکہ لوگ ان کے لالچ اور خوف کے بغیر محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے اس کی عبادت کریں-

زہد کے مقابلے میں شقیق بلخی دو لفظ استعمال کرتے ہیں- ایک راغب جس کا اوپر ذکر ہوا دوسرا ہوا (ہوس)، مؤخر الذکر لفظ کا استعمال تو ابھی اس معنی میں ہوتا ہے لیکن اول الذکر کا استعمال اصطلاحاً ان معنوں میں نہیں ہوتا جن میں شقیق بلخی نے اس کو استعمال کیا تھا-

شقیق بلخی کے یہاں زہد کا مطلب ہوا وہوس کا ترک اور آخرت کی فکر میں سرگرداں رہنا ہے- اس کی تائید ان کے اس اقتباس سے بھی ہوتی ہے جس میں انھوں نے بہت واضح انداز میں اس کو مبرہن کیا ہے کہ زہد اصلاً فکر آخرت اور آخرت میں کامیابی کی جدوجہد کا نام ہے-

فرماتے ہیں کہ تین خصلتیں ہیں جو زاہد کا تاج کہلاتی ہیں:

اول یہ کہ وہ خواہشات سے اعراض کے ساتھ چلے نہ کہ خواہشات کے ساتھ چلے-

دوسرا یہ کہ دل سے زہد کی طرف مائل ہو-

تیسرا یہ کہ جب بھی اس کو فرصت کے لمحات میسر آئیں تو یہ سوچے کہ قبر میں داخل ہونا اور اس سے نکلنا کس حال میں ہوگا اور قیامت کے دن کی طوالت، بھوک، پیاس، برہنگی، حساب اور صراط کو یاد کرے اور حساب کی طوالت اور اس دن کی رسوائی کو یاد کرے، اس کا یہ ذکر اس کو دھوکے کے گھر (اس دنیا) کے ذکر سے بے نیاز کردے گا- (۳۹)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سب سے قریب وہ زہاد ہوں گے جو اس سے سب سے زیادہ خوف کی روش اختیار کریں گے- اور اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ محبوب وہ زہاد ہوں گے جو اس کے لیے سب سے اچھے اعمال انجام دیں گے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے افضل وہ زہاد ہوں گے جو اس کے وعدوں پر سب سے زیادہ راغب ہوں گے (**اعظمهم فيما عنده رغبة**) اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ باعزت وہ زہاد ہوں گے جو سب سے زیادہ تقوی کی روش اختیار کرنے والے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے مکمل وہ زہاد ہوں گے جو سب سے زیادہ سخاوت کرنے والے اور اس کے سامنے سب سے زیادہ جھکنے والے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے

نزدیک سب سے کامل زہاد وہ ہوں گے جو یقین میں سب سے زیادہ ہوں گے- (۴۰)

طریقہ زہد: شقیق بلخی نے زہد کا راستہ اور راستہ میں آنے والی منازل کا بیان تفصیل سے کیا ہے لیکن ان کی بیان کردہ منازل بعد کے صوفیہ کے بتائے ہوئے منازل سے قدرے مختلف ہیں- ان کی زیادہ توجہ آخرت کی فکر اور اس فکر کے پیش نظر دنیا کے اعمال کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق انجام دینے کا نام ہے- اس دنیا میں انسان کو آرام و راحت بھی ہیں اور تکلیف و کلفت بھی، سالک کے لیے ضروری ہے کہ آرام و راحت اس کو خدا کی یاد سے غافل نہ کردے اور تکلیف و مصیبت اس کو فریاد و واویلا اور رحمت خداوندی سے مایوس نہ کردے، بلکہ آرام و راحت موجب شکر گزاری ہو اور تکلیف پر صبر کرے- فرماتے ہیں کہ زہد کے راستہ کی طرف لے جانے والے دروازے چھ ہیں-

1- بھوک پر رضا اور سرور کے ساتھ صبر کرنا نہ کہ واویلا اور فتور کے ساتھ-
2- غریبی پر خوشی کے ساتھ صبر کرنا نہ کہ غم کے ساتھ-
3- طویل فاقہ کشی پر فضل و اقبال کے ساتھ صبر کرنا نہ کہ افسوس کے ساتھ، گویا کہ وہ بھوکا ہے ہی نہیں بلکہ شکم سیر ہے-
4- عاجزی اور ذلت پر بہ طیب خاطر صبر کرنا نہ کہ کراہت کے ساتھ-
5- مصیبتوں پر رضامندی سے صبر کرنا نہ کہ ناراض کے ساتھ-
6- کھانے، پینے اور لباس کے بارے میں طویل غور وفکر کرنا کہ وہ کہاں سے آیا، کیسے آیا اور ممکن ہے کہ ایسا ہوا اور ہوسکتا ہے کہ ویسا ہو- (۴۱)

شقیق بلخی کے اس قول میں دو نکتے بیان کیے گئے ہیں- ایک تو یہ کہ مصیبت پر ہر حال میں بہ طیب خاطر صبر کرنا چاہیے- یہ مصیبت بھوک و پیاس کی ہو چاہے ذلت و تکالیف کی ہو، دوسرا یہ کہ حرام چیزوں سے اجتناب کرنا چاہیے-

شقیق بلخی نے زاہد اور متزہد کے درمیان فرق کرتے ہوئے دونوں کی خصوصیات شمار کرائی ہیں اور لوگوں کو نصیحت کی ہے کہ وہ متزہد کی صحبت سے بچیں، متزہد کی خصوصیات بتاتے ہوئے کہا ہے کہ متزہد وہ ہے جو دیکھنے میں خشوع و خضوع میں اپنے مدخل اور مخرج میں، کھانے اور لباس میں، اپنی چلنے اور اعمال میں اور اپنی خواہشات میں زاہدوں کے مشابہ روش اختیار کرے لیکن دنیا

سے اس کی رغبت اور محبت اس کے اس دعوی کے خلاف گواہی دے- اس کی رضا راغبین کی رضا کی طرح ہوگی- اس کا حسد، اس کے مقاصد، اس کی لمبی چوڑی باتیں، اس کا گھمنڈ، اس کا فخر، اس کی بداخلاقی اور اس کی لچھے دار گفتگو اور لا یعنی باتوں میں اس کا مستقل پڑے رہنا اس کے نفاق کی دلیل ہیں، اس سے بچو لیکن اگر کسی شخص میں یہ دس خصائل ہوں تو اس کے بارے میں امید ہے کہ وہ زہد کے کسی نہ کسی دروازے میں ضرور ہوگا- وہ دس خصائل یہ ہیں:

1- جب نیکی سے اس کو خوشی ہو اور برائی پر افسوس کرے-
2- اچھے کام کرنے پر اپنی تعریف کو ناپسند کرے اور اچھا کام کیے بغیر اس پر تعریف سے ایسے نفرت کرے جیسے خنزیر اور مردار کے گوشت یا خون سے نفرت کرتا ہے-
3- جب ان خصلتوں کو پہچان لے اور انہی میں اپنے دن اور رات کے اوقات صرف کرنے لگے اس کی خواہشات کم ہو جائیں گی اور جو سامنے ہے (یعنی موت اور قیامت) کی فکر بڑھائے گی-
4- جب آدمی ایسے کام میں مشغول ہوگا جس کے لیے اس کو پیدا نہیں کیا گیا ہے تو اس کے غم بڑھ جائیں گے- ایسا لگے گا جیسے وہ مجنوں ہے- پھر وہ اس چیز کو اسی وقت چھوڑ دے جس نے اس کو اطاعت الٰہی سے روکے رکھا تو اس سے اس کو زہد کی مٹھاس ملے گی اور اس کے ذریعہ وہ شیطان کے گروہ سے چھٹکارا پائے گا-
5- اللہ تعالیٰ کا ذکر ان کے نزدیک شہد سے زیادہ میٹھا، برف سے زیادہ ٹھنڈا اور سخت گرمی کے پیاسے کے لیے صاف اور ٹھنڈا اور میٹھا پانی جتنا لذت آگیں ہوتا ہے اس سے زیادہ لذیذ ہو جائے گا-
6- اس کو ان لوگوں کے پاس بیٹھنا جو زاہدوں کی تعریف کریں اور اس کو نصیحت کریں زیادہ اچھا لگے گا بہ نسبت ان کے جو انھیں درہم و دینار دیں-
7- اگر کوئی شخص اپنے گناہوں پر بہت نہ روئے تو اس کی توبہ قبول نہ ہوگی-
8- اس کی مسکراہٹ اور اس کی خوشی و مسرت کی کیفیت سے لوگ سمجھیں گے کہ اہل رغبت میں سے ہے نہ کہ اہل خوف میں سے-
9- اس کا دل اس سے یہ نہ کہے کہ تو کسی بھی اہل قبلہ سے افضل ہے-

10- اپنے گناہوں پر نظر رکھے دوسرے کے عیوب سے بچے-

جس شخص میں یہ دس چیزیں ہوں گی وہ امید ہے کہ زہاد کے طریقہ پر ہوگا- ان دس کے بعد سات اور ابواب ہیں-

1- اللہ تعالیٰ کے سامنے دل سے عاجزی کرنا نہ کہ صرف زبان سے-
2- اللہ تعالیٰ کے سامنے خوشی سے جھکنا نہ کہ ناپسندیدگی سے-
3- لوگوں سے بغیر لالچ کے حسن معاشرت اختیار کرنا-
4- دنیا کی طرف جھکنے والوں سے ایسے بھاگنا جیسے گدھا شیر سے- اور ان سے ایسی نفرت کرنا جیسے گدھا درندوں کی آواز سے کرتا ہے-
5- ہر ایسی چیز سے پناہ چاہنا جس کے عذاب کا ڈر ہو یا ثواب کی کوئی امید نہ ہو-
6- اپنے گناہوں پر رونے والوں کی صحبت اختیار کرنا-
7- اور موت کے بعد ہونے والے شدائد و مشکلات سے خوف کھانا-

جس کے اندر یہ باتیں ہوں گی وہ گویا سب سے افضل عبادت پر ہے اور زہاد کے طریقہ پر گامزن ہے- (۴۲)

حلیہ الاولیا میں یہ پوری گفتگو ہے- اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شاید کسی مجلس کی گفتگو ہے یا کسی سالک کو کی گئی نصیحت ہے- اس میں ان کے افکار بہت مربوط نہیں ہیں اگر ان افکار کو مربوط کیا جائے-

1- ہر قسم کی مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کرے اور اس پر صبر کرے اور اس کو بہ طیب خاطر برداشت کرے-
2- ریاکاری اور نمود و نمائش سے اور غرور و تکبر سے دور رہے- نیک کام کرنے پر اس کو خوشی ہو برے کام کے سرزد ہو جانے پر افسوس ہو، نیک کام پر اگر کوئی اس کی تعریف کرے تو اس کو ناگواری ہو- لیکن اگر ایسے کام پر کوئی اس کی تعریف کرے جو اس نے کیا ہی نہ ہو تو اس کو حد درجہ ناپسند کرے-
3- ہر وقت مستقبل یعنی موت اور قیامت کے حساب کی فکر میں رہے-
4- اچھے لوگوں کی صحبت اختیار کرے-

5- اپنے عیوب پر نظر رکھے اور دوسروں کی خوبیوں پر نظر رکھے، وغیرہ-

اگر کسی شخص میں یہ اوصاف پیدا ہو جائیں تو اس کے بارے میں یہ سوچا جا سکتا ہے کہ وہ زہد کی راہ پر گامزن ہے، لیکن اگر یہ اوصاف نہ پائے جائیں اور زہد کا دعویٰ ہو تو وہ متزہد ہے- ایسے لوگوں کی صحبت سے بچنا چاہیے-شقیق بلخی نے زاہد اور متزہد کے درمیان فرق کرنے کا ایک اصول بتایا ہے کہ زاہد اپنے عمل سے زاہد ہوتا ہے اور متزہد اپنے قول سے(۴۳) وہ سالک کو نصیحت کرتے تھے کہ دیکھو تم اللہ تعالیٰ کے معاملے میں کتنے جری ہو اور اللہ تعالیٰ کتنا حلیم ہے-(۴۴)

فکرآخرت: شقیق بلخی کی نصیحتوں میں سب سے زیادہ زور فکرآخرت پر ہے-شقیق بلخی کی نظر میں اہل طاعت ہی زندہ لوگوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں گناہ گار تو مردوں کی مانند ہیں- سالک کو ہمہ وقت اس فکر میں رہنا چاہیے کہ مرنے کے بعد کی تیاری پوری رہے- فرماتے تھے کہ موت کی ایسی تیاری کرو کہ جب موت آجائے تو یہ احساس نہ رہے کہ کاش اور مہلت ملتی-(۴۵)

شقیق بلخی کے نزدیک عقل مند آدمی وہ ہے جو ہر وقت ان تین حالتوں میں سے کسی ایک حالت میں رہے-

1- اپنے پچھلے گناہوں پر ہر وقت خوف زدہ رہے-
2- اس پر اگلا لمحہ کیا گزرے گا یہ اس کو معلوم نہ ہو- یعنی ہر وقت اگلے لمحے کی فکر میں لگا رہے-
3- انجام کار سے ہر وقت خائف رہے چونکہ وہ نہیں جانتا کہ اس کا خاتمہ کس چیز پر ہوگا-(۴۶)

عبادت: عبادت کے سلسلے میں عام طور پر مسلمانوں کا رجحان یہ ہے کہ عبادت انسانی زندگی کا مقصد ہے اور عبادت کا مقصد یہ ہے کہ بندہ دنیا میں ایک مطمئن زندگی گزارے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام کا مستحق قرار پائے- اس کو جنت مل جائے اور جہنم سے چھٹکارا مل جائے-شقیق بلخی نے عبادت کے اس مقصد کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے- انھوں نے فرمایا کہ ''عبادت کا حسن چار چیزیں ہیں-

1- جب بندہ اپنے آپ کو عبادت میں منہمک دیکھے تو اپنے دل سے کہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے- اور میرے اوپر اللہ تعالیٰ نے ہی یہ انعام فرمایا ہے وہ جب یہ سوچے گا تو اس کے اندر

سے گھمنڈ کا مادہ ختم ہو جائے گا-

2- اس کا دل ہر وقت ثواب میں اٹکا رہے چونکہ جب اس کا دل ثواب میں لگا رہے گا تو ریا کاری کا خیال ٹوٹ جائے گا- کیونکہ اب وہ اس نیت سے عمل کرے گا کہ اس کو اس پر ثواب ملے- اگر شیطان اس کے دل میں وسوسہ بھی ڈالے گا تو وہ کہے گا میں یہ کام اس لیے کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو اس پر ثواب عنایت فرمائے- جب وہ اس امید پر عمل کرے گا کہ اللہ تعالیٰ اس کو ثواب عطا فرمائے تو لوگوں سے اس کی امیدیں اور لالچ (طمع) ختم ہو جائے گی-

طمع یا لالچ کا مطلب ہے خدا کو بھول جانا، بندہ جب اللہ کو بھول جائیگا تو اپنی امیدیں مخلوق سے وابستہ کرے گا-(۴۷)

معرفت: شقیق بلخی نے معرفت کے بارے میں فرمایا کہ معرفت چار طرح کی ہوتی ہے:

1- اللہ کی تعالیٰ کی معرفت-
2- اپنے نفس کی معرفت-
3- اللہ تعالیٰ کے امر و نہی کی معرفت
4- اللہ تعالیٰ کے دشمنوں اور اپنے نفس کے دشمنوں کی معرفت-

اللہ تعالیٰ کی معرفت یہ ہے کہ بندہ دل سے یہ جانے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے نہ کوئی دینے والا ہے نہ کوئی روکنے والا ہے نہ نقصان پہچانے والا ہے نہ فائدہ پہنچانے والا-

معرفت نفس یہ ہے کہ تمھارا نفس یہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر نہ تمہیں کوئی نفع دے سکتا ہے نہ نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ تم کوئی کام کر سکتے ہو-

اللہ تعالیٰ کے امر و نہی کو جاننے کا مطلب ہے کہ تم یہ جان لو کہ تمہارے اوپر اللہ تعالیٰ کا حکم بجا لانا لازم ہے اور تمھارا رزق اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے- اور اس پر یقین کامل ہو کہ تمہیں رزق ملے گا، اعمال کو خلوص کے ساتھ انجام دو- اور اخلاص عمل کی پہچان تمہارے اندر دو خصلتوں کا ہونا ہے-طمع اور جزع یعنی تڑپ-

اللہ تعالیٰ کے دشمن کی معرفت کا مطلب یہ ہے کہ تم یہ جان لو کہ اللہ تعالیٰ کا ایک دشمن ہے اس سے جنگ کے بغیر اللہ تعالیٰ تمھارا کوئی عمل قبول نہیں کرے گا- اور یہ جنگ دل کے اندر ہوتی

ہے- آدمی اپنے دل میں جنگ کرے، جہاد کرے اور دشمن کو تھکا دینے والا ہے-(۴۸)

شقیق بلخی نے مزید فرمایا کہ معرفت کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ یہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ تمہارے پاس جو چیز ہے اس کو لے کر دوسرے کو دے دے- اور اگر تمہارے پاس کوئی چیز نہ ہوتو وہ تم کو دے دے-(۴۹)

اوپر کے صفحات میں حضرت شقیق بلخی علامہ الرحمہ کی حیات اور ان کے افکار کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا اس سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کس عظیم پائے کے صوفی تھے اور انھوں نے تصوف کی فکری تاریخ کا منہاج متعین کرنے کے لیے کتنا عظیم کارنامہ انجام دیا-

حوالہ جات

۱- ابونعیم اصفہانی: حلیۃ الاولیا وطبقات الاصفیا، دارالکتاب العربی، بیروت، لبنان غیر مؤرخہ، ص: ۸/ ۷، ابوالقاسم القشیری: الرسالہ، اردو ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد محسن، ادارۂ تحقیقات اسلامی پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۵۸، ص: ۱۳۹-۱۳۸-

۲- ابن الملقن: طبقات الاولیا تحقیق وتخریج نورالدین شریبہ، دارالمعرفۃ، طبع دوم ۱۹۸۶، ص: ۱۳، الرسالہ- (محولہ بالا، ص: ۱۳۹)

۳- الرسالہ (محولہ بالا) ص ۱۳۸

۴- ایضاً ص ۱۳۸

۵- ابن الملقن (محولہ بالا) ص ۱۵

۶- ذہبی: تاریخ الاسلام، تحقیق عمر عبدالسلام تدمری، دارالکتاب العربی، بیروت، طبع دوم ۱۹۹۹۳ص: ۲۳۰

۷- جمال الدین ابوالفرج ابن الجوزی: صفۃ الصفوۃ، تحقیق ابراہیم رمضان اور سعید اللحام، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۷۹ص: ۲/ ۳۹۰

۸- حلیۃ الاولیا (محولہ بالا ۸/ ۵۹)، تاریخ الاسلام، ص۱۲/ ۲۲۹

۹- تاریخ الاسلام۱۲/ ۲۲۹

۱۰- الرسالہ، ص: ۴۴۲

۱۱- طبقات الاولیا، ص: ۹

۱۲- تاریخ الاسلام-۱۲

۱۳- ذہبی: العبر فی خبر من غبر، تحقیق فواد سید، کویت، ۱۹۶۱، ص: ۱/ ۳۱۹

۱۴- طبقات الاولیا، ص: ۱۴

۱۵- ابوعبدالرحمٰن السلمی: طبقات الصوفیہ، تحقیق نورالدین شریبہ، دارالکتاب العربی، مصر، ۱۹۵۳، ص: ۶۲-۶۳

۱۶- تاریخ الاسلام، ص: ۱۲/ ۲۳۱

۱۷- تاریخ الاسلام، ص: ۱۲/ ۲۲۹

۱۸- تاریخ الاسلام، ص: ۱۲/ ۲۳۱

۱۹- تاریخ الاسلام، ص: ۱۲/ ۲۲۹

۲۰- تاریخ الاسلام، ص: ۱۲/ ۲۳۱

۱۲- ابن العماد: شذرات الذہب، تحقیق عبدالقادر ارناؤط اور محمود الارناؤط، دار ابن کثیر، بیروت، ۱۹۸۸، ص: ۴۴۲

۲۲- صفۃ الصفوۃ، ص: ۴/ ۱۳۵

۲۳- حلیۃ الاولیا، ص: ۸/ ۴۶

۲۴- تاریخ الاسلام، ص: ۱۲/ ۲۲۹

۲۵- ابن اثیر: الکامل فی التاریخ، ص: ۵/ ۲۷۰

۲۶- شذرات الذہب، ۴/ ۴۴۲

۲۷- ابن الجوزی: المنتظم فی تاریخ الملوک والامم، طبع حیدرآباد، ۱۳۵۷، ص

۲۸- ابن خلکان: وفیات الاعیان، طبع بولاق، ص ۲/ ۱۷۱

۲۹- حلیۃ الاولیا، ص: ۸/ ۳۴، الرسالہ، ص: ۱۴۰

۳۰- حلیۃ الاولیا، ص: ۸/ ۶۴

۳۱- طبقات الاولیا، ص: ۳۱

۳۲- عبدالرحمٰن بدوی: تاریخ التصوف الاسلامی، وکالۃ المطبوعات، کویت، ۱۹۷۵، ص: ۲۴۲

۳۳- الرسالہ،ص: ۱۳۸
۳۴- طبقات الصوفیہ،ص:۶۳
۳۵- حلیۃ الاولیا،ص: ۸/۶۲-۶۱
۳۶- طبقات الصوفیہ،ص:۶۳
۳۷- طبقات الصوفیہ،ص:۶۴
۳۸- حلیۃ الاولیا،ص: ۸/۷۰
۳۹- حلیۃ الاولیا،ص: ۸/۶۲
۴۰- حلیۃ الاولیا،ص: ۸/۷۰
۴۱- حلیۃ الاولیا،ص: ۸/۷۰
۴۲- حلیۃ الاولیا،ص: ۸/ ۶۷-۶۶
۴۳- طبقات الصوفیہ،ص:۶۴
۴۴- طبقات الصوفیہ،ص: ۶۵
۴۵- طبقات الصوفیہ،ص:۶۳
۴۶- طبقات الصوفیہ،ص:۶۴
۴۷- حلیۃ الاولیا،ص: ۸/۶۰
۴۸- حلیۃ الاولیا،ص: ۸/۶۰-۶۱
۴۹- حلیۃ الاولیا،ص: ۸/۶۶

ooo

پروفیسر علی احسان ایتک
ترجمہ: محمد ضیاء الرحمٰن علیمی

معاصر ترکی میں صوفی تحریکیں

مرکز برائے مطالعہ مذاہب وثقافت، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی اور بابا ورسا سنگھ جی مہاراج میموریل ٹرسٹ، گدئی پور، نئی دہلی کے اشتراک سے ۱۷، ۱۸ فروری ۲۰۱۰ کو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں Mysticism in World Religions کے موضوع پر دو روزہ عالمی سیمینار منعقد ہوا- دوسرے دن کے اجلاس میں پروفیسر علی احسان ایتک (صدر شعبۂ الٰہیات ۹ر ستمبر یونیورسٹی، ترکی) نے زیر نظر مقالہ "Sufi Movements in Contemporary Turkey" کے عنوان سے پڑھا- مولانا ذیشان احمد مصباحی اور مولانا اشرف الکوثر مصباحی جو جامعہ کے مذکورہ مرکز سے وابستہ ہیں، نے پروفیسر علی احسان ایتک سے ملاقات کی اور ان سے گزارش کر کے ان کا مقالہ حاصل کیا یہ مقالہ ترکی میں تصوف اور صوفیہ کی موجودہ صورت حال کو بخوبی پیش کرتا ہے- اس کے مصادر و مراجع زیادہ تر ترکی کتابیں تھیں جن کا ترجمہ مشکل تھا اس لیے مصادر و مراجع کو من وعن نقل کر دیا گیا ہے- (علیمی) -

گرینڈ نیشنل اسمبلی کے فیصلہ نمبر ۶۷۷/ ۱۹۲۵ صادر کردہ ۳۰ نومبر ۱۹۲۵ کے تحت ترکی میں خانقاہوں کو بند کر دیا گیا اور تب سے ہی ترکی میں تصوف پر پابندی عائد ہے، اندازہ یہ تھا کہ ترکی میں تصوف زیادہ سے زیادہ پندرہ سالوں تک زندہ رہے گا لیکن بعد کے ادوار میں ناموافق سیاسی انقلابات کی وجہ سے ترکی سماج میں تصوف اب تک زندہ ہے، پابندی عائد ہونے کی وجہ سے سرکاری طور پر تسلیم شدہ کوئی صوفی تحریک، سلسلہ تصوف اور کوئی خانقاہ نہیں ہے جو اپنی سرگرمیوں کو

سرکاری طور پر انجام دے سکے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت ترکی میں کوئی ایسا نظام تصوف یا ایسی کوئی خانقاہ نہیں ہے جہاں روایات کے مطابق درویش وصوفیہ رہتے ہوں، ان کی تربیت کا کوئی باقاعدہ انتظام ہو، ان کا اپنا بجٹ ہو اور ان کا اپنا پروگرام بھی ہو، البتہ اس وقت ترکی میں صوفیانہ زندگی اور سلاسل تصوف کا ایک ایسا رنگ سامنے آیا ہے جو نسبتاً تو بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت اس نے ماڈرن سماجی اور قانونی صورت حال سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا ہے، ان دو مختلف صورت حال کی وجہ سے چند سماجی اور نفسیاتی مسائل نے جنم لے لیا ہے۔

پہلا یہ کہ سرکاری قانون کے نفاذ کی وجہ سے صوفی تنظیموں اور تحریکوں کی حیثیت، غیر قانونی زمین دوز ڈھانچوں کی سی ہوگئی ہے جس کی بنیاد پر یہ پتا لگانا بڑا مشکل ہوگیا ہے کہ تصوف کے تئیں لوگ کیسا گمان رکھتے ہیں اور صوفی ازم کی سرگرمیاں کیا ہیں؟ اور اسی بنا پر صوفیانہ سرگرمیوں کے بارے میں زیادہ تر معلومات کا دار و مدار پولس رپورٹ، پولس انکوائری اور پریس ریلیز پر ہوتا ہے جو عموماً مبالغہ آمیزی اور قیاس و اندازے پر مبنی ہوتے ہیں اور اسی غیر یقینی صورت حال کا نتیجہ ہے کہ صوفی سلاسل سے جڑے افراد کی قیاسی تعداد دو سے سات ملین تک بتائی جاتی ہے اور اسی متضاد صورت حال کی وجہ سے مذہبی قائدین، سیاست داں حضرات مائل بہ تصوف لوگوں کا استحصال کرتے ہیں۔

دوسرا یہ کہ اس پابندی کی وجہ سے بدلتے سماجی تقاضے کے مطابق صوفیانہ نظریات و اعمال کی تعبیر و تشریح اور اس کی اصلاح کا عمل بھی انجام نہیں پا رہا ہے کیوں کہ متبادل افکار و اعمال پر بحث و مباحثہ ممکن ہی نہیں رہ گیا ہے۔

تیسرا یہ کہ صوفی سلاسل کے معتقدین اور حکومت کے ذمہ داروں کے مابین کچھ ایسے ناخوشگوار تنازعات اور اختلافات پیدا ہوگئے، اس کی وجہ سے معتقدین، حکومت کے تئیں تشدد پسندانہ رویہ اپنالیا جس کی بنا پر حکومت کی چند پالیسیاں جیسے کہ ریڈ کریسنٹ، اور تحفظ اطفال وغیرہ کو عوامی حمایت حاصل نہیں ہوسکی۔

چوتھا یہ ہے کہ ان سلاسل تصوف اور خانقاہوں کو قانونی جواز رکھنے والی سوسائٹی یا خیراتی اداروں کے طور پر منظم کیا گیا تاکہ انھیں قانون کی زد سے بچایا جاسکے اور اس کی وجہ سے یہ سوچ عام ہوئی کہ مختلف سیاسی اور مذہبی تنظیموں کا طریقہ کار ایک ہی ہے، چنانچہ بہت سے وہ گروپ جن

کو تصوف کے خلاف سمجھا جاتا ہے ان کا بھی کسی نہ کسی سلسلے میں تذکرہ مل جاتا ہے۔

۱-سلسلہ نقش بندیہ

صوفی سلاسل میں نقش بندیہ ترکی کا سب سے بااثر سلسلہ ہے اس سلسلے کی بنیاد حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقش بند نے چودہویں صدی عیسوی میں ڈالی۔ اسے سلسلہ نقش بندیہ احراریہ، نقش بندیہ مجددیہ اور نقش بندیہ خالدیہ کے نام سے جانا جاتا ہے اگرچہ اس سلسلے کی شاخ نقش بندیہ خالدیہ یہاں سب سے زیادہ رائج ومقبول ہے لیکن نقش بندیہ مجددیہ بھی یہاں فعال و سرگرم ہے، نقش بندی خالدی سلسلے کی اہم شاخیں کچھ اس طرح ہیں۔

(الف) سلسلہ اسکندر پاشا: اس سلسلہ سے متعلق افراد میں جہاں دوسرے معتقدین و متوسلین ہیں وہیں مشہور نقش بندی شیخ محمد زاہد کوتکو (متوفی ۱۳ نومبر ۱۹۸۳) بھی ہیں۔ سلاسل پر پابندی کی وجہ سے شیخ کوتکو نے اپنے زمانے میں بڑے مسائل کا سامنا کیا لیکن اس کے باوجود قانونی ہم آہنگی کے ساتھ انھوں نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ رہی کہ انھوں نے لوگوں کی ضعیف الایمانی کو دور کیا اور پھر سے صوفی تحریک میں قوت و جوش بھر دیا۔ شیخ کوتکو کا نظریہ تھا کہ جہالت نفس امارہ کی آواز ہے اور اسی بنا پر انھوں نے علم اور علمیت پر بڑی توجہ دی، ان کے خیال میں علم لوگوں کو جنت تک پہنچانے کا مختصر ترین راستہ ہے اور اسی کے پیش نظر انھوں نے اپنی پوری زندگی علم اور علمی سرگرمیوں میں صرف کردی، انھوں نے اپنی خانقاہ کی صوفیانہ سرگرمیوں کی بنیاد تعلیمات حدیث پر رکھی اور اس مقصد کے لیے انھوں نے 'رموز الحدیث' نامی کتاب کو اپنے یہاں درس میں شامل کیا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے شاگرد اور تربیت یافتہ پروفیسر عزت جوزان ان کے جانشین ہوئے۔ پروفیسر جوزان کے مطابق صوفیانہ تربیت کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی زندگی رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے مطابق ہوجائے اور وہ قرآنی اصول و اخلاق کے مطابق سیکھنا اور جینا شروع کردے۔ سالک کو چاہیے کہ وہ اچھی باتوں کو اختیار کرے اور بری باتیں جیسے فضولیات، جھوٹ اور غیبت سے بچے جس سے کہ لوگوں کے آپسی میل محبت میں فرق آتا ہے۔ کیوں کہ جن لوگوں کے مابین محبت نہیں ہوتی وہ انسانیت کی خدمت کرنے کے اہل نہیں ہوتے۔ شیخ جوزان کے زیر تربیت جماعت نے ۱۹۸۳ سے جزل آف اسلام

(Islam Dergisi) کے نام سے ایک میگزین نکالنا شروع کیا جس میں پہلا مقالہ شیخ جوزان تھا جو ان کے قلمی نام خلیل نجاتی گولو سے شائع ہوا- شیخ جوزان نے اپنے اس مقالے میں لکھا کہ مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کے معیار کو بلند کرنا ان کا مقصد ہے- اس جرنل کے علاوہ سلسلہ اسکندر پاشا کی طرف سے ماہنامہ ’وومین اینڈ فیملی‘‘ (Women and Family) سہ ماہی سائنس اینڈ آرٹ (Science and Art) اور بچوں کے لیے ’روز چائلڈ‘ (Rose Child) بھی شائع ہوتا ہے- خصوصاً جرنل آف اسلام میں اسلام سے متعلقہ جملہ مسائل پر گفتگو ہوتی ہے- عقائد، فقہ، حدیث، تفسیر، تصوف، اسلامی تاریخ اور اسلامی اداروں سے متعلق انٹرویوز اور مقالات شائع کیے جاتے ہیں، جس میں شیخ زاہد کوتکو کے انٹرویوز اور خلیل نجاتی گولو کے مقالات بھی ہوتے ہیں اس اسلامی جرنل کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اسلامی دنیا کی تمام سرگرمیوں پر نظر رکھتا ہے اور جب کبھی کسی مسلمان کو کوئی مشکل درپیش ہوتی ہے تو وہ اس پر مقالہ شائع کرنے کی کوشش کرتا ہے-

(ب) سلسلہ اریکوئی: یہ جماعت شیخ محمود سامی رمضان گولو کے معتقدین ومتبعین پر مشتمل ہے- شیخ رمضان گولو کی پیدائش ۱۸۹۲ ’عدنا‘ (Adana) میں ہوئی- ان کے بارے میں مانا جاتا ہے کہ وہ ایک ترکی قبیلہ ’اوکوکلار‘ (Ucoklar) کے اوغوز (Uguz) خاندان سے تھے اور ان کا سلسلہ نسب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے- انھوں نے عدنا میں ہی اپنی تعلیم مکمل کی اور پھر وہاں سے یونیورسٹی کی تعلیم کے لیے استنبول گئے- فیکلٹی آف لا سے گریجویشن فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا- وہاں تھوڑے دنوں تک نقش بندی خالدی سلسلے کی ایک خانقاہ سے متعلق رہے پھر بعد میں کلامی درویش لاج نامی ایک دوسری نقش بندی خالدی خانقاہ، جس کے سرپرست شیخ اربیلی محمد عزت (متوفی ۱۹۳۱) تھے، سے جڑ گئے اور ان کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے- وہ عدنا اس زمانے میں لوٹے جب کہ خانقاہوں پر پابندی عائد ہوچکی تھی چنانچہ انھوں نے جامع کبیر میں تبلیغ شروع کی اور اپنے سلسلے کی سرگرمیوں کو مذاکرہ کی مجلسوں کے ذریعہ برقرار رکھا اور بطور پیشہ ایک اکاؤنٹینٹ (Accountant) کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے- اس خانقاہ کی سرگرمیوں کی بنیاد تفسیر قرآن ہے- ان کے علاوہ شیخ رمضان گولو ایمانیات، اخلاقیات اور تربیت نفس جیسے مسائل پر گفتگو کرتے ہیں- وہ فرماتے ہیں کہ ذکر الٰہی دل کی غذا اور محبت و ایمان کا معیار ہے اور سوتے یا جاگتے ہر وقت دل کی حالت ایسی ہونی چاہیے کہ وہ اللہ کی یاد میں محو ہو، اس

سے غافل نہ ہو- وہ اس بات پر ہمیشہ بہت زور دیتے ہیں کہ کم کھانا، کم سونا اور کم بولنا تصوف کے بنیادی اصولوں میں سے ہے- شیخ رمضان گولو نے پوری زندگی اپنے اعلیٰ اخلاقی معیار کو برقرار رکھا، ہمیشہ اپنی اصلاح اور دوسروں کی اصلاح پر توجہ دی، کسی کا دل نہیں توڑا اور اپنی آخری سانس تک سرگرم عمل رہے اور اپنے پیشے سے بھی جڑے رہے، کیوں کہ وہ مانتے تھے کہ حلال کمائی عبادت کی روح ہے- ۱۹۸۴ میں سامی رمضان گولو کے انتقال کے بعد موسیٰ تپباس (Tapbas) ان کے جانشین ہوئے لیکن سلسلے کی سرگرمیوں کی نگرانی ایک کمیٹی کرتی ہے جو چار افراد پر مشتمل ہے اس کمیٹی نے ۱۹۸۶ میں الٹی نولوک (Altinoluk) نامی ایک جرنل شائع کرنا شروع کیا جس میں اس بات پر بحث کی گئی کہ اسلامی نظام برپا کرنے کے لیے ایک بنیاد پرست انقلاب لانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ لوگوں کو تربیت دینے کی ضرورت ہے، جب لوگ ایک مثالی اسلامی زندگی گزارنے لگیں گے تو اس کے ساتھ ہی ایک سماجی انقلاب آ جائے گا- اس جرنل کی اشاعت کا مقصد سماج میں ایمانی شعور اور عبادت کے تئیں احساس ذمہ داری بیدار کرنا ہے- یہ سلسلہ ایمانی حقائق کو ثابت کرنے کے لیے دوسرے سلسلوں کی طرح سائنس کا سہارا نہیں لیتا ہے بلکہ اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ راہ تصوف پر گامزن رہ کر لوگوں کے دلوں میں جگہ بنائی جائے اور ان تک موثر انداز میں اپنی بات پہنچائی جائے-

اس سلسلے کے پاس عددی قوت تو زیادہ نہیں ہے لیکن عموماً جو لوگ ہیں وہ خوشحال اور صاحب ثروت ہیں- چنانچہ یہ لوگ اسلام کی جانب مائل یونیورسٹی کے طلبہ کو مالی اعانت پیش کرتے ہیں اور اپنی ایسی ہی سرگرمیوں کی وجہ سے یونیورسٹیز میں یہ سلسلہ مشہور ومقبول ہے- یہ سلسلہ فاؤنڈیشن آف عزیز محمود ہدائی (Foundation of Aziz Mahmud Hudayi) اور کلچر اینڈ ایجوکیشن فنڈ آف مرادی (Culture and Education fund of Muradiye) کے تحت ثقافتی پروگراموں کا بھی انعقاد کرتا ہے-

(ج) سلسلہ اسماعیل آغا: اس سلسلہ کے قائد وپیشوا شیخ محمود استا عثمان گولو ہیں- یہ سلسلہ دراصل اسماعیل آغا مسجد کی جانب منسوب ہے، جہاں شیخ استا عثمان گولو امامت کے فرائض انجام دیتے ہیں- محمود استا عثمان گولو (ولادت: تربزان ۱۹۲۹) ایک نمایاں نقش بندی خالدی سلسلے کے شیخ حضرت اہسکالی علی حیدر (متوفی ۱۹۶۰) کے خلیفہ ہیں- اپنے شیخ کی وفات کے بعد ان کے

جانشین ہوئے اور شیخ زاہد کوتکو سے اپنے سلسلہ عقیدت ومحبت کو برقرار رکھا- شیخ کوتکو کی وفات کے بعد استا عثمان گلو زیادہ متحرک فعال اور خود مختار ہوگئے- اس سلسلے کے مطابق عورتوں کو نقاب کا استعمال ضرور کرنا چاہیے اور مردوں کو داڑھی رکھنی چاہیے اور لباس میں شلوار اور جبہ استعمال کرنا چاہیے- شیخ ہمیشہ یہ واضح انداز میں تعلیم دیتے ہیں کہ کیسے اور کس قسم کے تعلقات انہیں دوسروں کے ساتھ بنانے چاہیے اور کس طرح زندگی گزارنی چاہیے- یہ سلسلہ ماڈرن ازم اور مغربی تہذیب وتمدن اختیار کرنے کے خلاف ہے-

اس سلسلہ کی ایک اسماعیل آغا مسجد ہے- مدرسہ قرآن اور طلبا کی رہائش کے لیے ایک ہاسٹل بھی ہے- مدرسہ قرآن کے ساتھ ساتھ طالبات کی رہائش کے لیے بھی ایک ہاسٹل ہے- اور ترابزون (Trabzon)، قیصری (Kayseri)، توکت (Tokat)، اداپازاری (Adapazari) اور ازمت (Izmit) جیسے شہروں میں اس کا بڑا اثر و رسوخ ہے- استنبول کی کاؤنٹی جیسے اسکدار (Uskudar)، بائکوز (Beykoz) اور عمرانیہ (Umraniye) میں بھی اس جماعت کے متبعین کی ایک بڑی تعداد پائی جاتی ہے-

(د) سلسلہ منزل: یہ سلسلہ اس گاؤں کی جانب منسوب ہے جہاں اس کے قائد و پیشوا شیخ محمد راشد ایرول (متوفی ۱۹۹۳) رہتے ہیں اور جو ان کی سرگرمیوں کا مرکز بھی تھا- ان کی پیدائش ایک دوسرے گاؤں سنوس سیرت (Siyanus Siirat) میں ہوئی- پہلے انھوں نے اپنے والد سید عبدالحکیم حسینی (متوفی ۱۹۷۲) جو جنوب مشرقی انطولیا (Anatolia) اور شام کے مشہور مذہبی قائد اور صوفی رہنما تھے، سے تعلیم حاصل کی، بعد میں عربی، فقہ، حدیث، تفسیر کے چند اسباق دوسری مشہور شخصیات سے پڑھے- چوں کہ ان کے والد خود نقش بندی خالدی سلسلے کے مشہور شیخ تھے اور بچپن سے ہی محمد راشد ایرول صوفیانہ طرز زندگی سے واقف تھے اور اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے، اس لیے اپنے والد کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے اور بغیر کسی تعطل کے ۱۹۸۰ تک اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھا- مذہبی سرگرمیوں کی وجہ سے فوجی حکومت نے دو سال کے لیے ان کو جزیرہ گوکشادا (Gokchada) جلا وطن کر دیا-

یہ سلسلہ اگرچہ آغاز میں ایک علاقائی سلسلہ کے طور پر ابھرا تھا لیکن اس وقت اس کے پیروکار جہاں استنبول اور اس مضافات میں ہیں وہیں پورے ترکی میں اس کے متبعین موجود ہیں-

اب سوال یہ ہے کہ آخر یہ علاقائی جماعت کیسے ترکی قوم کے مابین مشہور اور عام ہوگئی- میرے خیال میں اس کے پیچھے راز یہ ہے کہ یہ جماعت ہمیشہ عام لوگوں سے گھل مل کر رہی، ان سے رشتے استوار رکھے اور لوگوں کو اچھے مشورے اور عمدہ صلاح دیے کہ کیسے اس دنیا میں اچھی طرح اور خوش وخرم زندگی گزاری جائے- اس کے علاوہ ان کی خوش اخلاقی کی بنا پر قید میں رہ رہے افراد اور دوسرے وہ افراد جو غلط ماحول میں اب تک جی رہے تھے، اب اس جماعت سے جڑ رہے ہیں ان کا اعتماد بحال ہو رہا ہے اور انھیں زندگی گزارنے کا پاکیزہ سلیقہ آ رہا ہے- جنوب مشرقی انوطالی علاقوں کو چھوڑ کر عموماً دیہاتی علاقوں میں ان کے اثرات نہیں ہیں لیکن ترکی کے بڑے بڑے شہروں میں ان کے ہمہ گیر اثرات ہیں- ان کے پیروکاروں میں ہر پیشے اور ہر عمر کے لوگ ہیں البتہ ادھیڑ عمر کے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے- یہ لوگ شیخ کی کرامتوں، ان کی روحانی امداد اور ان کے نظر کرم کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور مریدین ہمیشہ اپنے شیخ کی جانب سے امداد و کرم کے امیدوار رہتے ہیں- شیخ کی روحانی امداد کی داستانیں ان کے مریدین ہر جگہ بیان کرتے ہیں- ایسا کہا جاتا ہے کہ مریدین اپنے ہر مسئلہ میں حتی کہ روزمرہ کے کاموں میں بھی اپنے شیخ سے مشورہ ضرور لیتے ہیں- اس جماعت کے متبعین ذکر الٰہی کے لیے ایسی جگہ کو ترجیح دیتے ہیں جہاں اندھیرا اور شور وشغب نہ ہو اور ذکر کے وقت اپنی آنکھیں بند کر کے کمبل اوڑھ لیتے ہیں- کم سے کم ذکر پانچ ہزار مرتبہ کیا جاتا ہے اور عموماً صبح یا عشا کی نماز کے بعد انجام دیا جاتا ہے- یہ ذکر جو 'ختم' کہلاتا ہے اور جس کو اجتماعی انداز میں کیا جاتا ہے، مرید صادق بننے، گناہوں کی معافی اور روحانی ترقی کے لیے اس عمل کو انجام دینا ہر مرید کے لیے ضروری ہے- اس جماعت کے نزدیک تصور شیخ، اور تصور موت دونوں باتیں بہت اہم ہیں، کیوں کہ ان کے اعتقاد کے مطابق اس کی بدولت خدا کی محبت ملتی ہے- ان کے یہاں روحانی ترقی کے لیے یہ چیز ذکر الٰہی سے بھی زیادہ اہم ہے-

(ہ) سلسلہ عشقیہ: یہ سلسلہ جس کی بنیاد نقش بندی خالدی سلسلے کے شیخ حضرت عبدالحکیم ارواسی نے رکھی، اپنے شیخ کے لقب عشق (Isik) سے معروف ہے- شیخ عبدالحکیم ارواسی کے جد اعلیٰ ہلاکو کے بغداد پر حملے کے بعد ان کا قبیلہ اناطولیا (Anatolia) ہجرت کر گیا اور وین (Van) نامی علاقہ کے ارواس گاؤں میں اقامت پذیر ہوگیا- وہاں انھوں نے ایک مسجد اور خانقاہ بنائی اور وہاں چھ سو سال تک دین کی خدمت کی- نجیب فاضل قیسا قورک (Necip Fazil Kisakurik)

نے جب سے شیخ عبدالحکیم ارواسی کے احوال پر اپنی کتاب ''ہی اینڈ می'' (He and Me) لکھی ہے تب سے شیخ کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا ہے- یہ سلسہ جو کہ اپنی اقتصادی، معاشی اور تعلیمی سرگرمیوں کی وجہ سے ۱۹۸۰ کے بعد کے ادوار میں مشہور تھا، اس وقت ان کی زبردست عوامی گرفت ہے- ان کا اپنا ایک ٹی وی چینل ہے جو پورے ترکی میں نشر ہوتا ہے- ساتھ ہی اس سلسلے سے جرنل آف ہیومین اینڈ یونیورس (Journal of Human and Universe) اور جرنل آف ٹرکی چائلڈ (Journal of Turkey Child) بھی شائع ہوتا ہے- شیخ حسین حلمی عشق کی درازسنی کی وجہ سے، اس وقت ان کے شاگرد وتربیت یافتہ ڈاکٹر انور عرین (Anver Erin) سلسلہ کی انتظامی ذمہ داریاں سنبھال رہے ہیں-

عام نقش بندی خالدی سلسلے کے علاوہ کچھ علاقائی سلسلے بھی ہیں جیسے محمد لطفی (متوفی ۱۹۵۶) نقش بندی خالدی کا سلسلہ، سیواس اور ملاطیہ میں اسماعیل حقی تبرک (Toprak) (متوفی ۱۹۷۳) کا سلسلہ احرامیہ، احسان اغوز کا سلسلہ جو کہ اس وقت شہر کستا مونو (Kastamonu) اور اس کے علاقے میں سرگرم ہے اور ارزنجان اور بیبرت (Bayburt) میں موسی آفندی ویدی پاشا (متوفی ۱۹۷۴) کا سلسلہ-

(و) سلسلہ سلیمان حلمی طنخان: یہ سلسلہ سلیمان حلمی طنخان (متوفی ۱۹۵۹) کے معتقدین پر مشتمل ہے اور سلیمانیہ سے عوام میں معروف ہے- طنخان ۱۸۸۵ میں بلغاریہ میں پیدا ہوئے- ان کا تعلق ادریس بے (Bey) کی نسل سے ہے جن کو سلطان محمد فاتح نے تونہ (Tana) کے قائد کے طور پر بھیجا تھا- ان کے والد خواجہ زادہ عثمان سلستر (Silistre) میں سیتر لی (Satirli) مدرسہ کے ایک بڑے استاذ تھے-

سلیمان حلمی طنخان نے ابتدائی تعلیم سیتر لی (Satirli) مدرسے سے حاصل کی، بعد میں ۱۹۱۳ میں تعلیم کے لیے مدرسہ فاتح صحن سیمنا (Fatih Sahni Semna) اور مدرسہ سلیمانیہ بھی گئے- طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے شیخ صلاح الدین بن مولانا سراج الدین نقش بندی خالدی کی مجلس میں حاضر ہوئے اور ان کے پاس سیر سلوک مکمل کیا- بعد میں انھوں نے ۱۹۳۶ میں اپنے شیخ کی اجازت سے نقش بندی مجددی شیخ کے طور پر اپنی سرگرمیاں شروع کیں اور ۱۹۵۹ میں اپنی وفات تک اسے جاری رکھا- تصوف پر انھوں نے ایک کتاب بعنوان لیٹرز اینڈ واویل پوائنٹس

آف قرآن ود اے نیو میتھاڈ (Letters and Vowel points of Quran with a new method) یادگار چھوڑی- اس سے پتا چلتا ہے کہ اس زمانے کے سماجی اور سیاسی صورت حال کے مدنظر ان کا مقصد اصل صرف قرآن کی تعلیم کو عام کرنا تھا- یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک کمیٹی پورے سلسلے کا انتظام وانصرام سنبھالتی ہے- اس کمیٹی میں چار نمایاں نام یہ ہیں- کمال قیصر (Kacer)، حسین کپلان (Kaplan)، محمد عریقان، سیف الدین علقان اور بعد میں سلیمان طنخان کے شاگرد مثلاً حسین قماش، ہارون رشید، طیلوگولو، حلمی ترکمان، محمد عامر، لطفو دروان، مصطفیٰ عزلتم، مصطفیٰ سیر پان لی (Cirpanli) کے نام ہیں، لیکن درحقیقت سلیمان طنخان کے شاگرد کمال قیصر نے اس مشن کو اکیلے ہی آگے بڑھایا، بعد میں کمال قیصر قطحیہ سے ترکی قومی اسمبلی کے نمائندہ منتخب ہوگئے اور کونسل آف یورپ میں ترکی پارلیمنٹ یونین کے ممبر بھی بنے-

کمال قیصر کی سربراہی والے سلیمان طنخان کے سلسلے نے پہلی بار یورپ میں کام کرنے والے ترکوں کے مابین اسلامی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور ترکی میں دروس قرآن کو عام کرنے کا کام انجام دیا- اس نے پہلے مدارس قرآن شروع کیے اور بعد میں ۱۹۷۴ میں اسلامی ثقافت کے مراکز کھولے- ۱۹۷۵ میں اسلامی ثقافتی مراکز کی ایک یونین بنائی- جرمنی میں ۱۹۹۰ تک صرف اس سلسلے کی اپنی ڈیڑھ سو سے زیادہ مساجد تھیں، ترکی میں ان کی ایک ہزار سے زیادہ تنظیمیں ہیں جو فیڈریشن آف چیریٹیز ٹو اسٹوڈنٹ (Federation of Charities to Students) سے متعلق ہیں- اس سے اندازلگتا ہے کہ یہ سلسلہ تقریباً ایک لاکھ طلبا کو مالی امداد فراہم کرتا ہے-

پہلے 'افق' نامی ایک جرنل اور 'صباح' نامی ایک روزنامہ بھی شائع ہوتا تھا- فضیلت پبلی کیشن سے کچھ اشاعتیں ہوتی تھیں- اس وقت یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے گنج اکیڈمی کے نام سے ایک جرنل شائع کرنا شروع کیا ہے-

نقش بندی سلسلہ جس کا تذکرہ پہلے کیا گیا ہے، اس کا تعلق عموماً نقش بندی خالدی سلسلہ سے تھا، صرف سلیمان حلمی طنخان ہی نقش بندی مجددی سلسلے کے نمائندہ شیخ طریقت ہیں، البتہ دونوں سلسلے امام ربانی مجدد الف ثانی نقش بندی پر متفق ہیں- اس لیے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان دونوں سلسلوں کی تعلیمات حضرت شیخ مجدد کی مکتوبات پر مبنی ہیں- یہ کتاب جس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ صوفیانہ اعمال وافعال میں کوئی بھی بات شریعت سے متصادم نہیں ہونی چاہیے،

تمام نقش بندی سلسلے کی بنیاد کتاب ہے- اسی لیے نقش بندی سلسلے کے سارے مذکورہ مشائخ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ان کا مقصد احیائے شریعت اور سماج کو اسلامی رنگ میں رنگنے کے لیے جدو جہد کرنا ہے- سلسلے کے افراد جلوت میں خلوت کے اصول پر عمل پیرا ہو کر اپنی سرگرمیاں انجام دیتے ہیں- عموماً کسی خانقاہ میں نہیں رہتے بلکہ وہ سماج میں ہی رہتے ہیں اور دوسرے لوگوں سے رشتے رکھتے ہوئے وہ اپنی سرگرمیاں جاری رکھتے ہیں- پورے ترکی میں اس سلسلے کے افراد استنبول میں سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں- آبادی والے دوسرے علاقے مثلاً ازمت (Izmit)، اداپازاری (Adapazari)، بورسہ (Bursa)، بل قیصر (Bilkesir)، بیبرت (Beyburt)، غموشانی (Gumushane) بحر اسود کے علاقے کے شہر مثلاً تربزان توکت، کاستومونو، سینٹرل اناطولیا کے علاقے کے شہر مثلاً سیوائس، قیصری، انقرہ، انطاکیہ کے بحر ابیض متوسط کے علاقے، ازمیر کے ایجین (Aegean) علاقے میں، اناطولیا کے مشرقی اور جنوب مشرقی شہر جیسے مالاطیہ، ارض روم (Erzurum)، ارزنجان، ادیمان (Adyaman) سیرت (Siirt) اور بطلیس میں بھی اس سلسلے کے افراد کثرت سے ملتے ہیں، شروع سے ہی استنبول کا فاتح کاؤنٹی، ان کا مشہور مسکن رہا ہے- اس کے بعد دوسری کاؤنٹیاں مثلاً اسکودار (Uskudar)، بیکوز (Beykoz)، عمرانیہ، سیریر (Sariyer)، ایوپ (Eyup)، ایمینونو (Eminonu)، ارنکوی (Erinkoy) اور شاغلیان (Caglayan) آتی ہیں-

۲- سلسلہ خلوتیہ

اس سلسلے کی بنیاد شیخ ابوعبداللہ سراج الدین عمر بن اکمل الدین لجی خلوتی (متوفی ۱۳۴۹/ ۱۳۹۷) نے چودھویں صدی میں ڈالی- سلسلے کے شیخ ثانی حضرت یحیٰ شیروانی (متوفی ۱۴۵۷ء) کے خلفا و جانشین کے ذریعہ اس سلسلے کی اشاعت ہوئی-

اس وقت خلوتیہ سلسلے کی سب سے اہم شاخ جراحیہ ہے- اس کی بنیاد اٹھارہویں صدی کے آغاز میں شیخ نورالدین جراحی (متوفی ۱۷۲۱ء) نے استنبول میں ڈالی- سر طریق زادہ امین (متوفی ۱۷۵۹ء) نے اس کی نشر و اشاعت کی، ۱۹۲۵ء میں جس وقت خانقاہیں بند کی جا رہی تھی اس وقت سلسلہ جراحیہ کی ۲۴ سے ۲۹ خانقاہیں استنبول میں موجود تھیں لیکن صرف کرگ مرگ

(Karagumruk) کی ایک خانقاہ جمہوریت کے ابتدائی زمانے میں مشکل حالات میں اپنے وجود کو باقی رکھ سکی- جب ابراہیم فہرالدین اس خانقاہ کے شیخ تھے، اس وقت پابندی کے زمانے میں وہ خانقاہ کے نگراں ہوئے اور سلسلے کی سرگرمیوں کو جاری رکھنے میں کامیاب رہے- وہ اپنے جانشین مظفر عزاق (Ozak) (متوفی ۱۹۸۵ء) کو ساری ذمہ داریاں سونپ کر ۱۹۶۴ء میں اپنے منصب سے دست بردار ہو گئے-

مظفر عزاق کے زمانے میں سلسلہ جراحیہ کے پیروکاروں کی تعداد میں، خصوصاً امریکا اور یورپ میں اچھا خاصا اضافہ ہوا- ۱۹۸۵ء میں ان کی وفات کے بعد ابراہیم فہرالدین کے ایک دوسرے خلیفہ سفر دال (Sefer Dal) ان کے جانشین ہوئے- اس سلسلے کی سرگرمیاں قانونی طور پر ایسوسی ایشن آف انوسٹی گیشن اینڈ سسٹی نینس آف ٹرکش صوفی میوزک (Association of Investigation and Sustenance of Turkish Sufi Music) کے تحت جاری رہتی ہیں- جہاں اس سلسلے سے غیر معروف لوگ تعلق رکھتے ہیں وہیں بہت سے مشہور موسیقی کار مثلاً احمد اضحان (Ozhan)، کنعان جیلان (Canan Ceylan) وغیرہ بھی اس سلسلے سے منسلک ہیں- گرکمرگ میں دوشنہ اور جمعرات کی شام کو عمر طغرل کی سربراہی میں مذہبی مجلسیں اور محافل ذکر منعقد ہوتی ہیں-

سلسلہ خلوتیہ کی ایک دوسری شاخ سلسلہ شعبانیہ ہے جو اس وقت ترکی میں متحرک ہے- اس سلسلے کے بانی شیخ شعبان ولی (متوفی ۱۵۹۶ء) کے ذریعہ یہ سلسلہ یہاں کاستمونو سے آیا اور تا حال اس کا وجود باقی ہے- ۱۹۸۲ء تک اس سلسلے کے شیخ مصطفیٰ عزرین تھے- وہ اس بات کی تاکید کرتے تھے کہ لوگوں کو قرآن وسنت کے مطابق اپنی زندگی گزارنی چاہیے اور لوگوں کے ساتھ عدل وانصاف سے پیش آنا چاہیے- ان کے انتقال کے بعد سے یہ سلسلہ زوال پذیر ہے-

ان سلسلوں کے علاوہ دوسرے سلسلے مثلاً خلوتیہ عشاقیہ، خلوتیہ تیجانیہ بھی ترکی کے مختلف علاقوں میں موجود ہیں، لیکن ان دنوں ان کی کچھ قابل ذکر سرگرمیاں نہیں ہیں-

۳- سلسلہ قادریہ

سلسلہ قادریہ کی بنیاد شیخ عبدالقادر جیلانی (متوفی ۱۱۶۷ء) نے ڈالی- یہ اسلامی دنیا کا

مشہور ترین سلسلہ ہے- اشرف گولوعبداللہ رومی (متوفی ۱۴۷۰ء) کے ذریعہ یہ سلسلہ انطولیان (Anatolian) میں پندرہویں صدی میں پہنچا اور استنبول میں اسماعیل رومی (متوفی ۱۶۳۱ء) کے ذریعہ سترہویں صدی عیسوی کے آغاز میں آیا- درحقیقت یہ سلسلہ اس وقت ترکی میں کمزور ہے- اس وقت قادریہ سلسلے کی خانقاہیں مولویہ اور جراحیہ کی طرح سیاحوں کی نمائشی جماعت معلوم ہوتی ہیں- ان کے کچھ لوگ یورپ کے کشادہ مقامات میں محافل ذکر کا نمائشی پروگرام کرتے ہیں- اس سلسلے کی کچھ جماعتیں علاقائی حیثیت کی ہیں- اس وقت اس سلسلہ کی سب سے اہم شاخ 'سلسلہ خیری آفندی' ہے جس کے سربراہ شیخ مصطفیٰ خیری ہیں- ان کے انتقال کے بعد حیدر بعث ان کے جانشین ہوئے- یہ قادریہ سلسلہ ان دنوں زیادہ تیزی سے پھیلا ہے اور ان کی سرگرمیاں فنڈ آف اسکالرلی اسٹڈیز (Fund of Scholarly Studies) کے ذریعہ انجام پارہی ہیں- اس تنظیم کا مرکز توتربزان میں ہے لیکن یہ ترکی کے دوسرے شہروں میں بھی کام کررہی ہے اور سو سے زیادہ ترکی بھر میں اس کی آفسیں ہیں- اس تنظیم کی جانب سے دو جرنل 'دی سمری' (The Summary) اور دی ایڈوائز (The Advice) شائع ہوتے ہیں- یہ تنظیم اپنی تعلیمی سرگرمیوں سیاسی رجحانات اور بین مذاہب مکالمے کی مخالفت کی وجہ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے-

۴- سلسلہ رفاعیہ

یہ سلسلہ عراق کے قدیم ترین سلاسل تصوف میں ہے- بارہویں صدی عیسوی میں سید احمد رفاعی (متوفی ۱۹۸۲ء) نے اس کی بناڈالی- اپنے بانی کے نام کی نسبت سے اس کو سلسلہ احمدیہ بھی کہا جاتا ہے- یہ سلسلہ آگ اور سانپ سے کھیلنے، جسم میں چاقو زنی اور سوئی چبھونے کے لیے مشہور ہے- ان عجیب وغریب حرکات کا مقصد متبعین کی تعداد میں اضافہ کرنا ہے- البتہ یہ بات ضرور ہے کہ یہ ساری حرکتیں سلسلے کے بانی حضرت سید احمد رفاعی کے وصال کے بعد سلسلے میں پیدا ہوئیں- ترکی کے متاخر زمانے میں کنعان رفاعی (متوفی ۱۹۵۰ء) اس سلسلے کے سب سے بااثر شیخ طریقت گزرے ہیں- ان کی ولادت سلطنت عثمانیہ کے شہر سیلانک (Selanik) میں ۱۸۶۷ میں ہوئی- ان کے والد کا نام عبداللہ بے بن حاجی حسن بے تھا- ان کی والدہ کا نام جگن کنعان خانم تھا- وہ فرماتے تھے کہ ہر چیز کی اصلاح وبہتری خود اپنے آپ کی اصلاح وبہتری پر

منحصر ہے- اگر کوئی شخص اپنی غلط عادتوں کی اصلاح نہیں کرتا ہے تو وہ دوسروں سے بہتر تعلقات نہیں بنا سکتا، جو خود اپنے آپ کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا وہ دوسروں کو کیا فائدہ پہنچائے گا- جس کے پاس محبت اور ایمان کی دولت نہیں وہ ہمیشہ بھوکا اور محتاج رہتا ہے- اصلی دانش مندی اللہ سے محبت ہے اور اس کی پہچان یہ ہے کہ اس کی ساری مخلوق سے پیار کرے- کنعان رفاعی فرماتے تھے کہ عبادت میں مقام احسان یہ ہے کہ بندہ گویا اس وقت مشاہدہ حق میں غرق ہو جائے، کنعان رفاعی عمامہ، جبہ اور تسبیح پر زور نہیں دیتے بلکہ دل پر ان کی توجہ زیادہ رہتی ہے- وہ فرماتے ہیں کہ حکمت کے بغیر کوئی علم نہیں ہے اور ہر علم کا مقصد اصلی یہ ہے کہ عرفان حق حاصل ہو جائے اور سارے اعمال کا حاصل یہ ہے کہ اچھے اخلاق پیدا ہو جائیں- ان کے نزدیک تواضع اور خاموشی کو بڑا مقام حاصل ہے اور وہ یہ فرماتے ہیں کہ انسان کی ترقی علم کے ذریعہ ہی ممکن ہے- ان کی رائے میں ایک شیخ کے لیے صرف روحانی علم ہی کافی نہیں بلکہ اس زمانے کے مثبت ومفید علوم بھی اس کے لیے ضروری ہیں، ان کے خیال میں امام غزالی شیخ ابن عربی اور مولانا روم کی آرا تصوف کا وجود کامل ہے- صوفیانہ اخلاق یہ ہے کہ نہ کسی کا دل دکھائے اور نہ خود دکھی رہے- اس لیے اجتماعی ذکر جو بغیر سمجھے انجام دیا جائے درحقیقت بے معنیٰ ہے- کنعان رفاعی نے شخصی و انفرادی اصلاح پر بڑی توجہ دی ہے- یہ سلسلہ اچھے تعلیم یافتہ افراد خاص طور سے عورتوں کے درمیان فروغ پایا ہے کیوں کہ یہاں انھیں مسائل کا حال ملتا ہے اور عصری مسائل کی توضیح وتشریح ملتی ہے- ۱۹۵۰ء میں کنعان رفاعی کے وصال کے بعد سمیعہ ایوردی (Samiaha Ayverdi) کو جانشینی ملی اور انہوں نے سلسلہ کی قیادت کی، اس سلسلے کے متعلق افراد عموماً مذہبی موسیقی، خطاطی، زرکاری اور علمی مباحثے میں دلچسپی رکھتے ہیں-

۵- سلسلہ بکتاشیہ

یہ سلسلہ حاجی بکتاش ولی (متوفی ۱۲۷۱ء) کی جانب منسوب ہے- نیشاپور میں مذہبی علوم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے نعمان پیراندی سے تعلیم تصوف حاصل کیا- ان کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو ایک نئی زندگی جو محبت وایمان سے بھری ہے، کے لیے تیار کیا جائے- اسلامی قوانین رسوم و رواج اور مذہب کو ساتھ لے کر وہ ترکیوں کے مابین اسلام کی اشاعت میں کامیاب ہوئے-

میلامی (Melamiye) کی رائے کے مطابق تیرہویں صدی تک لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس سلسلے سے جڑی رہی- چودہویں صدی میں بلقان میں اس کی نشر و اشاعت شروع ہوئی اور دیکھتے دیکھتے یہ علاقہ سب سے مقبول عام سلسلہ بن گیا- سلسلہ بکتاشیہ میں ایک نیا موڑ اس وقت آیا جب سولہویں صدی میں سلطان بالم (Balim) کو اس سلسلے کی مشیخت عطا کی گئی- ۱۵۵۱ء میں سلیبی (Celebi) (خلفا) کی بغاوت کے بعد یہ سلسلہ دو شاخوں میں بٹ گیا- سیلبی اور بابلار (Babalar)- سیلبی شاخ کا ماننا ہے کہ حاجی بکتاش ولی نے شادی کی تھی اور ان کی اولاد بھی ہوئی اور اس لیے سلسلہ کی اشاعت ان کی اولاد سے ہوئی اور ہوگی- بابلار شاخ کے مطابق سلسلہ کا فروغ اور اس کی اشاعت وہ لوگ انجام دیتے رہے اور دیں گے جو حاجی بکتاش ولی کے روحانی جانشین ہوں گے- بدری نہیان (متوفی ۱۹۹۷ء) کے مطابق جو خود اس شاخ کی نمائندگی بھی کرتے ہیں، بکتاشیہ کوئی عام سلسلہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی فکر ہے جس میں غور و فکر پایا جاتا ہے اور جہاں انسانی روح اور دل پر یقین و اعتماد کیا جاتا ہے- بکتاشیہ سلسلے کے مطابق مرید کے بیعت ہونے سے پہلے خود اسے موت آجاتی ہے، یعنی وہ اپنی پرانی زندگی سے الگ ہوکر ایک نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے، اسی لیے بیعت و ارادت کے عمل کو قربانی کا نام بھی دیا جاتا ہے- نہیان کے مطابق سلسلہ بکتاشیہ کی بنیاد عرفان نفس، فنائے نفس، توازن و احتشام، ترک محرمات، ایمان داری، نرم دلی، دوسروں کی امداد، مصائب پر صبر، بہتان تراشی، حسد، تکبر، دشمنی اور فضولیات سے احتراز پر ہے- نہیان کے مطابق جو بکتاشیہ سلسلے میں بیعت چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کی عمر کم از کم ۱۸ سال ہو اور اس کے اندر بیعت کی طلب بھی ہو- ہوشیار، خوبیوں کا مالک، اخلاقی طور پر بلند اور سیکھنے کی لیاقت و اہلیت رکھتا ہو اور محتاط ہو، اپنی بیعت نہ توڑے اور اپنے سلسلے کے بھائیوں سے نفرت نہ رکھے، اپنا سارا کام شیخ کی نگرانی میں انجام دے اور ہر کام ان کے مشورے سے کرے، وہ حضرت محمد ﷺ کو اور حضرت علی کو اپنا بنیادی پیشوا اور شیخ طریقت سمجھے- عورت اگر بیعت ہونا چاہتی ہے تو شادی شدہ ہونے کی صورت میں اپنے شوہر اور غیر شادی شدہ ہونے کی صورت میں اپنے والدین سے بیعت اور خانقاہ سے آغاز تعلق کے لیے اجازت لے- البتہ عمر دراز عورتوں کو اس اجازت کی ضرورت نہیں- ہر سال قرشہیر (Kirshehir) حاجی بکتاش کاؤنٹی میں اگست کے مہینے میں حاجی بکتاش کا سالانہ عرس ہوتا ہے- عرس کی تقریبات میں اعلیٰ سطح کے

سیاسی قائدین شریک ہوتے ہیں اور تائید و حمایت کا پیغام سناتے ہیں- دوسری طرف وہ سلاسل تصوف کے خلاف اپنا ردعمل بھی ظاہر کرتے ہیں- ہمارے خیال میں یہ صورت حال اس چیز کو ثابت کر رہی ہے کہ یہ سیاسی قائدین موقع سے فائدہ اٹھا کر سلاسل تصوف کا استحصال کرتے ہیں اور انھیں اپنے نفع کے لیے استعمال کرتے ہیں-

۶- سلسلہ مولویہ

سلسلہ مولویہ کے موسس مولانا جلال الدین رومی (متوفی ۱۲۷۳ء) بلخ خراسان میں پیدا ہوئے- مذہبی تعلیم اپنے والد سلطان العلما بہاؤ الدین ولید سے حاصل کی، مولانا اپنے خاندان کے ساتھ انطولیا منتقل ہوگئے- ایک زمانے تک تعلیم و تعلم میں مشغول رہے اور پھر تصوف کی جانب مائل ہوئے- ان کا تصوف بلخ کے تصوف، اندلس کے توحیدی نظریہ اور خراسان کی روحانی محبت کا مجموعہ ہے- جیسا کہ ان کی نظموں سے بھی ظاہر ہے، مولانا کا تصوف حدود و قیود اور اعتقاد سے برتر ایک زندہ تجربہ ہے جسے محبت کے ذریعہ ہی سمجھا جاسکتا ہے-

اس سلسلے کی خاص چیز موسیقی، سماع اور ریاضت ہے- سماع کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور سماع کی ہر حرکت رموز و اشارات سے عبارت ہے- ایک ہزار ایک دن کا مجاہدہ ہوتا ہے- جو شخص اتنی مدت تک مجاہدہ کر لیتا ہے وہ سیلبی (Celebi) (خلیفہ) کہلاتا ہے اور گویا وہ مولانا کی روحانی اولاد ہو جاتا ہے اور عام لوگوں کو دے ئی (Dae) کہا جاتا ہے- ۱۸۲۶ میں جب عہد عثمانی میں محمود سلطان دوم نے بکتاشیہ سلسلے پر پابندی عائد کر دی تب سلسلہ مولویہ کو شہرت ملی- سیاسی قائدین مولویہ سلسلے کے تعلق سے معاندانہ رویہ نہیں رکھتے ہیں، کیوں کہ اس سلسلے کے مشائخ نے سماجی اور سیاسی صورت حال کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالا اور سیاسی اور مذہبی بغاوت و ٹکراؤ سے بچتے ہوئے حکومت کے ساتھ اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں- آج اس سلسلے کی اصل حیثیت فن اور ثقافت کی ہے- اس طرح سے مولویہ سلسلے نے جہاں ایک طرف درویشوں کی تعلیم کا کام انجام دیا وہیں اپنے ثقافتی ورثے کو بھی محفوظ رکھا- چنانچہ مولویہ خانقاہیں اعلیٰ سطح کے ثقافتی مراکز ہیں جہاں خاص لوگ رہتے ہیں- وہاں سے شعرا، خطاط اور موسیقی کاروں کو شہرت اور روحانی بصیرت ملی- ہماری قومی شاعرہ ناہید آسیہ (Nihat Asya) مشہور خطاط سہیل انور، طاہر الغون اور موسیقی کار سنوسن

تنزی کوار (Cinucen Tanrikorur) ان ہی میں کے چند نام ہیں- مولویہ سلسلے کی سرگرمیاں آج بھی جاری وساری ہیں- مولانا کے نام سے سیمینار، سمپوزیم اور اجتماعات منعقد ہوتے رہتے ہیں اور شب عروس (سماع) (عرس) ہر سال قونیہ میں منعقد ہوتا ہے-

خلاصہ کے طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ قومی سطح پر سلسلہ نقش بندیہ متحرک و فعال ہے- اس کے برعکس کچھ سلسلے مثلاً خلوتیہ، قادریہ، رفاعیہ اور مولویہ صرف استنبول اور اس کے علاقے میں سرگرم ہیں لیکن یہ بات بہرحال کہی جاسکتی ہے کہ موجودہ ترکی میں صوفی سلاسل نے اپنے وجود کو برقرار رکھا ہے-

مصادر و مراجع

1. Atacan, Fulya, *Sosyal Degisme ve Tarikat:* Carrahiler,Istanbul 1990.
2. Ayverdi,Samiha ve digerleri, *Kenan Rifai ve Yirminci Asrain isiginda muslumanlk,* Istanbul, 1993.
3. Bardakci, Mehmet Necmettin, *Sosyo-Kulturel Yayatta Tasavvuf,* Isparta 2000.
4. Bayramoglu,Ali, *Turkiye'de Islami Hareket: Sosyolojik Bir Bokis* (1994-2000), Istanbul 2001
5. Ba, Ibrahim, "Seyyid Abdulhakim Arvasi", *Sahabeden Gunumuze Allah Dostlari,* Istanbul 1996, IX, 406-418.
6. Bicer, Birol, "Tasavvufun Donusu Muthesem Oldu", *Aktuel,* Sayi: 209,2010: 02, 16-22.
7. Bostanci, Ali Haydar, "Haci Mustafa Hayri Ogut", *Sahabeden Gunumuze Allah Dostlari,* Istanbul 1996, X, 198-212.
8. Cakir, Rusen, *Ayet ve Slogan: Turkiye' de Islami Ulusumlar,* Istanbul 1990
9. Dana, Sadik, *Sultanu'l-arifin es-Seyh Mohmud Sami Ramazanoglu,* Istanbul 1991.
10. Demirci, Mehmet, Sorularla Tasavvuf ve Tarikatler, Istanbul 2001
11. Erdogan, Erol ve Mustafa Demirci, "Haci Hasan Efendi", *Sahabeden

Gunumuze Allah Dostlari, Istanbul 1996, X, 285-291.

12. Eyuboglu, Ismet Zek, Butun Yonleriyle Tasavvuf Tarikatlar Mezhepler Tarihi, Istanbul 1993.
13. Gunduz, Irfan, "Mehmed Zahid Kotku", *Sahabeden Gunumuze Allah Dostlari,* Istanbul 1996, X, 231-236.
14. Guner, Ahmet, *Tarikatlar Ansiklopedisi,* Istanbul 1991.
15. Konur, Himmet, "Avrupa Birligine Giris Surecinde Turkiye'de Tasavvuf ve Tarikatlar", *Turkiye'nin Avrupa Birligine Girisinin Dini Boyutu,* DIB, Ankara 2003, 551-564.
16. Konuralp, Okan, "Turkiye'nin Cemaat ve Tarikat *Haritasi" Hurriyet-Pazar,* 17 Eylul 2008.
17. Kucur, Abdullah, "Mustafa Ozeren Efendi", *Shabeden Gunumuze Allah Dostlar,* Istanbul 1996, X, 236-240.
18. Manav, Osman Bulent ve Seyfettin Kurt, "Suleyman Hilmi Tunahan", *Sahabeden Gunumuze Allah Dostlari,* Istanbul 1996, X, 43-58.
19. Noyan, Bedri, *Bektasilik ve Alevilik Nedir?,* Istanbul 1995.
20. Ozdamar, Mustafa, *Gonul Cerahi Nuredin Cerrahi ve Cerrahiler,* Istanbul 1995.
21. Ozturk, Yasar Nuri, Tasavvufun Ruhu ve Tarikatlar, Istanbul 1992.
22. Subasi, Necdet, "Seyh, Seyyid ve Molla", *Islamiyat,* c. 2/3, Temmuz-Eylul, Ankara 1999.
23. Tahrali, Mustafa, "Kenan Fifai", *Sahabeden Gunumuze Allah Dostlari,* Istanbul 1996, IX, 440-444.
24. Talu, Mehmed, "Ali Haydar Efendi", *Sahabeden Gunumuze Allah Dostlari,* Istanbul 1996, X, 101-108.
25. Usta, Niyazi, *Menzil Naksiligi-Sosyolojik Bir Arastirma-,* Ankara 1997.
26. Vakkasoglu, Vehbi, *Maneviyat Dunyamizda Iz Birakanlar,* Istanbul 1997.
27. Yildiz, Omer, "Seyyid Muhammed Raist Erol", *Sahabeden Gunumuze Allah Dostlari,* Istanbul 1996, X, 236-334.

❍❍❍

بحث ونظر

کیا تصوف اور صوفیہ کا دور ختم ہوگیا؟

عقابوں کے نشیمن زاغوں کے تصرف میں

"آج کی مشینی زندگی میں تعلیمات تصوف پر عمل کرنے کی ضرورت بڑھ گئی ہے- ایسے میں اصحاب تصوف کو اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ انسانی دماغ کے ساتھ انسانی قلب کی طہارت ہو سکے-"

مولانا یٰسین اختر مصباحی

تزکیہ واحسان کو تصوف کہا جاتا ہے جس کا حکم کتاب وسنت سے ثابت ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم تزکیہ واحسان سے بہمہ صفت موصوف ہیں- یہی صفت جو صدیوں سے عالم اسلام میں تصوف کی شکل میں رائج ہے، جس کی طرف مشائخ اسلام دعوت دیتے چلے آرہے ہیں، اس تصوف کے جو حامل ہیں انہیں صوفی کہا جاتا ہے- اور صوفی کی برکات وحسنات سے اسلامی معاشرہ ہر دور میں مستفیض ہوتا رہا ہے اور کل کی طرح آج بھی ہمارے معاشرے کو تصوف اور اصحاب تصوف کی شدید ضرورت ہے-

انسانیت کو تصوف کی ضرورت اس لیے ہے کہ اس کے عقائد اور اخلاق واعمال سب کی تطہیر ہو سکے- اس عمل تطہیر میں قلب انسانی کا بنیادی کردار ہوتا ہے اور تصوف براہ راست قلب ہی پر اثر انداز ہوتا ہے اور اسے رذائل سے پاک کرکے فضائل کا مخزن اور مرکز بنا دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ انسان اور انسانیت کا ہمیشہ تطہیر وتزکیہ واخلاق فاضلہ واعمال حسنہ سے متصف ہونا ہی کمال انسانیت ہے- اس لیے اس تصوف کی ہمیشہ ضرورت رہے گی اور اس کی افادیت باقی رہے گی-

حقیقی تصوف اور باکمال صوفیہ ہمیں اس لیے نظر نہیں آتے کہ ساری دنیا میں آج مادیت کا دور دورہ ہے- ساتھ ہی اخلاص وایثار کا فقدان ہے، جس سے صرف علم وفن نہیں بلکہ سارے انسانی شعبے بری طرح متاثر ہیں اور اس کی زد میں خانقاہیں بھی آچکی ہیں جس کی وجہ سے قدیم مشائخ صوفیہ کی زندگی کے آئینے میں آج کا تصوف اور آج کے اصحاب تصوف کا کوئی تبلیغی و اصلاحی کردار مشکل ہی سے کہیں کچھ نظر آتا ہے- ورنہ عمومی طور پر حال یہ ہو چکا ہے کہ عقابوں کے

نشیمن زاغوں کے تصرف میں آچکے ہیں اور بقول اقبال......ع

خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

آج کل کے صوفیہ اور سجادہ نشیں حضرات عام طور پر علم دین سے بے بہرہ و بے گانہ ہوتے ہیں اور اتباع شریعت سے بھی انہیں کوئی رغبت نہیں ہوتی ہے- اسی طرح کسی مسند نشینی کے لیے دینی وعلمی استحقاق کو نظر انداز کر کے بیٹے پوتے کی وراثت کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے- چاہے وہ جیسا بھی جاہل و بے عمل ہو-ایسی صورت میں کسی خیر کی توقع کہاں تک کی جاسکتی ہے-

پہلے کے شیخ طریقت اپنے خلفا میں سے اسے ہی اپنا خلیفہ اور جانشیں نامزد کرتے تھے جو علم وعمل ، اخلاق وکردار، تزکیہ واحسان ، ہر لحاظ اور ہر نہج سے دوسرے خلفا سے افضل اور قابل اعتماد ہو- جب کہ آج اس قدیم روایت کا کہیں نام ونشان بھی نہیں ہے- جس کی واحد وجہ اور واضح سبب میرے خیال میں یہ ہے کہ خانقاہوں کے ساتھ زمین جائیداد اور عمارت وغیرہ کی ملکیت کے ہوتے ہوئے اپنے نسبی وارث کو چھوڑ کر کوئی شیخ طریقت کسی دوسرے کو اپنا جانشین کیسے بنائے؟ گویا یہ جانشینی وسجادہ نشینی خلافت نہیں بلکہ وراثت بن چکی ہے- چاہے نامزد وارث اس کا اہل ہو یا نہ ہو، پیران طریقت کو آج اس کی کوئی پروانہیں-

گزشتہ وموجودہ وآئندہ ہر طرح کے روحانی اضطراب کا حل اسلامی تصوف ہی تھا اور ہے اور رہے گا، کیوں کہ اس تصوف کی اہمیت وافادیت زمان ومکان کے ساتھ مشروط ومقید نہیں- محض اخلاص کے ساتھ تصوف کے حقیقی تقاضے پورے کرنے کی ضرورت ہے اور تعلیمات تصوف پر عمل کرنے کی ضرورت ہے- ایک بات ذہن نشیں رہے کہ تصوف صرف علم کا نام نہیں بلکہ عمل کا نام تصوف ہے- ضروری علم دین کے ساتھ اسلامی تصوف کو جب اپنی زندگی میں ڈھال لیا جائے گا تبھی اس کے اثرات ظاہر ہوں گے اور اچھے نتائج وثمرات برآمد ہوں گے-

اس عہد سائنس وٹکنالوجی کی بات ہو یا اس کے علاوہ کسی دوسرے عہد کی، انسانی صفات، اخلاقی فضائل اور روحانی سکون کی ہر عہد کو ضرورت ہے اور مخلص ومتبع شریعت صوفیہ ہر عہد میں اپنا کردار نبھاتے رہے ہیں اور نبھاتے رہیں گے- آج کی مشینی زندگی میں تعلیمات تصوف پر عمل کرنے کی کچھ زیادہ ہی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور اصحاب تصوف کو اپنی ذمہ داری ادا کرنے اور اپنا کردار نبھانے کی بھر پور کوشش کرنی چاہیے تا کہ انسانی دماغ کے ساتھ انسانی قلب کی طہارت

ہو سکے اور دلوں کے زنگ دور کر کے انہیں صاف وشفاف شیشے کی طرح روشن ومنور کیا جاسکے-

تصوف اور اس کی صحیح تعلیمات پر عمل پیرا صوفیہ کا مستقبل یقیناً روشن ہے اور غلط تصوف اور دنیا دار صوفیہ کا مستقبل تاریک ہونے کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے لیکن ایسے تصوف اور صوفیہ سے ہمیں کیا لینا دینا، ہم تو اس تصوف کی بات کر رہے ہیں جس کی جڑیں اسلام کے ساتھ وابستہ ہیں اور ایسے صوفیہ کا ذکر کر رہے ہیں جو سنت رسول کو اپنا اسوہ سمجھتے ہیں اور صحابہ وتابعین کرام کی زندگی کو اپنے لیے مشعل راہ سمجھتے ہیں-

آخر میں میں ایک خاص بات کہنا چاہوں گا کہ اکیسویں صدی کا یہ دور بڑا ہی صبر آزما ہے اور ہر شعبۂ زندگی پر سیاست حاوی ہوتی جارہی ہے- اسی طرح اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بین الاقوامی سازشوں کا جال بچھتا جارہا ہے، اس کی بہت سی مثالیں بیسویں صدی عیسوی میں ہی مل جائیں گی - یہاں میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا جو تصوف اور جہاد سے متعلق ہے- لگ بھگ سو سال پہلے مراقش والجزائر ولیبیا وغیرہ میں یورپ کی بعض سامراجی طاقتوں نے فوجی مداخلت کی اور ملک کی وحدت وسالمیت کو طرح طرح کے خطرات سے دوچار کیا تو وہاں کے صوفیہ اور درویشوں نے جم کر اور ڈٹ کر ان حملہ آوروں کا مقابلہ کیا اور ان کے دانت کھٹے کر دیے- اس سے تنگ آکر ان سامراجی طاقتوں نے تصوف کے خلاف ایک محاذ کھولا اور صوفیہ ومشائخ کی کردارکشی کی مہم شروع کی اور اس کے لیے مسلمانوں کے درمیان سے ہی ان طاقتوں نے اپنے کام کے افراد پیدا کر لیے- اس طرح محض سیاسی مقصد کی تکمیل کے لیے تصوف کو زبردست نشانہ بنایا گیا-

آج سالہا سال سے جہاد کے خلاف حملوں کا سلسلہ جاری ہے- اگر چہ حقیقی معنوں میں کہیں جہاد نہیں ہورہا ہے لیکن اس نعرے سے امریکا وبرطانیا واسرائیل کو نقصان پہنچ رہا ہے- اس لیے جہاد کی اصطلاح کے خلاف ایک سازشی مہم چھیڑی گئی ہے کہ کوئی مسلمان جہاد کا نام نہ لے سکے اور جہاد ہی کے نام پر کسی بھی مسلم نوجوان کے خلاف اسلام دشمن طاقتیں جہاں چاہیں کوئی کارروائی کرسکیں- اسی کے ساتھ ساتھ آج امریکا اور برطانیا کے بعض حلقے تصوف کا راگ الاپنے لگے ہیں- جس کا مقصد اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ تصوف کی اشاعت کے نام پر جہاد کی روح سرد کی جاسکے اور انہیں ان کے مزعومہ تصوف کے ذکر وفکر میں لگا کر ان کی قوت عمل سلب کی جاسکے-

اس طرح یہ طاقتیں اپنے مفادات کے تحت کبھی تصوف اور کبھی جہاد کے خلاف ریشہ دوانیاں کرتی رہتی ہیں - خود جہاد کے فضائل بھی اس وقت انہی طاقتوں کے ذریعے بیان کرائے گئے جب روس نے افغانستان میں فوجی مداخلت کی تھی اور انہی کے تیار کردہ کل کے مجاہد آج کے دہشت گرد بن گئے ہیں-

اہل اسلام کو صرف انہی احکام وتعلیمات پر عمل کرنا چاہیے جن کا حکم کتاب وسنت میں ہے اور جنہیں علما وفقہاے اسلام نے کتاب وسنت کی روشنی میں بیان کیا- اس سے الگ ہٹ کر نہ کوئی کام کرنا چاہیے اور نہ ہی کسی سازش کا شکار ہونا چاہیے-

یورپ میں آج مثنوی مولانا روم بڑے ذوق وشوق کے ساتھ پڑھی جارہی ہے اور مولانا روم کے فلسفہ حیات کی تشہیر کی جارہی ہے- اوپر بتایا جاچکا ہے کہ تصوف کی بھی تبلیغ کی جارہی ہے- ظاہر ہے کہ اس کے پیچھے جو عزائم ہیں ان کے اندر کسی نہ کسی سازش کی بو محسوس ہوتی ہے جس سے مسلمانوں کو بہت ہوشیار اور چوکنا رہنا چاہیے-

○○○

صوفیہ خدمت انسانیت میں مصروف ھیں

"وہ نسخہ جو شبلی کے لیے مجرب اور ناگزیر تھا، کیا ان سے زیادہ اس کی ہمیں ضرورت نہیں ہے ؟ اس لیے صوفی اور تصوف دونوں ہمارے لیے اسی طرح ضروری ہیں، جس طرح ہوا، پانی اور آگ-"

پروفیسر اختر الواسع

یہ سوال کس ذہن کی پیداوار ہے اور اس طرح کا خیال کیوں کر آیا؟ یہ خود ایک حل طلب مسئلہ ہے؟ انسانی سماج جہاں کل تھا اور جس حال میں تھا اس میں یقیناً بیش بہا حیرت انگیز مادی ترقی ہوئی ہے- زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں- رسل ورسائل اور نقل وحمل کے ذرائع کی غیر معمولی ترقی نے بلا شبہ فراق وفصل کے تصورات کو بے معنی بنا کر رکھ دیا ہے- بلا شبہ کل تک جس کو دیوانے کی بڑ یا محض خواب وخیال کی باتیں سمجھا جاتا تھا، سائنس وٹکنالوجی کی ہمہ گیر ترقی نے آج اسے نہ صرف ممکن کر دکھایا ہے بلکہ وہ سب ہماری زندگی کا ناگزیر حصہ بن چکے ہیں- لیکن اس سب کے ساتھ جو بڑی تکلیف دہ سچائی ہے وہ یہ ہے کہ ستاروں کی گزرگاہ کا ڈھونڈنے والا اپنے افکار کی دنیا میں سفر کرنے سے قاصر ہے- زمین کی طنابیں کھنچ جانے سے دنیا ضرور عالمی گاؤں بن گئی ہے لیکن انسان انسان سے بہت دور ہو گئے ہیں- آج نہ صرف مشترکہ خاندان ختم ہوا ہے بلکہ قرابت کا احساس اور صلۂ رحمی کا جذبہ بھی مفقود ہوتا جارہا ہے- انسان محض غرض کا بندہ بن کر رہ گیا ہے اور اپنی ذات کی گرد ہی طواف میں مصروف ہے- حرص وہوا، بغض وعداوت، عناد وفساد، سازش وآزمائش، میں وہ اس طرح اپنے وجود کو کھو چکا ہے کہ خود اپنے آپ ہی کے لیے نہیں کائنات کے لیے بوجھ بن گیا ہے اور اگر قرآن کے لفظوں میں کہا جائے تو خشکی اور تری میں جو فساد ہے، یہ اسی کے کرتوتوں کی وجہ سے ہے- اس لیے آج کی صورت حال، کل کے مقابلے میں زیادہ بھیانک ہے-

انسانی تاریخ کے مختلف ادوار میں یہی صورت حال تھی جس کی اصلاح کے لیے اور انسانوں

کو صحیح راستے پر گامزن کرنے کے لیے، اسے اس کے عز وشرف کا احساس دلانے کے لیے، اس کا اس کے رب کے ساتھ سیدھا رابطہ ہو اور اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ وہ حسن سلوک کرے، خدا کا حق خدا کو اور بندوں کا حق بندوں کو ادا کرتا رہے، اپنے نفس کی حفاظت سے لے کر کائنات میں جو کچھ ہے اس کے تحفظ کی فکر میں سرگرداں ہو، اللہ نے پیغمبر بھیجے اور جب انسانی شعور اپنی ارتقا کی اعلیٰ ترین منزلوں تک پہنچ گیا تو ان کے خالق و مالک نے سراپا رحمت، جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں اپنا آخری نبی اور قرآن حکیم کی صورت میں اپنی آخری کتابِ ہدایت پہنچا دی- اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کریم میں جہاں 'صاحب خلق عظیم' کہا گیا ہے، '**رحمۃ للعالمین**' بتایا گیا ہے، وہیں اللہ نے '**سراج منیر**' یعنی روشن چراغ بھی بتایا ہے اور یہی وہ روشن چراغ ہے جس کے نورانی بطن سے احسان اور تزکیہ نفس نے جنم لیا اور ایک عملی صورت اختیار کی- یہی احسان وسلوک اور یہی تزکیہ نفس آگے چل کر تصوف کہلایا اور اس چراغ مصطفوی سے جو نورانی کرنیں پھوٹیں، انہی کو دنیا اللہ کے ولی اور صوفیہ کرام کے نام سے جانتی ہے- یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے عبادت کو تجارت اور اخلاق کو ریاکاری بننے سے بچایا- ایسے زمانے میں جب حکمراں جبر کی علامت تھے تو صوفی صبر کی، حکمراں حکم دیتے تھے اور صوفی مشورہ، یہ وہ لوگ تھے جن کا ذکر سورۃ الفرقان آیت:۶۳ میں یوں کیا گیا ہے:

''خاص بندگان الٰہی وہ ہیں جو زمین پر جھک کر چلتے ہیں اور جب جاہل انہیں چھیڑیں، تو وہ کہہ دیتے ہیں، اچھا خاموش رہو-''

صوفی دنیا سے کٹتا نہیں لیکن وہ اس میں اسی طرح سے رہتا ہے جیسے کہ آلودگیوں کے بیچ کمل- تو کل جب ان کی ضرورت تھی تو پھر آج کیوں نہیں ہوگی؟ بلکہ کل سے زیادہ ہوگی اور ہے- یہاں حضرت داتا گنج بخش مخدوم علی بن عثمان ہجویری کا ایک حوالہ دینا موزوں ہوگا- انہوں نے آج سے ایک ہزار سال پہلے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''کشف المحجوب'' کی وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے لکھا تھا:

''رب العزت جل مجدہ نے ہمیں بھی ایسے زمانے میں پیدا فرمایا کہ اہالیان زمانہ حظوظ حرص و ہوا کو شریعت بنا بیٹھے اور طلب جاہ اور ریاکاری کو خوف الٰہی قرار دیا اور بغض، حسد و کینہ کو حلم و بردباری بنالیا- مجادلہ کا نام مناظرۂ دین رکھ لیا- لڑائی جھگڑا، کمینہ پن کا نام غیرت رکھ لیا-

نفاق کے معنی زہد کر لیے اور غنائے باطل کو ارادت بتانے لگے- ہذیان و بکواس کا نام معرفت رکھ لیا- حرکت دل بڑھ جانے کو قلب جاری ہونا کہہ دیا- دل میں جو خطرات پیدا ہوتے ہیں اس کا نام الہام و حدیث نفس بنالیا- الحاد خالص کو فقر کہہ دیا- زندقہ کا نام **فنا فی اللہ** رکھ لیا- ترک شریعت کو طریقت بنا بیٹھے اور خس و خاشاک، فکر دنیا و آفت زمانہ کا نام معاملہ فہمی-''

ہم جیسے ''ناقصوں'' کے لیے اس ''پیر کامل'' اور ''کاملوں'' کے لیے ''رہنما'' نے جو کچھ اپنے زمانے کا نقشہ کھینچا ہے، کیا ہم اس سے بہتر زمانے میں ہیں؟ اگر کل ایک کشف المحجوب اور صاحب کشف المحجوب کی ضرورت تھی تو آج کیوں کر نہ ہوگی؟ آج بھی جب گناہوں کے مرض میں ہم جیسے بہت سے لوگ مبتلا ہیں تو اس مرض کی دوا ہمیں صرف صوفیہ کرام کے یہاں ہی مل سکتی ہے- اسی طرح جیسے کبھی مشہور زمانہ صوفی حضرت ابوبکر شبلی کو ملی تھی- کہا جاتا ہے کہ شبلی نے ایک حکیم سے کہا کہ مجھے گناہوں کا مرض ہے، اگر اس کی دوا بھی آپ کے پاس ہو تو عنایت کیجیے- جہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں، سامنے میدان میں ایک شخص تنکے چننے میں مصروف تھا، اس نے سر اٹھا کر کہا، شبلی یہاں آؤ میں اس کی دوا بتاتا ہوں-

''حیا کے پھول، صبر وشکر کے پھل، عجز و نیاز کی جڑ، غم کی کونپل، سچائی کے درخت کے پتے، ادب کی چھال، حسن اخلاق کی بیج، یہ سب لے کر ریاضت کے ہاون دستے میں کوٹنا شروع کردو اور اشک پشیمانی کا عرق ان میں روز ملاتے رہو- ان سب دواؤں کو دل کی دیگچی میں بھر کر، شوق کے چولہے پر پکاؤ، جب پک کر تیار ہوجائے تو صفائے قلب کی صافی میں چھان لینا اور شیریں زبانی کی شکر ملا کر، محبت کی تیز آنچ دینا، جس وقت تیار ہو کر اترے تو اس کو خوف خدا کی ہوا سے ٹھنڈا کر کے استعمال کرنا-''

وہ نسخہ جو شبلی کے لیے مجرب اور ناگزیر تھا، کیا ان سے زیادہ اس کی ہمیں ضرورت نہیں ہے؟ اس لیے صوفی اور تصوف دونوں ہمارے لیے اسی طرح ضروری ہیں، جس طرح ہوا، پانی اور آگ-

ایک سوال جو عام طور پر کیا جاتا ہے کہ اگر ایسا ہے تو آج صوفی نظر کیوں نہیں آتے؟ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ صوفی اشتہار بازی میں یقین نہیں رکھتا، وہ شہرت کا نہیں گمنامی کا طلب گار ہوتا ہے- وہ اپنے رب اور اس کی مخلوق دونوں کے مقابلے اپنی ذات کی نفی کرتا ہے- وہ صرف اپنے رب کی رضا پانے کے لیے ہمہ وقت مصروف رہتا ہے اور یہ بخوبی جانتا ہے کہ یہ رضائے

الٰہی، عبادت محض سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ اس کی خوشنودی اس میں ہے کہ اس کے بندوں کی خدمت کی جائے - اس لیے وہ دوسروں کے دکھوں کی صلیب اپنے کندھوں پہ اٹھاتا ہے - وہ اسیر آشیانہ نہیں بلکہ ضمیر دشت ودریا ہوتا ہے- وہ دردتنہا کا مالک نہیں ہوتا بلکہ غم زمانہ اس کی میراث ہوتی ہے، وہ حق کو نمایاں کرتا ہے اور خود کو مستور- وہ ایک مشفق مشیر، ایک دردمند رفیق اور دوسروں کے سکھ کے لیے خود دکھ اٹھانے والا ہوتا ہے- وہ ایسا وسیع الذہن اور وسیع المشرب انسان ہوتا ہے جو قرآن کے مطابق **لا اکراہ في الدين** پر عمل کر کے دکھاتا ہے اور دکھوں کے مارے لوگوں کو **لا تقنطوا** کا پیام برحق سناتا ہے اور انہیں حوصلہ دیتا ہے- وہ من وتو کا فرق نہیں جانتا- اس لیے یہاں کوئی غیر نہیں ہوتا- وہ صلح کل اور وصل خواہی کا نقیب ہوتا ہے-

آج کی بے چہرہ زندگی میں جب انسان انسان نہ رہ کر معاشی جانوروں کے ریوڑ میں تبدیل ہونے کی کوشش میں لگا ہوا ہے، اگر اب تک سب کچھ ہاتھ سے نہیں گیا ہے تو وہ انہیں لوگوں کی وجہ سے ہوسکا ہے جو شریعت وطریقت کے یکساں طور پر علم بردار ہیں لیکن کسی پر وہ خود کو ظاہر نہیں کرتے اور خاموشی سے عبادت الٰہی اور خدمت انسانیت میں ہر وقت مصروف رہتے ہیں-

ooo

تصوف کا نام رہ گیا ہے اور روح نکل چکی ہے

"موجودہ حالات میں بظاہر ایسا ہی لگتا ہے کہ تصوف اور صوفیہ کا دور ختم ہو گیا ہے لیکن ہمیں ایسا قول کرنے میں عجلت نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ تصوف ہمارے آقا محمد عربی ﷺ کے مشن کا نقطۂ آغاز بھی ہے اور منتہائے کار بھی-"

فیضان المصطفیٰ قادری

بظاہر ایسا ہی لگتا ہے کہ تصوف اور صوفیہ کا دور ختم ہوگیا، کیونکہ دور حاضر میں جو لوگ ہمیں نظر آتے ہیں ان میں صوفیہ کم اور متصوفین زیادہ ہیں- گویا صوفیا کہیں گم ہو گئے ہیں، اور متصوفین ابھر آئے ہیں- کیونکہ آج نہ وہ قدریں ہیں، نہ وہ معیار، نہ وہ سوزِ دل، نہ وہ سازِ دروں- تصوف جس کا نام ہے اس کا ڈھانچہ رہ گیا ہے اور روح نکل چکی ہے، رنگ رہ گیا ہے، رونق جا چکی ہے، سماع رہ گیا، سوزِ دل رخصت ہوا، جملے اثرات سے عاری ہوگئے، دعائیں مستجاب ہوتی نہیں لگتیں- انھیں سب وجوہات کی بنا پر خانقاہیں سنسان اور قہوہ خانے آباد ہونے لگے- لوگ وہ راستے بھول گئے جو خانقاہ کی طرف جاتے ہوں-

مانا ولایت کے لیے کرامت ضروری نہیں، مگر آخر ولی کے لیے کرامت کا صدور ممنوع تو نہ ہوگیا، اب وہ واقعات کیوں نظر نہیں آتے جنھیں دیکھ کر غیر مسلم اسلام قبول کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے؟ اب تو بس ایسی کرامتیں رہ گئی ہیں کہ ایکسیڈنٹ ہوا مگر جان بچ گئی- حالات بگڑے بالآخر سنبھل گئے- گویا ہر عمل میں کرامت کا کوئی نہ کوئی پہلو اس طرح نکال لیا جاتا ہے جیسے سعودیہ عربیہ میں چاند-

صوفیہ کرام اور بزرگان دین کی سیرت وسوانح سے یہ بات عیاں ہے کہ اس دور میں دولت وثروت پر نظر نہ تھی، حکومت واقتدار کو خاطر میں نہ لایا جاتا تھا، غریبوں پر امیروں کو ترجیح نہ دی جاتی تھی، لیکن اب پیش رو مشائخ عظام کے وارثین میں کیا وہی بات موجود ہے کہ دولت کو ہیچ

سمجھا جاتا ہو اور دنیا کو کوئی اہمیت نہ دی جاتی ہو، نہیں نہیں، بلکہ اسی کو اہمیت دی جاتی ہے- اسی کو قبلۂ توجہات بنایا جاتا ہے- وہی مطمحِ نظر اور محورِ فکر وخیال ہوتا ہے- حکومتی اہل کاروں کی مدارات کی جاتی ہے، مالداروں پر عنایات ہوتی ہیں اور غریبوں کو خاطر میں نہیں لایا جاتا- تحریکِ مرید سازی نے تو اصل مرشدوں کی شناخت گم کردی اور مرید ہی مراد بنتا چلا گیا- بیعتِ ارادت کا سلسلہ ختم ہوتا جارہا ہے، اب بیعتِ برکت رہ گئی ہے- وہ بھی رفتہ رفتہ بیعتِ دولت بنتی جارہی ہے- جب بیعت ارادت ہوتی تھی تو مرید کا سفر شروع ہوتا تھا- اب مرید ہوتے ہی سارا سفر ختم اور منزل متعین کردی جاتی ہے- ذرا حد سے آگے بڑھے تو مریدی پر بن آئے گی-

مزاج میں بڑی تبدیلی آگئی ہے، سوچ کا انداز بدل گیا ہے- لوگوں نے ریاکاری کا نام تقویٰ رکھ دیا، انانیت کا نام عزتِ نفس، اسراف کا نام سخاوت اور بزدلی کا نام مروت- غفلت وسستی کا نام زہد، مداہنت کا نام تدبر، مرعوبیت کا نام حکمت، خودنمائی کا نام صداقت اور شریعت سے دوری کا نام طریقت رکھ دیا ہے-

بیعت طریقت کا سلسلہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے شروع ہوتا ہے- آپ کے دور خلافت میں مال ودولت کی فراوانی تھی، مگر آپ کا عالم کیا تھا؟ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ میں جمعہ کے دن مسجد میں آیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ پرانا پیوندوں بھرا کپڑا پہنے منبر پر خطبہ دے رہے تھے، فرمارہے تھے: ''میں نے اپنے اس کپڑے میں اتنے پیوند لگوائے کہ اب مجھے پیوند لگانے والی سے شرم آتی ہے- علی کا دنیا کی زیب وزینت سے کیا کام! میں اس نعمت سے کیسے خوش ہوجاؤں جو فانی ہے اور پیٹ بھر کر کیسے کھاؤں؟ جب کہ حجاز کی حدود میں نہ جانے کتنے لوگ بھوکے ہوں- میں لوگوں سے ''امیر المؤمنین'' کہلوانے پر کیسے راضی ہوجاؤں اگر ان کی مشکلات اور تکلیفوں میں شریک نہ رہوں''-

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''یہ سن کر لوگ بہت روئے اور میں بھی رویا- میں نے کہا: امیر المؤمنین! اگر آپ نیا کپڑا پہن لیں تو کیا حرج ہے؟ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے حکمرانوں پر یہ ذمہ داری عائد فرمائی ہے کہ ان کا لباس ان کی رعیت کے غریب ترین لوگوں جیسا ہو، تاکہ دولت مند ان کی پیروی کریں اور محتاج لوگ غمگین نہ ہوں''- آپ نے حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ کو بصرہ کا والی بنایا- کچھ دنوں بعد بصرہ کے ایک شخص سے ان کی خیریت پوچھی،

اس نے کہا: میں نے انھیں ایک جگہ ضیافت میں دیکھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی وقت انھیں ایک خط لکھا، جس کا مضمون یہ تھا:

''افسوس! میں نے سنا ہے تم اہل بصرہ کی ضیافتوں میں شامل ہوتے ہو اور وہ قسم قسم کے کھانے تمہارے سامنے رکھتے ہیں- یاد رکھو جو حاکم ایسے لوگوں کا کھانا کھاتا ہے جو دولت مندوں کو بڑے تکلف سے بلاتے ہیں اور محتاجوں کو سختی سے دھکیل دیتے ہیں وہ حق اور باطل کی تمیز نہیں رکھتا''- (ذخیرۃ الملوک باب پنجم ۱۶۶)

آپ کے لختِ جگر نورِ نظر امام عالی مقام کو دولت سے نہیں غربت سے آزمایا گیا- عیش وعشرت کا نہیں، بےکسی اور خاک وخون کا امتحان لیا گیا-

اب وہی سلسلہ کہیں اور چلا جارہا ہے- وہ قدریں کہیں گم ہو کر رہ گئی ہیں اور دوسری آزمائش شروع ہوگئی ہے، یعنی دولت اور عیش وعشرت کی آزمائش- بغیر محنت دولت کے انبار ہیں، شان وشوکت کا کیا پوچھنا، پاؤں زمین پر نہیں پڑتے، نگاہیں غریبوں پر نہیں ٹکتیں، ہاتھ بیواؤں اور یتیموں کے سروں تک نہیں پہنچ پاتے، بیچ میں ہی مریدین اچک لیتے ہیں-

پہلے خانقاہی نظام میں تعلیم وتربیت کا پورا نظم ہوتا تھا- سلوک ومجاہدہ کی راہیں طے کرائی جاتی تھیں- کوئی شخص مرشد کے ہاتھ پر بیعت کیا ہوتا تھا گویا وہ طریقت کے راستے پر چل پڑتا تھا- لیکن اب تو خانقاہوں میں عموماً بیعت پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے- نہ مقامات طے کرانے والے پیر رہ گئے، نہ ارادت والے مرید، نہ ریاضت ومجاہدہ کا نظام- تبلیغ اسلام کے لیے علم وحکمت اور عقل ودانش کو کافی سمجھا جانے لگے، اور ریاضت ومجاہدہ کو غیر ضروری بلکہ اسلام مخالف قرار دیا جانے لگے تو کیا اس کا یہی نتیجہ ظاہر نہ ہوگا جو ہم دیکھ رہے ہیں، کہ ہماری تبلیغ کا رنگ ہی بدل گیا ہے- نہ کلام میں معنویت ہے، نہ وعظ ونصیحت کا کوئی اثر مرتب ہوتا ہے-

ان حالات میں لگتا ایسا ہی ہے کہ تصوف اور صوفیہ کا دور ختم ہوگیا لیکن ہمیں ایسا قول کرنے میں عجلت نہیں کرنی چاہیے- کیوں کہ تصوف ہمارے آقا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کا نقطۂ آغاز بھی ہے اور منتہائے کار بھی- بخاری شریف کے آغاز ہی میں ام المؤمنین صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جوانی میں لوگوں سے دور، جبل نور کے غارِ حرا میں جاکر گوشہ نشیں ہوگئے اور رات کی تنہائیوں میں اپنے رب کی یاد اور عبادت کرنے لگے- یہ عبادت

ذکر وفکر کی ہی کوئی صورت تھی- اور ذات وصفات الٰہی میں انہماک واستغراق کا یہ عالم تھا کہ اسی دوران جبرئیل امین آکر کہنے لگے: اقــرأ، پڑھیے- آپ نے پڑھنے سے انکار کردیا- ملکوتی صفات نے ناسوت کو لاہوت سے آشنا کرایا پھر کہا: اپنے رب کے نام سے پڑھیے، فوراً پڑھنا شروع کر دیا- شرف ہم کلامی سے شادکام کیا ہوئے کہ اب لمحہ لمحہ وحیِ ربانی کا انتظار ہونے لگا- جب تبلیغ کا حکم ہوا تو غار سے نکل آئے اور کوہِ صفا پر اپنے رب کی دعوت دی اور تبلیغ شروع فرمادی-

پوری زندگی تصوف کی ڈگر پر چلتے رہے، نہیں، بلکہ آپ جس راہ پر چلتے تھے اسی کا نام تصوف وسلوک ہے- صحابیِ رسول فرماتے ہیں: آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی منگتے کو ''نا'' نہ کہا- جب کھاتے تو اس طرح بیٹھ کر کھاتے کہ پیٹ بھر نہ سکے- کبھی کسی کھانے کو عیب نہ لگاتے، پسند آیا کھالیا، اچھا نہ لگا چھوڑ دیا- ہدیہ ملتا تو قبول فرمالیتے، پھر کسی اور کو عطا کردیتے، لوگوں کے قرض ادا کردیتے- ام المومنین کہتی ہیں: پوری زندگی میں ایسا دن نہ آیا کہ دونوں وقت پیٹ بھر کھانے کو روٹی ملی ہو- نرم روٹی نہ کھاتے، جو کی روٹی پسند فرماتے- ننگی چارپائی پر بھی سوجاتے کہ رسیوں کے نشانات جسم اقدس پر ظاہر ہونے لگتے- کئی کئی دن تک بھوک کے سبب پیٹ پر پتھر باندھتے، غزوۂ خندق کے موقع پر پیٹ پر دو پتھر باندھ رکھے تھے- بخاری شریف میں ہے: آپ رات میں اس قدر عبادت فرماتے کہ پائے اقدس میں ورم آجاتے- صحابہ نے عرض کیا: آپ کو اس قدر عبادت کی کیا ضرورت؟ آپ کو تو رب تعالیٰ نے پہلے ہی مغفرت کا مژدہ سنا دیا ہے- فرمایا: کیا میں شکرگزار بندہ نہ بنوں؟

وصال شریف کے تذکروں میں درج ہے کہ آخری وقت میں اپنے پاس کچھ مال ومتاع نہ رکھا، کوئی چیز ایسی نہ تھی جس پر اپنی ملکیت باقی رکھی ہو، بس ضرورت کی چند چیزیں رہ گئی تھیں، باقی درہم ودینار تقسیم کردیے، حجرات ازواج مطہرہ کو عنایت فرمادیا، کچھ مال ومتاع تھا جسے صدقہ فرمادیا، فدک کے باغات اور دیگر اموال غنیمت کو پہلے ہی صدقہ کرنے کا اعلان فرمادیا تھا- اب دنیا کا کوئی ساتھی بھلا نہ معلوم ہوتا تھا، اور دعا کرتے تھے: **اللھم في الرفیق الاعلیٰ، اللھم في الرفیق الاعلیٰ**-

یہ سب رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہے- کیا آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ قدروں کے پاسبان اس طرح گم ہوجائیں گے؟ ابھی قیامت اتنی قریب بھی نہ آگئی- ابھی

ساری بڑی نشانیاں باقی ہیں- پوری دنیا پر اسلام کا غلبہ ہونا بھی باقی ہے- حدیث پاک میں ہے: ہمیشہ روئے زمین پر سات ابدال رہیں گے، انھیں کے سبب لوگ رزق دیے جائیں گے- انھیں کی وجہ سے بارش ہوگی- دوسری حدیث شریف میں ہے: جب تک روئے زمین پر ''اللہ اللہ'' کہنے والی باقی ہیں قیامت قائم نہ ہوگی-

تصوف تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت ہے، تصوف آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی معیارِ زندگی کا نام ہے- تصوف ایک آئینہ ہے جس میں ان کی زندگی محسوس کی جاسکتی ہے- تصوف ان کی ترجیحات کا نام ہے- تصوف ان کی اداؤں کا نام ہے، تصوف ان اصول کا نام ہے جنھیں آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مقرب صحابہ کو عطا کیا ہے- جب تک دنیا قائم رہے گی ان کی سنت جاری وساری رہے گی، ان کی وراثت باقی رہے گی- ان کا اسوہ عملی پیکر میں موجود اور باقی رہے گا-

ہاں ایسا ہوسکتا ہے کہ دور حاضر کے نت نئے فتنوں اور اہل زمانہ کی ترجیحات کی بنا پر وہ قدسی صفات کسی گوشۂ عافیت میں چلے گئے ہوں- کہیں اور بسیرا کرلیا ہو یا آبادی میں رہ کر بھی گمنامی کو ترجیح دینے لگے ہوں، بہر کیف، کیا ہوا؟ اور تصوف کی قدریں کہاں چلی گئیں؟ ہمیں افسوس ہے کہ اس کا جواب ہمارے پاس نہیں-

○○○

شناسائی

سجادہ نشین آستانہ مخدوم شاہ صفی قدس سرہٗ حضرت شاہ

اعزاز محمد فاروقی عرف شمو میاں صاحب

سے خصوصی گفتگو

کچھ بستیاں اتنی خوش قسمت ہوتی ہیں کہ ان کی خوش بختی پر روئے زمین کے دوسرے حصے جس قدر بھی رشک کریں کم ہے، مدینۃالاولیاء قصبہ صفی پور شریف بھی دنیا کی انہیں بستیوں میں سے ایک ہے- یہ ضلع اناؤ کی طرف ہردوئی روڈ سے ستائیس کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے اس کا پرانا نام سائیں پور تھا لیکن جب حضرت شاہ ولایت مخدوم الانام شیخ الاسلام خواجہ عبدالصمد صفی معروف بہ مخدوم شاہ صفی قدس سرہ (وفات ۹۴۵ھ) اپنے مرشد برحق کے حکم سے اس بستی میں تشریف لائے تو اس کو رشک ثریا بنادیا اور پھر یہ بستی آپ ہی کے نام سے موسوم ہوگئی- حضرت میر واحد بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ اسی در کے فیض یافتہ ہیں- یہاں کے مشائخ اپنے مریدوں اور خلفاء سے اتنی محبت کرتے تھے کہ جو بھی آیا اس نے اس در سے جدا ہونا گوارا نہیں کیا اور اسی خاک کا حصہ بن جانے ہی میں اپنی ارجمندیوں کی معراج سمجھی-حضرت مخدوم شاہ صفی قدس سرہ سے لے کر اب تک پندرہ سجادگان والاشان زیب سجادہ ہوچکے ہیں- اس وقت حضرت شاہ اعزاز محمد، لقب مطلوب صفی عرف شمو میاں اس عظیم خانقاہ کی سجادگی کے منصب پر فائز ہیں، آپ کے والد حضرت شاہ نور محمد صفوی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ خادم محمد رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ وسجادہ نشیں تھے -آپ کی پیدائش ۱۹۴۰ء میں ہوئی- ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر حاصل کی پھر انٹرمیڈیٹ پاس کیا- آپ کے دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی ہیں اور سب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں- آپ کی تربیت میں آپ کی والدہ کا اہم رول ہے-آپ کو تمام روحانی سلسوں کی اجازت وخلافت

اپنے والدگرامی سے تقریباً ۱۹۷۱ء میں حاصل ہوئی- اجازت وخلافت کے چندسال بعد ہی سجادگی کی ذمہ داری بھی عطا ہوگئی- تقریباً تین دہائیوں سے اس دینی وروحانی فریضہ کو بحسن وخوبی انجام دینے کی کوشش میں لگے ہیں- آپ انتہائی منکسرالمزاج اور سادہ لوح شخصیت کے مالک ہیں- بزرگان دین سے بے حد عقیدت رکھتے ہیں اور بزرگوں کی وراثت اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں- خانقاہ صفویہ، تصوف اور اسلام کے موضوع پر حضرت کا انٹرویو لینے کے لیے مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی اور مولانا مجیب الرحمٰن علیمی کے ہمراہ آستانہ عالیہ صفویہ صفی پور شریف حاضر ہوا اور حضرت سے قارئین کے لیے ایک سنجیدہ بات چیت کی جس کو ہم قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، امید کہ یہ روایت قارئین الاحسان کے حلقے میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جائے گی-(حسن سعید چشتی)

سوال: (۱) بانی خانقاہ حضرت مخدوم شاہ صفی علیہ الرحمہ کی شخصیت پر کچھ روشنی ڈالیں-

جواب: اس خانقاہ کے بانی حضرت مخدوم شاہ عبدالصمد عرف صفی قدس اللہ سرہٗ ہیں- آپ بارہ یا تیرہ سال کی عمر میں حضرت مخدوم سعد بن بڈھن خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں حاضر ہوئے اور مرید ہوگئے، پھر وہیں علم حاصل کرنے میں مشغول ہوگئے- ایک روز حضرت مخدوم سعد کی آپ پر نظر پڑی نام و ولدیت پوچھی اور گھر دریافت کیا- آپ نے فرمایا کہ میرا نام عبدالصمد عرف صفی ہے، سائیں پور میرا مکان ہے اور والد صاحب کا نام علم الدین ہے- حضرت مخدوم سعد صاحب علم الدین کے واقعات سے واقف تھے، فرمایا: ''کسی کے پاس مت پڑھا کرو ہم سے پڑھا کرو، ہم تمہیں پڑھائیں گے-'' یہیں سے حضرت مخدوم کی صحبت میں رہنے لگے ، ایک زمانہ گزر گیا، ایک دن حضرت مخدوم نے پوچھا تم کھانا مطبخ سے کھاتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا جی ہاں ، فرمایا مطبخ سے مت کھاؤ جو کچھ بھی ہو ہمارے ساتھ کھاؤ- حضرت مخدوم سعد کی عادت تھی کہ آپ تین تین چار چار پانچ پانچ روز کے بعد کھانا کھاتے اور کسی کو خبر بھی نہ ہوتی- جب کوئی مہمان آتا مخدوم اس کے ساتھ کھاتے اور اسی وقت شیخ صفی کو بھی کچھ کھانے کا موقع مل جاتا- خلاصہ یہ کہ شیخ مخدوم شاہ صفی رحمۃ اللہ علیہ بھوک کی سختی جھیلتے اس کے باوجود اپنے استاد ومرشد کی بارگاہ میں جمے رہے- آپ نے اپنے مرشد کی بارگاہ میں رہ کر چلہ کشی کی- تیسرے دن

ہی تمام فتوحات حاصل ہوگئے اور مردان خدا کے مقامات عالیہ پر پہنچ گئے ،آپ صاحب جذب بزرگ تھے جس پر نظر پڑتی دیر تک دم بخود رہتا- کسی کو آپ سے آنکھ ملانے کی تاب نہیں تھی- آپ کو حضرت مخدوم سعد نے ہی خلافت بھی دی اور تمام خلفا پر فائق ہوئے- آپ کے بہت سے خلفاء تھے اور سب کے سب اہل علم تھے- اس وقت آپ کے چار مقرب خلفا سے سلسلہ صفویہ جاری ہے- (۱) حضرت مخدوم شیخ بندگی مبارک (۲) حضرت مخدوم سید نظام الدین اللہ دیا خیرآبادی (۳) شیخ شاہ فضل اللہ گجراتی (۴) حضرت شیخ سید حسین محمد سکندرآبادی قدس اللہ اسرارہم-

حضرت مخدوم شیخ بندگی مبارک آپ کے حقیقی بھانجے مرید وخلیفہ اور جانشین تھے- حضرت مخدوم صفی رحمۃ اللہ علیہ جب مرشد کے حکم سے سائیں پور آئے تو یہ علاقہ آپ کے ہی نام سے پکارا جانے لگا اور یہیں سے خانوادۂ چشتی نظامی مینائی کے ایک نئے سلسلہ، سلسلہ صفویہ کی بنیاد پڑی-

حضرت بندگی شاہ مبارک شاہ اعلیٰ جاجموی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے ہیں اور اسی لیے ہمارا خاندان فاروقی کہلاتا ہے- حضرت مخدوم شاہ صفی رحمۃ اللہ علیہ تو خود مجرد تھے لیکن آپ نے اپنی ہمشیرہ سے انہیں مانگ لیا تھا- اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے اپنی بہن سے بھانجے کے بارے میں پوچھا تو بہن نے ازراہ محبت کہہ دیا کہ سو رہا ہے- یہ جواب سن کر آپ نے فرمایا سوتا ہے تو سوتا ہی رہے، اب جب بہن نے بچے کو جا کر دیکھا تو پایا کہ اس کے جسم میں کوئی حرکت ہی نہیں ہے- گھبرائی ہوئی آئیں اور اپنے والد ماجد عبدالملک سے کہا کہ اس کے جسم میں تو کوئی حرکت ہی نہیں ہے- انہوں نے کہا ارے بات کیا ہوئی؟ بہن نے ماجرا سنایا- فوراً ہی عبدالملک صاحب نے فرمایا تمہارا بھائی قطب وقت ہے- جاؤ فوراً بلا کر لاؤ- بلا کر لائیں تو بچہ بدستور ٹھیک ہوگیا اور پھر اس وقت سے انہوں نے بندگی شاہ مبارک کو اپنی کفالت میں لے لیا اور اولاد کی طرح پرورش کی اور بعد میں بندگی شاہ مبارک نے اپنے صاحبزادے مولانا اکرم رحمۃ اللہ علیہ کو خلافت وجانشینی عطا کی جو سلسلہ نسلاً بعد نسلٍ چل رہا ہے- بندگی شاہ مبارک فاروقی تھے، اس طرح ہم لوگ نسلاً فاروقی ہیں، جب کہ مخدوم صفی رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان عثمانی تھا-

سوال: (۲) میدان دعوت وتبلیغ میں اس قدیم خانقاہ کی خاص خدمات کیا ہیں؟

جواب: اس خانقاہ کی خدمات کی کئی جہتیں ہیں: سب سے زیادہ دعوتی خدمات ہیں، قلمی اور تصنیفی خدمات کم ہیں اور مصنف کی حیثیت سے سب سے بڑا نام منشی عزیز اللہ شاہ کا ہے- ان کی

تقریباً باون کتابیں ہیں- ان میں بہت سی کتابوں کی اشاعت پاکستان سے ہوئی ہے- پاکستان میں ان کے علمی کارناموں پر توجہ دی گئی ہے- ان پر ایک پی ایچ ڈی بھی ہوچکی ہے- ان کے علاوہ دوسرے بزرگوں کے ملفوظات تو ہیں لیکن باضابطہ تصنیفات عموماً نہیں ہیں- اس کی اصل وجہ یہ رہی کہ اس خانقاہ کے اکثر صوفیہ ومشائخ پر استغراقی کیفیت کا غلبہ رہا اور صوفیہ دو طرح کے ہوتے ہیں اصحاب صحو اور اصحاب محو، اصحاب محو سے تصنیفات کی توقع ہی فضول ہے البتہ اصحاب صحو کی تصنیفات ہوا کرتی ہیں -اس کے علاوہ اس سلسلے سے جو دوسری شاخیں نکلی ہیں وہاں کے مشائخ نے تصنیفی یادگار چھوڑی ہیں -قلمی خدمات سے ہٹ کر سوچیں تو صفی پور کے مشائخ کرام کی دعوتی خدمات بہت زیادہ اور نمایاں ہیں -خدمات کا دائرہ مختلف ہے ،غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ کی زریں روایات ہیں اور عموماً اس مقصد کو خدمت خلق کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کی گئی -ان کی بارگاہوں میں جو کوئی آتا بلا امتیاز رنگ ونسل ومذہب اس کی حاجت روائی کی جاتی اور اس طرح لوگ متأثر ہوکر اسلام قبول کر لیتے -حضرت شاہ صفی رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک پر دھولا گڑھ تبّت کا ایک جوگی ایمان لایا- اس کا واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک مرتبہ دو جوگیوں کو ہوا میں اڑ کر پانی لے جاتے دیکھا آپ نے ایک نظر ڈالی اور فوراً اس کی قوت سلب ہوگئی، اب وہ گڑگڑانے لگے اور کہنے لگے کہ ہم لوگ اپنے استاد کے لیے دو گھڑا پانی لے جارہے تھے- آپ نے فرمایا جاؤ وہ بولے بابا آپ نے تو ایک نظر میں ہوا میں اڑنے کی ساری طاقت چھین لی جسے ہم نے دس سال کے مجاہدے کے بعد حاصل کی تھی- آپ نے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا اس کی قوت پرواز واپس آ گئی اور جاکر سارا ماجرا استاد کو سنایا تو استاد خود اپنے چالیس چیلوں کے ساتھ حضرت شاہ صفی کی زیارت کو پہنچا اور ایمان لے آیا- آپ نے اس جوگی ''شیخ سادھو'' کے بارے میں فرمایا کہ وہاں چراغ اور بتی پہلے سے موجود تھا پس آگ لگانے کی دیر تھی اس سادھو نے تبّت واپس جاکر خانقاہ قائم کی اور چین میں اسلام کی تبلیغ کی -سینکیانگ میں سلسلہ صفویہ چشتیہ کی شاخیں موجود ہیں ابھی جن مسلمانوں پر ظلم وستم ہوا ہے یہ وہی لوگ ہیں-

حضرت شاہ صفی نے روافض میں تبلیغ کی اور آپ کے ہاتھوں پر بہت سے روافض نے توبہ کی اس کے علاوہ اس خانقاہ کے مشائخ کے جو حضرات فیض یافتہ ہوئے ان سے بھی مختلف علاقوں میں دین کی خدمت ہوئی -خود حضرت شاہ صفی رحمۃ اللہ علیہ کے سولہ خلفاء تھے اور سب کے سب اپنے وقت کے آفتاب وماہتاب تھے- اس خانقاہ کی عبقری شخصیات میں حضرت افہام اللہ شاہ،

حضرت قدرت اللہ غوث الدہر اور حضرت خادم صفی رحمۃ اللہ علیہم بہت مشہور ہوئے- ان میں بھی خصوصاً شاہ خادم صفی رحمۃ اللہ علیہ سے سلسلے کو بڑا فروغ ملا-

سوال: (۳) سلسلہ صفویہ کے دوسرے سلاسل سے خصوصی امتیازات کیا ہیں؟

جواب: دیکھئے! یہ بات صحیح ہے کہ صوفیہ کے تمام سلسلے اپنے اندر الگ امتیازات رکھتے ہیں، سلسلۂ صفویہ کے بھی کچھ امتیازات ہیں جن سے یہ جانا پہچانا جاتا رہا ہے -اس سلسلے کی سب سے بڑی خصوصیت خدمت خلق رہی ہے -کوئی بھی آتا اس کی مقدور بھر خدمت کی جاتی اور اس کی ضرورتوں کو پوری کرنے کی کوشش کی جاتی- دوسری خاص بات یہ رہی کہ ہمارے مشائخ ہمیشہ امرا حکام سے دور بھاگتے، ان کی صحبت سے اپنے آپ کو بچاتے بلکہ تمام مخلوق کے ساتھ بھی بلا سبب اٹھنے بیٹھنے سے گریز کرتے- ہاں! اگر فائدہ پہنچانے والا ہوتا تو اس کی صحبت اختیار کرتے اگر کوئی ان کی خدمت میں طلب فیض کے لیے آتا تو ان کو بھی صحبت سے محروم نہیں فرماتے- حضرت شیخ سعد خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے لیے حضرت مخدوم شاہ صفی رحمۃ اللہ علیہ نے جو خلافت نامہ لکھا تھا اس میں اس بات کا تذکرہ موجود ہے کہ ہمارے مشائخ نے جنگل کو اختیار نہیں کیا لیکن پھر بھی عمومی اختلاط سے حتی الامکان گریز ہی کرتے- اس سلسلے میں اوراد ووظائف پر بھی شروع سے ہی زور دیا جاتا رہا ہے -جن کے سپرد جو وظیفہ کیا وہ اس کی پوری پابندی کرتے- مجاہدات پر بھی اس سلسلے میں کافی توجہ دی گئی ہے- ایک اور چیز اس سلسلے میں یہ رہی کہ یہاں نقشبندی ، قادری اور دیگر روحانی سلسلوں پر نظامی چشتی اور سہروردی سلسلوں کا ہمیشہ غلبہ رہا- دوسرے سلاسل بھی رہے لیکن اثر نظامی اور سہروردی سلسلے کا غالب رہا- ان سارے امتیازات وخصوصیات کا حاصل صرف یہ تھا کہ ؎

غرض یہ ہے کسی عنواں تجھے کریں مائل
کرشمہ سازئ ہر رند و پارسا معلوم

ورنہ میں امتیازات کا قائل نہیں، امتیازات کس لیے؟ سارے سلاسل کو متحد ہونا چاہیے-

سوال: (۴) موجودہ دور میں یہ خانقاہ ،دعوت وتبلیغ کے میدان میں کیا کارنامے انجام دے رہی ہے؟

جواب: ہم دعوت کے لیے خانقاہ سے باہر نہیں آتے لیکن پھر بھی دیکھئے ہم اس وقت بھی

دعوت وتبلیغ کے کام میں مصروف ہیں- غیر مسلموں میں بھی دعوت وتبلیغ کی کوشش جاری ہے-خود میرے ہاتھ پر دہلی کا ایک پنڈت خاندان اسلام لایا اگرچہ ابھی اس کے اسلام کا اعلان نہیں ہوا ہے، اسی طرح خدمت خلق کا سلسلہ جاری ہے، بلا امتیاز حاجت روائی بھی کی جاتی ہے-

ہم نے ایک سوسائٹی بنائی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں میں تعلیم عام کی جائے اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا جائے، پریشان حال لوگوں کی دل جوئی کرکے ان کو دین وایمان کی تعلیم دی جائے- اس کے علاوہ اور بہت سے عزائم ہیں-ہم سے جو بن رہا ہے ہم کررہے ہیں- ہم منصوبے بناتے ہیں اور کام کرتے ہیں- ان شاء اللہ اس کا نتیجہ آپ کو دیکھنے کو ملے گا- ہم اپنے بزرگوں کا فیضان لوگوں تک عام کرنے کی کوشش کررہے ہیں- دعا کریں کہ اللہ ہمیں مزید کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں اپنے مشائخ کی میراث کا سچا امین بنائے-

سوال: (۵) موجودہ دور میں اکثر خانقاہیں روبزوال ہیں اور مجموعی طور پر دعوت وتبلیغ کے میدان میں ناکام ہیں، اس کے کیا اسباب ہیں؟

جواب: میں آپ کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ آج کی اکثر خانقاہیں زوال کا شکار ہیں- اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اب جذبہ ایمانی کم ہوگیا ہے، علم وعمل سے دوری ہوگئی، خدمت خلق کا جذبہ بھی رخصت ہوگیا- پہلے تمام خانقاہیں ایمانی جذبوں سے سرشار لوگوں سے بھری تھیں تو وہ ہر کام اللہ کے لیے کیا کرتے تھے- پہلے خانقاہی لوگ علم سے آراستہ تھے تو وہ علم بانٹتے تھے اب علم ہی نہیں، خدمت خلق سے لوگ قریب آتے تھے وہ بھی اب کل کی بات ہوتی جارہی ہے- خانقاہوں کی نظر مریدوں کی جیب پر ہوتی ہے- لوگ ان سے جذامیوں کی طرح بھاگتے ہیں، عرس کے دوران ان کی بادشاہت رہتی ہے اور پھر کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا- یہی وہ خامیاں ہیں جن کی بنا پر خانقاہیں روبزوال ہیں اور دور ہی زوال کا ہے تو پھر دعوتی کام کا عروج کیسے ہوگا؟ اسی سبب سے دعوتی کام رکا پڑا ہے- پہلے ہمارے مشائخ حرص وہوس سے کس قدر پاک تھے اس کا اندازہ اس واقعے سے لگائیں- ایک بار نظام بادشاہ کا ایلچی تحفے لے کر منشی عزیز اللہ شاہ رحمۃ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا- پورا پیکٹ خوب صورت مخمل کے کپڑے میں لپٹا ہوا تھا، کھولا گیا تو اس میں کاشغری حلوہ ریشمی جوڑا اور پاجامہ تھا- ایلچی نے کہا یہ تحائف شاہ نظام نے آپ کی خدمت میں بھیجے ہیں اور آپ سے دربار میں حاضر ہونے کی

درخواست کی ہے- آپ نے کاشغری حلوہ ایک شخص کی جانب بڑھا دیا جسے آپ وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ دیا کرتے تھے- کہا دیکھو بادشاہ کا بھیجا حلوہ ہے، پاجامہ خود رکھ لیا اور ریشمی جوڑا اوالد کی طرف بڑھا دیا اور پھر ایلچی کو جواب دینا شروع کیا کہ دیکھو کہ جہاں تک دربار میں حاضر ہونے کا سوال ہے یہ مجھ سے ممکن نہیں ہے کیوں کہ میرے مرشد نے میرے دونوں پاؤں توڑ دیے ہیں، میں صفی پور شریف سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا ہوں، حلوے کے بارے میں فرمایا کہ بادشاہ کا کھانا فقیر کے حلق سے نیچے نہیں اتر سکتا، ریشم مرد پر حرام ہے، تو میں اس بڑھاپے میں وہ حرام کاری کیوں کروں- ہاں یہ پائے جامہ ریشمی نہیں تھا وہ میں نے رکھ لیا ہے اور اخیر میں پھر فرمایا کہ بادشاہ سے کہہ دینا کہ کنواں پیاسے کے پاس نہیں جاتا بلکہ پیاسا کنوے کے پاس آتا ہے -یہ شان تھی بزرگوں کی اب وہ شان ہی نہیں رہی- اس لیے آج خانقاہوں کا یہ حشر ہے-

سوال: (٦) خانقاہوں کی عظمت رفتہ کی بازیابی کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟

جواب: خانقاہوں کی پرانی شان اگرچہ ختم ہوگئی ہے پہلے جیسی بات اگرچہ نہیں رہی لیکن ابھی بھی راکھ کے ڈھیر میں ایسی چنگاریاں ہیں جو بھڑکتا شعلہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہیں- صرف ہوا دینے کی ضرورت ہے، اب مسئلہ یہ ہے کہ ہوا دے تو کون دے؟ یہاں تو ہر جگہ ہم چنیں دیگرے نیست والی بات سمائی ہوئی ہے-

اگر آج ہم واقعی خانقاہوں کی عظمت رفتہ کی بحالی کے لیے مخلص ہیں تو ہم کو اپنے ماضی کی طرف پلٹ کر جانا ہوگا کیوں کہ ماضی ہی ہمارا سرچشمہ ہے اور سرچشمہ سے ہی ہمارا تعلق کمزور ہوگیا ہے- گزشتہ زمانے میں ہمارے اسلامی سرچشمے سے جو پانی بہہ رہا تھا وہ شیریں اور صحت افزا تھا- ہمارے مشائخ علم وعمل اور حال کا جامع ہوتے تھے، علم سے آراستہ ہونے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ عابد علم کے ذریعہ بواسطہ توفیق الٰہی شیطان کا کھلونا بننے سے بچ جاتا ہے، عمل کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شمع ایمان کی فانوس بن کر حفاظت کرتا ہے اور سب سے آخر میں حال ہونے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ صاحب حال کی نظر مقاصد اور مغز شریعت پر ہوتی ہے وہ خشک زاہد، ظاہر پرست عالم نہیں ہوتا بلکہ درد کی لذت سے بھی آشنا ہوتا ہے- آج بھی اگر علم وعمل اور حال کے جامع افراد تیار ہونے لگیں تو خانقاہوں کی پرانی آن بان پھر سے دیکھنے کو مل سکتی ہے

سوال: (۷) خانقاہیں جو دعوت وتبلیغ اور امن وشانتی کا مرکز تھیں، وہ اختلاف وانتشار

اور جنگ وجدال کی جگہ کیوں اور کیسے بن گئیں؟

جواب: واقعی یہ ایک قابل افسوس حقیقت ہے کہ آج خانقاہوں سے امن وسلامتی کا سبق ملنے کے بجائے جنگ وجدال کا درس دیا جارہا ہے- سجادگان ومتولیان خود ہی آپس میں لڑ رہے ہیں- اب وہ دعوت وتبلیغ کا کام کیا انجام دیں گے اب تو وہ خانقاہ کی آمدنی کے قبضہ کے لیے کورٹ کچہری کا چکر لگارہے ہیں- دراصل ہوا یہ کہ اب خلوص وللّٰہیت کی جگہ حرص وہوس نے لے لی- لوگوں کی نظر میں مال وزر ہی سب کچھ ہوگیا- پہلے خانقاہی حضرات طالب مولیٰ تھے، انہیں اللہ کی خوش نودی چاہیے تھی، اب لوگوں کو مال چاہیے اور یاد رکھیے جب کبھی او رجس کسی تنظیم ،جماعت وتحریک کے افراد کے یہاں اخلاص وایثار کی حیثیت کم ہوجاتی ہے اور دوسرے اغراض آڑے آجاتے ہیں، ہوائے نفسانی کا غلبہ ہوجاتا ہے اور دنیا کی طلب دل میں جگہ بنالیتی ہے، اسی وقت سے وہ جماعت وتحریک جنگ وجدل اور اختلاف وانتشار کا گہوارہ بن جاتی ہے اور پھر جب تک کہ لوگ ہوش میں نہیں آجاتے زوال کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور جب کوئی علم وعمل اور حال وقال کا جامع اٹھتا ہے تو پھر نظام کی اصلاح کر کے اس جماعت وتحریک کو متحرک وفعال بنا دیتا ہے- اللہ ہم سب کے ظاہر وباطن کی اصلاح فرمائے- آمین

سوال: (۸) کیا آپ کو لگتا ہے کہ خانقاہوں میں بعض غیرضروری روایات ومراسم کی پابندی کی جاتی ہے اور اس کی وجہ سے نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں؟

جواب: مجھے آپ کی اس بات سے اتفاق ہے کہ خانقاہوں میں بعض غیرضروری مراسم کی پابندی کی جاتی ہے مثلاً ایک ماحول سا بن گیا ہے کہ موجودہ مشائخ بہت زیادہ تکلف کا مظاہرہ کرتے ہیں- ایک شخص آپ سے کئی سو کلومیٹر کا سفر طے کر کے ملنے آرہا ہے اور آپ اس سے گرم جوشی سے ملنے کو تیار نہیں، یہ ایک غیرضروری رسم ہے اور اس کی وجہ سے نقصان ہوتا ہے- اس کے علاوہ اور بھی غیرضروری مراسم ہیں، مثلاً چادر، گاگر، صندل وغیرہ- لیکن غور کیا جائے تو پتا یہ چلے گا کہ اصل نقصان غیرضروری مراسم کی پابندی سے نہیں بلکہ ضروری مراسم کے چھوڑ دینے کی وجہ سے ہوا- مثلاً صفی پور شریف ہی میں دیکھ لیجئے کہ ہر خانقاہ کے ساتھ ایک مسجد اور ایک کنواں بھی ہے یہ کیا بتارہا ہے؟ یہ ساری چیزیں یہی تو بتارہی ہیں کہ ہمارے بزرگوں کو نماز سے بے حد محبت تھی جو آج ہم میں نہیں ہے- صرف یہی ایک نہیں بلکہ جتنے ضروری مراسم تھے ان کو ہم نے ترک

کردیا اور غیرضروری مراسم کے ہم پابند ہوگئے مثلاً چادر، گاگر، قوالی وغیرہ- پس جب لوگوں نے یہ دیکھا کہ یہ حضرات عین شریعت کو ترک کر کے غیرضروری مراسم میں الجھے ہوئے ہیں تو انہوں نے اعتراض کیا اور ہم سے دور ہوگئے- اس طرح غیرضروری مراسم سے نقصان پہنچا- آج بھی اگر ضروری مراسم (شریعت وطریقت) کے ہم پابند ہوجائیں تو غیرضروری مراسم کی وجہ سے نقصانات کا جو سلسلہ چلا آرہا ہے انشاء اللہ وہ ضرور بند ہوجائے-

سوال: (۹) کیا آپ یہ مانتے ہیں کہ تشدد پسند وہابی تحریک کو غلط صوفیانہ مراسم نے جنم دیا؟

جواب: ہاں یہ بات درست ہے کہ غلط صوفیانہ مراسم نے وہابی تحریک کو جنم دیا ہے- جب اہل خانقاہ بدعات وخرافات میں کھو گئے تو ردعمل کے طور پر وہابی تحریک اٹھی اور انہیں بدعات وخرافات کی اصلاح کے دعوے کے ساتھ اٹھی اور حد سے بڑھ گئی- اگر یہ بدعات وخرافات پیدا نہ ہوئی ہوتیں تو شاید یہ وہابی تحریک آج نہ ہوتی اور آج بھی ان کی تحریک جو فروغ پارہی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ بدعات وخرافات کا سلسلہ خانقاہوں میں جاری ہے- اگر یہ سلسلہ ختم ہوجائے تو وہابی تحریک اپنی موت آپ مرجائے گی- اس وقت اہل خانقاہ بھی غلطی پر ہیں اور وہابی بھی دونوں کی اصلاح ضروری ہے، حق اور ایمان دونوں کے بیچ میں ہے-

سوال: (۱۰) یہ خیال کہاں تک درست ہے کہ تصوف اور صوفیہ کا دور ختم ہوگیا؟

جواب: تصوف اور صوفیہ کا دور نہ کبھی ختم ہوا نہ کبھی ختم ہوگا- جب تک چاند وسورج گردش میں ہیں، جب تک اہل ایمان باقی ہیں، تصوف باقی رہے گا اور صوفیہ انسانیت کی رہنمائی کرتے رہیں گے، انسانیت کو صوفیہ کی ضرورت کل بھی تھی اور آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی- ہاں اس میں کمی بیشی اور زوال وعروج کا سلسہ جاری رہے گا لیکن اس کی وجہ سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تصوف اور صوفیہ کا دور ختم ہوگیا- یہ خیال غلط اور بے بنیاد ہے-

سوال: (۱۱) معاشرے کی تعمیر میں خانقاہوں کا کیا رول ہے اور صوفی کا میدان عمل کیا ہے؟

جواب: بات دراصل یہ ہے کہ تبلیغ کے الگ الگ انداز ہوتے ہیں، اخلاقی اور انسانی حیثیت سے جو تبلیغ ہوتی ہے اس سے ایک معاشرہ تشکیل پاتا ہے- صوفی معاشرہ کا معمار ہوتا ہے اور خانقاہیں انسانی سماج کو اخلاقی خوبیوں سے آراستہ کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں- جھوٹ، حسد، غیبت، چوری اور اس جیسی دوسری برائیاں جو سماج کو کھوکھلا کرنے والی ہیں، ایک

صوفی سماج کے افراد کوان تمام برائیوں سے بچانے کی کوشش کرتا ہے اوراخلاقی اور انسانی قدروں پر مبنی ایک نئے سماج کی تعمیر کرتا ہے-صوفی کا میدان عمل نفس کی اصلاح کر کے دلوں میں نور ایمان روشن کرنا ہے اور پھراس کے وسیلے سے بندوں کا رابطہ اللہ سے جوڑنا ہے تا کہ دنیامیں پرامن انقلاب آجائے اور پھر صوفی خود بندگانِ خدا کے ساتھ مل کر سعادت حاصل کر سکے-

سوال: (۱۲) آج مسلمانوں میں اتحاد و یک جہتی کن بنیادوں پر قائم کی جاسکتی ہے؟

جواب: آج مسلمانوں کے لیے اتحاد و یک جہتی کا ہونا وقت کا جبری تقاضا ہے- اس طرف ہم کوتوجہ دینی ہوگی- اللہ تعالی کا ارشاد ہے "**واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً و لا تفرقوا**" ہمیں حتی الامکان انتشار سے بچنا چاہیے اور دلوں کو جوڑنے کی کوشش کرنی چاہیے اوراس کے لیے بنیادیں موجود ہیں کہ ہم کم ازکم کامن کاز کے لیے اتحاد پیدا کریں اورسب سے اہم بات یہ ہے کہ دوری اسی وقت ختم ہوگی یا کم ہوگی جب ہمارے اندر کچھ ایسی باتیں وعادتیں ہونگی جن سے ہمارا دشمن بھی موم ہوجائے- اللہ کے رسول ﷺ کے اردگرد ابتداً دشمن ہی تھے لیکن آپ نے جن حکمتوں سے اپنے گردوپیش کو اپنے لیے ساز گار بنایا اسے ہمیں بھی اپنی زندگی میں اتارنا چاہیے- اگر آج بھی ہم وعدے کے سچے اور امانت دار ہوجائیں اور مکارم اخلاق سے آراستہ ہوجائیں تو ہمارے دشمن بھی ہمارے دوست ہوجائیں گے- رسول خدا ﷺ نے اپنے دشمنوں کے دلوں کی دنیا کو انہیں ہتھیاروں سے فتح کیا تو ہم اپنے آقا کے نقش قدم پر چل کر اپنے دشمنوں کو کیوں نہیں زیر کر سکتے؟ معلوم ہوا کہ انسانی ہمدردی اور مکارم اخلاق کے نظام کو برپا کر کے ہی ہم یک جہتی قائم کر سکتے ہیں-

سوال: (۱۳) کیا آج تصوف اور خانقاہ کا احیا ہونا چاہیے؟ اگر ہاں تو اس کی بنیادیں کیا ہوں گی؟

جواب: تصوف اور خانقاہ کا احیا ہونا چاہیے- آج ہم تصوف اور خانقاہ کے احیا کے لیے جن چیزوں کو بنیاد بناسکتے ہیں ان میں سب سے پہلے ضروری یہ ہے کہ کوئی ایسا فرد کھڑا ہو جو احیا کا کام کرنے کے لیے کوشش کرے اوراس فرد کی اجازت وصحبت کا سلسلہ متصل ہو،اوروہ اہل سنت و جماعت پر قائم ہو اور اوامر ونواہی کا عالم ہو،انہیں بنیادوں پر خانقاہ کا احیا ممکن ہے- اس کے علاوہ کسی بھی بنیاد پر احیا کا کوئی بھی عمل موثر اور نفع بخش نہیں ہوسکتا-

سوال: (۱۴) شریعت وطریقت کے باہمی رشتہ کو آپ کس طرح سمجھتے ہیں؟

جواب: دیکھئے شریعت وطریقت کا باہم بڑا گہرا رشتہ ہے- ان دونوں میں کسی ایک کو بھی جدا کر کے نہیں سمجھا جاسکتا،شریعت پر عمل کے بغیر طریقت تک رسائی ممکن نہیں اور طریقت کے بغیر روح شریعت تک پہنچنا ممکن نہیں- گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شریعت وطریقت ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم ہیں- شریعت وطریقت کی مثال گوشت اور پوست کی طرح ہے- پوست شریعت ہے اور گوشت طریقت، پوست کو اگر گوشت سے الگ کردیا جائے یا گوشت کو پوست سے الگ کر دیا جائے ،دونوں ہی صورت درست نہیں- ہم دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ظاہری اعمال وافعال کا نام شریعت ہے اور اس کی روح کا نام طریقت ہے- اگرکوئی شریعت وطریقت کو ایک دوسرے سے الگ سمجھتا ہے تو وہ گمراہ ہے اوراس کی بات کا کوئی اعتبار نہیں کیا جانا چاہیے-

سوال: (۱۵) مجلّہ الاحسان کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

جواب: بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ ایسے موضوع پر میگزین نکال رہے ہیں جس پر مجلّاتی حیثیت سے کم ازکم ہندوستان میں زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے، ہماری دعا آپ کے ساتھ ہے- آپ کے جذبہ کو اللہ سلامت رکھے اور آپ کے قارئین کو بھی- کام کریں نام ہوگا اور لوگوں کو اس کا فائدہ پہنچے گا- اللہ تعالی ہم سب کی کوششوں کو قبول کرے اور مغفرت فرمائے- آمین!

○○○

محمد مجیب الرحمن علیمی

خانقاہ عالیہ نظامیہ صفویہ، صفی پور
تاریخ اور کارنامے

صفی پور ضلع اناؤ کا قدیم ترین قصبہ ہے، جو اناؤ سے ۲۷ رکلومیٹر جانب مغرب میں واقع ہے اور اناؤ شمالی ہند کے کثیر آبادی والا صوبہ اتر پردیش کی دارالحکومت لکھنؤ سے جانب جنوب میں ۶۴ رکلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔اس قصبہ کا پرانا نام ''سائی پور'' تھا، ساتویں صدی ہجری میں ایک کامل صوفی حضرت شاہ اکرم عثمانی سہروردی رحمۃ اللہ علیہ (وصال ۱۴ رشعبان ۶۷۵ھ) یہاں تشریف لائے، آپ کے ذریعہ اس خطہ میں اسلام کی تبلیغ ہوئی، آپ کی چوتھی پشت میں حضرت عبدالصمد عرف مخدوم شاہ صفی عثمانی چشتی قدس سرہ (وصال ۱۹ رمحرم الحرام ۹۴۵ھ) (۱) پیدا ہوئے بعد میں یہ قصبہ آپ ہی کے نام سے موسوم ہوگیا۔

مخدوم شاہ صفی قدس سرہٗ کا خاندانی پس منظر: حضرت شیخ عبدالصمد مخدوم شاہ صفی قدس سرہ کے آباء و اجداد ظاہری و باطنی خوبیوں کے مالک اور فقر و درویشی کے امین تھے۔آپ کے والد گرامی حضرت مولانا علم الدین رحمۃ اللہ علیہ سہروردی بزرگ تھے، آپ کو اپنے والد بزرگوار حضرت شاہ زین الاسلام رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت و خلافت تھی، ان کو ان کے والد حضرت شاہ اکرم علیہ الرحمہ (وصال ۱۴ رشعبان ۶۷۵ھ) نے اجازت و خلافت عطا کی تھی اور انہوں نے اس روحانی دولت کو اپنے والد سے حاصل کیا تھا۔مخدوم شاہ صفی قدس سرہ' کے آباواجداد مشرباً سہروردی تھے (۲) علوم ظاہری سے بھی مکمل حصہ رکھتے تھے، فقر و درویشی مخدوم شاہ صفی قدس سرہٗ کو آباواجداد سے ملی تھی اور نسب کے لحاظ سے آپ عثمانی تھے۔

بانئ سلسلہ صفویہ کا نسبی شجرہ: حضرت شیخ عبدالصمد عرف شاہ صفی قدس سرہٗ، حضرت شاہ علم

الدین قدس سرہٗ، حضرت شاہ زین الاسلام قدس سرہٗ، حضرت شاہ اکرم قدس سرہٗ، حضرت شاہ علی قدس سرہٗ، اس کے بعد کا نسبی شجرہ تلاش بسیار کے بعد بھی راقم کو دست یاب نہ ہوسکا۔

تعلیم و تربیت اور اجازت و خلافت: آپ کی ابتدائی تعلیم صفی پور میں ہوئی، بعد میں حضرت مخدوم شیخ سعدالدین خیرآبادی قدس سرہٗ کی خانقاہ جو علوم ظاہری و باطنی دونوں کا سنگم تھی اس میں داخل ہوئے اور یہیں علوم ظاہری و باطنی سے اپنے آپ کو آراستہ کیا اور مخدوم شیخ سعدالدین قدس سرہٗ کے مرید و خلیفہ ہوئے، حضرت مخدوم شیخ سعد بن بڈھن قدس سرہٗ کو حضرت مخدوم شاہ مینا لکھنوی قدس سرہٗ سے ارادت و خلافت تھی اور ان کو حضرت مخدوم شیخ سارنگ قدس سرہٗ سے۔ حضرت مخدوم شیخ سارنگ قدس سرہٗ کو حضرت مخدوم قوام الدین حاجی الحرمین قدس سرہٗ سے ارادت تھی اور حضرت مخدوم یوسف ایرچی قدس سرہٗ سے بھی اجازت تھی۔

حضرت مخدوم شیخ سارنگ قدس سرہٗ مختلف مشائخ سے فیض یاب ہوئے۔آپ کو حضرت مخدوم جہانیاں قدس سرہٗ کی بھی صحبت حاصل تھی لیکن خلافت آپ کے چھوٹے بھائی حضرت مخدوم سید صدرالدین ابوالفضل راجوقتال قدس سرہٗ سے تھی۔حضرت مخدوم جہانیاں جلال الحق بخاری قدس سرہٗ کو مختلف سلاسل میں اجازت و خلافت حاصل تھی (۳)۔سلسلہ عالیہ چشتیہ میں حضرت خواجہ نصیرالدین چراغ دہلوی قدس سرہٗ سے اجازت و خلافت تھی۔ان تمامی سلاسل کی اجازت و خلافت آج بھی خاندان صفویہ میں مروج ہے۔

بانئ سلسلہ صفویہ کے روحانی سلاسل ایک نظر میں

سلسلہ عالیہ قادریہ

حضرت شیخ عبدالصمد مخدوم شاہ صفی بن علم الدین قدس اللہ سرہ (۱۹ رمحرم الحرام ۹۴۵ھ)
حضرت شیخ سعدالدین خیرآبادی قدس اللہ سرہ (۱۶ رربیع الاول ۹۲۲ھ) (۴)
حضرت شیخ محمد مینا معروف بہ مخدوم شاہ مینا قدس اللہ سرہ (۲۳ رصفر ۸۸۴ھ) (۵)
حضرت شیخ سارنگ قدس اللہ سرہ (۱۷ رشوال ۸۵۵ھ) (۶)
حضرت سید ابوالفضل محمد راجوقتال قدس اللہ سرہ (ولادت: ۷۴۱ھ، وصال ۱۶ رجمادیٰ الثانی ۸۲۷ھ)
حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت قطب العالم جلال الحق بخاری قدس اللہ سرہ (۱۰ رذی الحجۃ ۷۸۵ھ)

حضرت شیخ محمد بن عبید غیشی قدس اللہ سرہ

حضرت شیخ فاضل بن غیشی قدس اللہ سرہ

حضرت شیخ عبید غیشی قدس اللہ سرہ

حضرت شیخ ابوالغیث بن جمیل قدس اللہ سرہ

حضرت شیخ علی افلح حداد قدس اللہ سرہ

حضرت شیخ علی حداد قدس اللہ سرہ

حضرت سید محی الدین ابومحمد شیخ عبدالقادر جیلانی بن میر صالح گیلانی قدس اللہ (۱۷ربیع الآخر ۵۶۱ھ)

حضرت شیخ ابوسعید المبارک بن علی المخزومی قدس اللہ سرہ (۷رشوال ۵۱۳ھ)

حضرت شیخ ابوالحسن علی القریشی قدس اللہ (یکم محرم الحرام ۴۸۶ھ)

حضرت شیخ ابوالفرح یوسف قریشی طرطوسی قدس اللہ سرہ (۳رشعبان المعظم ۴۴۷ھ)

حضرت شیخ ابوالفضل عبدالواحد بن عبدالعزیز تمیمی قدس اللہ سرہ (۶رجمادیٰ الاخریٰ ۴۲۵ھ)

حضرت شیخ عبدالعزیز تمیمی قدس اللہ سرہ

حضرت شیخ ابوبکر شبلی قدس اللہ سرہ (۲۷رذی الحجۃ ۳۳۴ھ)

حضرت شیخ خواجہ ابوالقاسم جنید بغدادی قدس اللہ سرہ (۲۷ررجب ۲۹۷/ ۲۹۸ھ)

حضرت شیخ سری سقطی قدس اللہ سرہ (۱۳ررمضان المبارک ۲۵۳ھ)

حضرت شیخ معروف کرخی قدس اللہ سرہ (۲رمحرم الحرام ۲۰۰ھ)

حضرت شیخ داؤد طائی قدس اللہ سرہ

حضرت شیخ حبیب عجمی قدس اللہ سرہ

حضرت شیخ حسن بصری قدس اللہ سرہ

حضرت امیر المؤمنین سیدنا علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ الکریم (۲۱ررمضان المبارک ر۴۰ھ)

حضرت سید المرسلین خاتم النبین شفیع المذنبین احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ (۱۲رربیع النور ۱۱ھ)

سلسلہ عالیہ چشتیہ

حضرت شیخ عبدالصمد شاہ صفی بن علم الدین قدس اللہ سرہ (۱۹رمحرم ۹۴۵ھ)

حضرت شیخ سعدالدین خیرآبادی قدس اللہ سرہ (۱۶رربیع الاول ۹۲۲ھ)

حضرت شیخ محمد مینا معروف بہ مخدوم شاہ مینا قدس اللہ سرہ (۲۳رصفر ۸۸۴ھ)

حضرت شیخ سارنگ قدس اللہ سرہ (۱۷رشوال ۸۵۵ھ)

حضرت سید ابوالفضل محمد راجو قتال قدس اللہ سرہ (۱۶رجمادیٰ الثانی ۸۶۷ھ)

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت قطب العالم جلال الحق بخاری قدس اللہ سرہ (۱۰رذی الحجۃ ۷۸۵ھ)

حضرت خواجہ نصیرالدین چراغ دہلوی قدس اللہ سرہ (۱۸ررمضان ۷۵۷ھ)

حضرت خواجہ نظام الحق والدین محمد بدایونی قدس اللہ سرہ (۱۸رربیع الثانی ۷۲۵ھ)

حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر قدس اللہ سرہ (۵رمحرم ۶۶۴ھ)

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی قدس اللہ سرہ (۱۴رربیع الثانی ۶۳۳ھ)

حضرت سلطان الہند غریب نواز خواجہ معین الدین حسن چشتی قدس اللہ سرہ (۶ررجب ۶۳۲ھ)

حضرت خواجہ محمد عثمان ہرونی قدس اللہ سرہ (۵رشوال ۶۰۳ھ)

حضرت خواجہ حاجی شریف زندنی قدس اللہ سرہ (۱۰ررجب ۵۸۴ھ)

حضرت خواجہ قطب الدین مودود بن ابویوسف چشتی قدس اللہ سرہ (یکم رجب ۵۲۷ھ)

حضرت خواجہ ناصرالدین ابویوسف چشتی قدس اللہ سرہ (۳ررجب ۴۵۹ھ)

حضرت خواجہ ناصح الدین ابومحمد بن ابواحمد چشتی قدس اللہ سرہ (۴رربیع الثانی ۴۱۱ھ)

حضرت خواجہ قدوۃ الدین ابواحمد ابدال چشتی قدس اللہ سرہ (یکم جمادیٰ الثانی ۳۵۵ھ)

حضرت خواجہ ابواسحاق شامی چشتی قدس اللہ سرہ (۱۴رمحرم ۳۲۹ھ)

حضرت خواجہ علو دینوری قدس سرہ (۱۴رمحرم الحرام ۲۹۹ھ)

حضرت خواجہ ہبیرہ بصری قدس اللہ سرہ (۷رشوال ۲۸۷ھ)

حضرت خواجہ سدید الدین حذیفہ مرعشی قدس اللہ سرہ (۴رشوال ۲۵۲ھ)

حضرت خواجہ ابراہیم بن ادہم بلخی قدس اللہ سرہ (۲۶رجمادیٰ الاول ۱۶۶ھ)

حضرت خواجہ فضیل بن عیاض قدس اللہ سرہ (۳رربیع الاول ۱۸۷ھ)

حضرت خواجہ عبدالواحد بن زید قدس اللہ سرہ (۲۷رصفر ۱۷۷ھ)

حضرت خواجہ حسن بصری قدس اللہ سرہ (یکم رجب ۱۱۰ھ)

حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ (۲۱ر رمضان ۴۰ھ)
حضرت سید المرسلین خاتم النبیین احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ (۱۲ر ربیع النور ۱۱ھ)

سلسلہ عالیہ سہروردیہ

حضرت شیخ عبدالصمد مخدوم شاہ صفی بن علم الدین قدس اللہ سرہ (۱۹ر محرم الحرام ۹۴۵ھ)
حضرت شیخ سعدالدین خیرآبادی قدس اللہ سرہ (۱۶ر ربیع الاول ۹۲۲ھ)
حضرت شیخ محمد مینا معروف بہ مخدوم شاہ مینا قدس اللہ سرہ (۲۳ر صفر ۸۸۴ھ)
حضرت شیخ سارنگ قدس اللہ سرہ (۱۷ر شوال ۸۵۵ھ)
حضرت سید ابوالفضل محمد راجو قتال قدس اللہ سرہ (۱۶ر جمادیٰ الثانی ۸۲۷ھ)
حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت قطب العالم سید جلال الحق بخاری قدس اللہ سرہ (۱۰ر ذی الحجہ ۷۸۵ھ)
حضرت خواجہ کبیر الحق والدین احمد بخاری قدس اللہ سرہ
حضرت خواجہ جلال الدین میر سرخ بخاری قدس اللہ سرہ
حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی قدس اللہ سرہ
حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی قدس اللہ سرہ
حضرت شیخ ضیاء الدین عبدالقاہر سہروردی قدس اللہ سرہ (۲۱ر رجب ۹۸۹ھ)
حضرت شیخ وجیہ الدین ابوحفص عمر قدس اللہ سرہ
حضرت خواجہ محمد معروف بہ خواجہ عمویہ قدس اللہ سرہ
حضرت خواجہ ابواحمد اسود دینوری قدس اللہ سرہ
حضرت خواجہ ممشاد علو دینوری قدس اللہ سرہ (۱۴ر محرم الحرام ۲۹۹ھ)
حضرت شیخ خواجہ ابوالقاسم جنید بغدادی قدس اللہ سرہ (۲۷ر رجب ۲۹۷/۲۹۸ھ)
حضرت شیخ خواجہ سری سقطی قدس اللہ سرہ (۱۳ر رمضان المبارک ۲۵۳ھ)
حضرت خواجہ معروف الکرخی قدس اللہ سرہ (۲ر محرم الحرام ۲۰۰ھ)
حضرت خواجہ داؤد طائی قدس اللہ سرہ
حضرت خواجہ حبیب عجمی قدس اللہ سرہ

حضرت خواجہ حسن بصری قدس اللہ سرہ (یکم رجب ۱۱۰ھ)
حضرت امیر المؤمنین سیدنا علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ الکریم (۲۱ر رمضان المبارک ۴۰)
حضرت سید المرسلین خاتم النبیین شفیع المذنبین احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ (۱۲ر ربیع النور ۱۱ھ)

مخدوم شاہ صفی قدس سرہٗ کے خلفا وسجادگان

مخدوم شاہ صفی قدس اللہ سرہٗ اپنے پیراور داداپیرہی کی طرح مجرد ومحصور تھے، آپ نے روحانی سلسلہ کی بقا کے لئے اپنی بہن کےلڑکے حضرت بندگی شاہ مبارک فاروقی جاجموی کی بچپن ہی سے تعلیم وتربیت فرمائی جوبعد میں صفوی مے کدہ کے پیرمغاں اورساقی بنے ،جن کی اولاد میں آج بھی یہ روحانی سلسلہ جاری ہے۔

خانقاہ صفویہ کے سجادگان ایک نظر میں

(۱) حضرت شیخ شاہ بندگی مبارک قدس اللہ سرہ (۷)
(۲) حضرت شیخ بندگی اکرم قدس اللہ سرہ
(۳) حضرت شیخ عبدالرحمٰن قدس اللہ سرہ
(۴) حضرت شیخ عبدالواحد قدس اللہ سرہ
(۵) حضرت شیخ زاہد قدس اللہ سرہ
(۶) حضرت شیخ بھولن شاہ قدس اللہ سرہ
(۷) حضرت شیخ عبداللہ قدس اللہ سرہ
(۸) حضرت شیخ محمد بن شاہ نعمت اللہ عرف شاہن میاں قدس اللہ سرہ
(۹) حضرت شیخ ولی محمد قدس اللہ سرہ
(۱۰) حضرت شیخ نوازش محمد قدس اللہ سرہ
(۱۱) حضرت شاہ ذوالفقاراللہ عرف شیخ الطاف محمد قدس اللہ سرہ (آپ کوحضرت شاہ خادم صفی قدس سرہٗ سے بھی خلافت تھی)
(۱۲) حضرت شیخ خادم محمد قدس اللہ سرہ

(۱۳) حضرت شیخ نور محمد قدس اللہ سرہ

(۱۴) حضرت شیخ مطلوب صفی، اعزاز محمد فاروقی معروف بہ شمومیاں مدظلہ العالی آپ موجودہ سجادہ نشین ہیں۔

مخدوم شاہ صفی قدس اللہ سرہٗ کے خلفا ایک نظر میں

(۱) حضرت شیخ بندگی مبارک جاجموی قدس اللہ سرہ (خواہرزادہ وسجادہ نشین)

(۲) حضرت سید نظام الدین عرف مخدوم الہدیہ خیرآبادی قدس سرہ (۸)

(۳) حضرت شیخ شاہ فضل اللہ گجراتی قدس اللہ سرہ

(۴) حضرت شیخ حسین محمد سکندرآبادی قدس اللہ سرہ (۹)

(۵) حضرت شیخ مبارک سندیلوی قدس سرہٗ

(۶) حضرت شیخ محمد مانوجگوری قدس سرہٗ

(۷) حضرت شیخ اللہ دیہ جنولی قدس سرہٗ

(۸) حضرت سید حسن محمد اودھی قدس سرہٗ

(۹) حضرت شیخ حاجی منڈھن آسیونی قدس سرہٗ

(۱۰) حضرت شیخ جان ساناڈھوی قدس سرہٗ

(۱۱) حضرت سید ابراہیم بلگرامی قدس سرہٗ

(۱۲) حضرت شیخ پیارہ کنجوی قدس سرہٗ

(۱۳) حضرت شیخ ابوالفتح آسیونی قدس سرہٗ

(۱۴) حضرت شیخ جانو کاکوروی قدس سرہٗ

(۱۵) حضرت جیو موہانی قدس سرہٗ

(۱۶) حضرت شیخ عبدالغنی فتح پوری قدس سرہٗ

(۱۷) حضرت شیخ سید طٰہٰ بلگرامی قدس سرہٗ

(۱۸) حضرت شیخ کمال الدین پھول قدس سرہٗ

(۱۹) حضرت شیخ عبدالباقی چشتی بدایونی قدس اللہ سرہٗ (۱۰) (وصال ۹۲۱ھ) آپ شیخ احمد شیبانی

علیہ الرحمہ (۱۱) کے شاگرد اور سکندر لودھی کے زمانہ کے مشہور بزرگ ہیں۔

اول الذکر چار خلفاء سے سلسلہ صفویہ کا فروغ ہوا ''عین الولایت'' ص: ۵۶/۵۵ پر حضرت محمد عزیز اللہ شاہ تحریر کرتے ہیں:

''آپ کے چار خلیفہ سے سلسلہ جاری ہے پہلے بندگی شیخ مبارک سے جو آپ کے بھانجے اور صاحب سجادہ ہیں دوسرے مخدوم الہدیہ خیرآبادی سے اور یہ سلسلہ حضرت شاہ قدرت اللہ قدس اللہ سرہٗ کے واسطے سے یہاں موجود ہے اور سعدی میاں بلگرامی قدس اللہ سرہٗ ان کی اولاد میں ہیں، تیسرے حضرت شیخ فضل اللہ گجراتی سے اور یہ سلسلہ بھی حضرت شاہ قطب عالم کے واسطے سے یہاں موجود ہے۔ چوتھے حضرت شیخ حسین محمد سکندرآبادی سے جو دہلی کے پاس ہے اور یہ سلسلہ حضرت میر عبدالواحد بلگرامی صاحب سنابل کی اولاد میں شائع ہے جو بلگرام اور مارہرہ میں ہیں''

خانقاہ صفویہ کے فیض یافتگان: تصوف اور سلوک کی مشہور کتاب ''سبع سنابل شریف'' کے مصنف حضرت میر سید عبدالواحد بلگرامی قدس اللہ سرہٗ اپنے بچپن ہی میں حضرت مخدوم شاہ صفی قدس اللہ سرہٗ کے دست مبارک پر بیعت ہوئے تھے، بعد میں حضرت کے خلیفہ حضرت مخدوم محمد حسین سکندرآبادی نے میر صاحب قبلہ کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری ادا کی اور خلافت واجازت سے سرفراز فرمایا، (۱۲) حضرت میر عبدالواحد قدس اللہ سرہٗ سلسلہ رضویہ برکاتیہ کے روحانی شیوخ اور خانوادۂ برکاتیہ کے آباواجداد میں آتے ہیں۔ (۱۳) خانقاہ مارہرہ میں آپ ہی کے ذریعہ سلسلہ چشتیہ نظامیہ صفویہ کا فیض پہنچتا ہے، بعد میں کالپی شریف سے بھی اجازت وخلافت ملی اور سلسلہ قادریہ کا غلبہ ہوگیا۔

اسی طرح بعد کے دور میں سرزمین لکھنؤ کے نہایت مشہور محقق اور صوفی حضرت سید عبدالرحمٰن پنجابی لکھنوی قدس اللہ سرہٗ (۱۴) بھی سلسلہ صفویہ کے روحانی چشمہ سے سیراب ہوئے، آپ حضرت پیر بخش صفی پوری علیہ الرحمہ کے اجازت یافتہ تھے۔

یوں ہی خانقاہ حضرت مخدوم شیخ سارنگ قدس اللہ سرہٗ مجھگواں شریف کے سجادہ حضرت شاہ دانش علی میاں بھی خانقاہ صفویہ کے بارہویں سجادہ نشین حضرت شاہ خادم محمد علیہ الرحمہ کے خلیفہ تھے، حضرت شاہ دانش علی میاں علیہ الرحمہ کے صاحب زادے وسجادہ نشین حضرت سلطان عارف علی شاہ علیہ الرحمہ (۱۵) مجھگواں شریف جن کا حال ہی میں ۱۸/ذی الحجہ ۱۴۲۹ھ/ ۱۷/دسمبر ۲۰۰۸ء

کوصال ہوا ہے نہایت ہی بارعب وباکمال ملامتی صوفی گزرے ہیں۔

درگاہ حضرت مخدوم شیخ سعد خیر آبادی قدس اللہ سرہٗ کے سجادہ نشین حضرت شاہ سجاد حسین میاں علیہ الرحمہ(وصال ۱۸؍صفر ۱۴۲۰ھ/۳؍جون ۱۹۹۹ء) کوحضرت دانش علی میاں سے اجازت وخلافت حاصل تھی۔

سلسلہ صفویہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ دیگر خانقاہوں کے سجادگان بلکہ اپنے مخدوم زادوں کی تربیت کرنے اوران کو اجازت وخلافت عطا کرنے کا موقع میسر آیا اور ملک کے بڑے بڑے علماء ودانشوروں کی روحانی تربیت کی ذمہ داری ادا کی۔

خانقاہ صفویہ کے مشہور مشائخ اوران کے کارنامے: خانقاہ صفویہ کے ساتویں سجادہ نشین حضرت شاہ عبداللہ قدس اللہ سرہٗ کے دوخلفا بہت زیادہ مشہور ہوئے (۱) حضرت شاہ قدرت اللہ غوث الدھر قدس اللہ سرہٗ آپ بارہ بنکی مسولی کے قدوائی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔حج کے درمیان کسی بزرگ نے صفی پور کا پتہ بتایا تھا،صفی پور تشریف لاتے ہی مراتب عالیہ کا حصول آسان ہوگیا۔آپ کی ذات بابرکات سے بے شمار لوگ فیض یاب ہوئے ،بہت سارے غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا اور آپ نے سترہ (۱۷) نفوس قدسیہ کوخلافت واجازت سے سرفراز فرمایا۔

شاہ قدرت اللہ علیہ الرحمہ کے خلفا ایک نظر میں

(۱) حضرت شاہ غلام نبی صفی پوری
(۲) حضرت مولانا شاہ نصیرالدین عرف سعدی میاں بلگرامی
(۳) حضرت مولانا شاہ صلاح الدین گوپاموی
(۴) حضرت مولانا شاہ مصطفیٰ خان
(۵) حضرت مولانا شاہ مصباح الدین خان گوپاموی
(۶) حضرت شاہ کفایت اللہ لکھنوی
(۷) حضرت شاہ نجابت علی لکھنوی
(۸) حضرت مولانا شاہ حیدرعلی سندیلوی
(۹) حضرت مولانا شاہ اکبرعلی سندیلوی

(۱۰) حضرت مولانا شاہ عبدالرشید سندیلوی
(۱۱) حضرت شاہ غلام علی سدھوری
(۱۲) حضرت مولانا شاہ عشق حسین جہان آبادی
(۱۳) حضرت شاہ رضا میاں صفی پوری
(۱۴) حضرت شاہ نور دکنی گجراتی
(۱۵) حضرت مولانا شاہ غلام علی سوداگر صفی پوری
(۱۶) حضرت شاہ سبحان بلگرامی
(۱۷) حضرت شاہ پیر بخش صفی پوری رحمہم اللہ تعالیٰ

۱۲؍رجب ۱۱۸۳ھ کو آپ کا وصال ہوا اور صفی پور ہی میں مدفون ہوئے ،۱۱؍۱۲؍رجب کو ہر سال آپ کا عرس ہوتا ہے۔

صفی پور کی ایک خاص بات یہ ہے کہ جو یہاں آیا وہ یہیں کا ہوکر رہ گیا،یہی وجہ ہے کہ اس تاریخی قصبہ میں بہت سارے بزرگوں کے مزارات موجود ہیں جس کی وجہ سے یہ قصبہ مدینۃ الاولیاء صفی پور شریف کے نام سے جانا جاتا ہے۔اور ہر درگاہ سے متصل ایک کنواں اور ایک مسجد ضروری طور پر موجود ہے ،یہ مقامات جہاں ہم کو یہ بات بتاتے ہیں کہ ہمارے مشائخ نے نماز کی بے حد پابندی کی ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مے خانہ کا نظام درگاہ سے نہیں بلکہ رند سے ہے ۔

رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہیں مے خانہ بنے

حضرت عبداللہ شاہ قدس اللہ سرہٗ کے دوسرے مشہور خلیفہ حضرت افہام اللہ شاہ ہیں،آپ بھی قدوائی تھے اور لکھنؤ کے قریب بھٹولی کے رہنے والے تھے،آپ حضرت شاہ سید عبد الرشید قادری امجھری رحمۃ اللہ علیہ کے مرید وخلیفہ تھے،حضرت امجھری علیہ الرحمہ حضرت غوث پاک کی روحانی اورنسبی اولاد سے ہیں،باطنی طور پر حضرت مخدوم شاہ صفی قدس اللہ سرہٗ نے حضرت افہام اللہ شاہ کو امجھری علیہ الرحمہ سے طلب کرلیا تھا،حضرت امجھری علیہ الرحمہ نے اپنے مرید وخلیفہ افہام اللہ شاہ کو صفی پور روانہ فرمایا آپ نے صفی پور پہنچ کر حضرت شاہ عبداللہ علیہ الرحمہ سے اجازت

و خلافت حاصل کی اور بانی خانقاہ حضرت مخدوم شاہ صفی علیہ الرحمہ سے اویسی نسبت کی بنیاد پر فیضیاب ہوئے۔

آپ سے خلق خدا کافی تعداد میں فیض یاب ہوئی اور آپ نے صرف آٹھ حضرات کو اجازت وخلافت سے نوازا۔

حضرت افہام اللہ شاہ کے خلفا

(۱) حضرت شاہ محمدی عرف غلام پیر ساںڈوی قدس سرہٗ
(۲) حضرت شاہ پیر محمد عرف چھیدی میاں قدس سرہٗ
(۳) حضرت پیرزادہ صفی پوری قدس سرہٗ
(۴) حضرت شاہ علیم اللہ شاہ نوتنوی قدس سرہٗ
(۵) حضرت شاہ امان اللہ نوتنوی قدس سرہٗ
(۶) حضرت شاہ حاجی کرم صفی،صفی پوری قدس سرہٗ
(۷) حضرت شاہ حسام الدین لکھنوی قدس سرہٗ
(۸) حضرت شاہ نصرت اللہ ساںڈوی قدس سرہٗ (والد ماجد حضرت شاہ محمدی عرف غلام پیر علیہ الرحمہ)

حضرت شاہ افہام اللہ علیہ الرحمہ مجرد تھے ۲۱؍ربیع الاول ۱۱۹۶ھ میں آپ کا وصال ہوا، اور صفی پور ہی میں مدفون ہوئے۔ آپ نے اپنے خلیفہ حضرت شاہ پیر محمد علیہ الرحمہ کو جانشین مقرر فرمایا تھا۔

افہام اللہ شاہ علیہ الرحمہ کے سجادگان

حضرت شاہ پیر محمد چھدی میاں (وصال ۱۲۲۱ھ)
حضرت شاہ علی محمد کرم میاں (وصال ۱۲۲۷ھ)(۱۶)
حضرت شاہ محمد حفیظ اللہ (ولادت ۱۲۰۱ھ/ وصال ۲۲؍جمادی الآخرہ ۱۲۸۱ھ)(۱۷)
حضرت شاہ امیر اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ (۱۸)

یوں تو سلسلہ صفویہ کے تقریباً تمام مشائخ اپنے آپ میں ایک عالم سمیٹے ہوئے تھے مگر ان

میں بعض نے ایسا تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا ہے جن کے ذکر کے بغیر تاریخ صفی پور شریف نامکمل رہے گی ان میں سے چند کا تذکرہ گزر چکا، اب اس عظیم شخصیت کا ذکر کیا جارہا ہے جس کو سلسلہ صفویہ کا مجدد کہا جاتا ہے، جن کے بارے میں اس سلسلہ کے عظیم بزرگ حضرت شاہ قدرت اللہ قدس سرہٗ نے فرمایا تھا کہ میرے بعد صفی پور میں ایک چراغ روشن ہوگا جس پر ایک زمانہ شیفتہ اور پروانہ وار نثار ہوگا، اس شمع ہدایت سے بہت سے طالبان راہ خدا مستفیض ہوں گے وہ اپنا اور اپنے پیران طریقت کا نام روشن کرنے والا ہوگا۔

اس پیشین گوئی کے مصداق حضرت شاہ خادم صفی محمدی قدس سرہٗ ہوئے، آپ ۱۲؍رجب ۱۲۲۹ھ کو دوشنبہ کی رات صفی پور میں پیدا ہوئے، آپ کے والد کا نام حضرت عطائے صفی عرف بڑے میاں تھا، آپ کے والد ہی کی طرح والدہ بھی پارسا، خدارسیدہ تھیں۔

آپ نسباً امیر المؤمنین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی چوبیسویں پشت میں آتے ہیں۔

حضرت شاہ خادم صفی محمدی قدس سرہٗ کا پدری نسب نامہ

حضرت شاہ خادم صفی علیہ الرحمہ
حضرت شاہ عطائے صفی عرف بڑے میاں علیہ الرحمہ
حضرت شاہ محمد معصوم
حضرت شاہ نہال علیہ الرحمہ
حضرت شاہ عبدالحق علیہ الرحمہ
حضرت شیخ دانیال علیہ الرحمہ
حضرت شاہ عبدالرزاق علیہ الرحمہ
حضرت شیخ محمد علیہ الرحمہ
حضرت شاہ بندگی مبارک علیہ الرحمہ
حضرت شیخ عبدالملک علیہ الرحمہ
حضرت شیخ محمد لڈن علیہ الرحمہ
حضرت محمد گدن

حضرت محمد جعفر

حضرت محمد غوث

شیخ حق گو ملک یار پیران

حضرت شاہ اعلیٰ جاجموی علیہ الرحمہ

شیخ قاضی سراج علیہ الرحمہ

حضرت شیخ ابوالفتح علیہ الرحمہ

شیخ محمد عمر علیہ الرحمہ

شیخ ابوبکر علیہ الرحمہ

شیخ عبدالقادر علیہ الرحمہ

شیخ حسن زنجانی علیہ الرحمہ

شیخ عبدالمجید علیہ الرحمہ

حضرت شیخ عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت امیرالمؤمنین عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

والدہ کی طرف سے بھی آپ فاروقی تھے، مادری و پدری نسب نامہ میں صرف چند ناموں کا فرق ہے، والدہ کی طرف سے صرف پانچ پشتوں کے بعد حضرت شاہ بندگی مبارک علیہ الرحمہ پر دونوں نسب نامہ مل جاتا ہے۔

حضرت مخدوم خادم صفی محمدی قدس سرہٗ کا مادری نسب نامہ

آپ کے نانا کا نام شیخ فضل اللہ ہے اور ان کے والد کا نام حضرت شاہ غلام پیر علیہ الرحمہ

حضرت شاہ مخدوم عالم علیہ الرحمہ

حضرت شاہ عبدالرسول علیہ الرحمہ

حضرت شاہ دانیال علیہ الرحمہ

اس کے آگے کا سلسلہ مادری و پدری ایک ہی ہے۔

حضرت شاہ خادم صفی محمدی قدس سرہٗ کے تذکرے کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ

مادرزاد ولی تھے، بچپن ہی سے آپ کی ذات الگ تھی، عام بچوں کی طرح نہیں۔آپ کے دادا پیر حضرت غلام زکریا علیہ الرحمہ نے آپ کی ایک خدمت گزاری پر خوش ہو کر فرمایا کہ حفیظ اللہ شاہ کو تیری ایک امانت سپرد کردی ہے، بڑے ہونے کے بعد ان سے طلب کر لینا، بعد میں آپ حضرت حفیظ اللہ شاہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور خلافت واجازت سے نوازے گئے۔

آپ نے صرف ضروری تعلیم حاصل کی اور عین شریعت کی طلب میں مصروف رہے، قرآن کا علم حضرت عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ کے شاگرد حضرت شیخ چراغ علی علیہ الرحمہ سے حاصل کیا اور تصوف اور سلوک کی کتابیں مولوی حکیم ہدایت اللہ سے پڑھی، آپ نے ہر علم و فن میں کسی نہ کسی کو اپنا استاد بنایا، اور جب جس چیز کی ضرورت پڑی حاصل کر لی، علم برائے عمل حاصل کیا ، ہمیشہ اس کو واسطہ خیال کیا اور اصل مقصد کو پیش نظر رکھا۔

احکام شریعہ کے ابتدائی عمر ہی سے پابند تھے، دل طلب مولیٰ کے جذبہ سے سرشار تھا، باشعور ہونے کے بعد مرشد کامل کی ضرورت پڑی، اس وقت آپ کے ماموں حضرت حفیظ اللہ شاہ کا فیض جاری تھا، بیس سال کی عمر میں حضرت حفیظ اللہ شاہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے، بیعت کے بعد حالت مزید بدل گئی، صرف یادالٰہی سے کام تھا اسی عمر میں چچا کی صاحب زادی سے آپ کا عقد مسنون بھی ہوگیا، ازدواجی زندگی میں مصروف ہونے کے باوجود جذبہ طلب مولیٰ میں کوئی کمی نہ آئی۔ مجاہدات و ریاضات کے پہلے ہی سے عادی تھے، اس کے باوجود مرشد کے حکم کے مطابق اس راہ میں مختلف قسم کی شدتیں برداشت کرنی پڑیں اور ایک دن ان تمام مجاہدات شاقہ کی تپش سے کندن ہوگئے۔ بالآخر ۱۲۵۵ھ ماہ ذی قعدہ میں جمعہ کے دن مرشد گرامی حضرت حفیظ اللہ شاہ نے تمام روحانی نعمتوں سے نوازتے ہوئے اجازت وخلافت سے سرفراز فرمایا۔

آپ سیرت نبوی کے آئینہ دار تھے، خلافت واجازت ملنے کی وجہ سے مسند ارشاد پر فائز ہوگئے اور رشد و ہدایت کا عظیم کارنامہ انجام دیا، آپ کی بارگاہ میں مریدوں کی ایک بڑی جماعت ہمیشہ موجود رہتی، آپ ان کی تعلیم وتلقین کو اپنا دینی فریضہ خیال کرتے، تربیت اور تزکیہ نفس میں اکثر اوقات گزارتے، خلافت کے بعد سے ۱۲۸۷ھ تک (تقریباً ۲۲/سال تک) صفی پور سے باہر تشریف نہ لے گئے، ہمیشہ خلق خدا کو معرفت الٰہی سے روشناس کرایا، ناقصوں کو کامل اور کاملوں کو رہنما بنانے کا کام انجام دیا، ۴۲/نفوس قدسیہ کی مکمل تربیت وتزکیہ کرنے کے بعد ان کو

اجازت وخلافت سے سرفراز فرمایا، جن میں سے تمام کے تمام اپنے وقت کے کامل مرشد اور مکمل راہنما کی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے دست حق پرست پر ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ تائب ہوئے اور ان کے ذریعہ طالبین مولیٰ نے اپنے مقصد حیات تک رسائی حاصل کی ۔

کعبۃ العشاق باشد ایں مقام   ہر کہ ناقص آمد ایں جا شد تمام

حضرت شاہ خادم صفی علیہ الرحمہ کے خلفائے کرام

(۱) حضرت خلیفۃ اللہ شاہ عرف شاہ امیر احمد
(۲) حضرت ذوالفقار اللہ شاہ عرف الطاف محمد صفی پوری (آپ خانقاہ صفویہ کے گیارہویں صاحب سجادہ ہیں)
(۳) حضرت صاحب سرّقل ہواللہ شاہ عبدالغفور محمدی (۱۹)
(۴) حضرت کریم اللہ شاہ عرف کریم بخش صفی پوری (۲۰)
(۵) حضرت شاہ عظمت اللہ خان افغان فرخ آبادی
(۶) حضرت حبیب اللہ شاہ عرف رمضان خان بانگرمؤی ثم سیتل گنجوی
(۷) حضرت عطاء اللہ شاہ عرف عطا حسین صفی پوری
(۸) حضرت یقین اللہ شاہ عرف سید قمر علی پنجابی ثم لکھنوی
(۹) حضرت عنایت اللہ شاہ صفی پوری
(۱۰) حضرت مولانا حافظ شاہ عبدالرحمٰن ترہوانی
(۱۱) حضرت مظہر اللہ شاہ عرف سید مظہر حسین لکھنوی
(۱۲) حضرت اہل اللہ شاہ عرف مشرف علی دہلوی ثم میرٹھی
(۱۳) حضرت مبارک اللہ شاہ عرف مبارک حسین
(۱۴) حضرت ظہور اللہ شاہ عرف اچپل شاہ ملتانی
(۱۵) حضرت مولانا حافظ شوکت علی شاہ سندیلوی
(۱۶) حضرت امیر اللہ شاہ اناوی

(۱۷) حضرت نوراللہ شاہ عرف نور محمد خان گھاتم پور، کانپور
(۱۸) حضرت شرافت اللہ شاہ آسیون، اناؤ
(۱۹) حضرت شاہ سعادت علی خان رام پوری
(۲۰) حضرت اسداللہ شاہ عرف چودھری محمد خصلت حسین سندیلوی
(۲۱) حضرت مراداللہ شاہ عرف مدار بخش کھیری لکھیم پوری
(۲۲) حضرت کلیم اللہ شاہ عرف فرزند حسن تیونتوی، اناوی
(۲۳) حضرت مظہر اللہ شاہ عرف سرفراز علی سانڈوی
(۲۴) حضرت وجہ اللہ شاہ عرف مولوی فیض محی الدین ہردوی
(۲۵) حضرت کرامت اللہ شاہ بانگرموی
(۲۶) حضرت رحیم اللہ شاہ عرف سالار بخش کانپوری
(۲۷) حضرت احسان اللہ شاہ صفی پوری
(۲۸) حضرت خوب اللہ شاہ اناوی
(۲۹) حضرت سید شاہ یعقوب علی ترکواسی گڑگاؤں، دہلی
(۳۰) حضرت شاہ محمد شفیع صفی پوری
(۳۱) حضرت برحق اللہ شاہ حقانی اناوی
(۳۲) حضرت شاہ نیاز حسین بانگرموی
(۳۳) حضرت انوار اللہ شاہ عرف نور محمد محمودنگری، لکھنوی
(۳۴) حضرت کفایت اللہ شاہ بلہوری، کانپوری
(۳۵) حضرت سید یعقوب موہانی موہان، اناؤ
(۳۶) حضرت اظہار اللہ شاہ عرف نیاز محمد صفی پوری
(۳۷) حضرت خلیل اللہ شاہ عرف حکیم خلیل الدین لکھنوی ثم الہ آبادی
(۳۸) حضرت روح اللہ شاہ عرف مولوی حسین علی، صفی پوری
(۳۹) حضرت احمد اللہ شاہ عرف احمد علی، صفی پوری
(۴۰) حضرت بشارت اللہ شاہ صفی پوری

(۴۱) حضرت عین اللہ شاہ، خلیل احمد، صفی پوری

(۴۲) حضرت عزیز اللہ شاہ عرف منشی محمد ولایت علی خان صفی پوری قدست أسرارہم

حضرت شاہ خادم صفی قدس سرہٗ نے ان ۴۲/نفوس قدسیہ کے علاوہ مزید ۲۹/مردوں اور ۷/عورتوں کو شربت نوش فقیر بنایا، آپ نے خود بھی فقیری کا اعلیٰ نمونہ بن کر دکھایا، ۱۲۵۵ھ میں جب حضرت حفیظ اللہ شاہ نے اجازت وخلافت سے سرفراز فرمایا تو آپ نے اپنے تمام جائداد یہاں تک کہ ذاتی گھر بھی مرشد کو نذر کردیا اور خود مرشد کے گھر میں رہنے لگے۔

حضرت شاہ خادم صفی قدس سرہٗ نے اپنی عمر کے ۵۸ بہاروں کو دیکھا تھا، آپ نے اپنی زندگی کے اکثر حصے سخت عبادت و ریاضت اور تنگی میں گزارے، آپ ۱۲۷۷ھ کے بعد مسلسل بیمار رہے اور درمیان میں والدہ کے اصرار پر علاج ومعالجہ کی غرض سے لکھنؤ، کان پور جانے کا اتفاق ہوا، ایام علالت میں پیرومرشد کی عیادت بھی حاصل رہی، مرشد کی دعا کی برکت سے ایک بار مکمل صحت یاب بھی ہوئے جس کے شکرانے میں مرشد کے وصال (۱۲۸۱ھ) کے بعد مزار شریف پر چادر پیش کیا اور اپنے شیخ زادہ حضرت امیر اللہ شاہ علیہ الرحمہ کو عمامہ، پیرہن، پائے جامہ اور کچھ نقد نذر کیا۔

یوں تو آپ نے اپنی زندگی کا تمام حصہ صفی پور ہی میں گزار دیا اس کے باوجود چند مقامات پر آپ کے تشریف لے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ کان پور آنے جانے کے درمیان جاجموٗ میں حضرت مخدوم شاہ اعلیٰ علیہ الرحمہ کی درگاہ میں حاضری ہوئی جو آپ کے اجداد میں آتے ہیں جن کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے۔(۲۱)

کان پور میں قیام کے درمیان حضرت شاہ غلام رسول نقشبندی علیہ الرحمہ سے دلچسپ ملاقات ہوئی، گفتگو کے درمیان آپ نے حضرت شاہ غلام رسول نقشبندی علیہ الرحمہ سے فرمایا کہ آپ کا گھر بے رونق لگ رہا ہے، اور اس کے دو یا تین دنوں کے بعد حضرت نقشبندی علیہ الرحمہ کا وصال ہوگیا۔

حضرت شاہ خادم صفی قدس سرہٗ اپنے مرشد کے وصال کے چھ سال بعد ۱۳/رجب ۱۲۸۷ھ میں وصال فرماگئے۔ اور صفی پور ہی میں مدفون ہوئے۔ آپ کا مزار مقدس آج بھی مرجع خلائق ہے۔

خانقاہ صفویہ کی علمی ودعوتی خدمات

خانقاہ صفویہ کے بانی مخدوم شاہ صفی سے آج تک ہر ایک سجادہ کے خلفا ومریدین کی تعداد

شمار سے باہر ہیں۔ خلفا کی اگر فہرست تیار بھی کرلی جائے تو مریدین کی تعداد متعین کرنا ممکن نہیں، پھر ان خلفاء کی دعوتی خدمات اور ان کے ذریعہ سے دامن اسلام سے وابستہ ہونے والوں کا شمار اور ان کے خلفا اور خلفا کے خلفا کی تعداد یقیناً شمار سے باہر ہے۔

مخدوم شاہ صفی قدس سرہ سے ابھی تک تقریبا ۴۸۶ سال کا عرصہ گزر گیا مگر صفی پور سے رشد وہدایت کا کام نہ ختم ہوا اور نہ رکا مسلسل جاری ہے اور ہر دور میں بے شمار انسان اس عظیم درگاہ سے وابستہ ہوکر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے، لاکھوں کی تعداد میں اولاد آدم نے اپنی گناہوں سے آلودہ زندگی سے توبہ کرکے راہ ہدایت اختیار کیا اور یہاں کے مشائخ نے عبادت وریاضت اور مجاہدہ کرانے کے بعد ہزاروں نفوس قدسیہ کو عالم انسانیت کو نور ہدایت سے منور کرنے کے لائق بنایا، یہ وہ خدمات ہیں جن کو تحریر کے قبضہ میں لانا ہی ممکن نہیں اور اگر کوشش کی بھی جائے تو ایک جماعت درکار ہے، جو جماعت خانقاہ صفویہ کی خدمات پر انسائکلو پیڈیا تیار کرے پھر بھی یقین سے یہ کہنا آسان نہ ہوگا کہ تمام خدمات کا احاطہ کرلیا گیا ہے، خواہ وہ دعوتی خدمات ہوں یا علمی۔

مارہرہ، بدایوں، بریلی اور نہ جانے کن کن خانقاہوں اور فروعی روحانی سلاسل مثلاً بقائیہ، عارفیہ، رضویہ، برکاتیہ وغیرہم کے روحانی شیوخ بلکہ بدایوں، بریلی اور مارہرہ کے شیخ الشیوخ حضرت میر عبدالواحد بلگرامی قدس سرہ کی تعلیم وتربیت بھی اسی خانقاہ سے ہوئی۔ سید طٰہٰ بلگرامی اور میر عبدالواحد کے والد میر ابراہیم مخدوم شاہ صفی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ میر صاحب مخدوم صاحب کے صرف مرید ہوئے، ان کی تربیت مخدوم کے دو خلفاء نے مل کر کی ایک تو میر صاحب کے والد میر ابراہیم اور دوسرے محمد حسین سکندر آبادی اور ان دونوں بزرگوں نے ان کو مخدوم سے ملی ہوئی نعمتوں سے بھی نوازا، مخدوم شاہ صفی نے ان دونوں بزرگوں کو قادریہ، سہروردیہ اور چشتیہ میں اجازت وخلافت عطا فرمائی تھی، یہ اجازت میر صاحب تک پہنچی اور میر صاحب کے ذریعہ مارہرہ، بدایوں، بریلی اور نہ جانے کہاں کہاں تک پہنچ گئی۔

علمی خدمات کی بات کی جائے تو سلسلہ صفویہ کے تمام مشائخ علمی امانتوں کے حقیقی وارث رہے ہیں، مگر صرف مشہور ناموں کو شمار کیا جائے تو سرفہرست میر عبدالواحد بلگرامی، میر عبد الجلیل بلگرامی، سیف اللہ المسلول شاہ فضل رسول عثمانی بدایونی، تاج الفحول مولانا شاہ عبدالقادر بدایونی، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قادری، حضرت محمد عزیز اللہ شاہ قدست اسرارہم کے اسماء آتے

ہیں۔یہ وہ پاک نفوس قدسیہ ہیں جس میں کا ہرکوئی بالواسطہ یا بلاواسطہ صفوی ضرور ہے اوران میں سے ہرایک اپنے علمی ودعوتی کارناموں کی بنیاد پر عالم میں مشہور ہے۔

یہ تھا سلسلہ صفویہ کی علمی خدمات کے ضمن میں،اگر خانقاہ صفویہ کی علمی خدمات اورعلمی شخصیات کی بات کی جائے تو راقم کی ناقص رائے کے مطابق حضرت محمدعزیزاللہ شاہ کا نام سرفہرست آتا ہے۔ذیل میں مختصراًان کا تذکرہ قلم بند کرتے ہیں۔

خانقاہ صفویہ کی ایک علمی شخصیت: حضرت محمدولایت علی عزیز اللہ شاہ عزیزؔصفی پوری (ولادت ۲رصفر۱۲۵۹ھ/۱۸۴۰ء وصال ر۱۳محرم الحرام ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء)سلسلہ صفویہ کے مجدد حضرت شاہ خادم صفی محمدی قدس سرہٗ کے مرید وخلیفہ تھے،آپ صفی پورمیں پیدا ہوئے اورکچھ زمانہ لکھنؤ میں قیام رہا۔غدر کے وقت صفی پور منتقل ہوئے ،عربی ،فارسی اوراردو میں کامل دسترس رکھتے تھے،تینوں زبانوں میں نثرونظم فی البدیہہ تحریرکرتے آپ کی فارسی شاعری اور فارسی نثر دیکھ کرحالی اورشبلی نے قصیدہ پڑھا ہے آپ کا فارسی کلام آج بھی ہند وپاک کے قوال پڑھتے ہیں اورصاحب ذوق مسرورنظرآتے ہیں ؎

دو عالم بکاکل گرفتار داری بہر مو ہزاراں سیہ کار داری
ز سر تا بہ پا رحمتی یامحمدﷺ نظر جانب ہر گنہگار داری
عزیزؔ اللہ اللہ کہ از کفرعشقش نہاں در تہ خرقہ زنار داری

۴۰رسے زائد تصنیفات چھوڑیں،فارسی نثر میں ’’پنج رقعہ‘‘ آپ کی نثر نگاری کا شاہ کار اور ’’عقائدالعزیزؔ‘‘ کے نام سے عقائد پرنہایت ایمان افروز کتاب آپ کے علمی معیارکا ثبوت ہے ’’سوانح اسلاف،عین الولایت ،تعلیم المخلصین ،مخزن الولایت والجمال،اعجازالتواریخ،بیان التواریخ، مراۃالصنائع قصیدہ،مثنوی فتح مبین،دیوان ولایتؔ(فارسی)،دیوان عزیزؔ(فارسی)‘‘ وغیرہ آپ کی نثرنگاری،شعرگوئی،تاریخ گوئی،عقائداوراسلامیات پرتبحرعلمی کے منہ بولتے ثبوت ہیں۔ آپ کی شاعری کے مطالعہ سے معلوم ہوتاہے کہ آپ کی شاعری تین حالتوں میں دائرہے۔فنافی الشیخ یافنافی الرسول یافنافی اللہ کے مقام سے آپ شاعری کرتے ہیں۔

سماع کے شائق تھے محفل میں خوب روتے اوررقص بھی کرتے آپ کے پیر بھائی اورماموں حضرت عین اللہ شاہ عرف خلیل میاں آپ کا ساتھ دیتے۔خلیل میاں کا جب وصال ہوگیا تو آپ

محفل میں بہت کم شریک ہوتے۔

آپ نے اپنی زندگی کے اکثر حصوں کوگوشہ نشینی ،قناعت اورتوکل میں گزاردیا،اگرکوئی کچھ نذرکرتا تواس کوغریب اورمستحق کے حوالہ کردیتے۔

آپ نے دس پاک بازہستیوں کواجازت وخلافت سے نوازا۔۱۳رمحرم الحرام ۱۳۴۷ھ دوشنبہ کے دن صفی پورمیں آپ کا وصال ہوااورصفی پورہی میں اپنے پیرومرشد کی درگاہ میں مدفون ہوئے۔

مشائخ خانقاہ صفویہ کا اعتقادی،فقہی اورصوفی مسلک

اعتقادی مسلک: صفی پورشریف کے مشائخ کی تصنیفات واقوال واعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ عقائد میں ماتریدی تھے ،اورآج بھی سجادگان صفی پورعقائد میں اسی امام کے مقلد ہیں جن کی تقلید تقریباہندوستان کی اکثرمسلم آبادی کرتی ہے۔

سلسلہ صفویہ کے بانی مخدوم شاہ صفی قدس سرہ کے مریداورآپ کے خلیفہ کے خلیفہ عظیم صوفی حضرت میرعبدالواحدبلگرامی قدس سرہ نے اپنی مایہ نازتصنیف ’’سبع سنابل‘‘میں عقائد ومعاملات اورمسلمات کونہایت وضاحت کے ساتھ تحریرکردیاہے،جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتاہے کہ سلسلہ صفویہ کے صوفیہ کاعقیدہ رفض وخروج سے الگ راہ اعتدال کے مطابق وہی عقیدہ ہے جوزمانہ سے اہل سنت وجماعت کاچلا آرہاہے اورآج بھی یہی عقیدہ ہے۔جیسا کہ اس سلسلہ کے قریب زمانہ کے مشہورعالم وصوفی حضرت محمدعزیزاللہ شاہ قدس سرہ کی کتاب ’’عقائدالعزیز‘‘ کے مطالعہ سے معلوم ہوتاہے کہ ہندوستان کی دیگرخانقاہوں کے مشائخ جس فقہی اوراعتقادی مسلک کے پابند تھے اورہیں،صفی پورشریف کے مشائخ بھی ان ہی مسالک کے پابند تھے اورہیں۔

فقہی مسلک: صفی پور کے مشائخ فقہ میں حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے مقلد رہے ہیں مگرعام تقلید سے تھوڑاالگ رہے جیسا کی صوفیہ کاطریقہ رہاہے کہ کچھ فروعی مسائل میں وہ خود اجتہاد یاباطنی اشارات سے کام لیتے ہیں ،حضرت محبوب الٰہی قدس سرہٗ قرأت خلف امام کے قائل صرف اسلئے تھے کہ ان کے پاس حدیث تھی ،یہاں انہوں نے قول امام پرعمل کرنے سے زیادہ بہترقول رسول پرعمل کرنے کوخیال کیااوریہ معمول اس سلسلہ میں آج بھی چلا آرہاہے،صوفی حکیم

ہوتا ہے،مقاصد شریعت پر اس کی نگاہ ہوتی ہے،ضرورت وحاجت کے تحت یا روحانی کشف کی بنیاد پر بعض مسائل میں منفرد ہوتے ہیں ۔اس کے باوجود مقلد ہی کہے جائیں گے۔ بلکہ ان نفوس قدسیہ نے بھی اپنے آپ کو مقلد ہی شمار کیا،حنفی مسلک کی تقلید میں سلطان الاولیا حضرت شیخ نظام الدین قدس سرہٗ اس قدر ریختہ تھے کہ اپنے چاہنے والوں کو اس وقت تک خلافت واجازت سے سرفراز نہ فرماتے جب تک کہ وہ فقہ حنفی کی مایہ ناز کتاب ھدایہ مکمل ختم نہ کر لیتا۔

صوفی مسلک: صفی پور شریف میں پروان چڑھنے والا صفویہ سلسلہ کے تقریباً تمام مشائخ کا صوفی مشرب چشتی ہی ہے،اس سلسلہ کے مشائخ کو دیگر سلاسل کی بھی اجازت وخلافت ہے ۔مگر یہاں کے صوفیہ نے چشتیہ نظامیہ میں بیعت کا سلسلہ دوسرے سلاسل کے بہ نسبت زیادہ رکھا،مگر اوراد و وظائف اور معمولات کے اعتبار سے سلسلہ صفویہ صرف چشتی رنگ وروپ ہی نہیں رکھتا بلکہ اس سلسلہ میں دیگر روحانی سلاسل مثلاً سہروردی اور قادری رسوم ومعمولات پر بھی عمل کیا جاتا ہے۔

تعلیقات

(۱)''مآثرالکرام'' میں غلام علی آزاد بلگرامی مخدوم شاہ صفی قدس سرہٗ کا نام کچھ اس طرح تحریر فرماتے ہیں''شیخ صفی الدین بن عبدالصمد بن شیخ علم الدین سائی پوری قدس سرہ ازکمل اولیاء واکابر خلفا شیخ سعدالدین خیرآبادی است'' یہاں پہ علامہ آزاد بلگرامی علیہ الرحمہ سے یہ تسامح ہوا کہ مخدوم شاہ صفی عبدالصمد قدس سرہٗ کے نام اور عرف دونوں میں فرق نہ کرتے ہوئے درمیان میں بن لگا دیا جو درست نہیں ہے'' درست اس طرح ہے،شیخ صفی عبدالصمد بن مولانا علم الدین جیسا کہ''سبع سنابل'' اوردیگر مراجع میں مذکور ہے۔وصال کے تعلق سے تحریر کرتے ہیں''وفات شیخ صفی نوزدہم ماہ محرم ۹۳۳ھ'' اور''فوائد سعدیہ'' میں یوں تحریر ہے''وفاتش ہژدہم محرم الحرام سنہ نہ صدوسی وسہ ہجری ومزار مبارکش درسائی پورزیارت گاہ خلائق است وبرمرقد شریفش آں قدر ہیبت وجلال است کہ حین زیارت دربدن رعشہ می افتد''اور میر عبدالواحد بلگرامی کے حوالہ سے آزاد بلگرمی نے مآثرالکرام میں تحریر کیا ہے کہ میر عبدالواحد بلگرامی نے تاریخ وصال یوں کہا ہے''شیخ پاک''اور شیخ پاک کا عدد ۹۳۳ھ ہی نکلتا ہے۔

سلسلہ صفویہ کی عظیم علمی شخصیت حضرت محمد عزیز اللہ شاہ قدس سرہ (وصال ۱۳؍محرم الحرام

۱۳۴۷ھ ۱۹۲۸ء) اپنی تصنیف'' عین الولایت''میں اس طرح تحریر کرتے ہیں''وفات شریف سنہ نوسو پینتالیس (۹۴۵ھ) میں واقع ہوئی چنانچہ جب آپ نے حضرت شیخ ابوالفتح آسیونی کو خلیفہ کیا ہے تب مثال اجازت (خلافت نامہ) اپنے دست مبارک سے لکھ کر مرحمت فرمائی ہے اس کے آخر میں لکھا ہے''کتبہ صفی بن علم ۹۴۴ھ اربع واربعین وتسع ماۃ'' اوراسی مثال کے حاشیہ پر حضرت شیخ ابوالفتح نے آپ کے اسم مبارک کے پاس اپنے ہاتھ سے لکھا ہے کہ آپ کی وفات دوشنبہ کی رات کو محرم کی انیسویں تاریخ سنہ نو سو پینتالیس (۹۴۵) میں واقع ہوئی اور یہ مثال حضرت امیر اللہ شاہ صاحب کے پاس موجود ہے اوراس پر آپ کی مہر بھی لگی ہوئی ہے اس کا نقش یہ ہے'' عبدالملک العلام صفی علم بن زین الاسلام'' اورمہر گولی ہے اوراسی کے موافق جناب ماموں صاحب قبلہ (مولوی حکیم ہدایت اللہ مرحوم) خیرآباد سے خواہ کہیں اور سے حضرت شیخ پیارہ آپ کے خلیفہ کے مثال پران کا لکھا ہوا دیکھ آئے تھے اوراسی حساب سے''شیخ پاک بوذ''اور''مخدوم صفی زاہدولی بوذ'' دونوں تاریخیں قدیم سے چلی آتی ہیں جولوگ ''بوذ'' کوان دونوں میں سے نابود کرتے ہیں محض بے سود کرتے ہیں اوراسی حساب سے فقیر نے آپ کی تاریخ لکھی ہے''

قطعہ

شاہ صفی حضرت عبدالصمد — رفت بجنت ز سہ پنجی سرائے

مصرع تاریخ نوشتم عزیزؔ — مردخدا بود وولی ہائے ہائے

(۹۴۵ھ) (عین الولایت:ص:۵۸)

ان حوالوں سے معلوم ہوا کہ میر صاحب نے تاریخ وفات ''شیخ پاک بوذ'' کہا ہے،مگر بعد کے لوگوں نے بود کو نابود کردیا،اس کی وجہ سے یہ خرابی آئے گی کہ شیخ ابوالفتح آسیونی آپ کے خلفاء سے خارج ہوجائیں گے کیوں کہ''شیخ پاک'' کا عدد ۹۳۳ ہے اور خلافت کا سال ۹۴۴ ہے مگر جب شیخ پاک کے ساتھ بود لگا دیا جائے تو ۹۴۵ کا عدد حاصل ہوتا ہے اور یہی درست ہے کیوں کہ شیخ ابوالفتح کا مخدوم شاہ صفی کا خلیفہ ہونا سبھی کو تسلیم ہے۔

(۲) مخدوم شاہ صفی کے جداعلیٰ شاہ اکرم (وصال ۱۴؍شعبان ۶۷۵ھ) غالباً حضرت سلطان بہاء الدین ذکریاملتانی قدس سرہ کے مرید وخلیفہ تھے ۔اگر مخدوم کے آباء واجداد کا روحانی شجرہ

دست یاب ہوتا تومزید وضاحت ہوجاتی، غالب گمان ہے کہ صفی پورشریف میں مخدوم صاحب کے روحانی وارثین کے پاس سلسلہ سہروردیہ کاقدیم شجرہ محفوظ ہو۔جب تک کوئی پختہ ثبوت نہ مل جائے یقین کے ساتھ کچھ کہنامناسب نہیں۔

(۳)سیدجلال الحق بخاری قدس سرہ کوسلسلہ قادریہ کی اجازت مخدوم محمدبن عبیدغیثی سے اورسلسلہ سہروردیہ کی اجازت مخدوم کبیرالدین احمد بخاری سے اورسلسلہ چشتیہ کی اجازت حضرت خواجہ نصیرالدین چراغ دہلوی سے ملی اورآپ نے اپنے چھوٹے بھائی حضرت سیدابوالفضل راجوقتال کواور حاجی حرمین قوام الدین بن ظہیرالدین عباسی اورحضرت یوسف ایرچی کو ان تمام سلاسل کی اجازت عطافرمائی،حاجی حرمین، خواجہ نصیرالدین چراغ دلی کے مرید تھے۔اور دمشق کےعظیم بزرگ شیخ قطب الدین دمشقی مصنف ''الرسالۃ المکیۃ'' سے بھی تلقین ذکرر کھتے تھے۔آپ کے بارے میں قاضی محمدارتضی علی صفوی گوپاموی قدس سرہ ''فوائد سعدیہ''میں تحریرکرتے ہیں''قدوۃالعارفین حضرت حاجی شاہ قوام الدین بن ظہیرالدین عباسی قدس اللہ اسرارہ وافاض علینا انوارہ کہ مرید قطب المشائخ خواجہ نصیرالدین چراغ دہلی وخلیفہ سید السادات مخدوم جہانیاں قدس سرہمابودہ ودرتربیت مریدان شانے عالی داشت سالہا درصحبت سیدالسادات ماندہ وبرزیارت حرمین شریفین زادہما اللہ شرفاًوتعظیماًفائز گشتہ وآنجا اکثر مشائخ وقت را دریافت ودردمشق ازشیخ قطب الدین دمشقی مصنف ''رسالہ مکیہ''تلقین ذکرگرفتہ واوراتجرید وتفرید بمرتبۂ کمال بود''

(۴) شیخ سعدالدین بن بڈھن بن شیخ محمدقصبہ اناؤ کے قاضی قدوہ کےاولاد سے تھے۔علوم ظاہری اور باطنی کےشہنشاہ تھے۔حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اخبارالاخیار میں حضرت مخدوم شیخ سعد خیرآبادی قدس سرہٗ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مرید شیخ میناست۔بزرگ بود۔حافظ حدود شریعت وآداب طریقت ہمتے عالی داشت وموصوف بود بترک وتجرید، او نیز برطریقہ پیرخود حصور بود ومولع بودبوجدوسماع ،عالم بود بعلوم شریعت وطریقت''۔(اخبارالاخیار:۱۹۹،کتب خانہ رحیمیہ دیوبند)

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی تحریرکرتے ہیں''برطریقہ حضرت مرشد حصورزیست وسالہامسند تدریس وارشادرارونق بخشید۔وشروح غرابرمتداولات بقلم آورد۔مثل شرح بزودی وحسامی وکافیہ

ومصباح وامثال آں ومجمع السلوک نام شرحے برسالہ مکیہ نوشتہ دریں کتاب ملفوظات وحالات شیخ مینا بسیار درج کردہ ہرگاہ از شیخ خودنقل می کندمی گوید۔''قال شیخی شیخ میناادام اللہ فینا''مزارفائض الانوارش درخیرآباد حاجب روائے خلائق است'' آپ کےمشہورخلفاء میں قاضی محمدمنّ اللہ کاکوری اورمخدوم شاہ صفی عبدالصمدصفی پوری کانام آتاہے،آپ شیخ مینا کی باگاہ میں بیس سالوں تک حاضررہے اورمرتبہ کمال تک جاپہنچے غلام علی آزادتحریرکرتے ہیں''ودست ارادت بہ شیخ مینائے لکھنوی دادوساغرلبریز از مینائے معرفت نوش کرد''،اپنے پیرہی کی طرح مجرد ومحصور تھے۔مرشد کے وصال کے بعدخیرآبادمیں سکونت اختیارکی اور۱۶؍ربیع الاول ۹۲۲ھ میں وصال پایا،آج بھی آپ مرجع وحاجت روائے خلائق ہیں۔

(۵) شیخ محمدمینامعروف بہ شاہ مینابن قطب الدین آپ حضرت قوام الدین خلیفہ حضرت جلال الحق بخاری کے بھتیجے اورشیخ سعدالدین کے مرشد ہیں،آپ کانام میناآپ کے چچانے رکھاتھا۔آپ دس برس کی عمرتک اپنے چچاہی کی پرورش میں رہے،۱۵؍سال کی عمرمیں مخدوم شیخ سارنگ کے ہاتھ پربیعت ہوئے،اورحضرت راجوقتال کے بعض دیگرخدام سے ذکرکی تلقین لی۔۱۲؍سال کی عمرمیں ہی قطبیت پرفائز ہوگئے تھے،جس کا اظہارحضرت بدیع الدین مدار کے مرید قاضی شہاب الدین نے کیاہے۔بے شمارکرامتیں ہیں۔بچپن ہی سے کرامتوں کاظہورشروع ہوگیاتھا۔۲۳؍صفر۸۸۴ھ کووصال ہواجب کہ غلام علی آزاد تحریر کرتے ہیں''شاہ میناچہارم صفر۸۷۴ھ اربع وسبعین وثمان مائتہ بہ گلشن مینوخرامید''۔اورارتضی علی گوپاموی نے'' فوائدسعدیہ'' میں یوں تحریرکیاہے''وفات قطب العالم قدس سرہ بتاریخ بست وسویم صفرہشت صدوہشتادوچہارم ہجری(۸۸۴ھ) ومزارش دربلدۂ لکھنؤزیارت گاہ ہرخاص وعام است'' آپ لکھنؤمیں مدفون ہوئے آپ کامزارآج بھی زیارت گاہ عام وخاص ہے،کسی بزرگ نے کہاہے ؎

ہر کہ خواہد چشم را بینا کند　　سرمۂ خاک در مینا کند

(۶) شیخ سارنگ نوجوان تھے کہ حضرت جلال الحق بخاری اورحضرت سیدابوالفضل راجوقتال دونوں بھائی دلی تشریف لائے نوجوان بادشاہ وقت کی طرف سے خدمت پرماموتھا کہ ان دونوں مخدوموں نے جذبہ اطاعت الٰہی اورحب حقیقی کاشعلہ بھڑکادیاپھرحضرت قوام الدین کے دست مبارک پربیعت ہوئے اوردنیا کاچکرکاٹتے ہوئے حرمین شریفین ہوتے ہوئے قصبہ ایرچ

میں حضرت یوسف ایرچی خلیفہ حضرت مخدوم جہانیاں جلال الحق بخاری کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اورسلوک کے تمام مراتب طے کئے اجازت وخلافت سے نوازے گئے ،اس درمیان مرشد ارادت حضرت قوام الدین کا وصال ہوا، وصال کے وقت آپ نے شیخ سارنگ کو یاد کیا مگر ملاقات نہ ہوئی ،شیخ سارنگ حضرت یوسف ایرچی سے خلافت واجازت لینے کے بعد لکھنؤ سے بارہ کوس دور مجھگواں جو ایک غیر آباد مقام تھا، میں سکونت پذیر ہوئے اس درمیان حضرت سید راجو قتال نے خرقہ خلافت اور دیگر انعامات سے سرفراز فرمایا۔شیخ مینا اور شیخ حسام الدین صوفی ،شیخ سارنگ کے ہی خلیفہ تھے شیخ حسام الدین جانشین بھی ہوئے ،۱۷رشوال ۸۵۵ھ کو آپ کا ۱۲۰رسال کی عمر میں وصال ہوا اور مجھگواں ہی میں آرام فرما ہیں۔

(۷) شیخ مبارک بن عبدالملک، مخدوم اعلیٰ جاجموی کی اولاد میں ہیں اور شیخ عبدالملک، مخدوم شاہ صفی کے حقیقی بہنوئی ہیں ،قصبہ جاجمؤ مسلمانوں کی قدیم بستی ہے، موجودہ شہر کان پور سے پانچ چھ میل کی دوری پرانا ؤ روڈ پر واقع ہے۔

(۸) سید نظام الدین شیخ الھدیہ بن سید میرن بچپن ہی میں اپنے والد کے ہمراہ مخدوم شیخ سعد الدین خیرآبادی قدس سرہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور مرید ہوگئے، مرشد کے اشارہ پر تحصیل علم کی خاطر پنجاب کا سفر کیا، واپسی پر معلوم ہوا کہ مرشد کا وصال ہوگیا، ادھر مرشد نے اپنے خلیفہ مخدوم شاہ صفی قدس سرہ کو وصیت کی تھی کہ نظام الدین جب واپس آئے تو تعلیم وتربیت کرنا اور خرقہ خلافت عطا کرنا، جب آپ مخدوم شاہ صفی کی بارگا میں حاضر ہوئے اسی دن مخدوم شیخ سعد الدین قدس سرہ کا عرس تھا، مخدوم شاہ صفی نے شیخ الہدیہ سے محفل میں چلنے کو کہا آپ نے قوالی کے آلات کی وجہ سے اعراض کیا، مخدوم نے قوالوں کو آلات سے دور ہونے کا حکم دیا اور تھوڑی دیر کے بعد آلات نے خود ہی سرود شروع کردیا ایسا دیکھتے ہی شیخ الہدیہ کیف میں آئے اور بے ہوش گر پڑے ،ہوش میں آنے کے بعد معلوم ہو کہ مخدوم مجھگوا گئے ہیں، شیخ الہدیہ بھی مجھگوا گئے، مگر وہاں معلوم ہوا کہ مخدوم لکھنؤ گئے جب شیخ لکھنؤ حاضر ہوئے تو معلوم ہوا کہ صفی پور گئے اور شیخ جب صفی پور آئے تو معلوم ہوا کہ مخدوم خیرآباد گئے شیخ الہدیہ صفی پور ہی میں مزدورں کے ساتھ مخدوم کی خانقاہ کی تعمیر میں بغیر اجرت کے مصروف رہے کہ مخدوم خیرآباد سے واپس ہوئے اورفرمایا ’’شما بنائے خود مستحکم کردید‘‘(تم نے اپنی بنیاد پکی کرلی)۔

سید نظام الدین شیخ الھدیہ کا دور اکبر بادشاہ کا دور ہے بادشاہ کے کارندوں نے آپ کو پریشان کرنا چاہا اور دربار شاہی میں حاضر کیا۔مگر بادشاہ اکبر آپ کے ہیبت وجلال کو دیکھتے ہی تعظیما کھڑا ہوگیا اور عزت واحترام کے ساتھ رخصت کیا۔فیضی جو اکبر بادشاہ کا معتمد علیہ تھا اس نے آپ کو پریشان کرنے کے لئے مختلف طریقے اپنائے مگر عاجز رہا۔ ۷رربیع الاول ۹۹۳ھ میں آپ کا وصال ہوا اور خیرآباد میں مدفون ہوئے اس کے چھ مہینے بعد فیضی نے آپ کے مرقد مبارک پر بڑا گنبد بنوایا جو آج بھی موجود ہے فیضی ہی نے آپ کی قطعہ تاریخ کہی جو روضہ شریف کی دیواروں پر نقش ہے۔

(۹) شیخ حسین سکندرآبادی مخدوم شاہ صفی کے مرید وخلیفہ اور میر عبدالواحد بلگرامی کے مربی اور شیخ خلافت ہیں ، پہلے آپ شراب نوشی کرتے تھے کہ اچانک جذبہ الٰہی بھڑک گیا اور مختلف بزرگوں سے ملاقات کرتے ہوئے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کا کی قدس سرہ کے روحانی اشارہ پر صفی پور پہنچ گئے ۔صفی پور میں آپ کی تڑپتی روح کو سکون میسر آیا،آپ کی مرادیں پوری ہوئیں اور دنیاوی مے کدہ سے نکل کر روحانی مے کدہ کے شہسوار بن گئے ۔ڈیڑھ سال تک شیخ کی صحبت میں رہنے کے بعد اجازت وخلافت سے مرشد گرامی نے سرفراز فرمایا اور اپنے وطن واپس ہونے کا حکم جاری کردیا،حضرت میر عبدالواحد بلگرامی اوران کے والد کے پیر بھائی ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے والد کے اچھے دوست بھی تھے ۔(مزید معلومات کے لئے سبع سنابل کا مطالعہ مفید ہے)۔

(۱۰) مخدوم شاہ صفی قدس سرہٗ کے خلفاء کی تعداد بعض نے ۱۶ بعض نے اور ۱۷/ ۱۸ تحریر کیا ہے۔شمار کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے خلفاء کی تعداد ۱۹ ہے حضرت محمد عزیز اللہ شاہ قدس سرہٗ ۱۷ خلفاء کے اسمائے گرامی تحریر کرنے کے بعد ’’عین الولایت :ص:۵۵‘‘ کے حاشیہ پر یوں تحریر کرتے ہیں ’’یہاں کی کتابوں میں اسی قدر اسماء لکھے ہیں اور فقیر کی سماعت میں پہلے سے اٹھارہ تھے۔غالبا ایک بزرگ شیخ کمال الدین پھول ہیں جن کا ذکر صراحت کے ساتھ اوپر ہو چکا‘‘اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۵۴ پر شیخ کمال الدین کا تذکرہ یوں کرتے ہیں ’’ایک کتاب ہے **مخزن الاسرار فی سلاسل الکبار** اس کے مصنف شیخ محمد عارف نامی عرف عبدالنبی عثمانی شطاری وہ اس کتاب میں لکھتے ہیں کہ میرے دادا شیخ کمال الدین پھول نے مخدوم شیخ صفی قدس اللہ سرہٗ کے

ہاتھ سے خرقہ خلافت پہنا اور میرے باپ کو مکتب کے دن آپ کے ہاتھ پر مرید کرایا'' یہاں پے شیخ عبدالباقی چشتی بدایوانی کا ذکر نہیں ملتا مگر ''مخزالولایت والجمال'' کے مقدمہ میں (ص:۲۱) ڈاکٹر خصلت حسین صابری صاحب یہ تحریر کرتے ہیں ''جناب ضیاء القادری صاحب بدایونی اپنی تالیف ''تاریخ اولیاء حق'' (۱۳۷۷ھ) میں اپنے جداعلیٰ مخدوم شیخ عبداللہ عارف باللہ کے سلسلہ میں رقم طراز ہیں ''سکندر لودھی کے زمانے کے اولیاء میں شیخ عبدالباقی چشتی بدایونی۔ شیخ احمد شیبانی ناگوری کے شاگرد اور مخدوم شیخ صفی خواجہ عبد الصمد بن علم الدین کے خلیفہ ہیں ''مخدوم عبد اللہ عارف باللہ از مریدان صادق ایشاں است'' ان حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مخدوم صاحب کے خلفا کی تعداد ۱۹ ہے واللہ اعلم بالصواب۔

(۱۱) شیخ احمد شیبانی خواجہ حمید الدین ناگوری کے روضہ میں اپنے پیرومرشد خواجہ حسین ناگوری کے قرب میں مدفون ہیں۔

(۱۲) میر عبدالواحد قدس سرہ اپنی مایہ ناز تصنیف میں خود تحریر کرتے ہیں ''ایں فقیر مرید مخدوم شیخ صفی است وخلافت از مخدوم شیخ حسین دارد۔ مخدوم شیخ حسین رابا پدر ایں فقیر الفتی ومجبتی تمام بود ومیان یک دیگر اختصاص کلی داشتند و پدر فقیر نیز خلیفہ مخدوم شیخ صفی بود۔ بدیں سبب ایں فقیر رجوع بہ مخدوم شیخ حسین نیز عنایتہا ونوازش ہائے فراواں ارزانی داشتند کہ یار زادۂ است وجامہ خلافت نیز پوشانیدند۔ اگر چہ فقیر رالیاقت ایں جامہ نبود اما شکرانۂ درگاہ باری تعالیٰ می گزرانم کہ پیوند بیعت بایشاں دارم''۔

(۱۳) میر عبدالواحد کے والد میر ابراہیم بن قطب الدین بن ماہرو بن بڈھ بلگرامی، میر بڈھ بلگرام سے باڑی چلے گئے اوران کے پوتے میر قطب الدین (وصال ۹۰۴ھ) سانڈی میں سکونت اختیار کرلیا اور میر ابراہیم بن قطب الدین (وصال ۹۳۴ھ) جو میر عبدالواحد کے والد ہیں ان کو مخدوم شاہ صفی سے اجازت وخلافت حاصل تھی۔ میر عبدالواحد ۹۱۲ھ یا ۹۱۵ھ میں سانڈی میں پیدا ہوئے آپ کی دو شادیاں تھیں پہلی بیوی سے میر عبدالجلیل (وصال ۱۰۵۷ھ) اور دوسری سے میر فیروز، میر یحیٰ اور میر طیب (وصال ۱۰۶۶ھ) پیدا ہوئے میر صاحب کے بڑے لڑکے میر عبدالجلیل (وصال ۱۰۵۷ھ) نے مارہرہ کو قرارگاہ بنا کر اس قصبہ کو رشد وہدایت کا مرکز بنادیا۔ خانقاہ مارہرہ کے موجودہ شیخ حضرت یحیٰ میاں میر عبدالجلیل کے نسباً دسویں پشت میں آتے ہیں، جب کہ

دوسرے حضرات مثلاً حضرت پروفیسر سید شاہ محمد امین میاں قادری اوران کے برادران اور نظمی میاں وغیرہ فاتح بلگرام سید محمد صغریٰ کی دوسری اولاد سے ہیں، مارہرہ میں عبدالجلیل بلگرامی کے ذریعہ جو روحانی سلسلہ گیا وہ آج بھی اپنے آب وتاب کے ساتھ باقی ہے اور تقریباً چار سو سال کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی اس خاندان کے قابل فخر وارثوں نے اس روحانی چراغ کی لو مدھم نہ ہونے دیا۔

(۱۴) سید عبدالرحمٰن (وصال ۱۲۴۵ھ) اودھ کے مرجع خلائق بزرگ گزرے ہیں آپ کے ملفوظات کا مجموعہ ''انوار الرحمن بتنویر الجنان'' فارسی اور رموز واسرار معرفت سے پر تصنیف ''کلمۃ الحق'' سلوک وتصوف کی مایہ ناز کتابوں میں شامل ہے، آپ کا روحانی سلسلہ شاہ نورالہدی، جلال الدین تھانیسری، عبدالقدوس گنگوہی، مخدوم احمد عبدالحق رودولوی، جلال الدین محمود پانی پتی اور شمس الاولیا شمس الدین ترک پانی پتی کے واسطوں سے مخدوم سید علاء الدین علی احمد صابر کلیری سے جاملتا ہے۔ آپ کو مختلف سلاسل میں اجازت حاصل تھی۔ سلسلہ عالیہ صفویہ میں آپ کے شیخ حضرت شاہ پیر بخش صفی پوری قدس سرہٗ ہیں جو حضرت شاہ قدرت اللہ غوث الدہر قدس سرہٗ کے مرید خلیفہ تھے۔

(۱۵) سلطان محمد عارف علی شاہ مجھگواں شریف کے درگاہ کے سجادہ تھے، آپ کی ذات زمانہ قریب کی عجیب وغریب روحانی شخصیت گزری ہے، آپ بظاہر تعلیم یافتہ نہیں تھے مگر اپنی باطنی خوبیوں، ظاہری حسن اور انسانوں کے دکھ درد کو محسوس کرنے والا قلب کے مالک تھے، ایثار وقربانی کا جذبہ از حد غالب تھا، مشائخ کی محبت رگ رگ میں سرایت کئے ہوئے تھی۔ یہ وہ خوبیاں تھیں جن کو دیکھ کر دیندار سے لیکر دنیادار تک، عوام سے لیکر خواص تک غیر تعلیم یافتہ سے لیکر بڑے بڑے ادیبوں شاعروں اور ریسرچ اسکالروں کی بھاری جماعت پروانہ وار آپ پر نثار تھی۔ زمانہ قریب کی مایہ ناز ناولسٹ ادیبہ قرۃ العین حیدر بھی آپ کی خوبیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی، قرۃ العین نے اپنی ادبی زبان اور عمدہ انداز میں آپ کا تذکرہ کیا ہے، اپنی مشہور زمانہ کتاب ''گردش رنگ چمن'' میں سلطان محمد عارف صاحب کے بارے میں جو چند مضامین اس نے قلم بند کئے ہیں وہ یہ ہیں (۱) مارٹین کوٹھی (۲) بن ساگر کے باسی (۳) دریائے نور (۴) روم وتبریز (۵) جنگل میں جگنو (۶) قطب ستارہ وغیرہ۔

سلطان عارف صاحب اگرچہ بظاہر تعلیم یافتہ نہ تھے مگر صوفیہ کرام کے فارسی اشعار کافی تعداد میں حفظ تھے، قرۃ العین حیدر اپنا مشاہدہ یوں تحریر کرتی ہے ''ان کو بے شمار اردو فارسی اشعار یاد ہیں۔ اور رامائین کی چوپائیاں اور کبیر کے دوہے۔ ایک سہ پہر حجرے میں فرش پر لیٹے رومی کے اشعار سنا رہے تھے ہم نے پوچھا آپ نے فارسی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ کہنے لگے ''ارے ہم نے اردوئے کون سی پڑھی ہے جو فارسی پڑھتے''

یقین نہ آیا۔ بعد میں عربی باجی سے پوچھا وہ بولیں ''راجہ صاحب اسے علم لدنی کہتے ہیں''

سلطان محمد عارف اسم بامسمّٰی تھے صرف اللہ کی معرفت ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ اللہ کے بندوں کے شریک غم بھی تھے اور ان کو مال و اسباب سے مدد تو کرتے ہی تھے ساتھ میں اللہ کے بندوں کو اللہ کی معرفت سے روشناس کراتے اور اس کی رحمت سے قریب تر کرنے کی ہمہ وقت کوشش کرتے۔ قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں۔ ''ایک دیہاتی مسلمان حجرے میں داخل ہوا۔ میاں کے قدموں میں بیٹھ کر اپنی داستان الم بیان کرنے لگا۔ سر جھکائے سنا کیے پھر آہستہ سے بولے۔ دیکھو بندر کے بچے کی طرح جو اپنی ماں کو پکڑے رہتا ہے اپنے رب کو پکڑے رہو۔ بلی کا بچہ دیکھا ہے نا کس طرح اپنے آپ کو اپنی ماں کے سپرد کر دیتا ہے؟ وہ اسے اپنے دانتوں میں دبوچے پھرتی ہے بچھڑا تھن سے منہ لگاتا ہے اسے فوراً ماں کا دودھ مل جاتا ہے میاں اس دیہاتی سے اسی کی ایجری میں بات کر رہے تھے۔ بہرحال زبردست ماہر نفسیات ہیں۔ یہ صوفیاء صدیوں سے عوام کیلئے سائیکٹرسٹ کا فریضہ تو انجام دیتے ہی رہے ہیں۔ باقی روحانیت وغیرہ اپنے پلے نہیں پڑتی''

عینی آپا ایک طرف اللہ والوں کی عظمت اور خدمت خلق کو تسلیم کرتی ہیں۔ دوسری طرف روحانیت کے بارے میں کہتی ہیں۔ ''یہ اپنے پلے نہیں پڑتی'' صاحبہ معذور ہیں کیونکہ جو آم کھایا ہی نہ ہو اسے کیا معلوم کہ ذائقہ کوئی چیز ہے بھی کہ نہیں، عقل پرست کو بغیر چکھے تسلیم بھی نہیں کرنا چاہئے۔ اس کے باوجود اتنا ہی کم نہیں ہے کہ عینی آپا نے صوفیہ کی عظمت کا اقرار کیا۔ اصل بات یہاں یہ ہے کہ سلطان عارف میاں کی روحانی عظمت، انسانی ہمدردی اور بندوں کو ان کے رب سے قریب کرنے کے انوکھے انداز کا اقرار ان سبھی نے کیا جنہوں نے قریب سے ان کو دیکھا۔ وہ اپنے آپ میں ایک عالَم تھے کوئی ان کا جواب نہ تھا۔ بظاہر کچھ ملامتوں کے حامل تھے جن کی وجہ سے ایک خاص طبقہ نے نامناسب خیال کیا اور دوری اختیار کی اور یہ بھی ضروری تھا۔

(۱۶) شاعلی محمد اکرم میاں کے بعد پانچ سالوں تک درگاہ خالی رہی اس کے بعد شاہ محمد حفیظ اللہ شاہ تشریف لائے اور درگاہ کا نظام از سر نو زندہ کیا۔

(۱۷) حضرت محمد حفیظ اللہ شاہ صفی پورہی میں پیدا ہوئے، آپ کا نسبی سلسلہ یوں ہے، والد کا نام شیخ فضل اللہ بن شاہ غلام پیر بن مخدوم عالم بن شیخ عبدالرسول بن شیخ دانیال رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اس کے آگے آپ کا اور حضرت مخدوم عالم (حضرت شاہ خادم صفی) کا شجرہ نسبی ایک ہو جاتا ہے، آگے کا حضرت مخدوم عالم کے نسبی شجرہ میں مذکور ہے۔

آپ سلسلہ قادریہ میں اپنے چچا حضرت غلام یحیٰ سے بیعت تھے حضرت غلام یحیٰ اپنے والد شاہ غلام پیر کے مرید و خلیفہ اور جانشین تھے اور آپ حضرت مولانا شاہ صلاح الدین گوپاموی سے بھی اجازت رکھتے تھے، آپ کے صاحبزادے حضرت شاہ غلام ذکریا کو آپ کے علاوہ حضرت شاہ کرم میاں، حضرت شاہ حسن علی محدث، حضرت برحق شاہ اور حضرت صوفی شاہ عبدالرحمٰن لکھنوی سے بھی اجازت و خلافت ملی ہوئی تھی، حضرت شاہ حفیظ اللہ اپنے چچازاد بھائی حضرت شاہ غلام ذکریا کے ساتھ حضرت صوفی عبدالرحمٰن لکھنوی کی مسجد میں رہتے تھے، اور غازی الدین بہادر نواب وقت کے سواروں میں ملازم تھے، تیس سال کی عمر میں یکا یک جذبہ الٰہی سے سرشار ہوئے اور طلب رضائے مولیٰ میں سرگرداں ہوئے، ایک دن خواب میں حضرت افہام اللہ شاہ کو دیکھا کہ آپ فرما رہے ہیں میری درگاہ خالی ہے تم یہاں آکر بیٹھو، نوکری ترک کی صفی پور حاضر ہوئے، درگاہ میں گوشہ نشین ہوئے، اویسی فیض سے فیض یاب ہوئے، اور پھر اس درگاہ کے ہو کر رہ گئے تقریباً پچاس سالوں تک اس درگاہ کی خدمت کی اور اس درمیان حضرت افہام اللہ شاہ کے باطنی اشارہ پر ان کے مرید و خلیفہ حضرت شاہ محمدی غلام پیر سانڈی آپ (حفیظ اللہ شاہ) کو اجازت و خلافت سے نوازنے کے لئے صفی پور تشریف لائے اور افہام اللہ شاہ کے خرقہ سے بھی نوازا ان کی آمد کی خبر آپ کو روحانی طور پر پہلے ہو چکی تھی، آپ ان کے منتظر تھے۔ کچھ دنوں کے بعد آپ کے چچازاد بھائی حضرت غلام زکریا قادری بھی لکھنو سے صفی پور تشریف لائے اور آپ کو غور سے دیکھا قلبی اطمینان کے بعد آپ کو ان تمام نعمتوں سے نوازا جس کو انہوں نے مختلف پیران طریقت سے حاصل کیا تھا اور خود اپنی طرف سے بھی اجازت و خلافت سے سرفراز کیا، آپ نے پچاس سالوں تک شاہ افہام اللہ کی خانقاہ میں متوکل رہتے ہوئے گزارا، اکثر مستغرق رہتے، آنے والوں کی

بہتر تربیت فرماتے ،معرفت الٰہی سے آگاہ کرتے آپ حضرت غوث پاک سے خاص نسبت رکھتے تھے ،کم کھاتے ،آخری زمانہ میں محویت کا غلبہ رہا سماع سنتے لیکن رقص نہ کرتے ،مگر خوب روتے ،آپ کے ملفوظات کے دو مجموعوں کا ذکر ملتا ہے(۱) حفیظ الافہام (۲) ہدیہ صفویہ ،مگر افسوس کہ دونوں نایاب ہیں۔

آپ کے خلفاء کے اسماء

(۱) حضرت چراغ علی شاہ صفی پوری
(۲) حضرت سعداللہ شاہ صفی پوری
(۳) حضرت شاہ علی محمد سانڈی
(۴) حضرت علی رضا شاہ سرگروہ مداریہ
(۵) حضرت احمد اللہ شاہ آسیونی
(٦) حضرت مرزا احمد شاہ لکھنوی
(۷) حضرت شاہ امیر اللہ
(۸) حضرت شاہ خادم صفی محمدی قدست اسرارہم القدسیة

حضرت حفیظ اللہ شاہ قدس سرہ کا وصال ۲۲/جمادیٰ الآخرہ ۱۲۸۱ھ/دوشنبہ کی رات ہوا،اورآپ کا مقبرہ حضرت افہام اللہ شاہ کے گنبد کی پشت پر موجود ہے،آپ آج بھی مرجع خلائق ہیں۔

(۱۸) آپ حضرت شاہ محمد حفیظ اللہ کے بڑے صاحب زادے تھے ۱۲۷۷ھ میں آپ خلافت وجانشینی سے سرفراز کئے گئے اس وقت خانقاہ میں ایک بڑی بھیڑ موجود تھی اور سارے لوگ روحانی کیف ومستی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

(۱۹) حضرت عبدالغفور قل ھواللہ شاہ آپ تقریباً ۱۲۳۵ھ میں پیدا ہوئے نسباً عثمانی تھے ،۱۲۹۰ھ میں صفی پور حاضر ہوئے اور پھر حضرت شاہ خادم صفی محمدی قدس سرہٗ کے دست پر بیعت ہوئے ۱۲۷۱ھ میں نکاح ہوا اور ۱۲۹۰ھ میں کچھ دنوں تک مرشد نے آپ کو اپنی تربیت میں رکھا اور روحانی نعمتوں سے نوازتے ہوئے اجازت وخلافت سے سرفراز فرمایا ''قل ھواللہ شاہ'' کے لقب سے ملقب کیا آپ مرشد کے حکم سے بارہ بنکی کو جائے قرار بنایا،۲۲/جمادیٰ الاولیٰ ۱۳۲۴ھ/وصال

ہوا اور بارہ بنکی ہی میں مدفون ہوئے۔آپ کے تین صاحب زادے تھے سب کے سب کامل و مکمل بزرگ ہوئے اور تقریبا چالیس سے زائد نفوس قدسیہ کوآپ سے روحانی نعمتیں میسر آئیں۔آپ کے خلفامیں ایک عظیم نام حضرت مخدوم شاہ عارف صفی قدس سرہ (وصال ۱۸/ذیقعدہ ۱۳۲۰ھ) کا آتا ہے حضرت شاہ عارف صفی قدس سرہٗ سید سراواں الٰہ آباد کے رہنے والے تھے آپ ہی کے ذریعہ سید سراواں جو بزرگوں کا بسایا ہوا قدیم قصبہ ہے پھر سے مخلوق خدا کے عقیدتوں کا مرکز بن گیا اورآپ کی ذات سے منسوب خانقاہ عارفیہ کے صاحب سجادہ شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی چشتی کی علمی وروحانی تحریک وقیادت میں تصوف کے قرآنی وحدیثی نام سے تحقیقی، تنقیدی اور علمی مجلّہ الاحسان اس وقت آپ کے زیر مطالعہ ہے ان شاء اللہ عنقریب ان مقدس ہستیوں کا تفصیلی تذکرہ پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوگی۔

(۲۰) حضرت شاہ کریم اللہ عرف کریم بخش کے خلیفہ حضرت بقاء اللہ شاہ ہوئے اور حضرت بقاء اللہ شاہ کے ذریعہ سلسلہ صفویہ کا فروغ ہندوبیرون ہند خاص طور سے ہندوپاک میں خوب ہوا،جگہ جگہ سلسلہ صفویہ بقائیہ کی خانقاہیں آج موجود ہیں۔سلسلہ بقائیہ کی تاریخ بھی مستقل ترتیب دینے کی ضرورت ہے ان شاء اللہ۔

(۲۱) حضرت مخدوم شاہ اعلیٰ جاجموی کی درگاہ پر جب پہلی بار حضرت شاہ خادم صفی قدس سرہٗ حاضر ہوئے تو بہت ساری قبروں پر پاؤں رکھتے ہوئے چل پڑے ،لوگوں کو حیرانی ہوئی ،تھوڑی دیر بعد آپ نے فرمایا کہ ان قبروں میں کوئی مدفون نہیں ہے،تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ ماضی میں امراء وقت صلحاء کی قبروں کے قریب دفن ہونے کی خواہش کرتے تھے ،ان کو دور رکھنے کے لئے قدیم لوگوں نے بہت ساری مصنوعی قبریں بنادیں تھیں۔

کتابیات

۱ تذکرۃ الاصفیاء (سوم)، درویش نجف علیمی ، اسرار کریمی پریس الٰہ آباد/۱۹۹۵ء
۲ نغمہ شفاعت، مرتب: محمد خصلت حسین صابری ۱۹۴۸ء
۳ دیوان ولایت (فارسی)، شاہ محمد عزیز اللہ صفوی، ابوالعلائی اسٹیم پریس آگرہ
۴ فوائد سعدیہ (مترجَم) ، قاضی ارتضی علی صفوی گوپاموی شارپ پرنٹنگ ایجنسی دریا گنج

دہلی/۲۰۰۲ء

۵ شجرہ قادریہ برکاتیہ رضویہ، رضا آفسیٹ ممبئی

۶ شجرہ چشتیہ نظامیہ صفویہ عارفیہ

۷ تذکرۃ الاصفیا (دوم)، درویش نجف علیمی اسرار کریمی پریس الہٰ آباد۔۱۹۹۴ء

۸ تذکرۃ الاصفاء (اول)، درویش نجف علیمی، فائین آفسٹ پریس الہٰ آباد۔۱۹۹۳ء

۹ مخزن الولایت والجمال، محمد عزیز اللہ شاہ، مترجم: محمد خصلت حسین صابری، ناشر: پاک اکیڈمی ۱/۱۴۱/وحید آباد، گولی مار، کراچی ۔۱۹۶۳ء/۱۳۸۲ھ

۱۰ سوانح اسلاف، محمد عزیز اللہ شاہ صفوی، ادبی پریس لکھنؤ ۔۱۳۴۶ھ

۱۱ حیات اعلیٰ حضرت، محمد ظفر الدین بہاری مرکز اہلسنت برکات رضا، پوربندر، گجرات۔ ۲۰۰۳/۱۴۲۴ھ

۱۲ سبع سنابل شریف (اردو ترجمہ)، میر عبدالواحد بلگرامی، مترجم: مفتی خلیل خان برکاتی عالمین پرنٹرز، لاہور

۱۳ مآثر الکرام، غلام علی آزاد بلگرامی، سن تصنیف: ۱۸۱۰ء/مطبع کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد۔۱۸۸۵ء

۱۴ فوائد سعدیہ (فارسی متن) محمد ارتضیٰ علی گوپاموی، مطبع نولکشور لکھنؤ/۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۵

۱۵ مجمع السلوک، شیخ سعد الدین خیرآبادی مخطوط (۸۹۰ء/۱۴۵۰ھ) رضا لائبریری، رام پور

۱۶ اللہ والے بلگرام کے محمد نورالحسن اویسی سیف آبادی، مخدوم ملت لائبریری سیف آباد پرتاپ گڑھ۔۲۰۰۹ء/۱۴۳۰ھ

۱۷ سجادِ سعد، سید ضیاء علوی، ۱۹۹۹ء

۱۸ اخبار الاخیار (مترجَم)، مصنف: شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۔مترجم: سبحان محمود ناہید آفسیٹ پرنٹرس نئی دہلی۔۱۹۹۹ء

۱۹ اخبار الاخیار (فارسی متن)، مصنف: شیخ عبدالحق محدث دہلوی، کتب خانہ رحیمیہ دیوبند

۲۰ مآثر الکرام تاریخ بلگرام (مترجم)، غلام علی آزاد۔مترجم: مفتی محمد یونس رضا مونسی، مرکز الدراسات الاسلامیہ، جامعہ الرضا رضا نگر، متھراپور، سی. بی گنج، بریلی

۲۱ عین الولایت، محمد عزیز اللہ شاہ صفی پوری، منشی نولکشور لکھنؤ ۱۹۵۳ء

۲۲ عقائد العزیز، محمد عزیز اللہ شاہ صفی پوری، راجہ رام کمار لکھنؤ مارچ ۱۹۵۲ء/۱۳۷۱ھ

۲۳ گردش رنگ چمن، قرۃ العین حیدر، کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔۲۰۰۷

OOO

صوفی ادب

ڈاکٹر سید حسنین اختر

عربی کی صوفیانہ شاعری

تصوف مذہب کے روحانی و باطنی پہلو کا نام ہے یعنی انسان عبادت، ریاضت اور مجاہدہ کے ذریعۂ باطنی و روحانی طور پر اس مقام پر پہونچے جہاں حقیقت ابدی اس پر منکشف ہوجائے- زہد وتقویٰ اور خشوع وخضوع تصوف کے لازمی عناصر میں سے ہیں-تصوف کا آغاز ختمی مرتبت فخر موجودات رحمۃ للعٰلمین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات مبارک ہی سے ہوتا ہے، کیوں کہ آپ ہی کی بدولت انسان گمراہیوں سے نکل کر اجالوں میں آئے اور انھیں خصوصیت کے ساتھ بصارت وبصیرت عطا ہوئی- مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہوا جو اسلام کے روحانی و باطنی پہلو کی طرف متوجہ ہوا- یہی حضرات بعد میں صوفی یا متصوف کے لقب سے جانے گئے-

جہاں تک عربی میں صوفیانہ یا عارفانہ شاعری کا تعلق ہے تو اگر تصوف کو زہد وتقویٰ وترک دنیا میں منحصر کردیا جائے تو یہ چیز عربی کے متعدد شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہے-مگر صرف مذکورہ بالا خصوصیات کا نام ہی تصوف نہیں ہے- یہ سب چیزیں جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے، تصوف کے لازمی عناصر میں سے ہیں- اس لیے جہاں تصوف ہوگا وہاں ان خصوصیات کا پایا جانا لازمی ہے-لیکن اس کے برعکس جہاں یہ تمام خصوصیات پائی جائیں وہاں ضروری نہیں تصوف بھی ہو، کیوں کہ تصوف ایک باضابطہ عقیدہ ونظریہ کا نام ہے-ایک تحریک ہے جس کے کچھ اصول وضوابط ہیں جس میں ان عناصر کے علاوہ معرفت الٰہی کے ساتھ ساتھ عشق ومحبت کا ہونا لازمی ہے اور یہ عشق مجازی نہیں حقیقی ہے جو خالق حقیقی سے کیا جاتا ہے- اور جب خالق سے عشق کیا جائے گا تو مخلوق سے عشق کرنا اس کا لازمہ ہوگا- چنانچہ اس قبیل کے شعرا میں سب سے پہلا نام ذوالنون المصری (وفات: ۲۴۵ھ) کا آتا ہے- ڈاکٹر شوقی ضیف کے مطابق ذوالنون تصوف اسلامی کے حقیقی مؤسس تھے جنھوں نے تصوف کے احوال و مقامات کی ترتیب کا کام انجام دیا اور صوفیانہ وجد کی تعریف بیان کی، نیز جام عشق ربانی کا جو کہ تصوف

کا جوہراوراس کی بنیاد ہے،ذکر سب سے پہلے انہوں نے کیا-(۱)

ذوالنون ہروقت عشق الٰہی میں غرق رہتے تھے ان کا قلب حب الٰہی سے معمور تھا وہ کہتے ہیں:(۲)

لک من قلبی المکان المصون — کل لوم عَلَیَّ فیک یھون

لک عزم بان اکون قتیلا — فیک والصبر عنک مالایکون

ذوالنون اپنے رب سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ تو میرے دل میں رہتا ہے، تیرے بارے میں میرے لیے ہر ملامت حقیر ہے، میرا عزم ہے کہ تیری محبت میں جان دیدوں، اب میں تجھ سے دور نہیں رہ سکتا گویا کہ میں تیرے وصال کے لیے تڑپ رہا ہوں- ایک اور جگہ وہ کہتے ہیں:

اموت وماماتت الیک صبابتی — ولاقضیت من صدق حبک اوطاری

تحمل قلبی فیک مالاابثہ — وان طال سقمی فیک أوطال اضراری

یعنی میں مر بھی جاؤں تو بھی تیرے لیے میرا عشق ختم نہیں ہوگا اور نہ ہی تیری محبت کے بارے میں میری تمنائیں وخواہشات پوری ہوں گی - میرے دل میں تیری جو محبت ہے میں اسے ظاہر نہیں کرتا اگرچہ میرا مرض وتکلیف طول پکڑ جائے-یعنی تیرا عشق ومحبت لازوال ہے-

ذوالنون کے بعد ابوالقاسم جنید بغدادی (۳) (وفات/۲۹۷ھ) کا نام آتا ہے-ان کا شمار کبار متصوفین میں ہوتا ہے- آپ طریقۂ جنیدیہ کے بانی ہیں-جنید کے کلام میں **فنافی الذات الالٰھیة** کی فکر پائی جاتی ہے-**فنافی الذات الالٰھیة** کا مقصد نفس کو تمام شہوات ورغبات سے پاک کرنا اوراسے ارادۂ الٰہیہ سے ہمکنار کرنا ہے-وہ کہتے ہیں:

افنیتنی عن جمیعی — فکیف ارعی المحلا

یعنی تیرے عشق ومحبت نے مجھے فنا کردیا ہے-میرا تو اب کچھ بھی نہیں سب کچھ تیرا ہی ہے اور تیرا ہی اختیار ہے-میرا کوئی اختیار نہیں-جنید بغدادی کے متعدد مریدوں وشاگردوں نے بھی بڑی شہرت پائی، ان میں دو نام اہم ہیں، ایک ابومغیث الحسین بن منصور الحلاج (وفات/۳۰۹ھ) اور دوسرے ابوبکر الشبلی (وفات/۳۳۴ھ) حلاج ایران کے شہر تستر میں پیدا ہوئے اور وہاں سہل التستری الصوفی کی صحبت اختیار کی پھر بغداد آئے تو وہاں جنید بغدادی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے-دوبار فریضۂ حج ادا کیا نیز دنیا کے مختلف مقامات کی سیر کی، ان میں ہندوستان بھی شامل

ہے-حلاج کی شخصیت،ان سے منسوب کچھ نظریات کی وجہ سے کافی متنازع رہی- ڈاکٹر شوقی ضیف کے مطابق نظریات میں شدت کے سبب ہی حلاج کے جنید بغدادی سے بھی اختلافات ہوگئے،حلاج کے مطابق زاہد جب آلام ومصائب کا متحمل ہوجائے تو اس کا نفس مجاہدہ وریاضت کے ذریعہ صاف ہوجاتا ہے یہاں تک کہ وہ اس مقام رفیع پر پہونچ جاتا ہے کہ اس میں صورۃ الٰہیہ کی حقیقت بطور عطیۂ الٰہی جذب ہوجاتی ہے اور خالق اس میں نظر آنے لگتا ہے(۴)

حلاج دراصل ایک مجذوب تھے اور حالت جذب میں جو کیفیت ہوتی ہے اس کا ادراک صرف وہی شخص کرسکتا ہے جو اس کیفیت سے گزرا ہو- وہ حالت جذب میں کہتے ہیں:

مزجت روحک فی روحی کما — تمزج الخمرة بالماء الزلال

فاذا مسّک شیءٌ مسّنی — فاذاانت انافی کل حال

یعنی تیری روح میری روح میں اس طرح گھل مل گئی ہے جیسے شراب صاف پانی میں ملادی جائے -جب کوئی شئی تجھے مس کرتی ہے تو مجھے مس کرتی ہے- پس تو ہر حال میں ہوں- یہاں خمر سے حقیقت صورۃ الٰہیہ اور ماء زلال سے نفس صافی کی تشبیہ دی گئی ہے-علاوہ ازیں حلاج نے ناسوت ولاہوت کی تعبیریں بھی استعمال کی ہیں، ناسوت سے مراد روح انسانی اور لاہوت سے مراد روح الٰہی ہے-شوقی ضیف نے کتاب الطّواسین کے حوالہ سے ان کے اس سلسلے میں چند اشعار نقل کیے ہیں-(۵)

سبحان من اظہر ناسوتہ — سرّ سنالاھوتہ الثاقب

ثم بدالخلقہ ظاھراً — ھوفی صورۃالاکل والشارب

پہلے شعر میں آدم علیہ السلام کی طرف اور دوسرے شعر میں ان کی ذریت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ پاک ہے وہ ذات جس کے ناسوت نے اس کے لاہوت کی تجلی کے راز ظاہر کیا پھر وہ کھانے پینے والے کی شکل میں ظاہر ہوگیا-

حلاج کے متعدد اقوال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تنزیہ خالق پر ایمان رکھتے تھے-مثال کے طور پر ان کا یہ قول:

ان اللہ تعالیٰ لاتحیط به القلوب ولاتدرکه الابصارولاتمسکه الاماکن ولاتحویه الجہات ولایتصورفی الاوھام ولایتخایل للفکرولایدخل تحت کیف

ولا ینعت بالشرح والوصف(٦)

اس قول میں مولائے کائنات حضرت علی کے ان کلمات کی بازگشت سنائی دیتی ہے جو آپ خالق کائنات کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتے تھے، آپ کہتے ہیں:

"الحمدلله الذی لایبلغ مدحته القائلون ولایحصی نعماء ه العادون ولایؤدی حقه المجتهدون الذین لایدرکه بعدالهمم ولاینا له غوص الفطن الذی لیس لصفته حدمحدود ولانعت موجود ولاوقت معدود ولااجل ممدود" یعنی ساری تعریفیں اس اللہ کے لیے ہے جس کی مدحت تک بولنے والوں کے تکلم کی رسائی نہیں اور اس کی نعمتوں کو گننے والے شمار نہیں کر سکتے، اس کے حق کو کوشش کرنے والے بھی ادا نہیں کر سکتے نہ ہمتوں کی بلندیاں اس کا ادراک کر سکتی ہیں اور نہ ذہانتوں کی گہرائیاں اس کی تہہ تک جا سکتی ہیں، اس کی صفت ذات کے لیے نہ کوئی حد متعین ہے نہ توصیفی کلمات، نہ مقررہ وقت ہے اور نہ آخری مدت-(٧)

حلاج کے علاوہ اسی دور کے متصوفین شعراء میں ایک نام ابوبکر شبلی (متوفی ۳۳۴ھ) کا بھی آتا ہے جو جنید بغدادی کے تلامذہ کی طرح حلاج کے دوستوں میں سے تھے-شبلی جنید کے متبعین میں تھے اور اپنے پیرومرشد کی طرح فنافی الذات الالٰہیہ پر ایمان رکھتے تھے-ان کے مطابق ذات باری تعالیٰ واجب الوجود اور خالق عالم ہے اور وہ مخلوق سے جدا ہے اس سے مخاطب ہوا جا سکتا ہے لیکن اسے دیکھا نہیں جا سکتا وہ کہتے ہیں:

خاطبت موجوداًبغیرتکلم   ولاحظت معلوماًبغیرعیان

یعنی میں بغیر تکلم کے موجود سے مخاطب ہوا اور میں نے معلوم کو بغیر دیکھے ملاحظہ کیا-ذوالنون المصری کے علاوہ مصر کے شعرا متصوفین میں ایک اہم نام ابن الفارض (ولادت ۵۷۶ھ وفات ۶۳۲ھ) کا ہے- ابن الفارض کا نام عمر ابن کمال الدین علی الفارض تھا-ابن الفارض کے والد شامی الاصل تھے لیکن جوانی میں قاہرہ منتقل ہوگئے جہاں ابن الفارض کی ولادت ہوئی-جب ابن الفارض جوان ہوا تو اس کے والد نے اسے مقطم میں صوفیہ کے طبقہ مستضعفین میں شامل کر دیا، جہاں وہ ایک عرصہ تک عبادت و ریاضت میں مشغول رہا-مقطم سے وہ مکہ کی طرف روانہ ہوا جس کی وادیوں میں اس نے تقریباً پندرہ برس گزارے-اس دوران وہ مسلسل عبادت و ریاضت میں مشغول رہتا یہاں تک کہ اس پر حقیقت منکشف ہوئی-پھر وہ قاہرہ لوٹا جہاں وہ مقطم اور جامع

از ہر میں کئی کئی روز تک عبادت میں مشغول رہتا-اس دوران وہ سوتا نہ کھاتا نہ پیتا-اس طرح دنیاومافیہا سے بالکل لاتعلق و بے خبر رہتا-اس عالم وجد میں اس کی زبان سے وہ اشعار جاری ہوتے جن میں شوق وصال اور عشق الٰہی کے شعلے بھڑکتے ہوتے-وہ نور الٰہی کو تمام کائنات اور اس کے عناصر میں پھوٹتے ہوئے دیکھتا ہے اور کہتا ہے:

تراه ان غاب عنی کل جارحة   فی کل معنی لطیف رائق بهج
فی نغمةالعودوالنای الرخیم اذا   تألفابین ألحان من الهزج
وفی مسارج غز لان الخمائل فی   بردالاصائل والاصباح فی البلج
وفی مساقط أنداء الغمام علیٰ   بساط نورمن الازهارمنتسج
وفی مساحب اذیال النسیم اذا   اهدی الیّ سحیرا اطیب العرج

میں اللہ کے جلال و جمال کا مشاہدہ کائنات کی ہر شئی میں کر سکتا ہوں چاہے وہ بانسری کا نغمہ ہو یا گانے کا ساز اور ہرنوں کے گھنے جنگلوں میں پو پھٹتے وقت جب ٹھنڈی و تازہ ہواؤں کے جھونکے دلوں کو فرحت بخشتے ہیں اور پھولوں و کلیوں میں جب کہ ان پر شبنم نے اپنے قطرے بکھیر دیے ہوں نیز اس نسیم میں جس نے پوری فضا کو معطر کر کے ایک جادو کر دیا ہے-

ابن الفارض اس ذات اعلیٰ کا مشاہدہ کائنات کی ہر شئی میں کرتا ہے یہی اس کے وجد اور عشق الٰہی کا راز ہے-اس کا شمار عربی کے صف اول کے شعرا متصوفین میں ہوتا ہے اس کے شعری دیوان میں ایک قصیدۂ تائیہ ہے جو "نظم السلوک" کے نام سے بھی جانا جاتا ہے جس میں اس نے اپنے صوفیانہ نظریات کو پیش کیا ہے-نیز خمریات یعنی معرفت الٰہیہ میں ایک قصیدہ میمیہ ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے-(٨)

شربنا علیٰ ذکرالحبیب مدامةً   سکرنابهامن قبل ان یخلق الکرم
لها البدرکأس وهی شمس یدیرها   هلال وکم یبدواذامزجت نجم
و ان خطرت یوماً علی خاطر امرئ   اقامت به الافراح وارتحل الهمّ
و لو نضحوا منها ثری قبرمیت   لعادت الیه الروح وانتعش الجسم

وہ شراب حب الٰہی میں سرشار ہو کر کہتا ہے کہ ہم نے ذکر حبیب کی شراب پی لی ہے اور ہم

اس کے نشے میں ڈوب چکے ہیں اور یہ شراب کرم یعنی انگور سے بھی قدیم ہے- یہاں شاعر فکر حقیقت محمدیہ کی طرف اشارہ کررہا ہے جس کے بارے میں صوفیہ کا خیال ہے کہ وہ تخلیق کائنات سے بھی قدیم ہے- وہ کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس شراب کو محسوس یعنی سونگھ بھی لے تو تمام خوشیاں اس کا مقدر ہوں گی اور غم و حرماں نصیبی دور ہوگی اور اگر اس کا چھڑکاؤ کسی قبر پر کردیا جائے تو میت کی روح واپس آجائے گی اور اس میں جان پڑ جائے گی- یہاں روح سے مراد روح مجازی نہیں بلکہ روح حقیقی ہے-

یہ تو شعرا تھے جن کا تعلق مصر بغداد یا ایران وغیرہ سے تھا- مسلم اندلس میں بھی متعدد صوفی شعرا گزرے ہیں جن میں ہم صرف دو اہم شعرا کے ذکر پر اکتفاء کریں گے- ایک ابوعمر احمد بن یحییٰ بن عیسیٰ الالبیری الاصولی (وفات ۴۲۹ھ) اور دوم شیخ اکبر ابن عربی-(۹)

الالبیری کا شمار اس خطہ کے اہم شعرائے متصوفین میں ہوتا ہے- اس کے بارے میں ڈاکٹر شوقی ضیف کی رائے ہے کہ یہ پہلا صوفی شاعر ہے جس نے وضاحت کے ساتھ عقیدہ تصوف کو عقیدہ اعتزال سے ملا کر پیش کیا ہے- الالبیری کہتا ہے:

شربت بکأس الحب من جوهر الحب　　　رحیقاً بکف العقل فی روضة الحب

وخامدماء الروح فاهتزت القوی　　　قوی النفس شوقاً وارتیاحاً الیٰ الرب

ونادیٰ حثیثا بالأنین حنینها　　　الٰهي الٰهي من لعبدک بالقرب

وخاطبه وحیاً الیه ملکه　　　سأکشف یاعبدی لعینک عن حجب

فاعمل بالتسبیح مثلک لم اجده　　　تعالیت عن کفء یکافیک اوصحب

وہ کہتا ہے کہ میں نے جام محبت سے صاف اور بہترین شراب جس میں روح کا پانی ملایا گیا ہو، باغ محبت میں پی تو میرے تمام قوی شوق وصال اور خوشی سے جھومنے لگے اور میری تمنا نے بے تاب ہوکر پکارا اے رب اپنے بندے کو قرب عطا کر، تو الہامی طور پر رب نے اس سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے میرے بندے میں تیرے اپنے پردے ہٹا دوں گا، تو تسبیح کر اور کہہ کہ اے مالک تیرا کوئی مثل نہیں اور ہر کفو و ساتھی سے منزہ ہے- یہاں سورۂ توحید کی آیت "**ولم یکن له کفواً احد**" کی طرف اشارہ ہے-

ایک اور شعر ملاحظہ کریں:

یامحدثاً کنت لم تزل　　　وکذالک ربی لایزال بلامکان

یعنی اے کل جہانوں کو پیدا کرنے والے تو ہمیشہ رہنے والا ہے اور لامحدود ہے-

ایک اور جگہ کہتا ہے:

جلک صفات جلاله فجلاله　　　قدجل عن تحدید کیف ومن وما

یعنی ذات باری تعالیٰ کو زمان و مکان کیفیت میں محدود نہیں کیا جاسکتا وہ ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے-

اندلس سے متعلق دوسرے اہم صوفی شاعر ابن عربی ہیں- ابن عربی وہ شخصیت ہے جس نے عالم تصوف ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کو اپنی آرا و نظریات سے متأثر کیا- تصوف کے جتنے بھی سلسلے ہیں وہ کہیں نہ کہیں ابن عربی کے نظریات سے متأثر نظر آتے ہیں، دنیائے تصوف میں غالباً یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے تصوف اور اس کے حقائق و اسرار کو اس طرح مدون کیا کہ وہ باقاعدہ ایک علم بن گیا، ابن عربی کی تالیفات کی تعداد چار سو تک پہنچتی ہے- ان کے نزدیک علم کی تین قسمیں ہیں- ایک علم العقل یعنی جو غور و فکر سے حاصل ہو- دوسرا علم الاحوال جو ذوق و تجربہ سے حاصل ہو اور سوم علم الاسرار- یہ علم سابقہ دونوں علوم سے برتر اور عقل اس کے ادراک سے پرے ہے- یہی علم حضرات انبیاء و رسل اور صوفیہ کا علم ہے اور اس میں سب سے اہم عقیدہ عقیدۂ وحدۃ الوجود ہے- یہی وہ عقیدہ ہے جس کا شیخ اکبر نے اپنی تمام تصانیف اور اشعار میں جگہ جگہ ذکر کیا ہے-

شیخ اکبر کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے تصوف کو ایک علامتی اور رمزی بیان سے آشنا کیا- یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنے دیوان ''ترجمان الاشواق'' کی شرح بھی خود کی - ہوا یوں کہ جب ان کا دیوان منظر عام پر آیا تو لوگوں نے ان کے اشعار پر اعتراضات کیے، جس کی خبر ان کے مریدوں نے انہیں پہنچائی تو انہوں نے طے کیا کہ وہ خود اپنے اشعار کی شرح کریں گے- چنانچہ وہ اس شرح کے مقدمہ میں اشعار کی شکل میں اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں-(۱۰)

کل مااذکره من طلل　　　اوربوع اومغان کل ما

اونساء کاعبات نهد　　　طالعات کشموس اودمی

صفة قدسية علوية　　اعلمت ان لصدقي قدما

فاصرف الخاطر عن ظاهر　　واطلب الباطن حتى تعلما

وہ کہتے ہیں کہ میں اپنے اشعار میں جس کا بھی ذکر کرتا ہوں چاہے وہ مقامات ہوں، مکانات ہوں، محلات ہوں، خوب صورت ونوجوان عورتیں ہوں، کچھ بھی ہو سب کا ذکر ذات باری تعالی کے لیے اپنی محبت اور اس کے اسرار وانوار کے اظہار کے لیے رمزیہ طور پر کرتا ہوں، اس لیے اپنی نظر کو ظاہر سے ہٹا کر باطن میں جھانک-

وہ جمال حق اور اپنے شوق کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

أغيب، فيفنى الشوق نفسي فالتقي　　فلا اشتفي فالشوق غيبا و محضرا

ويحدث لي لقياه مالم اظنه　　فكان الشفاء داء من الوجود آخرا

لأني ارى شخصاً يزيد جماله　　اذا ما التقينا نفرة وتكبرا

فلابد من وجد يكون مقارناً　　لما زاد من حسن نظاماً محررا

یعنی محبوب حقیقی سے غیبت میں رہتا ہوں تو شوق وصال مجھے فنا کرتا رہتا ہے اور جب اس سے ملاقات کرتا ہوں تو تمنا تسکین وآسودگی نہیں پاتی، جو تجلیات شوق کی زیادتی طلب کرتے ہیں اس طرح شوق، غیبت وحضوری دونوں حالتوں میں قائم رہتا ہے اور نفس ترقی کے اعلی مدارج پر پہنچنا چاہتا ہے- محبوب حقیقی کی ملاقات اضطراب وشوق کے وہ سامان پیدا کر دیتی ہے جس کا وہم وگمان بھی دل نہ کرتا تھا- اس طرح محبوب سے ملاقات کے ذریعہ درد ومحبت کے ایک نئے مرض کی ابتدا ہوتی ہے یہ اس لیے کہ میں ایک ہستی عالی اور حسن مطلق کو دیکھتا ہوں جس کا حسن وجمال بے حد وانتہا ہے اور نگاہ شوق میں بڑھتا ہی جاتا ہے- اس کی بلندی وکبریائی کی کوئی حد نہیں تو وجد وشوق کے لیے ایک ایسا بسیط نظام ہو جو حسن حقیقی کے وفور تجلیات اور دقائق حسن کے مطالعہ کے لیے ایک آزاد نظام کی حیثیت رکھتا ہو-

ابن عربی اس بلند مقام پر پہونچ گئے ہیں کہ جہاں انسان مذہبی عصبیت وفرقہ واریت سے بالکل پاک ہوکر ہر شخص کو ایک انسان کی شکل میں دیکھتا ہے وہ انسانوں کو مذہب کے خانوں میں نہیں بانٹتا وہ کہتے ہیں:

لقد صار قلبي قابلا كل صورة　　فمرعى لغزلان ودير لرهبان

وبيت لاوثان وكعبة طائف　　والواح توراة ومصحف قرآن

ادين بدين الحب اني توجهت　　ركائبه فالحب ديني وايماني

یعنی میرا دل ہر صورت وجگہ کو قبول کرنے لگا ہے چاہے وہ ہرنوں کی چراہ گاہ ہو یا راہبوں کا دیر، بت کدہ ہو یا کعبہ، توریت ہو یا قرآن- میں تو محبت کے مذہب پر یقین رکھتا ہوں میرا دین و ایمان محبت ہے-

حقیقت میں یہ وسیع القلبی صوفیہ کا خاصہ ہے، وہ مذہبی تنگ نظریوں سے آزاد ہیں- اس دور میں انسان جس اضطراب وبے چینی کا شکار ہے اور نام نہاد مذہبی ودھارمک لوگ انسانی سماج میں جو نفرت گھولنے کی کوشش کررہے ہیں تو اس کے توڑ کے لیے ضرورت ہے کہ صوفیہ کی تعلیمات کو عام کیا جائے تاکہ انسانی خون، جو انسان نما درندوں نے مذہب کے نام پر ارزاں کر رکھا ہے، اس کی قدر وقیمت وعظمت کو پہچانا جائے اور مذہب کے نام پر یہ خون خرابہ بند ہو-

حوالہ جات

۱- تاریخ الادب العربی، عصر الدول والامارات، مصر، للدکتور شوقی ضیف ص:۳۴۷

۲- ایضاً ص:۳۴۸

۳- المنجد فی الاعلام مطبوعہ بیروت

۴- ایضاً وتاریخ الادب العربی از شوقی ضیف، العصر العباسی الثانی ص:۴۷۷

۵- ایضاً ص:۴۷۹

۶- ایضاً

۷- نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱

۸- المنجد فی الاعلام وتاریخ الادب العربی مصر از شوقی ضیف ص:۳۵۹

۹- تاریخ الادب العربی اندلس از شوقی ضیف ص:۲۶۶

۱۰- ترجمان العشاق مقدمہ-

OOO

زاویہ

حجۃ الاسلام امام محمد غزالی قدس سرہٗ کی تاریخی خدمات پر خصوصی گوشہ

ادارہ

آئینۂ حیاتِ غزالی

نام: محمد بن محمد

عرف : غزالی

لقب : حجۃ الاسلام، مجدد قرن خامس

ولادت: ۴۵۰ھ طابران (طوس)

اساتذہ و مشائخ: احمد بن محمد راذ کانی، امام ابونصر اسماعیلی، امام الحرمین شیخ فارمدی، حافظ عمر بن ابی الحسن زراسی

کمالات: فقیہ، اصولی، صوفی، فلسفی، متکلم، واعظ

تدریسی مناصب: معید مدرسہ نظامیہ نیشاپور (نائب مدرس) مدرسہ نظامیہ نیشاپور کی صدارت

اسفار : نیشاپور، بغداد، دمشق، شام، حجاز، فلسطین، مصر، اسکندریہ

تلامذہ: محمد بن تومرت، امام قاضی ابوبکر عربی، قاضی ابونصر احمد بن عبداللہ، ابوالفتح احمد بن علی، ابومنصور محمد بن اسماعیل، ابوسعید محمد بن السعد، ابو حامد محمد بن عبدالملک، ابوسعید محمد بن علی کردری، امام ابوسعید محمد بن یحییٰ نیشاپوری، امام ابوالحسن سعد الخیر بن محمد البلنشی، ابوالحسن علی بن محمد جوینی صوفی، ابوالحسن علی بن مسلم جمال الاسلام، ابوالحسن علی بن مطہر دینوری

تجدیدی کارنامے : عقائد کی اصلاح، اخلاق کی اصلاح، مسئلہ تکفیر پر سیر حاصل بحث، علم مناظرہ ومباحثہ کی اصلاح، عقل ونقل کی تطبیق، باطنیہ کے خلاف جہاد، فلاسفہ سے معرکہ آرائی، متکلمین کی اصلاح، صوفیہ کی اصلاح، تدوین فن تصوف، علماے ظاہر پر تنقید، علما کی اصلاح، واعظین کی اصلاح، بادشاہ وقت اور ارکان سلطنت کی اصلاح، تعلیم کی اصلاح، اسرار شریعت پر گفتگو

نمایاں تصنیفات: احیاء علوم الدین، الاقتصاد فی الاعتقاد، تہافت الفلاسفہ، التفرقۃ بین

الاسلام و الزندقۃ، القسطاس المستقیم، القول الجمیل فی الرد علی من غیر الانجیل، کیمیائے سعادت، المستصفی، المنقذ من الضلال، مقاصد الفلاسفہ، میزان العمل

چند مشہور ناقدین: ابوبکر بن العربی، محدث ابن الصلاح، محدث ابن جوزی، حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، ابن رشد

زندگی کے مختلف ادوار:

پہلا دور: ۴۵۰ تا ۴۸۸ (عمومی دور)

دوسرا دور: ۴۸۸ تا ۴۹۹ (تلاش حق اور روحانی اضطراب کا دور)

تیسرا دور: ۴۹۹ تا ۵۰۵ (افادہ وتجدیدی خدمات کا دور)

وفات: ۱۴/ جمادی الآخرہ ۵۰۵ھ بمقام طابران (طوس)

○○○

ذیشان احمد مصباحی

امام غزالی کا فکری نظام

المنقذ من الضلال کی روشنی میں

ابو حامد محمد بن محمد الغزالی (۱۰۵۸/۴۵۰-۱۱۱۱/ ۵۰۵) اس عبقری شخصیت کا نام ہے، اسلامی تاریخ جس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے- امام غزالی کی انفرادیت اس حقیقت میں مضمر ہے کہ وہ اپنے عہد کی تمام تاریکیوں سے گزر کر، بے اعتدالیوں کو گہرائی سے سمجھ کر، علاج کے لیے کمر بستہ ہوئے اور کامیاب ہوئے- ان کا کمال یہ ہے کہ وہ فلسفے میں ابن سینا اور فارابی کا درجہ رکھتے ہیں مگر بطور فلسفی نہیں جانے جاتے، علم الکلام میں ابوالحسن اشعری اور نظام معتزلی کے اندرون تک پہنچے ہوئے ہیں مگر بطور متکلم کے نہیں جانے جاتے- فقہ واصول میں امام شاطبی جیسا کام کیا لیکن ''اصولی'' ان کی شناخت نہیں بن سکی- انھوں نے جنید اور بسطامی کی طرح چلہ کشی کی لیکن ''صوفی'' ان کے نام کا حصہ نہیں بن سکا، ہر فن میں کمال انھیں کسی ایک فن کی طرف منسوب ہونے سے ابا کرتا رہا- اور یہ سب کچھ صرف اس لیے ممکن ہو سکا کہ کبھی بھی انھوں نے ساحل پر کھڑے ہو کر موج دریا کا تماشہ نہیں دیکھا، بلکہ اسے گناہ سمجھتے ہوئے، ہر موج سے ٹکرائے، ہر خندق میں چھلانگ لگا دی، اور کہیں سے موتی تو کہیں سے ہیرا نکالنے میں کامیاب رہے- ان کی عظمتوں کا اندازہ ایک انگریزی محقق مانٹ گمری واٹ (W. Montgomery Watt) کی اس تحریر سے لگایا جاسکتا ہے گو کہ اس بات سے کلی اتفاق نہیں کیا جاسکتا اور اس نے خود بھی جزوی طور پر اس سے اختلاف کیا ہے:

"Al-Ghazali has been acclaimed by both western and Muslim scholors as the greatest Islamic theologian and inded as the greatest Muslim after Mohammad".

(Islamic Phylosophy and Theology, Page: 85, Edinburgh, 1985)

غزالی عظمتوں کے اس مینار تک کیسے پہنچے، غزالی خودنوشت کے انداز میں "**المنقذ من الضلال و الموصل الیٰ ذی العزة و الجلال**" لکھ کر انھوں نے اس راز سے خود ہی پردہ اٹھا دیا- یہ دنیا کی غالباً واحد خودنوشت ہے جو بہت مختصر ہوتے ہوئے بھی بے انتہا مشہور ومقبول ہے- غزالی نے اپنی روحانی کشمکش، اندرونی اضطراب اور تلاش حق میں ہر در کی خاک چھاننے اور ہر عقدے کو کھولنے کی کوشش کی ہے اور پھر اس منزل تک رسائی کی فرحت انگیز داستان لکھی ہے جہاں صرف نور و یقین کی جلوہ سامانی ہے-

المنقذ من الضلال میں امام غزالی نے اپنی سپاٹ سرگزشت کے ساتھ ہی بیچ بیچ میں اپنی پختہ فکر اور زاویۂ نگاہ کا تذکرہ بھی کر دیا ہے اور کہیں کہیں ایک ایک جملے میں سچ مچ سمندر کو کوزے میں بھر دیا ہے- یہ باتیں غزالی کے فکری منہج کو اجاگر کرتی ہیں- ذیل میں **المنقذ من الضلال** سے انھی بکھرے موتیوں کو چننے اور ان سے غزالی کے نظام فکر کو سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہے- قارئین محسوس کریں گے کہ غزالی کے ان خیالات کی معنویت موجودہ حالات میں کئی گنا بڑھ گئی ہے-

سب سے بڑی وجہ گمراہی: امام غزالی کے نزدیک کثرت مذاہب اور تعدد مسالک گمراہی کی سب سے بڑی وجہ ہے- بقول ان کے یہ ایسا سمندر ہے جس میں اکثر لوگ ڈوب گئے اور بہت کم لوگ اس سے نکلنے میں کامیاب ہو سکے اور طرفہ تماشہ یہ کہ ہر شخص خود کو برحق سمجھتے ہوئے شاداں و نازاں ہے-

بحر عميق غرق فيه الأكثرون، و مانجا منه الا الاقلون و كل فريق يزعم انه الناجي، "و كل حزب بما لديهم فرحون" (الروم: ۳۲) (المنقذ من الضلال، ص: ۳)

اس بات کی اہمیت امام غزالی کے نزدیک کتنی زیادہ ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے خطبۂ کتاب کے بعد اسی سے اپنی بات کا آغاز کیا ہے اور ساتھ ہی مناسبت کے پیش نظر حدیث افتراق امت کو نقل کیا ہے اور اس کی یہ کہتے ہوئے تصدیق کی ہے کہ صادق و مصدوق ﷺ نے جیسا فرمایا تھا ویسا ہی بعد میں وقوع پذیر ہوا-

مطالعے میں معروضیت (Objectivity) چاہیے: امام غزالی کے سامنے گمراہی کا یہ سمندر (کثرت مذاہب و مسالک) عنفوان شباب یعنی بیس سال کی عمر سے پہلے ہی ٹھاٹھیں مارنے لگا اور اسی وقت تشکیک و ریب کا مرض انھیں لاحق ہو گیا لیکن غزالی اس معاملے میں ہمالیہ صفت عزم

جواں رکھتے تھے، انھوں نے اس سے گھبرانے اور ڈرنے کی بجائے سیدھے اس اتھاہ سمندر میں غوطہ لگا دیا اور پوری جرأت مندی کے ساتھ تلاش حق کا سفر طے کیا- وہ لکھتے ہیں کہ:

"باطن کی باطنیت، ظاہری کی ظاہر پرستی کی وجوہ، فلسفی کے راز فلسفہ، متکلم کے کلام و مناظرہ کی حقیقت، صوفی کی صوفیت، عابد کے مقصد عبادت اور زندیق بے دین کی زندیقیت و بے دینی کو جاننے کی میرے اندر ہوس تھی اور اس کے لیے میں نے ہر ممکن کوشش کی- (**المنقذ من الضلال، ۳**)

اس سے غزالی کی معروضیت (Objectivity) کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے- لیکن اس معروضیت (Objectivity) نے غزالی کو اس موڑ پر پہنچا دیا کہ:

"تقلید کی زنجیریں ٹوٹ گئیں، بچپن کے موروثی عقائد بکھر گئے، کیوں کہ میں نے دیکھا کہ نصاریٰ کے بچے صرف نصرانی، یہود کے بچے صرف یہودی اور مسلمانوں کے بچے صرف مسلمان ہی بنتے ہیں-"

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث میرے کانوں میں آئی کہ ہر بچہ "فطرت" پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں-" اب میرے اندر "فطرت اصلی" جاننے کا شوق پیدا ہو چلا-" (ص:۴)

حقیقت علم: لیکن "فطرت اصلی" کو جاننے سے پہلے غزالی کے سامنے یہ سوال کھڑا ہوا کہ پہلے وہ یہ جانیں کہ جاننے کی حقیقت "حقیقت علم" کیا ہے؟ غور وفکر کے بعد ان پر واضح ہوا کہ حقیقی علم صرف وہ علم ہے جس میں کسی طرح کا کوئی شک و ریب نہ ہو- جیسے دس تین سے زیادہ ہے- یہ ایسا علم یقینی ہے کہ اس میں کوئی بھی شک پیدا نہیں کر سکتا- حتیٰ کہ کوئی لاٹھی کو سانپ بنانے کا ہنر رکھتا ہو اور وہ ایسا کر کے دکھا دے اور دس تین سے زیادہ ہے، کے کلیے کو توڑنے کو کہے جب بھی سابقہ یقین میں کسی طرح کا احتمال پیدا نہیں ہو سکتا- لیکن "علم" کے اس معیار کو طے کرنے کے بعد غزالی نے جب اپنی معلومات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ اس معیار پر صرف "حسیات" اور "بدیہیات" اترتی ہیں- باقی دیگر تمام معلومات کے اندر ایسا یقین اور حتمیت موجود نہیں ہے-

آگے بڑھنے سے پہلے پھر غزالی نے سوچا کیوں نہ "محسوسات" اور "بدیہیات" کا بھی گہرائی سے جائزہ لے لیا جائے تا کہ معلوم ہو سکے کہ اس کے اندر بالکل شک کی گنجائش نہیں ہے-

کیوں کہ پہلے تو دیگر معلومات پر بھی ایسے ہی اعتبار تھا لیکن غور کرنے کے بعد ان کی حقیقت واضح ہوگئی-تفکر و تدبر کے معمولی سفر کے بعد ہی غزالی پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ ''حسیات'' پر بھی آنکھ بند کر کے یقین نہیں کیا جاسکتا- کیوں کہ محسوسات میں سب سے زیادہ معتبر ''بصریات'' (وہ امور جو دیکھنے سے معلوم ہوتے ہیں) ہیں-لیکن بسا اوقات تجربے سے ان کا غیر یقینی ہونا بھی ثابت ہو جاتا ہے-مثلاً سورج سے پیدا ہونے والا ''سایہ'' بظاہر ٹھہرا ہوا نظر آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کسی لمحے بھی ٹھہرا ہوا نہیں ہوتا- اسی طرح زمین سے تارے چھوٹے نظر آتے ہیں جب کہ حقیقت میں وہ بہت بڑے ہیں-

اب غزالی کو لگا کہ صرف ''بدیہیات'' پر ہی، جو عقلی ہیں، کلی اعتماد کیا جاسکتا ہے- کیوں کہ دس تین سے زیادہ ہے، نفی و اثبات شئی واحد میں جمع نہیں ہوسکتے، شئی واحد حادث و قدیم، موجود و معدوم، واجب اور محال نہیں ہوسکتی- یہ ایسے حقائق ہیں جن میں کسی طرح کا کوئی شک نہیں-لیکن اس کے ساتھ ہی پھر غزالی کو اس شک نے آدبوچا کہ کیا اب تک جتنی معلومات میں شک لاحق ہوا اور ان کا اعتبار ختم ہوا، وہ صرف عقل کی وجہ سے ہوا، اسی لیے عقلی بدیہیات یقینی معلوم ہو رہے ہیں، لیکن کیا عجب کہ عقل سے ماورا بھی کوئی ادراک کرنے والی قوت ہو کہ جب وہ ظاہر ہو تو عقلی چیزوں کا اعتبار ختم ہو جائے- یہ ضرور ہے کہ ہمارے سامنے وہ مافوق العقل مدرک آشکار نہیں ہے، لیکن اس کے آشکار نہ ہونے کی وجہ سے اس کے امکان کو جھٹلایا تو نہیں جاسکتا- اس کے بعد غزالی کے نزدیک عقلی بدیہیات بھی قابل اعتبار نہ رہ سکے-غزالی کے اس شبہے کو ''خواب'' کے تصور نے اور تقویت پہنچا دی- کیوں کہ ہم خواب میں بہت سی چیزوں کو اصلی تصور کرتے ہیں، لیکن جونہی آنکھ کھلتی ہے وہ سب کے سب خیالات وخرافات معلوم ہوتے ہیں-غزالی نے کہا یہ ممکن ہے کہ یہ حالت بیداری بھی، ایک طرح کا خواب ہو، جس کے ٹوٹنے کے بعد اس حالت کی غیر واقعی حقیقت واضح ہوگی- شاید یہ خواب موت سے ٹوٹ جائے- غالباً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کی طرف اس حدیث میں اشارہ فرمایا ہے-

''لوگ سوئے ہوئے ہیں، جب موت آئے گی بیدار ہو جائیں گے-''

الناس نیام فاذا ماتو، انتبهوا.

کشف محتاج برہان نہیں: امام غزالی کے اوپر یہ بے یقینی، سفسطہ اور لاادریت دو مہینے تک

طاری رہی- پھر رفتہ رفتہ اعتدال کی طرف لوٹے اور ''بدیہیات عقلی'' پر اعتماد بحال ہوگیا- اور بقول غزالی ایسا صرف مشیت ربانی اور عطائے وہاب سے ہوا، نہ کہ کسی دلیل یا برہان سے- کیوں کہ ان کے پاس کوئی ایسی چیز بچی ہی نہیں تھی جو دلیل و برہان بن سکتی- وہ تو مکمل لاادریت کی کیفیت سے دوچار تھے- وہ ایک ربانی نور تھا جسے قدرت نے قلب غزالی پر اتارا تھا اور وہی نور لاادریت سے علم کی طرف اور ظلمت سے روشنی کی طرف پلٹنے کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا سبب ٹھہرا- اسی سے غزالی نے ''کشف'' کے برحق اور معتمد ہونے کو ثابت کیا-فرماتے ہیں:

''جسے یہ گمان ہو کہ ''کشف'' دلائل پر موقوف ہے، وہ اللہ کی وسیع رحمت کا دائرہ تنگ کرنا چاہتا ہے- جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد خداوندی: **فمن يرد الله ان يهديه يشرح صدره للاسلام**'' (الانعام: ۱۲۵) میں ''شرح'' کے بارے میں سوال ہوا تو آپ نے فرمایا: ''وہ ایک نور ہے جسے اللہ دل میں اتارتا ہے-'' عرض کیا گیا: اس کی علامت کیا ہے؟ فرمایا: ''**التجا فی عن دار الغرور و الانابة إلیٰ دار الخلود**'' اس خانۂ پر فریب سے گریز اور دارالبقا کی طرف رجوع'' (المنقذ من الضلال، ص: ٦)

متکلمانہ مباحث ناکافی: امام غزالی کو جب عطائے ربانی اور نور سبحانی سے بدیہیات عقلی میں اعتبار و یقین حاصل ہوگیا تو اس کے بعد وہ دیگر معلومات اور عقائد و افکار کی تصحیح کی طرف متوجہ ہوئے- ان کے سامنے ادراک حقائق کے چار بڑے مسالک تھے- ۱- طریقۂ متکلمین، ۲- طریقۂ باطنیہ، ۳- طریقۂ فلاسفہ اور ۴- طریقۂ صوفیہ- امام غزالی نے باری باری چاروں طریقوں کا گہرا مطالعہ کیا اور ہر ایک راستے سے اپنی مراد تک پہنچنے کی کوشش کی-

سب سے پہلے طریقہ متکلمین کا مطالعہ کیا-فرماتے ہیں:

''میں نے علم الکلام سے شروع کیا، اسے حاصل کیا اور سمجھا، اس فن کے محققین کی کتابیں پڑھیں، اس میں کتابیں لکھیں، میں نے پایا کہ یہ علم اپنے مقصد کو پورا کر رہا ہے، لیکن میرے لیے ناکافی ہے-'' (ص: ۸)

اس کی وجہ غزالی نے یہ بتائی کہ متکلمانہ مباحث اسلام میں نو پیدا افکار و عقائد کی تصحیح کے لیے ہیں، ان کی بنیاد کتاب و سنت، اجماع یا تقلیدی احکام ہیں، ان مباحث سے کتاب و سنت کے ماننے والوں کے افکار کی تصحیح تو کی جاسکتی ہے لیکن جسے عقلی بدیہیات کے سوا کسی چیز پر اعتماد

ہی نہ ہو، اس کے لیے یہ مباحث اور یہ دلائل قطعاً ناکافی ہیں۔

تردید کے لیے اعلیٰ درجے کی تحقیق ضروری: علم الکلام کے بعد علم الفلسفہ کی باری تھی۔غزالی سے پہلے علمائے اسلام میں بہت تھوڑے حضرات نے ادھر توجہ دی تھی، لیکن ان کی وہ توجہ بالکل ناکافی تھی، علمائے متکلمین کا مقصد فلسفہ کے مطالعے سے صرف فلسفیانہ مباحث کی تردید تھی، اس لیے وہ صرف مطالعہ برائے تردید کے عادی تھے۔غزالی نے اس روش کو ناپسند کیا۔ بقول غزالی:

''جب تک کوئی شخص کسی بھی علم کی چوٹی تک نہیں پہنچ جاتا، اس کے فساد وضرر سے واقف نہیں ہوسکتا۔ اسے اس علم کی فاضل ترین شخصیت کے درجے تک پہنچنا چاہیے، پھر آگے بڑھ کر ایک درجہ اور بلندی پر پہنچنا چاہیے تاکہ اس فن کی وہ غلطیاں اس پر واضح ہوں جو اس کے امام پر واضح نہ ہوسکی تھیں۔اس کے بعد ہی اس فن کے فساد کے سلسلے میں اس کا دعویٰ برحق ہوسکے گا۔کسی مسلک کا رد، اس کے فہم اور اس کی حقیقت کے ادراک سے پہلے تاریکی میں نشانہ سادھنے کے ہم معنی ہے۔''

ان رد المذهب قبل فهمه و الاطلاع على كنهه رمي في عماية.

ریاضیات سے پیدا شدہ دو غلط فہمی: امام غزالی نے پہلے علوم فلسفہ کو تقسیم کیا۔ان کے مطابق علوم فلسفہ کی یہ چھ قسمیں ہیں: ۱۔ ریاضی (Mathemetics)، ۲۔منطق (Logic)، ۳۔طبیعیات (Physics)، ۴۔ الٰہیات (Metaphisics)، ۵۔ سیاسیات (Politics) اور ۶۔ اخلاقیات (Ethics)۔غزالی نے سب سے پہلے ریاضیات کا تجزیہ کیا۔ان کے مطابق ریاضیات کا تعلق دینی امور کے اثبات وانکار سے بالکل ہی نہیں ہے۔ یہ برہانی اور یقینی امور ہیں۔ ریاضیات میں کسی طرح کا کوئی شبہ نہیں ہے۔ یہ ایک علاحدہ دنیا ہے جس کا ادراک ریاضیات کو پڑھنے کے بعد ہو جاتا ہے۔

لیکن غزالی کہتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ ریاضیات کی دنیا الگ ہے اور مذہب کی دنیا الگ۔ مذہب کے اثبات وانکار سے ریاضیات کا کوئی تعلق نہیں۔لیکن ہوتا یہ ہے کہ لوگ علوم فلسفہ میں ریاضیات کو الگ کرکے نہیں دیکھ پاتے اور انھیں یہ غلط فہمی ہوجاتی ہے کہ جس طرح ریاضیات قطعیت پر مبنی ہے اسی طرح غلطی سے وہ فلاسفہ کی ان ساری باتوں کو بھی قطعی سمجھنے لگتے ہیں جن کا تعلق وہم وگمان سے ہے۔ اس طرح ریاضیات نادانوں کے لیے بالواسطہ طور پر گمراہی کا باعث

بن جاتا ہے جو یہ نہیں سمجھتے کہ ایک فن کا ماہر دوسرے فن میں حماقتیں بھی کرسکتا ہے۔

لكل ضاعة اهل بلغوا فيها رتبة البراعة و السبق، و ان كان الحمق و الجهل قد يلزمهم في غيرها۔

غزالی کہتے ہیں کہ فلسفے کی وجہ سے دین کو بے وقعت کرنے کی حماقت اسلام کے بعض جاہل دوستوں نے بھی کی ہے۔ وہ یہ کہ انھوں نے جب فلسفہ کی گمراہیاں دیکھیں تو غلطی سے وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ سارے فلسفیانہ علوم گمراہ کن ہیں، حتیٰ کہ انھوں نے ریاضیات سے بھی دشمنی مول لی اور اس چیز کو جب ریاضیات کے ماہرین نے دیکھا تو انھیں یہ گمان ہوگیا کہ دین سائنس کی قطعی باتوں کے بھی مخالف ہے۔

دین کے تعلق سے یہ احمقانہ فریضہ آج بھی اسلام کے نادان دوست انجام دے رہے ہیں۔

منطق دین کا مخالف نہیں: امام غزالی کا منطق کے بارے میں بھی یہی خیال ہے کہ منطق کا تعلق دین کے اثبات یا انکار سے قطعاً نہیں ہے۔ ہاں! غزالی منطق سے پیدا ہونے والی اس گمراہی کے قائل ہیں کہ اس فن کے ماہرین نے نتیجے کی قطعیت کے لیے جو شرطیں رکھی ہیں ان کو صحیح طور پر الٰہیات میں وہ نہیں نبھا پاتے اور اس طرح تاریکی ان کا مقدر بنتی ہے اور اس سے عوام یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ جب مناطقہ دین مخالف باتیں کہہ رہے ہیں تو وہ باتیں غلط کیسے ہوسکتی ہیں؟

کائنات زیر دست قدرت ہے: طبیعیات Physics کے بارے میں غزالی کی رائے ہے کہ یہ علم اس کائنات سے اسی طرح بحث کرتا ہے جس طرح فن طب جسم کے احوال سے بحث کرتا ہے۔تو جس طرح طب کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے کا تعلق دین کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے نہیں ہے، اسی طرح طبیعیات کے اقرار یا انکار کو بھی دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہاں! طبیعیات کے بعض مسائل ایسے ہیں جن میں فلاسفہ نے اپنی حدیں توڑ دی ہیں اور وہ یہ بھول گئے ہیں کہ کائنات اپنے خالق کے دست قدرت میں ہے۔ یہی ایک موٹی بات نہ سمجھنے کی وجہ سے تخلیق وتکوین کائنات سے متعلق بعض امور میں فلاسفہ اپنی حدیں توڑ کر آگے بڑھ گئے۔

الٰہیات (Metaphysics) میں فلاسفہ کا تساہل: غزلی کا خیال ہے کہ فلاسفہ نے الٰہیات میں بہت ٹھوکریں کھائیں اور اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ نتیجے کی قطعیت کے لیے فن منطق میں انھوں نے جو اصول بنائے تھے، الٰہیات میں پورے طور سے انھیں نبھا نہ سکے۔غزالی کے مطابق

الٰہیات میں فلاسفہ کی غلط فہمیوں کو موٹے طور پر بیس حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، جن میں تین گمراہیاں ایسی ہیں جن کے قائل کی تکفیر کی جائے گی اور وہ یہ ہیں:

۱- اجسام کا حشر نہیں ہوگا، ثواب وعذاب صرف روحانی ہوگا-

۲- اللہ کو صرف کلیات کا علم ہے، جزئیات کا نہیں-

۳- کائنات ازلی اور قدیم ہے-

غزالی نے انہی بیسوں مسائل کی تحقیق وتردید کے لیے **تہافت الفلاسفہ** لکھی تھی-

رجال کی شناخت حق سے ہوتی ہے: غزالی نے علوم فلسفہ میں اخلاقیات سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فلاسفہ کی اخلاقی تعلیمات، زمانہ قدیم کے انبیا، صالحین اور صوفیہ کے اقوال و احوال سے ماخوذ ہیں- اس لیے فلاسفہ کی ان تعلیمات کو صرف اس لیے رد نہیں کیا جاسکتا کہ وہ فلاسفہ کی زبانوں سے ہم تک پہنچ رہی ہیں- یہ ہمارے ضعیف دماغوں کا حال ہے جو فلاسفہ کی ساری باتوں کو آنکھ بند کرکے رد کردیتے ہیں- مثال کے طور پر کوئی نصرانی **لا الہ الا اللہ عیسی روح اللہ** کہتا ہے تو وہ چراغ پا ہوجاتے ہیں اور وہ یہ نہیں سمجھتے کہ وہ شخص اس قول کی وجہ سے کافر نہیں ہے بلکہ نبوت محمدی کے انکار کی وجہ سے کافر ہے- یہ وہ لوگ ہیں جو حق کی شناخت رجال سے کرتے ہیں، رجال کی شناخت حق سے نہیں کرتے- جب کہ عقل مند آدمی سرور عاقلاں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی پیروی کرتا ہے جن کا فرمان ہے: حق کی شناخت رجال سے مت کرو، بلکہ حق کو پہچانو، اہل حق کو پہچان لوگے-

لا تعرف الحق بالرجال بل اعرف الحق تعرف اهله.

عقل مند آدمی پہلے حق کی معرفت حاصل کرتا ہے، پھر کسی بات کو دیکھتا ہے، اگر وہ صحیح ہے تو اسے تسلیم کرلیتا ہے، خواہ اس کا قائل حق پرست ہو یا گمراہ- بلکہ بسا اوقات وہ گمراہوں کی باتوں میں سے اچھی باتوں کو الگ کرنے کی کوشش کرتا ہے کیوں کہ اسے معلوم ہے کہ مٹی سے سونا بھی نکلتا ہے- (**المنقذ من الضلال**، ص: ۱۴)

عوام کو گمراہوں کی کتابیں پڑھنے سے روکنا چاہیے: امام غزالی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ فلاسفہ کی اخلاقی تعلیمات یکسر غلط نہیں ہیں بلکہ ان میں بعض قیمتی جواہر پارے بھی بکھرے پڑے ہیں- وہ یہ بھی تاکید کے ساتھ کہتے ہیں کہ کسی بات کو صرف اس لیے رد نہیں کیا جاسکتا کہ کہنے والا غلط

تھا، لیکن اس کے ساتھ وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ عامی کو گمراہوں کی کتابیں نہیں پڑھنا چاہیے، کیوں کہ رفتہ رفتہ یہ ہوگا کہ اچھی باتوں کے ساتھ ملی ہوئی وہ بعض گمراہیوں کو بھی بھلی تصور کرنے لگے گا اور اس طرح وہ جادۂ اعتدال سے بہک جائے گا- غزالی کے الفاظ ہیں:

''تیراکی سے ناواقف شخص کو سمندر کے ساحل سے روکا جائے گا، ماہر تیراک کو نہیں، اسی طرح بچے سے سانپ کو الگ رکھا جائے گا اس سے نہیں جو سانپ پکڑنے کی مہارت رکھتا ہو-''

غزالی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بھی کہتے ہیں کہ ''اکثر لوگوں کو اپنی ذہانت و فطانت کا غرہ ہے- اس لیے کوشش کی جائے کہ حتی الامکان اہل ضلال کی کتابوں کے مطالعے کا دروازہ بند ہو-'' (**المنقذ**، ص: ۱۴)

واضح رہے کہ یہ باتیں عام حالات کے لیے ہیں ورنہ ایک محقق اور تحقیق کار کے لیے غزالی مکمل معروضیت کے قائل ہیں- وہ اس بات کے قائل ہیں کہ جب تک کسی بھی مکتب فکر کا گہرائی سے مطالعہ نہیں کیا جاتا اس کا رد ممکن نہیں- اس کا ذکر پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے-

عقل ناکافی ہے: عقلی علوم/ فلسفیانہ علوم کے گہرا مطالعہ اور تحقیق وتجزیہ کے بعد امام غزالی اس نتیجے پر پہنچے کہ عقل زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے اور حقیقت سے پردہ اٹھانے میں ناکافی ہے- چوں کہ ریاضیات اور منطق محکم اصولوں پر مبنی ہیں لیکن ان کا تعلق دین کے اثبات وانکار سے نہیں ہے- طبیعیات احوال کائنات سے بحث کرتی ہے جس طرح طب احوال ابدان سے بحث کرتا ہے، اس لیے اس کا تعلق بھی مذہب کی حقیقت سے نہیں ہے- صرف الٰہیات کے مباحث ایسے ہیں جن کا تعلق مذہب کے بنیادی اصولوں سے ہے، لیکن غزالی کے بقول فلاسفہ اس میں منطقی اصولوں کی پابندی سے قاصر رہے- شاید اس لیے کے مابعد الطبیعیاتی امور میں منطقی انداز فکر کامیاب نہیں ہے- اس لیے آخر میں غزالی اس نتیجے پر پہنچے کہ عقل ادارک حقائق میں ناکافی ہے- ان کے الفاظ ہیں:

''جب میں علم فلسفہ کے مطالعے، اس کے سمجھنے اور اس کی گمراہیوں کو اجاگر کرنے سے فارغ ہوا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ فلسفہ بھی میرے مقصد کو پورا کرنے سے قاصر ہے اور عقل تمام حقائق کے ادراک سے عاجز ہے-''

ان العقل ليس مستقلا بالاحاطة بجميع المطالب.

کب گمراہیوں کو پیش کرکے ان کا رد کرنا درست ہے؟: امام غزالی کے عہد میں مسلمانوں کا

ایک طبقہ باطنیہ کا تھا، جن کا خیال تھا کہ ادراک حقیقت اور فہم شریعت کے سلسلے میں صرف امام معصوم کا قول حجت ہوسکتا ہے- لوگ اس کے لیے امام معصوم کے محتاج ہیں، جو امام نظروں سے غائب ہیں- وہ ایک دن ضرور سامنے آئیں گے، کتاب وسنت کے نصوص کے سلسلے میں وہ جو تفہیم کریں گے وہ شک سے ماورا اور قابل اعتماد ہوگی- غزالی نے لکھا ہے کہ یہ طبقہ اپنی غلط فہمیوں پر رفتہ رفتہ دلیر ہوتا گیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس عہد میں جو لوگ ان کا رد کرتے تھے، ان کا طرز استدلال بہت ہی کمزور تھا- غزالی سے ایک شخص نے بتایا کہ باطنیہ یا اہل تعلیم اپنے خلاف لکھی ہوئی تحریروں کو پڑھتے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں- امام غزالی نے محسوس کیا کہ باطنیہ کے رد میں جو تحریریں آ رہی ہیں وہ اس لیے باطنیہ کے لیے نا قابل التفات ہیں کہ ان کے لکھنے والے نہ صحیح طور پر باطنیت کو سمجھتے ہیں اور نہ ہی باطنیت کے علم برداروں کے دلائل کو سمجھتے ہیں- اس لیے ان کی باتیں بے وزن ہوتی ہیں- غزالی نے فلسفیانہ علوم وفنون سے فراغت کے بعد باطنیت کی طرف توجہ کی اور اس کو گہرائی سے سمجھنے کی کوشش کی- پھر جب ان کی فکری بے اعتدالیاں غزالی پر واضح ہوگئیں تو غزالی نے ایک ایک کرکے ان کے شبہات اور دلائل کو ترتیب وار پیش کیا اور پھر ان کا جواب دیا- غزالی کی یہ روش ان کے بعض معاصرین کو ناگوار گزری اور انھوں نے یہ کہا کہ غزالی نے باطنیہ کے دلائل کو مرتب اور علمی انداز سے پیش کرکے ایک طرح سے باطنیت کو عام کیا ہے- کیوں کہ کل تک جو لوگ باطنیت پسندوں کے دلائل سے واقف نہیں تھے، غزالی نے انھیں ان سے واقف کرا دیا- غزالی کے ان مخالفین نے اپنی بات کو مضبوط کرنے کے لیے امام احمد ابن حنبل کا حوالہ دیا کہ جب حارث محاسبی نے معتزلہ کے رد میں کتاب لکھی تو امام احمد ابن حنبل نے اسے پسند نہیں فرمایا- حارث محاسبی نے کہا ''گمراہی کا رد فرض ہے'' تو امام احمد ابن حنبل نے فرمایا: ''جی ہاں! لیکن تم نے پہلے ان کے شبہات کو بیان کیا ہے، پھر ان کا جواب دیا ہے- اب وہ شخص جس نے صرف شبہات کا مطالعہ کیا اور جواب کی طرف التفات نہیں کی، یا جواب پڑھا لیکن اسے سمجھ نہ سکا، اس کی عاقبت کے بارے میں تم کیسے مطمئن رہ سکتے ہو؟'' امام غزالی اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''امام احمد ابن حنبل کی بات درست ہے- لیکن یہ ان شبہات کے بارے میں ہے جو ابھی عام نہ ہوئے ہوں- لیکن جب شبہات عام ہو جائیں تو ان کا جواب دینا ضروری ہے اور جواب

اسی وقت ممکن ہے جب اعتراضات پورے نقل کر دیے جائیں- ہاں! اپنی طرف سے ایسا شبہ پیش نہیں کرنا چاہیے جسے مخالفین نے خود بھی پیش نہ کیا ہو- اور میں نے ایسا نہیں کیا ہے- بلکہ میں نے ان شبہات کو ایک شخص سے سنا جو میرے پاس آتا جاتا تھا- پھر یہ ان سے ملا اور ان کے مسلک کو اختیار کر لیا اور اس نے بتایا کہ جو لوگ ان کے خلاف لکھتے ہیں وہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں، کیوں کہ رد کرنے والے اب تک ان کے دلائل کو ہی نہیں سمجھ سکے ہیں- پھر اس نے مجھ سے ان کے دلائل کو بیان کیا- اس لیے میں نے نہیں چاہا کہ میرے اوپر بھی طعنہ کسا جائے کہ میں نے ان کے دلائل کو نہیں سمجھا- چنانچہ میں نے ان کے شبہات و دلائل کو پیش کیا- مجھے یہ بھی پسند نہیں تھا کہ کوئی یہ گمان کرتا کہ میں نے صرف ان کے دلائل سنے، انھیں سمجھ نہیں سکا- اس لیے میں نے ان اعتراضات کو صاف صاف بیان کیا-'' (**المنقذ من الضلال**، ص: ۱۷)

مخالف کی ہر بات نہیں ٹھکرانی چاہیے: امام غزالی نے لکھا ہے کہ باطنیہ کے رد میں جو لوگ کتابیں لکھ رہے تھے، باطنیہ ان سے اپنی اصلاح کرنے کی بجائے اور غالی اور متشدد ہوتے جا رہے تھے- اس کی وجہ یہ تھی کہ رد کرنے والے باطنیہ کے ان باتوں کو بھی رد کر رہے تھے جو بجائے خود درست تھیں- مثال کے طور پر باطنیہ کا قول تھا کہ انسانی عقل پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ عقلیں باہم مختلف ہیں- اس لیے علم کے لیے ضروری ہے کہ ایسا معلم ہو جو بالکل معصوم ہو- باطنیہ کی یہ بات اپنے آپ میں مضبوط تھی اور ان کا رد کرنے والے ان کے اس دعوے کا بھی رد کر رہے تھے- اس لیے وہ ایسی باتیں پڑھ کر اپنے تشدد اور غلو میں اور بڑھتے جا رہے تھے- غزالی تردید میں سلیقہ مندی کے قائل تھے، جو اسی وقت ممکن ہے جب مخالف کی بات غور سے سنی جائے، اسے سمجھا جائے، اس کی معقول باتوں کا اعتراف کیا جائے اور اس کی غلط فہمیوں کو احسن طریقے سے واضح کیا جائے، اگر ایسا نہ کیا گیا تو غزالی کے خیال میں تردید فائدہ مند ہونے کے بجائے نقصان دہ ہو جائے گی اور مخالف اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے کی بجائے اس میں اور دلیر ہو جائے گا-

غزالی فرماتے ہیں کہ باطنیہ کی یہ بات بالکل درست ہے کہ تعلیم کے لیے امام معصوم کی ضرورت ہے- امام معصوم کے ہم بھی قائل ہیں، اور وہ امام معصوم پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں- رہی یہ بات کہ وہ ہمارے بیچ میں نہیں ہیں تو باطنیہ کے امام بھی تو غائب ہیں- ان کے بیچ موجود نہیں ہیں- اور رہی یہ بات کہ جن مسائل میں پیغمبر کی تصریح نہ ہو، اس میں

کیا ہوگا؟ تو یہ اعتراض تو باطنیہ کے اوپر بھی وارد ہوگا اور اس کا حل ان کے پاس نہیں ہے جب کہ ہمارے پاس اس کا حل موجود ہے اور وہ حل حضرت معاذ بن جبل کا ارشاد ہے جس کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے سراہا تھا- معاذ ابن جبل نے کہا تھا کہ میں مسائل کا حل سب سے پہلے کتاب اللہ میں تلاش کروں گا، اس میں نہیں پایا تو سنت رسول میں تلاش کروں گا اور اگر اس میں بھی نہیں پایا تو اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا- ہاں! یہ درست ہے کہ اجتہاد میں خطا کا امکان ہے-لیکن اگر اجتہاد مخلصانہ ہوتو خطا کرنے پر بھی مجتہد ایک اجر کا مستحق ہوگا جیسا کہ احادیث میں وارد ہے-

صوفیہ کی راہ ایمان کی راہ ہے: کلام، فلسفہ اور باطنیت کی تہوں میں پہنچ کر جب غزالی تشنہ و نامراد واپس ہوئے تو صوفیہ کے طریقے کا مطالعہ شروع کیا- ان کے بقول صوفیہ کا طریقہ علم اور عمل سے مکمل ہوتا ہے- انھوں نے پہلے ابوطالب مکی کی قوت القلوب، حارث محاسبی کی تصوف سے متعلق کتابیں اور جنید بغدادی، شبلی، ابو یزید بسطامی وغیرہ کبار صوفیہ کی منتشر تحریروں اور حالات کا مطالعہ کیا- اور تعلیم وتعلم سے تصوف اور صوفیہ کو جاننا جہاں تک ممکن تھا جانا، لیکن پھر خیال ہوا کہ نشہ اور بھوک کی تعریف وتحدید الگ ہے، لیکن خود ان کا احساس اور تجربہ بالکل ہی الگ ہے- چنانچہ غزالی نے سلوک اور ذوق کی راہ اختیار کی اور نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ذات خداوندی، نبوت اور آخرت پر کامل ایمان ویقین کی دولت گراں مایہ حاصل ہوگئی- غزالی فرماتے ہیں کہ ایمان کے یہ تینوں اصول میری روح میں رچ بس گئے-لیکن کسی دلیل کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایسے اسباب، احوال اور تجربات کی وجہ سے جو شمار سے باہر ہیں-

فهٰذه الاصول الثلاثة من الايمان كانت قدر سخت في نفسي، لا بدليل معين محـرر بـل باسباب و قرائن و تجارب لا تدخل تحت الحصر تفاصيلها- (المنقذ من الضلال، ص: ۲۱)

راہ سلوک کنج نشینی چاہتی ہے: صوفیہ کے راستے کو اختیار کرنے اور توحید، نبوت اور یوم آخرت پر حتمی یقین پیدا ہونے کے بعد غزالی کو احساس ہوا کہ آخرت کی سعادت تقویٰ پر مبنی ہے- اور تقویٰ اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب دنیا سے دل کو توڑ دیا جائے اور اسے آخرت سے جوڑ دیا جائے انھوں نے اپنے حال کا تجزیہ کیا تو خود کو غیر ضروری امور سے وابستہ پایا- اس میں ان کی

نیت بھی آخرت طلبی کی بجائے دنیا طلبی پر مبنی تھی- اس لیے انھوں نے سب کچھ چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا- ایک طویل اندرونی کشمکش کے بعد رخت سفر باندھا اور علما و حکام کے ہزار روکنے کے باوجود بغداد کو خیر باد کہہ دیا- دو سال تک شام میں مقیم رہے- خلوت میں ذکر وفکر اور مجاہدہ و ریاضت کرتے دن گزارتے- پھر حج کا شوق پیدا ہوا اور حرمین شریفین کا سفر کیا اور دوسرے شہروں میں گئے- اکثر اوقات خلوت میں ریاضت ومجاہدہ میں بسر ہوتے-تقریباً دس سال تک کنج نشینی کا یہ سفر جاری رہا-

طریقہ صوفیہ کی عظمت: دس سالوں تک مجاہدے کے بعد امام غزالی کو صوفی مسلک پر کامل اعتماد ہوگیا- اور نہ صرف اس پر اعتماد ہوگیا بلکہ اس کی انھیں وہ ایمان وایقان حاصل ہوا جس کی نعمت ان سے چھن گئی تھی- وہ بھی اس شان سے کہ ان کا ایمان تقلیدی کے بجائے ایک طرح کا تجرباتی ایمان ہوگیا- لکھتے ہیں:

''خلوت کے ان ایام میں ایسے ایسے راز کھلے جن کا شمار کرنا ناممکن ہے، فائدے کے لیے صرف اتنا ذکر کرتا ہوں کہ مجھے یقین سے معلوم ہوگیا کہ صرف صوفیہ ہی راہ خدا کے صحیح مسافر ہیں- ان کی سیرت سب سے اچھی، ان کا راستہ سب سے بہتر اور ان کے اخلاق سب سے ستھرے ہیں- بلکہ اگر دانشوروں کی دانش، حکما کی حکمت اور علمائے شریعت کے علم کو جمع کر دیا جائے اور ان سے صوفیہ اپنے اخلاق کو بدل کر بہتر کرنا چاہیں تو ایسا ان کے لیے ممکن نہ ہوگا- صوفیہ کے تمام ظاہری اور باطنی حرکات وسکنات مشکوٰۃ نبوت سے مقتبس ہیں اور نور نبوت کے سوا روئے زمین پر کوئی ایسا نور نہیں ہے جس سے روشنی حاصل کی جاسکے- خلاصۂ کلام یہ کہ کوئی بھلا اس طریقے کے بارے میں کیا کلام کرے گا جس کی پہلی شرط طہارت، دل کو ماسوی اللہ سے مکمل پاک کر لینے سے عبارت ہے اور جس کی کنجی، جس کی حرمت نماز کی سی ہے، دل کو پورے طور سے ذکر الٰہی میں محو کر دینے کا نام ہے اور جس کی انتہا کلی طور پر اللہ میں فنا ہو جانا ہے- اور فنا آخری منزل صرف اس اعتبار سے ہے کہ وہ کسب واختیار کی آخری منزل ہے ورنہ حقیقت میں وہ اس سفر کا آغاز ہے اور اس سے پہلے کے جو درجات ہیں ان کی حیثیت صرف دہلیز کی ہے-

راہ سلوک کے آغاز کے ساتھ ہی مکاشفات ومشاہدات کی شروعات ہو جاتی ہے- یہاں تک کہ وہ حالت بیداری میں فرشتوں اور انبیا کی روحوں کو دیکھتے ہیں- وہ ان کی آوازیں سنتے ہیں اور

ان سے فوائد حاصل کرتے ہیں- پھر صور و امثال کے مشاہدے سے ترقی ہوتی ہے اور سالک ان بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے جن کی تعبیر سے بیان قاصر ہے- اگر کوئی ان احوال کو بیان کرنا چاہے تو اسے ایسے الفاظ کا سہارا لینا پڑے گا جن کا استعمال غلط ہے اور ان سے بچنا اس کے لیے ناممکن-

قصہ مختصر! یہ کہ معاملہ اس قرب تک پہنچتا ہے جسے ایک گروہ حلول خیال کرتا ہے، ایک دوسرا طبقہ اسے اتحاد گمان کرتا ہے اور ایک تیسرا طبقہ اسے وصول باور کرتا ہے جب کہ یہ ساری باتیں غلط ہیں- ان کے غلط ہونے کو ہم نے اپنی کتاب **المقصد الاسنیٰ** میں بیان کیا ہے- جسے یہ احوال طاری ہوں اسے صرف اتنا کہنا چاہیے کہ جو کچھ ہوا اسے میں بیان نہیں کر سکتا- تم بس اسے اچھا گمان کرو اور اس کے بارے میں سوالات مت کرو-

و کان ما کان مما لست اذکره　　فظن خیراً و لا تسأل عن الخبر

(المنقذ من الضلال، ص: ۲۳)

ولایت کا فہم، نبوت کے فہم کی کنجی ہے: امام غزالی اپنے مطالعہ و تحقیق اور تلاش و جستجو کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ایمانیات کے فہم کے لیے عقلی ذرائع ناکافی ہیں، عقلی علوم سے اشتباہ حاصل ہوگا جب کہ شرعی علوم سے ایک مومن کے لیے تفصیلات سے آگاہی ہوگی- لیکن نفس ایمان کا حصول نہ شرعی علوم سے ممکن ہے اور نہ ہی عقلی علوم سے- ایمانیات کے واقعی ادراک کا راستہ صرف کشف کا راستہ ہے، جو صوفیہ کا راستہ ہے- غزالی کا ماننا ہے کہ جب کوئی شخص صوفیہ کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو اسے حقیقت ولایت کا ادراک ہوتا ہے اور یہی چیز نبوت کے فہم کی کنجی بنتی ہے- کیوں کہ جو شخص ولایت کو نہیں سمجھ سکتا وہ نبوت کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا اور نبوت کو سمجھے بغیر ایمان کے دوسرے حصوں کو سمجھنا ناممکن ہے- اس لیے کہ نبوت ہی مفتاح احکام شریعت ہے- تمام عقائد و احکام پر ایمان، ایمان بالنبوۃ پر مبنی ہے- غزالی حقیقت ولایت کی عظمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حاصل کلام یہ کہ جسے ذوق کے ذریعے احوال صوفیہ کی نعمت حاصل نہ ہو وہ نام کے سوا نبوت کی حقیقت سے واقف نہیں ہوسکتا- اولیا کی کرامتیں یقینی طور پر کمالات نبوت کے ادنیٰ درجے ہیں-'' (**المنقذ من الضلال، ص**: 23)

نبوت مفتاح الغیوب ہے: حقیقت نبوت کے ذیل میں امام غزالی نے لکھا ہے کہ انسان بالکل سادہ لوح، ہر شے سے بے خبر ہوتا ہے- پھر رفتہ رفتہ اس کے اندر حواس پیدا ہوتے ہیں-

الاحسان-1

سب سے پہلے لمس کی قوت پیدا ہوتی ہے، پھر بصارت آتی ہے، پھر سماعت پیدا ہوتی ہے- پھر ذائقہ کی قوت پیدا ہوتی ہے- تقریباً سات سال کی عمر میں قوت تمیز پیدا ہوتی ہے، جس سے انسان کو بھلے برے کا ادراک ہوتا ہے، جس کا ادراک حواس نہیں کر سکتے- اس کے بعد انسان دولت عقل سے سرفراز ہوتا ہے جس سے وہ واجب، ممکن اور محال جیسے عقلی امور کو سمجھتا ہے- غزالی کا ماننا ہے کہ معروف مدرکات/ ذرائع علم کے سوا بھی ایسا ذریعہ علم ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو عطا کرتا ہے- وہ ایسا ذریعہ علم ہے جس کے آنے کے بعد آنکھوں سے سارے حجابات اٹھ جاتے ہیں- ماضی، حال و مستقبل سب کچھ نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے- غیوب مشہود بن جاتے ہیں- امام کے الفاظ ہیں:

''عقل سے ماورا ایک اور ذریعۂ ادراک ہے جو آدمی کو ایک ایسی آنکھ دے دیتا ہے جس سے وہ عالم غیب کا مشاہدہ کرتا ہے، مستقبل کے حالات اور دیگر امور اس کے سامنے ہوتے ہیں- عقل ان باتوں کے ادراک سے اسی طرح عاجز ہے جس طرح قوت تمیز، معقولات کے ادراک سے عاجز ہے، یا جس طرح حواس قوت تمیز سے معلوم ہونے والی باتوں کے ادراک سے قاصر ہیں- صاحب تمیز شخص پر اگر عقلی چیزوں کو پیش کیا جائے تو ان کا انکار کر بیٹھتا ہے اور انھیں ناممکن تصور کرتا ہے- اسی طرح بعض ارباب عقل نبوت سے حاصل ہونے والی معلومات کا انکار کرتے ہیں اور اس کو ناممکن خیال کرتے ہیں- یہ عین جہالت ہے- کیوں کہ ان کی دلیل صرف یہ ہے کہ اس ذریعۂ علم تک ان کی رسائی نہیں ہے- اب جو قوت ان میں موجود نہیں ہے، وہ سرے سے اس قوت کا ہی انکار کر بیٹھتے ہیں-'' (المنقذ من الضلال، ص: ۲۵)

''نبوت اس ذریعہ علم کا نام ہے جس سے ایک آنکھ پیدا ہوتی ہے، جس آنکھ میں ایسا نور ہوتا ہے جس کی روشنی میں غیب بے حجاب ہو جاتا ہے-'' (ایضاً)

عقل کا دائرہ کار: امام غزالی نبوت کو مافوق العقل ایک ذریعہ ادراک سمجھتے ہیں اور ان کے خیال میں نبوت کا کام امراض قلب کا علاج ہے- ان کا کہنا ہے کہ انسان جسم اور قلب سے مرکب ہے- قلب سے ان کی مراد حقیقت روح ہے جو معرفت الٰہی کا محل ہے- اس قلب کے علاج سے عقل قاصر ہے- کیوں کہ عقل سے اس قلب کے احوال معلوم نہیں ہو سکتے- اب ایسے میں لامحالہ امراض قلب کے علاج کے لیے نبی کی ضرورت ہے جس طرح امراض جسم کے علاج کے لیے

طبیب کی حاجت ہے- سوال یہ ہے کہ پھر قلب کے معاملات میں عقل کا کیا رول ہے؟ کیا یہ معاملات یکسر عقل سے پرے ہیں؟ امام غزالی اس کا جواب دیتے ہیں:

''حاصل کلام: انبیا علیہم السلام امراض قلب کے طبیب ہیں- عقل کا فائدہ اور اس کا کام یہ ہے کہ اس نے یہ حقیقت سمجھائی اور نبوت کی تصدیق کی گواہی دی اور نبوت سے حاصل ہونے والی معلومات کے ادراک سے اپنی عاجزی کا اعتراف کیا اور اس نے ہمارا ہاتھ پکڑ کر پیغمبر کے حوالے کر دیا جیسے اندھوں کو ان کے رہنماؤں کے حوالے اور پریشاں حال مریضوں کو مشفق طبیبوں کے حوالے کیا جاتا ہے- یہی عقل کی جولان گاہ اور منتہیٰ ہے- وہ اس کے آگے کے مراحل کے ادراک سے عاجز ہے-'' (المنقذ من الضلال، ص: ۴۸)

بے عملی باطنی کفر ہے: نبوت پر ایمان اور شریعت کی تصدیق کرنے کے باوجود شرعی احکام میں تساہلی اور سستی ایک عام مرض ہے، جس میں عوام سے خواص تک اور جہلا سے علما تک ملوث ہیں- جب مجاہدہ اور اعتکاف کے دس سال پورے ہوگئے اور امام غزالی بے انتہا فیوضات ربانیہ اور انوار الٰہیہ سے مستفیض ہوگئے تو ان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ شرعی احکام میں اس قدر تساہل کیوں برتا جاتا ہے؟ اسی سوال نے غزالی کے اندر اصلاح وتجدید کا ذوق بیدار کیا اور ایک بار پھر اپنے عہد کے عظیم مصلح نے احکام اسلامی کی تجدید واحیا کی نیت سے خلوت کو الوداع کہا اور جلوت کی زندگی پھر سے اختیار کی- اس سلسلے میں امام غزالی نے مختلف طبقے سے تعلق رکھنے والے متعدد افراد سے یہ سوال کیا:

''تم احکام شریعت کے اتباع میں تساہلی کیوں برتتے ہو؟ اگر تمھیں آخرت پر ایمان ہے اور پھر بھی تم اس کی تیاری کرنے کے بجائے اسے دنیا کے عوض بیچ رہے ہو تو یہ حماقت ہے- کیوں کہ جب تم ایک کے بدلے دو چیزیں نہیں بیچتے ہو تو پھر چند دنوں کے عوض ایک غیر متناہی زندگی کو کیوں بیچ رہے ہو؟ اور اگر تمھیں آخرت پر یقین نہیں ہے تو پھر تم کافر ہو- اپنی جان کو ایمان کی طلب میں وقف کر دو اور اپنے کفر خفی کا سبب تلاش کرو جو تمھارا باطنی مذہب ہے، جس کی وجہ سے تم ایسی جسارت کرتے ہو، اگر چہ تم اپنے اس باطنی مذہب کا اظہار نہیں کرتے- ایمان کا دکھاوا کرتے ہو اور شریعت کا دم بھرتے ہو-'' (المنقذ من الضلال، ص: ۲۹)

غزالی نے ہر طبقے کے افراد سے یہ سوال کیا اور مختلف افراد نے مختلف طریقے سے عذر لنگ

پیش کیا- غزالی میدان میں آئے اور اصلاح کا بیڑا اٹھایا، عوام وخواص کی روش پر اپنی مختلف کتابوں جیسے **القسطاس المستقیم**، کیمیائے سعادت، **المنقذ من الضلال** وغیرہ میں گفتگو کی اور ان کی رگ بیمار کو پکڑنے اور نسخۂ کیمیا تجویز کرنے کی پوری کوشش کی-

حقیقی علم اور حقیقی علما: مذکورہ سوال کے جواب میں بعض عوام نے غزالی کو یہ الٹ پٹا جواب دیا کہ:

''شریعت کی پابندی تو علما کو زیادہ کرنی چاہیے جب کہ فلاں مشہور فاضل بے نمازی ہے، فلاں عالم شراب پیتا ہے، فلاں اوقاف کا مال کھاتا ہے، فلاں عالم بادشاہ کی چاپلوسی کرتا ہے اور حرام کاری کرتا ہے، فلاں عالم قضا اور گواہی کے معاملے میں رشوت لیتا ہے اور اس طرح کی بہت ساری مثالیں ہیں-''

امام غزالی اس کا جواب تین طریقے سے دیتے ہیں:

۱- ایسے آدمی سے یہ کہنا چاہیے کہ تم فلاں عالم کے بارے میں یہ کہہ رہے ہو کہ وہ حرام کھاتا ہے- بات یہ ہے کہ جس طرح وہ عالم اس حرام کی حرمت کو جانتا ہے تم بھی شراب، سور کے گوشت اور سود کی حرمت کو جانتے ہو، بلکہ غیبت، جھوٹ، چغل خوری کی حرمت کو بھی جانتے ہو اور ان گناہوں کا ارتکاب بھی کرتے ہوے- اس لیے نہیں کہ ان کے گناہ ہونے پر تمھارا ایمان نہیں ہے بلکہ اس لیے کہ شہوت تم پر حاوی ہوگئی ہے- اس عالم کے اندر بھی وہ شہوت ہے جو اس پر حاوی ہے- اس میں اور تم میں صرف فرق یہ ہے کہ وہ اس کے علاوہ دوسری باتوں کو بھی جانتا ہے، جن کا تعلق اس گناہ سے روکنے سے نہیں ہے-

۲- عام آدمی سے یہ کہا جائے کہ وہ عالم اپنے علم کو سرمایۂ آخرت سمجھتا ہے اور یہ گمان کرتا ہے کہ اس کا علم قیامت میں شفیع بن کر اسے بچالے گا- اس کی وجہ سے اس کے اندر اتباع شریعت میں تساہل آجاتا ہے- حالاں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ علم اس کے لیے بلندی درجات کا سبب بننے کی بجائے اس کے خلاف حجت بن جائے- لیکن بہرحال یہ ممکن ہے کہ عالم، عمل کے بغیر بھی اپنے علم سے نفع اٹھا سکے- لیکن تم عام آدمی ہو، اگر تم اسی عالم کو دیکھتے ہوئے بے عمل رہ گئے تو تمھاری بدعملی تمھیں ہلاک کر دے گی اور تمھارا کوئی شفیع نہ ہوگا-

۳- صحیح جواب یہ ہے کہ حقیقی عالم لغزش کے سوا گناہ کا مرتکب نہیں ہوسکتا اور گناہ پر اصرار تو

کر ہی نہیں سکتا- کیوں کہ علم حقیقی وہ علم ہے جس سے گناہ کے زہر ہلاہل ہونے کی معرفت حاصل ہوتی ہے جس سے دنیا کے بالمقابل آخرت کی اچھائی کا یقین حاصل ہوجاتا ہے- جسے یہ معرفت حاصل ہو جائے وہ اعلیٰ کو ادنیٰ کے عوض نہیں بیچ سکتا اور یہ علم ان علوم وفنون سے حاصل نہیں ہوتا جس میں اکثر لوگ لگے ہوئے ہیں- کیوں کہ وہ علوم خدا کی معصیت پر جسارت پیدا کرتے ہیں، جب کہ علم حقیقی عالم کے اندر خشیت، خوف اور امید کو بڑھاتا ہے جو اس کے اور گناہوں کے بیچ حائل ہو جاتے ہیں- ہاں! اس سے لغزشیں ہو جاتی ہیں، کیوں کہ لغزش سے کوئی بشر نہیں بچ سکتا- لیکن یہ ایمان کی کمزوری کی دلیل نہیں- مومن آزمایا جاتا ہے، پھر توبہ کرتا ہے- وہ معصیت پر اصرار کرنے اور گناہوں میں مبتلا رہنے سے بہت دور رہتا ہے-'' (المنقذ من الضلال، ص: ۳۹)

المنقذ من الضلال کے سرسری مطالعے سے یہ جواہر پارے سامنے آئے- گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو اور بھی بہت سے قیمتی ہیرے نکل سکتے ہیں، جن سے نہ صرف حجۃ الاسلام امام غزالی کے فکری نظام اور انداز نظر کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان شفاف آئینوں میں آج کی تصویر بھی دیکھی جاسکتی ہے- دراصل امام غزالی کا دور فلسفہ، باطنیت، تصوف اور متکلمانہ جدال کا دور تھا جس نے نفس دین اور حق کی معرفت کو مشتبہ کر دیا تھا- آج یہ دور پھر پلٹ آیا ہے، سائنس فلسفے کی جگہ، اباحیت پسندی باطنیت کی جگہ، درگاہیت تصوف کی جگہ اور مسلکی جنگیں متکلمانہ جدال کی جگہ پوری آب وتاب کے ساتھ ایمان ویقین کو پامال کرنے کے لیے پیش نگاہ ہیں- یہ حالات کی یکسانی ہی کہیے کہ امام غزالی کی سرگشت ''**المنقذ من الضلال**'' کو ہر قاری اپنی سرگزشت سمجھتا ہے- اس لیے اب یہ ضروری ہوگیا ہے کہ کچھ جواں عزم پھر غزالی کی طرح اٹھیں اور انفرادی طور پر نہ سہی اجتماعی طور پر ہی وہ مقدس فریضہ انجام دینے کی کوشش کریں جسے ''مشکوٰۃ نبوت'' کی روشنی میں امام غزالی نے انجام دیا- اس عظیم فریضے کی ادائیگی بڑے پیمانے پر امام غزالی کے لٹریچر کی تقسیم اور افکار کی تشہیر کے ذریعے بھی کی جاسکتی ہے-

○○○

منظر الاسلام ازہری

امام غزالی اور اصول فقہ

امام محمد بن محمد بن محمد بن احمد طوسی ابو حامد الغزالی کی پیدائش خراسان کے ایک ضلع طوس میں ۴۵۰ھ میں ہوئی- والد محترم محمد نہایت نیک طینت اور شریف انسان تھے، وفات کا وقت قریب آیا تو اپنے ایک بزرگ دوست کو کچھ پیسے دے کر وصیت کی کہ میں یہ دونوں صاحبزادے محمد اور احمد کی تعلیم کی ذمہ داری تمہارے سپرد کرتا ہوں- والد محترم کا انتقال ہوگیا مگر اس بزرگ نے ان کی وصیت پر پوری پابندی کے ساتھ عمل کیا اور دونوں بھائیوں کی تربیت میں ان کا دیا ہوا مال ومتاع صرف کر دیا- یہ اموال جب ختم ہو گئے تو بزرگ نے کہا: میں ایک عاجز انسان ہوں تمہارے والد کا دیا ہوا جو کچھ تھا تم پر خرچ کر دیا، میری اتنی استطاعت نہیں ہے کہ آگے تمہارا خرچ برداشت کرسکوں، تم لوگ کسی مدرسہ میں چلے جاؤ، تمہارے کھانے، پینے کا انتظام ہو جائے گا- دونوں بھائی تعلیم میں مصروف ہوگئے جو بعد میں ان کی بلندی اور شہرت کا سبب بنا-

امام محمد غزالی نے پہلے تو اپنے علاقہ میں ہی رہ کر کچھ تعلیم حاصل کی، اس کے بعد جرجان جا کر امام ابونصر اسماعیلی سے علم فقہ حاصل کیا- امام ابونصر اسماعیلی نے جو کچھ پڑھایا تھا اس وقت کے رواج کے مطابق امام غزالی نے اسے قلم بند کر لیا تھا، پھر طوس واپس آ گئے-

سفر کی واپسی کا دلچسپ واقعہ: امام غزالی جب وطن واپس ہو رہے تھے تو راستہ میں ڈاکوؤں نے آلیا اور جو کچھ مال ومتاع تھا سب لوٹ لیا، اس کے ساتھ امام کا لکھا ہوا وہ نوٹ بھی لٹ گیا جو انہوں نے امام ابونصر اسماعیلی کی درسگاہ میں لکھا تھا- ایک طرف تو خوف وہراس کا عالم تھا دوسری طرف اس علمی سرمایہ کے لٹ جانے کا ملال- جرأت مندانہ اقدام کرکے ڈاکوؤں کے سربراہ کے پاس گئے اور کہا برائے کرم میری وہ کاپی مجھے لوٹا دیجئے- سردار نے پوچھا اس میں کیا ہے؟ امام نے کہا وہ علم کا خزانہ ہے اسی کے لیے میں نے اپنا وطن ترک کیا اور اتنی مشقت اٹھائی

ہے- ڈاکوؤں کا سردار ہنس پڑا اور بولا: تمہارا یہ دعویٰ کیسے درست ہوسکتا ہے کہ تم نے علم کی معرفت حاصل کرلی ہے، ہم نے تم سے تمہارا نوٹ لے لیا تو تم علم سے خالی ہوگئے!!

سردار نے امام کا نوٹ واپس کردیا- اس واقعہ کا امام غزالی پر بڑا گہرا اثر پڑا، جب وہ طوس واپس ہوئے تو تین سال مکمل علم حاصل کرنے میں لگ گئے اور جو کچھ اس نوٹ میں تھا یاد کرلیا-

اب غزالی پر ایک الگ دھن سوار ہوگئی تھی اور علم سے ان کی دلچسپی جنون کی حد تک بڑھ گئی تھی ''معمولی علما ان کی تشفی نہیں کرسکتے تھے اس لیے تکمیل علوم کے لیے وطن سے نکلنا چاہا، اس زمانہ میں اگرچہ تمام ممالک اسلامیہ میں علوم فنون کے دریا بہ رہے تھے- ایک ایک شہر بلکہ ایک ایک قصبہ مدرسوں سے معمور تھا- بڑے بڑے شہروں میں سینکڑوں علما موجود تھے اور ہر ایک عالم کی درسگاہ بجائے خود ایک مدرسہ تھا، لیکن ان سب میں دو شہر علم وفن کے مرکز تھے، نیشاپور اور بغداد، کیونکہ خراسان، فارس اور عراق کے تمام ممالک میں دو بزرگ استاد الکل تسلیم جاتے تھے، یعنی امام الحرمین اور علامہ ابو اسحٰق شیرازی، اور یہ دونوں بزرگ ان ہی دونوں شہروں میں درس دیتے تھے- نیشاپور کی حالت یہ تھی کہ اسلام میں سب سے پہلا مدرسہ جو تعمیر ہوا وہ یہیں ہوا، جس کا نام، مدرسہ بیہقیہ، تھا- امام غزالی کے استاد امام الحرمین نے بھی یہیں سے تعلیم پائی تھی- عام شہرت ہے کہ دنیائے اسلام میں سب سے پہلا مدرسہ بغداد کا نظامیہ تھا، چنانچہ ابن خلکان نے بھی یہی دعویٰ کیا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ فخر بغداد کے بجائے نیشاپور کو حاصل ہے- بغداد کا نظامیہ ابھی وجود میں نہیں آیا تھا کہ نیشاپور میں بڑے بڑے دارالعلوم قائم ہوچکے تھے-'' (۱) امام غزالی کی نگاہ انتخاب مدرسہ بیہقیہ پر پڑی جہاں کے مدرس اعظم امام الحرمین عبدالملک ابوالمعالی جوینی تھے- اما الحرمین کی درسگاہ میں داخلہ لے لیا اور کم از کم چار سو طلبہ کی موجودگی کے باوجود قوت حافظہ، علمی ذوق، ذہانت وفطانت نے انہیں اپنے استاد کی کامل توجہات کا مرکز بنادیا اور نوازشات میں کوئی کمی نہیں چھوڑی یہاں تک کہ ایک ایسا وقت آیا جب استاد نے کہا:

الغزالی بحر مغدق، والکیا أسد مخرق، والخوافی نار محرق-

غزالی بھرا ہوا سمندر ہے، الکیا چیر دینے والا شیر ہے اور خوافی آتش فشاں ہے-

امام الحرمین سے غزالی نے فقہ، اصول اور علم کلام میں خوب استفادہ کیا، استاذ کی موجودگی ہی میں پڑھانے کی ذمہ داری بھی سنبھال لی- امام الحرمین کا جب انتقال ہوگیا تو علم وحکمت کے

دوسرے مراکز بغداد، حجاز، دمشق، بیت المقدس کا سفر کیا اور ہر جگہ علوم وفنون سے خوب سیرابی حاصل کی، ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کا کام بھی کرتے رہے- ۴۸۴ھ میں بغداد آئے تو اپنی علمی مہارت اور جولانی فکر کی وجہ سے مدرسہ نظامیہ بغداد کے مدرس اعظم کی حیثیت سے منتخب ہوگئے-

امام غزالی کے شاگرد امام محمد بن یحیٰ امام غزالی کی تعریف میں کہتے ہیں وہ ثانی شافعی ہیں-

علامہ اسعد میہنی نے کہا: غزالی کی معرفت، علم اور فضل تک وہی شخص پہنچ سکتا ہے جو عقل میں کمال کی منزل تک پہونچ چکا ہو-

امام سبکی نے کہا: انسان کی علمی بلندی وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو خود اس معیار تک پہنچ سکا ہو... امام غزالی علم وحکمت کے ایسے شیر تھے کہ دوسرے سارے شیر ان کے سامنے تھرا اٹھتے تھے اور منھ چھپائے پھرتے اور ایسے بدر کامل تھے جو دن کو روشنی بخشتا ہے- (۲)

امام غزالی نے اسلامی علوم کی تمام شاخوں پر کامل دسترس حاصل کیا مگر خصوصیت کے ساتھ، فکر وفلسفہ، تصوف، کلام اور فقہ واصول میں اپنی پہچان بنائی- تذکرہ نگاروں نے سینکڑوں صفحات ان کی حیات پر قلمبند کیے ہیں، میں اپنی اس تحریر میں اصول فقہ میں امام صاحب کی مہارت کا تذکرہ خصوصیت کے ساتھ کروں گا-

امام غزالی کی لگ بھگ پانچ سو تصنیفات ہیں- اصول فقہ میں ان کی ''**تهذيب الاصول**'' ''**المستصفى من علم الاصول**'' ''**شفاء الغليل في بيان مسالك التعليل**'' ''**المكنون في الاصول**'' اور ''**المنخول**'' خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں-

ان کتابوں میں امام غزالی کی اصولی شان، محققانہ نظر، اور آزاد فکری بڑی واضح نظر آتی ہے- اصول فقہ کے مختلف پہلوؤں پر دل کھول کر بحث کی ہے- کتاب اللہ، سنت، اجماع اور قیاس کی بحثوں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے- قطع نظر اس سے کہ ''المنخول'' کی نسبت امام غزالی کی طرف کرنے میں بعض محققین نے شک کا اظہار کیا ہے تاہم ان کے شبہ پر کوئی ٹھوس دلیل نہیں ہے اور امام غزالی کی طرف اس کی نسبت میں بھی کوئی شک نہیں، جیسا کہ خود ''المستصفی'' میں ان کی عبارت سے مستفاد ہے اور جس کی توضیح ابن السبکی نے بھی ''طبقات الشافعیۃ'' میں کردی ہے- اس کتاب کے اصولی مباحث میں غزالی نسبتاً کم آزاد معلوم ہوتے ہیں اور کہیں کہیں تعصب کی پوری پوری جھلک بھی نظر آتی ہے- مثلاً امام اعظم ابوحنیفہ کے بارے میں یہ لکھ دیا کہ وہ فقیہ

اور مجتہد نہیں (۳)....اور امام مالک کے نظریہ ''مصالحہ مرسلہ'' پر تنقید کرتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ انہوں نے امت کی ایک تہائی کا قتل کر دیا ہے-(۴)

''المنخول'' میں امام غزالی اپنے استاذ امام الحرمین کے افکار سے زیادہ قریب ہیں، اس کی وجہ محققین کے نزدیک ''المنخول'' کی ابتدائی ایام میں تالیف ہے جبکہ ''المستصفی'' میں ان کی محققانہ شان بہ حیثیت ایک آزاد محقق نظر آتی ہے اور اصولی مباحث پر جب بحث کی ہے تو نہ مذہب کی پرواہ کی اور نہ استاد کی، جو کچھ حق سمجھ میں آیا لکھتے چلے گئے- کسی بھی مسئلہ کو صرف چھیڑنے کی حد تک نہیں چھوڑا بلکہ اس کا پورا پورا حق ادا کر دیا-

اصول فقہ میں امام غزالی کا طریقہ کار

جس طرح اہل حدیث کے نزدیک مغاربہ اور مشارقہ کی اصطلاح کا ایک خاص مفہوم ہے اور دونوں مدارس کے محدثین کا اپنا اپنا طریقہ ہے، اسی طرح اہل اصول کے نزدیک دو طریقے رائج ہیں- اول متکلمین کا اور دوسرا احناف کا طریقہ کار- متکلمین اصول فقہ میں علم کلام کے نہج پر بحث کرتے ہیں- فروع سے زیادہ اصول پر ان کی توجہ ہوتی ہے- معتزلہ، شوافع، مالکیہ- اس طریقہ سے زیادہ مشہور ہیں- احناف کا طریقہ کار اس کے برعکس ہے، وہ فروع کی روشنی میں اصول کی تعیین کرتے ہیں- ائمہ احناف بالخصوص امام اعظم رضی اللہ تعالی عنہ نے جن مسائل کی توضیح کی ہے، بعض کے اصول تو خود بیان کر دیے ہیں اور بعض صرف مسائل کی حد تک ہے اور متاخرین احناف نے ان فروع کی روشنی میں اصول وضع کیا- یہی وجہ ہے کہ احناف کی اصولی کتابوں میں قواعد ذکر کرنے کے بعد کئی ایک فروع کا ذکر کیا جاتا ہے-

امام غزالی شافعی المذہب اور اشعری المعتقد ہیں اس لیے وہ اپنے طرز بیان میں اپنے اسلاف کے پیروکار ہیں- دیگر فنون کی طرح اصول فقہ میں بھی امام غزالی کا نام اتنا نمایاں ہوا کہ دنیا نے انہیں اصول فقہ کا امام تسلیم کر لیا بلکہ ان چار محققین علما میں شمار کرنے لگی جنہیں اصول فقہ کا مرجع تصور کیا جاتا ہے-

وکان واحدا من أربعة علیهم يقوم الأصول والیهم ترجع معظم مصنفاته التی شاعت وذاعت وهم:

۱- القاضی عبد الجبار المعتزلی فی کتابه العمد-

۲- ابو الحسین البصری فی کتابه المعتمد والذی شرح به العمد-

۳- امام الحرمین الجوینی فی کتابه البرهان-

۴- الغزالی فی کتابه المستصفی- (۵)

غزالی ان چار علما میں سے ایک ہیں جن سے اصول فقہ کا قیام ہے اور اصول فقہ میں لکھی گئی اکثر کتابیں انہیں کتابوں کا خلاصہ ہیں- ان چار علما کے اسمائے گرامی یہ ہیں (۱) قاضی عبد الجبار معتزلی جو العمد کے مصنف ہیں (۲) ابو حسین بصری جو المعتمد کے مؤلف ہیں (۳) امام الحرمین الجوینی جو البرهان کے مصنف ہیں (۴) اور امام غزالی جو المستصفی کے مصنف ہیں-

المستصفی کے مقدمہ پر نظر پڑتے ہی غزالی کی اصولی شان جھلکنے لگتی ہے اور اس کی ترتیب اتنی انیق ہے کہ طالب علم دیکھتے ہی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ اصول فقہ کی وادی اجتہاد میں قدم رکھنے والا ہے- مقدمہ کے ایک اقتباس کا خلاصہ آپ بھی ملاحظہ کیجئے- امام غزالی نے علم کی تین قسمیں کی ہیں:

۱- عقلی جن کے سیکھنے پر شریعت نہیں ابھارتی ہے مثلا حساب، ہندسہ، نجوم وغیرہ..

۲- نقلی مثلاً علم حدیث، تفسیر... ان علوم اور ان کے امثال کے سیکھنے کی مصیبتیں بھی کم ہیں کیونکہ اس میں ہر بڑا اور چھوٹا برابر حیثیت کا مالک ہوتا ہے اور اس لیے بھی کہ نقل کے لیے قوت حافظہ ہی کافی ہے، اس میں عقل کی کوئی گنجائش نہیں-

۳- علم فقہ اور اصول فقہ- سب سے اعلی علم وہ ہے جس میں عقل اور سماع کا امتزاج ہو، فکر اور شرع کا حسین سنگم ہو- علم فقہ اور اصول فقہ اسی آخری قسم میں سے ہے، نہ تو وہ محض عقلی تصرف کا نام ہے کہ شریعت کے نزدیک وہ غیر مقبول ہو جائے اور نہ ہی وہ محض تقلید کا مجموعہ ہے کہ جس میں عقل کی کوئی تائید و توفیق شامل ہی نہ ہو- یہی وجہ ہے کہ علم فقہ اور اصول فقہ کے حامل علما کی شان بھی بڑی بلند ہوتی ہے، یہی دنیا و آخرت کی پونجی بھی ہے، اسی وجہ سے میں نے بھی اپنی عمر کا ایک حصہ اور اپنی جوانی کا وقت اس علم میں صرف کیا اور فقہ و اصول میں کئی کتابیں تصنیف کی-... پھر مجھ سے چند شائقین اصول فقہ نے اس علم میں تصنیف کا مطالبہ کیا جس کی ترتیب بڑی اچھی ہو- میں نے ان کے مطالب کا جواب دیا

، میں نے ایک بہترین ترتیب کے ساتھ اس علم میں تالیف کرنے کا ارادہ کرلیا، اس کی ترتیب اتنی دلفریب ہے کہ دیکھنے والا پہلی ہی نظر میں اس علم کے تمام مقاصد سے آگاہ ہوجائے گا... ملخصا (۶)

اصول فقہ کی تعریف: امام غزالی نے عام اصولی کی طرح ''اصول'' اور ''فقہ'' کی تعریف الگ الگ کی ہے اور پھر ایک ساتھ دونوں کی تعریف کی ہے، لکھتے ہیں:

الفقه: عبارة عن العلم والفهم فی أصل الوضع، يقال: فلان يفقه الخير والشر أی يعلـه ويفهمه، ولكن صار بعرف العلماء عبارة عن العلم بالأحكام الشرعية الثابتة لأفعال المكلفين خاصة -(۷)

فقہ اصل وضع میں علم اور فہم سے عبارت ہے- کہا جاتا ہے فلاں خیر اور شر کو جانتا اور سمجھتا ہے- مکلفین کے افعال کے لیے خاص طور پر ثابت شدہ احکام شرعیہ کے علم کا نام اصول فقہ ہے-

اصول فقہ: عبارة عن أدلة هذه الأحكام وعن معرفة وجوه دلالتها علی الاحكام من حيث الجملة لا من حيث التفصيل- (۸)

اصول فقہ احکام شرعیہ کے دلائل اور بالاجمال احکام پر اس کی دلالت کے طریقے کا نام ہے-

اصول فقہ میں غزالی کا اجتہاد

اہل اصول کے ضمن میں ہم نے ذکر کیا ہے کہ چار ایسے علما ہیں جن کو اصول فقہ کا بنیادی ستون مانا جاتا ہے- غزالی ان میں سے ایک ہیں- یہ بات محض دعوی کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ اس کی اپنی ایک معنوی حیثیت بھی ہے جو ان کی اصولی کتابوں میں جگہ جگہ نظر بھی آتی ہے- مستصفی کے تمہیدی کلمات سے ہی اس دعوی کی تصدیق ہوتی ہے کہ غزالی نے اصول کے مباحث کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے جن میں تیسرا خالص ان کا اجتہاد ہے- چنانچہ اہل اصول کا نظریہ ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

اعلم أنك اذا فهمت أن نظر الأصولی فی وجوه دلالة الأدلة السمعية علی الأحكام الشرعية، لم يخف عليك أن المقصود معرفة كيفية اقتباس الأحكام من الأدلة فوجب النظر فی الأحكام، ثم فی الأدلة وأقسامها، ثم فی كيفية

اقتباس الأحكام من الأدلة، ثم فی ثقات المقتبس الذی له أن يقتبس الأحكام، فان الأحكام ثمرات، وكل ثمرة فلها صفة وحقيقة فی نفسها، ولها مثمر، ومستثمر، وطريق فی الاستثمار-

والثمرة هی الأحكام، أعنی الوجوب والحظر والندب والكراهة والاباحة، والحسن والقبح، والقضاء والأداء، والصحة والفساد، وغيرها-

والمثمر هی الأدلة، وهی ثلاثة: الكتاب والسنة، والاجماع، فقط.

وطرق الاستثمار هی وجوه دلالة الأدلة، وهی أربعة: اذ الأقوال اما أن تدل علی الشئی بصيغتها ومنظومها، أو بفحواها ومفهومها، أو باقتضائها وضرورتها، أو بمعقولها ومعناها المستنبط منها-

والمستثمر هو المجتهد، ولا بد من معرفة صفاته، شروطه وأحكامه، فاذا جملة الأصول تدور علی أربعة أقطاب:

القطب الأول: فی الأحكام، والبدائة بها أولی لأنها الثمرة المطلوبة.

القطب الثانی: فی الأدلة، وهی الكتاب والسنة، والاجماع، وبها التثنية اذ بعد الفراغ من معرفة الثمرة لا أهم من معرفة المثمر.

القطب الثالث: فی طريق الاستثمار، وهو وجوه دلالة الأدلة وهی أربعة: دلالة بالمنظوم، ودلالة بالمفهوم، ودلالة با لضرورة والاقتضاء، ودلالة بالمعنی المعقول-

القطب الرابع: فی المستثمر، وهو المجتهد الذی يحكم بظنه، ويقابله المقلد الذی يلزمه اتباعه، فيجب ذكر شروط المقلد والمجتهد وصفاتهما. (۹)

آپ نے جب احکام سے متعلق ادلہ سمعیہ کی دلالت کے طریقوں میں اصولی کے نظریات جان لیا تو آپ پر یہ بھی پوشیدہ نہیں رہنا چاہئے کہ اس سے مقصود دلائل سے احکام کے اقتباس اور استخراج کے طریقہ کی معرفت ہے، لہٰذا احکام میں غور فکر ضروری ہے، پھر دلائل اور اس کے اقسام میں غور وفکر کی ضرورت ہے، اس کے بعد دلائل سے احکام کے استخراج کے طریقوں میں غور وفکر کی ضرورت ہے، پھر جو شخص احکام کا استخراج کرے گا، اس کے اوصاف کو جاننے کی ضرورت

ہے کیونکہ احکام نتیجہ (ثمرۃ) سمجھے جاتے ہیں اور ہر نتیجہ کی اپنی کچھ نہ کچھ صفت اور حقیقت ہوتی ہے، اس نتیجہ کا کوئی ماخذ (مثمر) بھی ہوتا ہے، اس سے فائدہ اٹھانے (مستثمر) والا ہوتا ہے اور فائدہ اٹھانے (استثمار) کے طریقے بھی ہوتے ہیں-

نتیجہ سے مراد احکام ہیں، یعنی واجب، حظر، ندب، کراہت، اباحت، حسن و قبح، قضاء واداء، صحیح اور فاسد وغیرہ..

ماخذ (مثمر) سے مراد دلائل ہیں اور ان کی صرف تین قسمیں ہیں: کتاب، سنت، اور اجماع-

دلائل سے احکام کے اقتباس اور استخراج کے (طرق الاستثمار) طریقے سے مراد دلائل کا مسائل یا احکام پر دلالت کرنے کا طریقہ ہے اور یہ چار طرح کے ہیں: اس کی وجہ یہ ہے کہ اقوال کی دلالت کسی چیز پر یا تو اپنے صیغے اور الفاظ کے طور پر ہوگی، یا اس کے مضمون و مفہوم کے طریقہ پر یا اس کی اقتضا اور ضرورت کے طریقہ پر یا اس سے سمجھ میں آنے والے مسائل اور اس سے مستنبط ہونے والے معنی پر اس کی دلالت ہوگی- (لہٰذا یہ صرف چار طریقے ہوئے)

فائدہ اٹھانے والا (مستثمر) سے مراد مجتہد ہے، اس لیے اس کے صفات، اس کی شرطیں اور اس کے احکام کا جاننا ضروری ہے- لہٰذا آپ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اصول فقہ اجمالی طریقہ سے چار قطبوں کے ارد گرد گھومتا ہے:

قطب اول: احکام پر مشتمل ہیں..

قطب دوم: کتاب، سنت، اجماع کے دلائل ہیں..

قطب ثالث: احکام کے استخراج کے طریقوں پر مشمل ہے- اس کی چار قسمیں ہیں (۱) لفظ کی دلالت (۲) مفہوم کی دلالت (۳) ضرورت و اقتضاء کی دلالت (۴) معنی معقول کے ذریعہ دلالت-

قطب چہارم: مستثمر یعنی مجتہد کے احکام پر مشتمل ہے، اس کے بالمقابل مقلد ہیں جس پر اتباع اور تقلید ضروری ہے لہٰذا مقلد اور مجتہد کی شرطیں اور ان کے صفات کا ذکر بھی ضروری ہے-

مذکورہ اقتباس کو بغور پڑھئے تو امام غزالی کی شان اجتہاد بڑی واضح نظر آتی ہے اور اس کا مرجع خاص طور پر قطب ثالث ہے، جس میں انہوں نے دلائل سے احکام کے استخراج کے

طریقوں کا بیان کیا ہے- اہل اصول کے نزدیک دیگر تین قسمیں تو آپ کو ملیں گی مگر اس تیسری قسم کا کوئی ذکر نہیں جبکہ اصول فقہ میں احکام کے استخراج کے طریقوں کی معرفت کا کلیدی رول ہے- غزالی کی یہ ایسی خصوصیت ہے جسے ان کے ازلی رقیب ابن رشد نے بھی اپنے مخصوص انداز میں اعتراف کیا، وہ اپنی کتاب مختصر المستصفی میں لکھتے ہیں

فأما أجزاء هذه الصناعة بحسب ما قسمت اليه فى هذا الكتاب فأربعة أجزاء، فالجزء الأول يتضمن النظر فى الأحكام، والثانى فى أصول الأحكام، والثالث فى الأدلة المستعملة فى استنباط حكم عن أصل وكيف استعمالها، والرابع يتضمن النظر فى شروط المجتهد وهو الفقيه.

وأنت تعلم مما تقدم من قولنا فى غرض هذه الصناعة، وفى أى فى الجزء الثالث من هذا الكتاب، لأن أجزاء الأخرى من جنس المعرفة التى غايتها العمل، ولذلک لقبول هذه الصناعة باسم بعض ما جعلوه جزء لها، فدعوها بأصول الفقه، والنظر الصناعى يقتضى أن يفرد هذا القول فى هذا الجزء الثالث اذهو مباين بالجنس لتلک الأجزاء الأخرى..(۱۰)

مستصفی کی تقسیم کے اعتبار سے اصول فقہ کے چار اجزاء ہیں، پہلا جز احکام میں غور وفکر پر مشتمل ہے، دوسرا جز اصول احکام پر، تیسرا جز کسی بھی دلیل سے کسی بھی حکم کا استنباط کرنے میں جو دلائل استعمال کیے جاتے ہیں اور اس کے استعمال کرنے کے طریقے پر مشتمل ہے اور چوتھا مجتہد یعنی فقیہ کی شرطوں میں غور وفکر سے متعلق ہے-

میری بیان کردہ باتوں سے آپ اتنا ضرور سمجھ چکے ہوں گے کہ اصول فقہ کے مقاصد کیا ہیں اور کس علم کے تحت یہ داخل ہے اور یہ کہ کتاب کا تیسرا جز خاص توجہ کا طالب ہے کیونکہ دوسرے اجزاء کا تعلق ان معارف سے ہے جس کا مقصد عمل ہے..

ابن رشد کی ان عبارتوں پر اپنی طرف سے کچھ تبصرہ کیے بغیر استاذ محترم علامہ ڈاکٹر علی جمعہ کا یہ تجزیہ اور تبصرہ ملاحظہ کیجئے:

وابن رشد هنا ينبهناالى خصيصة هامة تميز به المستصفى فى خطة التصنيف عن بقية مصنفات الأصول، حتى تلک التى أتت بعد ابن رشد واعتمدت على

المستصفى كمدرسة الامام فخر الدين الرازى فى كتابه المحصول وأتباعه كصاحب الحاصل والتحصيل والمنهاج.

وقضية استثمار الأحكام هى القضية الشاغلة للغزالى فى القطب الثالث من المستصفى، وعبر عنه ابن رشد بالنظر الثالث وهى واضحة تمامافى ترجمه لهذا القطب وأبوابه وفصوله، هذا الوضوح الذى لا نجده للأسف بنفس الدرجة فى أشهر مدارس الأصول، والتى نتبعها الى يومنا، وهى مدرسة المحصول.

فهذا القطب ترجمه الغزالى بكيفية استثمار الأحكام من مثمرات الأصول، ويشتمل على صدر ومقدمة وثلاثة فنون...وهذه المباحث وان كانت مذكورة فى مدرسة المحصول وفروعه وفى كتب الفن عامة الا أنه لايشملها قطب واحد كما فى المستصفى، وليس هذا مجرد عنوان اختفى بل تحول بدليل...(11)

ابن رشد اپنی اس تحریر میں مستصفی کی اہم خصوصیت کا بیان کر رہے ہیں، ایسی خصوصیت جس سے اصول فقہ کے موضوع پر لکھی جانے والی تمام کتابوں سے اس کا امتیاز نمایاں ہوجاتا ہے، حتی کہ ابن رشد کے بعد آنے والے علما کی کتابوں کا اعتماد بھی مستصفی پر ہی نظر آتا ہے مثلا دبستان امام رازی جن کی اپنی ایک پہچان ہے، کا اعتماد بھی مستصفی پر نظر آتا ہے، اس کی بڑی دلیل رازی کی کتاب المحصول ہے- یونہی ان کی پیروی کرنے والے علما مثلا صاحب حاصل والتحصیل اور صاحب منہاج بھی اسی روش پر ہیں -دلائل کے استعمال کا طریقہ غزالی نے اپنی کتاب کے اقطاب میں تیسری قطب میں بیان کیا ہے جس کو ابن رشد نے نظر ثالث سے تعبیر کیا ہے اور اس کی اہمیت اس کے قطب کے ابواب اور فصلوں میں ذکر کی جانے والی بحثوں سے پوری طرح واضح ہے- جس وضاحت کے ساتھ مستصفی میں ان چیزوں کا بیان ہے افسوس کی بات ہے کہ اتنی وضاحت کے ساتھ اصول فقہ کی مشہور دبستان یعنی المحصول جس کی آج ہم اتباع کرتے ہیں، میں بھی نہیں ملتی- یہ قطب جس میں غزالی نے قواعد سے احکام کے استخراج کے طریقوں کا ذکر کیا ہے ایک تمہید، مقدمہ اور فنون پر مشتمل ہے- یہ بحثیں گرچہ دبستان محصول، اس کی شاخوں اور اس فن کی عام کتابوں میں موجود ہیں مگر مستصفی کی طرح ایک قطب میں یکجا موجود نہیں- یہ صرف دعوی نہیں بلکہ اس کی دلیل بھی موجود ہے..

یہاں مناسب ہے کہ اصول فقہ کے بعض ان مسائل کا ذکر کروں جہاں غزالی ایک آزاد محقق اور اصولی کی حیثیت سے نمایاں نظر آتے ہیں، گرچہ ان مسائل کے بعض گوشے ایسے ہیں جو قابل تامل اور محل نظر ہیں مگر میں کسی فیصل کی حیثیت سے ان کا مطالعہ نہیں کر رہا ہوں -ان مسائل کو ذکر کرنے کا مقصد صرف غزالی کی مجتہدانہ فکروں کو سامنے لانا ہے، تاہم کہیں کہیں ان کے بعض ایسے نظریات کی طرف تنبیہ ضرور کروں گا جو بظاہر خود ان کی فکروں سے متعارض نظر آئے گی-

۱-حسن وقبح

اصول فقہ کے اہم مباحث میں سے ایک ''حسن و قبح'' یعنی اچھائی اور برائی کا مسئلہ ہے- اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہماری زندگی میں شب و روز ایسے مسائل آتے رہتے ہیں جن میں کسی کو ہم اچھا سمجھتے ہیں اور کسی کو برا- مثال کے طور پر کوئی شخص چوری کرلیتا ہے تو اسے ہمارے معاشرہ میں برا سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس نے ایک برا کام کیا- کوئی شراب پیتا ہے تو اسے برا سمجھا جاتا ہے کیونکہ شراب پینا معاشرہ میں برا سمجھا جاتا ہے، اس نے ایک برا کام کیا لہذا لوگ اسے برا کہتے ہیں- یونہی کسی نے کسی کے احسان کے بدلے اس کا شکریہ ادا کرلیا، یا پابندی کے ساتھ نماز پڑھتا ہے، غریبوں کی مدد کرتا ہے، جھگڑا، لڑائی، جھوٹ، زنا سے پرہیز کرتا ہے تو ایسے شخص کی معاشرہ میں تعریف کی جاتی ہے کیونکہ یہ سارے اچھے کام ہیں اور ایسا کرنے والا یقیناً ایک اچھا انسان ہے-مگر سوال یہ ہے کہ اس اچھائی یا برائی کا علم ہمیں کس طرح ہوا؟ کیا ہمارے غور وفکر کرنے کی وجہ سے ہم نے اس کی اچھائی یا برائی کو جان لیا یا شریعت نے ہمیں بتایا کہ یہ چیزیں اچھی ہیں تو ہم نے مان لیا اور بری ہے تو ہم نے اس کی برائی تسلیم کرلی؟ اس سوال کے جواب میں علمائے اصول کے دو مختلف نظریات ہیں - پہلا نظریہ معتزلہ، ماتریدیہ اور بعض اشاعرہ کا ہے- ان علما کا ماننا ہے کہ اچھائی اور برائی کا تعلق عقل سے ہے- بعض چیزیں ایسی ہیں جن کی اچھائی یا برائی کا علم عقلا بلا غور وفکر کے ہوجاتا ہے، مثلا ڈوبتے ہوئے ہوا شخص کو بچالینا، کسی نے کچھ دیا تو اس کا شکریہ ادا کرلینا وغیرہ-

دوسرا نظریہ اشاعرہ اور امام شافعی کے متبعین یعنی امام جوینی، رازی اور غزالی وغیرہ کا ہے- اس نظریہ کا ماننا ہے کہ صدق و کذب، شکر و ناشکری اور اچھائی و برائی کا تعلق شریعت سے ہے- شریعت نے جسے اچھا کہا وہ اچھا ہے اور جسے برا کہا وہ برا ہے- امام غزالی اس نظریہ کے ایک بڑے مؤید کی حیثیت رکھتے ہیں، انہوں نے اپنی اصولی کتابوں بالخصوص ''المنخول'' اور ''مستصفی''

میں اس مسئلہ پر بڑی تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور اپنے مخالفین کا رد کیا ہے- ان کی بحث کا خلاصہ درج ذیل ہے-

امام غزالی نے ''حسن وقبح'' کے معانی میں تین اصطلاحات بیان کی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:

ا-عام لوگوں کی اصطلاح میں فاعل کی غرض اور اس کے مقصد کے موافق جو کام ہو اسے ''حسن'' یعنی اچھا کہا جاتا ہے- جو ان کی غرض اور مقصد کے مخالف ہو اسے ''قبح'' یعنی برا کہا جاتا ہے، اور اگر کوئی کام ایسا ہو جو کرنے والے کے نہ موافق ہو اور نہ مخالف تو اسے ''عبث'' یعنی بیکار کہتے ہیں-

۲-شریعت نے جس کام کی تعریف کی وہ ''حسن'' یعنی اچھا ہے-غرض اور قصد سے اس کا کچھ تعلق نہیں ، لہٰذا اللہ تعالی کے تمام افعال ''حسن'' ہیں خواہ وہ کسی کے غرض کے موافق ہو یا مخالف- اس بنیاد پر شریعت نے جس چیز کو مندوب یا واجب کہا وہ چیز ''حسن'' ہوگی اور ''مباح'' ''حسن'' میں داخل نہیں ہوگا-

۳- کوئی شخص بھی کچھ کر رہا ہے تو اس پر ''حسن'' کا اطلاق کیا جائے گا، اس اعتبار سے ''مباح'' کے کرنے کا جب حکم ہوگا تو وہ حسن ہوجائے گا اور اللہ تعالی کا فعل ہر حال میں حسن رہے گا-

غزالی کہتے ہیں ''حسن و قبح'' کے یہ تینوں اضافی معانی ہیں، ان کا تعلق موافقت اور مخالفت سے ہے- اگر شریعت کا ورود نہیں بھی ہوتا تو موافقت اور مخالفت سے اس کو طے کرلیا جاتا کیونکہ یہ اضافی صفات ہیں اور اس سے ہمیں کوئی اختلاف نہیں- اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ جھوٹ کو بذات خود برا کہنا کس حد تک معقول ہے اور صدق کو بذات خود اچھا کہنا کس قدر درست ہے- یعنی اچھائی برائی کا تعلق شریعت سے نہیں بلکہ عقل سے ہے-غزالی حسن و قبح کو عقلی تسلیم کرنے والوں کے بعض دلائل کی طرف اشارہ کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ آپ کے ان دلائل سے بحث کے تین زاویے سمجھ میں آتے ہیں: (ا) ''قبح'' کسی چیز کی ذاتی صفت ہے-(۲) اہل دانش اس کی برائی یا اچھائی سے بدیہی طور پر واقف ہیں- (۳) اہل دانش کسی بات پر متفق ہوجائیں تو وہ واقعی طور پر حجت ہے اور یہ اس کے بداہت کی دلیل ہے-

امام غزالی یہ تین مقدمے قائم کرکے ہر ایک کا الزامی جواب دیتے ہیں-

''قبح'' کو وصف ذاتی ٹھہرانا تحکم اور غیر معقول ہے، کیونکہ قتل ان کے نزدیک بذات خود اس وقت برا فعل ہے کہ مقتول کو بلا عوض قتل کردیا گیا ہو اور اس سے کوئی ایسی چیز صادر نہیں ہوئی ہو جس سے اسے قتل کا مستحق سمجھا جاسکے- یہاں تک کہ جانوروں کو تکلیف دینا اور انہیں ذبح کرنا بھی جائز ہوگا اور اللہ تعالی کے لیے یہ کوئی بری بات نہیں کیونکہ وہ آخرت میں اس کے بدلے ثواب عطا کرے گا-قتل کی اپنی ذات کے اعتبار سے صرف ایک حقیقت ہے، اس سے کوئی مطلب نہیں کہ مقتول نے کسی جنایت کا ارتکاب کیا یا نہیں یا یہ کہ اس کے بعد آخرت کی کسی لذت سے شاد کام ہوگا - وہ ہر حال میں قتل ہے ، ہاں اگر فوائد اور اغراض کا اعتبار کیا جائے اور اس کی طرف اس کی نسبت کی جائے تو یہ باتیں درست ہوسکتی ہیں- اسی طرح ''جھوٹ'' کا بذات خود برا ہونا کیسے تصور کیا جاسکتا ہے جبکہ اگر کوئی ظالم شخص کسی نبی کے قتل کرنے کا اگر ارادہ رکھتا ہو تو اس کی نگاہ سے بچانے کے لیے اور اس نبی کی حفاظت کی غرض سے جھوٹ بولنا جائز ہے بلکہ ایسی صورت میں جھوٹ بولنا واجب ہے ، اگر جھوٹ نہیں بولے گا تو گنہگار ہوگا!! اگر یہ بذات خود صفت ہے تو حالات کے بدلنے سے اس میں تبدیلی کیسے آگئی؟

اہل دانش کو اس کی اچھائی اور برائی کا علم ہونا ایک بدیہی امر ہے، یہ بھی ہمیں تسلیم نہیں- ہم (اور اشاعرہ کی پوری جماعت) اس مقدمہ میں بھی آپ سے اختلاف رکھتے ہیں جبکہ بدیہی چیزوں میں عقلا کی اتنی بڑی تعداد کا اختلاف نہیں ہوتا...

تیسرے مقدمہ کا الزامی جواب دیتے ہوئے غزالی کہتے ہیں کہ ہم تھوڑی دیر کے لیے یہ تسلیم کرلیتے ہیں کہ اہل دانش کا جھوٹ کی برائی اور سچ کی اچھائی پر اتفاق ہے تو بھی یہ حجت نہیں کیونکہ یہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اس اتفاق پر مجبور ہیں بلکہ ایسا ممکن ہے کہ کبھی وہ ایسی باتوں پر متفق ہوجائیں جو بدیہی اور ضروری نہ ہوں جیسا کہ لوگوں نے صانع کے اثبات پر اتفاق کرلیا ہے، اور بعثت رسول پر اتفاق کرلیا اس کی مخالفت صرف چند لوگوں نے کی ہے... یونہی لوگوں کا اس عقیدہ پر متفق ہوجانا بھی کوئی دلیل اس لیے نہیں کہ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض کا اعتماد سمعی دلیل پر ہو جو اس چیز کی برائی پر دلالت کرتی ہو، کچھ لوگوں نے انہیں کی تقلید میں اس پر اتفاق کرلیا ہو اور کچھ لوگوں نے گمراہ لوگوں سے جو باتیں سرزد ہوئی ہیں ان کے شبہہ میں اس پر اتفاق کرلیا ہو- لہٰذا ان اسباب میں سے کسی سبب کی وجہ سے کسی بات پر اتفاق کرلینا اس کے بدیہی ہونے کی

دلیل نہیں ہے بلکہ اس کے حجت ہونے پر بھی دلیل نہیں ہے... سماع یعنی شرع نے اس امت کے تمام افراد کا غلطیوں پر متفق ہونے کے امکان کو ضرور رد کر دیا ہے... مگر ایسا ہوسکتا ہے کہ تمام لوگ تقلید یا شبہ کی وجہ سے غلطیوں پر اتفاق کر لیں - ملحدوں میں سے بعض ایسے ہیں جو ان چیزوں کی برائی کا اعتقاد بالکل نہیں رکھتے اور نہ ہی ان کی نقیض کی اچھائی کا اعتقاد رکھتے ہیں لہٰذا اہل دانش کے اتفاق کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا... ملخصا (۱۲)

امام غزالی نے اس کے بعد مزید تین وجوہ سے اس نظریہ کی غلطی پر تنبیہ کی ہے جو گرچہ دلچسپ ہیں مگر بخوف طوالت ہم اس کو ترک کرتے ہیں-

(۲) امام غزالی اور مسئلہ نسخ

عربی زبان میں ''نسخ'' کا معنی کسی سابق چیز کا ختم کر دینا یا کسی چیز کو دور کر دینا- جب سورج کی کرنیں سایہ کو ختم کر دیتی ہیں تو عرب اسے **نسخت الشمس الظل** سے تعبیر کرتے ہیں اور جب ہوا کی روش قدموں کے نشانات کو اڑا لے جاتی ہے تو عرب اسے **نسخت الریح آثار المشی** سے تعبیر کرتے ہیں اور کبھی کبھی نسخ الکتاب پر بھی اس کا اطلاق کیا جاتا ہے- لہٰذا اس لفظ کو مشترک سمجھا جائے گا- ملخصا (۱۳)

اصطلاح اصول میں اس کی تعریف اس طرح کی گئی ہے: **الخطاب الدال علی ارتفاع الحکم الثابت بالخطاب المتقدم علی وجه لولاه لکان ثابتا به مع تراخیه عنه-** (۱۴)

ایسا خطاب جو سابقہ خطاب سے ثابت شدہ حکم کو ختم کرنے پر دلالت کرے اس طور پر کہ اگر پہلا حکم نہ آتا تو تاخیر کے ساتھ آخری خطاب سے اس کا ثبوت ہو جاتا-

مسئلہ نسخ قرآن ان مسائل میں سے ایک ہے جس پر ہمیشہ دانش کدہ فکر وفن میں گرما گرم بحث رہی ہے- کسی نے اس کا اعتراف کیا ہے تو کسی نے مطلقا اس کا انکار کیا- ابتدا میں یہود اور دیگر گمراہ فرقوں نے اس کا انکار کیا ہے بعد میں ملت بیضا کے بعض محققین نے منسوخ آیتوں کی تعداد میں اختلاف کیا اور بعض کچھ قیود وشروط اور تاویل کی بنیاد پر مطلقاً نسخ کے منکر ہوگئے، تاہم علمائے اصول اور اہل سنت وجماعت کی ایک بڑی تعداد قرآن میں نسخ کے وجود پر متفق ہے، اس لیے علمائے اصول نے اس کے اثبات پر مستقل دلائل دیئے ہیں- اس کا ثبوت قرآن، سنت اور

اجماع سے کیا ہے-

امام غزالی اسلاف کی اس جماعت کا بقایا ہیں جو قرآن کریم میں نسخ کے قائل ہیں، انہوں نے اپنی کتاب ''المنخول'' اور ''المستصفی'' میں بڑی تفصیلی بحث کی ہے اور مسئلہ نسخ کو ثابت کیا ہے- بنیادی طور پر اس کی دو قسمیں کی ہیں: اول قرآن کا نسخ قرآن سے اور دوم قرآن کا نسخ حدیث رسول سے- ان تمام تفصیلات سے قطع نظر نسخ کی صرف اس دوسری قسم پر غزالی کی رائے بیان کرنا میرا مقصد ہے کیونکہ یہ ان مسائل میں سے ایک ہے، جہاں امام غزالی نے اپنے امام کی مخالفت کی ہے اور اپنے موقف پر بھر پور دلائل دیے ہیں- امام غزالی نے نسخ کی چار شرطیں بیان کی ہیں، لکھتے ہیں:

اول: أن یکون المنسوخ حکما شرعیا لا عقلیاأصلیا، کالبراءة الأصلیة التی ارتفعت بایجاب العبادات-

دوم: أن یکون النسخ حکما بخطاب، فارتفاع الحکم بموت المکلف لیس نسخا اذ لیس المزیل خطابا رافعا لحکم خطاب سابق، ولکنه قد قیل أولا: الحکم علیک مادمت حیا، فوضع الحکم قاصر علی الحیاة فلا یحتاج الی الرفع-

الثالث: أن لا یکون الخطاب المرفوع حکمه مقیدا بوقت یقتضی دخوله زوال الحکم کقوله تعالی ﴿ثم أتموا الصیام الی اللیل﴾ البقرة:۱۸۷-

الرابع: أن یکون الخطاب الناسخ متراخیا، لا کقوله تعالی ﴿ولا تقربوهن حتیٰ یطهرن﴾ البقرة:۲۲۲- وقوله تعالی ﴿حتی یعطوا الجزیة عن ید وهم صاغرون﴾ التوبة:۲۹- (۱۵)

اول: شے منسوخ کا حکم عقلی نہیں بلکہ شرعی ہونا چاہیے- مثلاً انسان کسی حکم کا مکلّف اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ کوئی دلیل تکلیف نہ آ جائے، جب کوئی دلیل تکلیف آ جائے تو انسان اس حکم کا پابند ہو جاتا ہے-

دوم: نسخ کا ثبوت کسی خطاب سے ہوگا، لہٰذا کسی مکلّف کے رحلت کر جانے کے بعد اس سے حکم کا منقطع ہو جانا نسخ نہیں ہوگا کیونکہ موت خطاب سابق سے ثابت شدہ حکم کے لیے خطاب رافع کا درجہ نہیں رکھتی، تاہم اتنا ضرور ہے کہ حکم کا تعلق مکلّف کی پوری حیات سے ہے لہٰذا اس کو ختم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں-

سوم: جس خطاب سے ثابت شدہ حکم منسوخ کردیا گیا ہواس میں کسی وقت کی شرط نہیں لگائی جائے گی کہ اس کے داخل ہونے سے اس کا حکم بھی ختم ہوجائے- مثلا اللہ تعالی نے فرمایا: روزہ کورات تک پورا کرو-

چہارم: خطاب ناسخ کا مؤخر ہونا ضروری ہے، لہٰذا اللہ تعالی کا قول "**ولا تقربوهن حتى يطهرن**" اور "حتى يعطوا الجزية عن يد وهم صاغرون" کو ناسخ کہنا درست نہیں ہوگا-

ان شرطوں کے بعد غزالی نے نو ایسی شرطوں کا ذکر کیا ہے جو نسخ میں نہیں پائی جانی چاہیے- چوتھی شرط کے تحت رقمطراز ہیں:

لا يشترط أن يكون نسخ القرآن بالقرآن، والسنة بالسنة فلا تشترط الجنسية بل يكفي أن يكون مما يصح النسخ به- (١٦)

نسخ میں اس بات کی شرط نہیں ہونی چاہئے کہ قرآن کا نسخ قرآن سے ہی ہوگا، سنت کا نسخ سنت سے ہی ہوگا، جنسیت کی شرط نسخ میں بالکل نہیں ہونی چاہئے بلکہ نسخ جس سے صحیح ہو وہی کافی ہے-

المنخول میں اس مسئلہ کو اور واضح طور پر بیان کیا ہے، لکھتے ہیں:

لا خلاف في جواز نسخ الكتاب بالكتاب، ونسخ الكتاب بالسنة جائز عند الأصوليين، خلافا لمالك والشافعي والأستاذ أبي اسحاق في زمرة الفقهاء(١٧)

قرآن کا نسخ قرآن سے، میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، قرآن کا نسخ سنت رسول سے اہل اصول کے نزدیک جائز ہے، امام مالک، امام شافعی اور فقہا میں ابواسحاق کا اس میں اختلاف ہے-

امام غزالی نے اپنے اس موقف پر تفصیلی دلائل دیئے ہیں مگر ان کے دلائل سے پہلے امام شافعی کے نظریات کا خلاصہ ملاحظہ کیجئے- امام شافعی اپنی کتاب "الرسالہ" میں فرماتے ہیں:

اللہ تعالی نے اپنے علم کے مطابق خلق کو پیدا کیا، اس کے فیصلہ کو کوئی ٹال نہیں سکتا اور وہ جلد حساب لینے والا ہے-

اللہ تعالی نے قرآن کریم میں ہر چیز کا بیان واضح کردیا ہے اور ہدایت اور رحمت کے ساتھ نازل فرمایا ہے- اس میں کچھ چیزیں فرض کی ہیں اور اس کو ثابت رکھا ہے اور کچھ دوسرے کو نسخ کردیا- اللہ تعالی نے ایسا اس لیے کیا ہے تاکہ وہ اپنے بندوں پر اپنی عنایتوں کا اظہار فرمائے،

ان کی زندگیوں میں آسانیاں پیدا ہوں، مشکلات سے انہیں نجات مل سکے، نعمتوں میں اضافہ ہو، اعمال کے عوض ثواب عطا کرے، جس کے ذریعہ بندہ جنت کا مستحق ہو سکے، جہنم سے نجات ملے، لہٰذا جن چیزوں کو اس نے ثابت رکھا اور جن چیزوں کو منسوخ کردیا ان میں رحمت ہی رحمت ہے، **فلله الحمد على نعمه**- اس کے بعد فرماتے ہیں:

وأبان الله لهم أنه انما نسخ ما نسخ من الكتاب بالكتاب، وأن السنة لا ناسخة للكتاب وانما هي تبع للكتاب يمثل ما نزل نصا، ومفسرة معنى ما أنزل الله منه جملا..

فأخبر الله أن نسخ القرآن وتأخير انزاله لا يكون الا بقرآن مثله...

وهكذا سنة رسول الله ﷺ لا ينسخها الا سنة لرسول الله ولو أحدث الله لرسوله في أمر سن فيه غير ماسن رسول الله ﷺ لسنّ فيما أحدث الله اليه حتى يبين للناس أن له سنة ناسخة للتي قبلها مما يخالفها وهذا مذكور في سنته ﷺ.(١٨)

اللہ تعالی نے یہ بیان کردیا کہ جو کچھ منسوخ ہوگا وہ قرآن سے ہی منسوخ ہوگا، سنت قرآن کا ناسخ نہیں ہوگی بلکہ وہ قرآن کے تابع ہوگی، جو کچھ کتاب میں بیان کیا گیا اس کی تمثیل ہوگی اور جو مجمل ہے اس کا بیان ہوگی...

اللہ تعالی نے اس بات کا بیان فرمایا قرآن کا نسخ اور اس کے نزول میں تاخیر ہونا قرآن کی ہی دوسری آیتوں سے ہوگا..

یونہی رسول کریم ﷺ کی سنت کا حال ہے کہ وہ سنت کے لیے ہی ناسخ ہوگی- اگر اللہ تعالی اپنے رسول ﷺ کو ایسا نیا قانون عطا کرتا جو رسول ﷺ کے دیئے ہوئے قانون کے علاوہ ہوتا تو یقیناً یہ نیا قانون وہی ہوتا جس کا حکم اللہ تعالی نے اپنے رسول ﷺ کو دیا حتی کہ رسول ﷺ یہ بیان کردیتے کہ ان کی کچھ ایسی سنت ہیں جو پہلے کی ایسی سنتوں کے لیے ناسخ ہے جو اخیر والی سنت کے خلاف تھی اور یہ رسول پاک ﷺ کی سنت میں مذکور ہے-

جمع الجوامع میں امام شافعی کے کلام کی تشریح ان الفاظ میں ہے:

ويكون المراد من صدر كلام الشافعي أنه لم يقع نسخ الكتاب الا بالكتاب وان كان ثم سنة ناسخةله، ولا نسخ السنة الا بالسنة وان كان ثم قرآن ناسخ لها،

أی لم یقع النسخ لکل منهما بالأخر الا ومعه مثل المنسوخ عاضد له. (۱۹)

امام شافعی کے ابتدائی کلام کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا نسخ قرآن سے ہی ہوسکتا ہے گرچہ سنت بطور ناسخ موجود ہو اور سنت کا ناسخ سنت ہی ہوسکتی ہے، گرچہ قرآن اس کے نسخ کے لیے موجود ہو- یعنی ایک کا نسخ دوسرے سے نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کا مثل اور جنس موجود نہ ہو-

امام شافعی کا نظریہ جان لینے کے بعد اب امام غزالی کا اپنے موقف پر استدلال ملاحظہ کیجیے: فرماتے ہیں:

قرآن کا نسخ سنت سے اور سنت کا نسخ قرآن سے ممکن ہے کیونکہ دونوں ہی اللہ تعالی کی جانب سے آئی ہے- یعنی دونوں وحی الٰہی ہیں- لہٰذا ایک کا نسخ دوسرے سے ہونے میں کون سی مانع ہوسکتی ہے؟- نسخ سے متعلق جنسیت اور مثلیت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا - یہ عقلا بھی محال نہیں اور سماع اس کے وقوع کی روشن دلیل ہے- آپ کو اسلامی تاریخ میں متعدد ایسے شواہد مل سکتے ہیں جہاں قرآن کو سنت کا ناسخ تسلیم کیا گیا ہے، مثال کے طور پر بیت المقدس کو قبلہ سمجھنا قرآن میں نہیں ہے، اس کا حکم سنت میں ہے تاہم اس کا ناسخ قرآن میں موجود ہے- یونہی اللہ تعالی کا قول: **فالآن باشروھن** (بقرہ ۱۸۷) جماع کی حرمت کا ناسخ ہے- یہ تحریم قرآن میں نہیں ہے- عاشورہ کا نسخ رمضان کے روزہ سے ہوا ہے، جبکہ عاشوراء کا ثبوت سنت سے ہے- نماز خوف کا حکم قرآن میں آیا ہے مگر اس نے جنگی حالات میں سنت سے ثابت شدہ حکم تاخیر کو منسوخ کردیا- رسول اکرم ﷺ نے جنگ خندق کے موقع پر نماز دیر سے ادا کی تھی اور فرمایا تھا: اللہ ان کی قبروں کو آگ سے بھردے- کیونکہ کافروں کی وجہ سے نبی ﷺ وقت پر نماز ادا نہیں کرسکے تھے- یونہی اللہ تعالی کا قول: **فلا ترجعوھن الی الکفار** (ممتحنہ: ۱۰) نے نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان اور عمل کو منسوخ کردیا جس میں آپ کافروں سے عہد و پیمان اور صلح کیا ہے-

قرآن کا سنت سے منسوخ ہونے کی مثال والدین اور رشتہ داروں سے متعلق وصیت کا باطل ہونا، والی حدیث ہے، جس میں رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: **ألا لا وصیة لوارث** - کیونکہ آیت میراث میں والدین اور رشتہ داروں کی وصیت سے نہیں منع کیا گیا ہے کیونکہ ایسا ممکن تھا کہ والدین اور رشتہ داروں کو بحکم قرآن مال کا ایک مخصوص حصہ ملے اور ساتھ ہی بہ حیثیت موصی لہ مال کا کچھ اور حصہ مل جائے- اس طور پر آیت میراث اور وصیت دونوں میں تطبیق بھی ہوجاتی -

یونہی رسول کرم ﷺ کا فرمان ہے: اللہ تعالی نے ان کے لیے راستہ ہموار کیا ہے، کنوارا شخص اگر کنواری عورت کے ساتھ زنا کرے تو سو کوڑے کا مستحق ہوگا اور ایک سال کے لیے اسے ملک بدر بھی کردیا جائے گا، شادی شدہ مرد اگر شادی شدہ عورت کے ساتھ زنا کرے تو اسے سو کوڑے کے ساتھ رجم بھی کیا جائے گا- یہ عورتوں کا گھر میں مقید رہنے کا ناسخ ہے-

ایک بات قابل توجہ ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا میراث والی آیت نے وصیت والی آیت کو منسوخ کردیا، گویا نبی ﷺ نے آیت وصیت کو بذات خود منسوخ نہیں کیا اور بیان فرمایا کہ اللہ تعالی نے ان کے لیے راستہ پیدا کردیا ہے، یہ اور اللہ تعالی کا وعدہ ہے- قرآن میں ہے: **أو یجعل اللہ لھن سبیلا** - (نساء: ۱۵)

اپنے موقف پر بھر پور اجمالی دلائل دینے کے بعد امام غزالی نے امام شافعی رضی اللہ تعالی عنہ کی طرف سے خود ایک سوال اٹھایا ہے اور خود ہی اس کا جواب بھی دیا ہے- لکھتے ہیں:

اگر کوئی کہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالی علیہ نے فرمایا: سنت کا نسخ قرآن سے جائز نہیں جیسا کہ قرآن کا نسخ سنت سے جائز نہیں- آپ نے جن آیتوں اور سنتوں کا ذکر کیا ہے، ایسا نہیں کہ امام شافعی کی نظر وہاں تک نہیں پہونچی ہو- ان کا تو یہ خیال ہے کہ سنت کا نسخ سنت ہی سے ہوسکتا ہے کیونکہ نبی ﷺ ہی اپنی سنت کو دوسری سنت یعنی اپنے دوسرے قول سے ختم کردیتے تھے، لہٰذا وہ اپنے کلام یعنی سنت اور قرآن دونوں ہی کے شارح و مفسر ہیں، قرآن سنت کا بیان نہیں ہوسکتا اور قرآن سنت کے مبیّن کی حیثیت سے کہیں نظر بھی نہیں آتا، اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا منقول نہیں ہے، ورنہ نسخ تو اسی صورت میں واقع ہوجاتی؟

ہمارا جواب یہ ہوگا کہ اگر آپ عقلا اس کے جواز کی بات کرتے ہیں تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن سے ہی کعبہ کی طرف رخ کرنا واجب سمجھ میں آتا ہے، گرچہ بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا ثبوت سنت سے بھی ثابت ہے- یہ بھی ممکن ہے کہ کعبہ کی طرف رخ کرنے کا وجوب سنت سے ثابت ہو اور بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا ثبوت قرآن سے ثابت ہو- اگر ان کا یہ کہنا ہو کہ ایسا واقع نہیں ہوا ہے تو آپ کو معلوم ہے کہ ہم پہلے اس کا وقوع نقل کرچکے ہیں- یہاں کسی ایسی سنت کے مقدر ماننے کی کوئی ضرورت نہیں جس کا وجود ہی ختم ہوچکا ہو- یہ کہنا کہ ایسا بالکل ہی واقع نہیں ہوا ہے محض تحکم ہے- اگر اکثر لوگوں کی رائے آپ کے موافق ہوتی تو ممکن ہے

کہ اس میں کوئی نزاع کی بات نہ ہو،مگر علما کی ایک جماعت کا اختلاف نقل کیا جاچکا ہے-

اس جواب کے بعد امام غزالی نے نسخ میں مطلقا جنسیت کا اعتبار کرنے والوں کے دلائل ذکر کر کے اس کا جواب دیا ہے، وہ رقم طراز ہیں:

جنس کا قول کرنے والوں نے اس آیت سے دلیل دی ہے: **قال الذین لا یرجون لقاء نا ائت بقرآن غیر هذا أو بدله قل مایکون لی أن أبدله من تلقاء نفسی ان أتبع الا ما یوحی الی (یونس:١٥)**

منکرین بعث اور حشر ونشر نے کہا اس کے علاوہ کوئی دوسرا قرآن لاؤ یا اس میں تبدیلی کرو، آپ کہہ دیجئے کہ میں اپنی جانب سے کچھ نہیں بدل سکتا، میں تو بس اسی کی پیروی کرتا ہوں جو کچھ مجھ پر وحی کی جاتی ہے-

معلوم ہوا کہ قرآن کا نسخ سنت سے نہیں ہوسکتا-

ہمارا جواب یہ ہے کہ اس بات میں کچھ اختلاف نہیں کہ نبی ﷺ اپنی طرف سے آیتوں کو منسوخ نہیں کر سکتے بلکہ نسخ جب بھی ہوگا تو وحی الٰہی سے ہی ہوسکتا ہے لیکن اس وحی کا قرآن کے الفاظ میں سے ہونا ہی کوئی ضروری نہیں- اگر ہم نبی ﷺ کے اجتہاد سے نسخ کو جائز قرار دیں تو بھی یہی شرط ہوگی کہ اس اجتہاد کی اجازت اللہ تعالی کی طرف سے ہے اور زبان رسول کو صرف ترجمان یا واسطہ بنایا گیا ہے، ناسخ حقیقی معنوں میں اللہ تعالی کی ہی ذات ہے-

مقصد یہ ہے کہ نسخ کی شرطوں میں سے یہ نہیں ہے کہ قرآن کا حکم قرآن سے ہی منسوخ ہوگا بلکہ رسول کی زبان سے نسخ ہوگا جو قرآن کے علاوہ وحی ہے- اللہ تعالی کا کلام ایک ہے، وہی ایک اعتبار سے ناسخ ہے اور دوسرے اعتبار سے منسوخ - ایسا نہیں کہ اس کے دو کلام ہیں ایک قرآن ہے اور دوسرا قرآن نہیں- حقیقت یہ ہے کہ اختلاف صرف عبارتوں کا ہے- کبھی کلام باری پر ایسے الفاظ کے ذریعہ اس کی دلالت ہوتی ہے ہمیں جس کی تلاوت کا حکم دیا گیا ہے، جسے قرآن کہا جاتا ہے- اور کبھی ایسے الفاظ کے ذریعہ جس کی تلاوت نہیں کی جاتی ہے، جس کو سنت کہتے ہیں- ہر دو قسم کا سماع نبی اکرم ﷺ کے ہی واسطہ سے ہے اور ناسخ ہر حال میں اللہ تعالی ہی ہے-

یہاں یہ بات بھی پیش نظر ہونی چاہئے کہ کافروں نے اسی قرآن کے مثل لانے کا مطالبہ کیا تھا، نبی ﷺ نے جواب دیا کہ میں اپنی طرف سے کلام لانے پر قادر نہیں، انہوں نے اس کے

علاوہ کوئی اور حکم کا مطالبہ نہیں کیا تھا، اس بیان میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے کہ قرآن کا نسخ سنت سے اور سنت کا قرآن سے نہیں ہوسکتا اور ایسا کرنا ممنوع ہے؟

دوسری دلیل انہوں نے قرآن کریم کی اس آیت سے دی ہے: **ما ننسخ من آیة أو ننسها نأت بخیر منها أو مثلها-(بقرة:١٠٦)**

جب ہم کسی آیت یا اس کے حکم کو ختم کرتے ہیں تو اس سے بہتر یا اسی کی طرح دوسری آیت لاتے ہیں-

اس آیت میں اس بات کا بیان ہے کہ ایک آیت کا نسخ دوسری آیت یا اسی کی طرح دوسری آیت سے ہی ہوسکتا ہے اور سنت آیت کی طرح نہیں- اس کے بعد اللہ تعالی نے اپنی بڑائی کا اظہار کیا اور فرمایا: **ألم تعلم أن الله علی کل شئی قدیر**- اس آیت میں اس بات کا بیان ہے کہ اللہ تعالی کی ذات ہی قادر مطلق ہے، اور اس کے کلام کی طرح کوئی بھی کلام لانے پر قادر نہیں-

جواب: ہم نے پہلے ہی یہ واضح کر دیا ہے کہ ناسخ ہر حال میں اللہ تعالی ہی ہے، وہی زبان رسول ﷺ کے ذریعہ اس کا اظہار فرماتا ہے، انہیں کے واسطہ سے ہمیں یہ بتایا کہ اس نے اپنی کتاب کو نسخ کیا ہے اور اس پر کوئی اور قادر نہیں-

اگر اللہ تعالی کسی آیت کو نبی ﷺ کی زبان کے واسطہ سے منسوخ کردے پھر اسی کی طرح ایک دوسری آیت نازل فرمائے تو گویا اس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اس میں یہ شرط نہیں لگائی جائے گی کہ یہ دوسری آیت پہلی کی ناسخ ہے بلکہ اس کا نسخ تو زبان رسول کے واسطہ سے پہلے ہی ہوچکا ہے اور وہی یعنی سنت اس کا ناسخ سمجھی جائے گی-

اس آیت کا قطعا یہ مطلب نہیں کہ اس کی طرح ایک دوسرا قرآن لایا جائے جو اس سے بہتر ہو، کیونکہ قرآن کی بعض آیتوں کو بعض سے برتر نہیں کہا جاسکتا- خواہ قرآن کو آپ کلام الٰہی قدیم تسلیم کریں یا مخلوق، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسا عمل ہوگا جو اس سے بہتر اور آسان ہوگا یا یہ کہ ثواب کے اعتبار سے اس میں زیادتی ہوگی... ملخصا (٢٠)

قرآن کی بعض آیتیں بعض دوسری آیتوں سے افضل ہیں یا نہیں، یونہی ایک سورہ دوسرے پر برتری رکھتا ہے یا نہیں، ایک قدیم مسئلہ ہے- امام غزالی نے مساوات اور عدم فوقیت کے بارے میں امام اشعری اور باقلانی کی اتباع کی- امام قرطبی کا بھی یہی نظریہ ہے، بلکہ امام مالک کی

طرف بھی اس نظریہ کا انتساب کیا گیا ہے- مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ غزالی نے اپنی کتاب ''جواہر القرآن'' میں اپنے اس نظریہ کی مخالفت کی ہے اور بعض آیتوں کی فوقیت بعض پر تسلیم کیا ہے- جواہر القرآن میں ہے:

لعلک تقول قد أشرت الی تفضیل بعض أیات القرآن علی بعض، والکلام کلام اللہ، فکیف یفارق بعضه بعضا؟ فاعلم أن نور البصیرة ان کان لا یرشدک الی الفرق بین أیة الکرسی وأیة المداینات، وبین سورة الاخلاص وسورة تبت.. فقلد صاحب الرسالة ﷺ فهو الذی أنزل علیه القرآن وقال: فاتحة الکتاب أفضل سورة القرآن، وأیة الکرسی سیدة أیة القرآن، وقل هو الله أحد تعدل ثلث القرآن- (۲۱)

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے تو قرآن کی بعض آیتوں کو بعض پر فوقیت دے دی- پورا قرآن تو خدا کا کلام ہے، پھر بعض اور بعض میں فرق کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ میں جواب دوں گا کہ اگر نور بصیرت کے ذریعہ آپ آیۃ الکرسی، مداینات، سورہ اخلاص اور تبت یدا میں فرق نہیں کر سکتے تو صاحب وحی ﷺ کی اتباع کیجئے- کیونکہ انہیں پر قرآن نازل ہوا ہے اور ان کا ہی فرمان ہے: سورہ فاتحہ قرآن کا سب سے افضل سورہ ہے- آیۃ الکرسی قرآن کی آیتوں کا سردار ہے اور قل ھو اللہ تہائی قرآن کے مثل ہے-

(۳) ''مشترک'' کا مفہوم امام غزالی کے نزدیک

ہم نے ابتدا میں ذکر کیا ہے کہ امام غزالی نے اپنی کتاب ''المستصفی'' کو چار قطبوں تقسیم کیا ہے- قطب ثالث استدلال کے طریقوں پر مشتمل ہے، جو خود امام غزالی کی اختراع ہے، جس میں دوسرے اہل اصول نے بھی ان کی اتباع کی ہے- اس قطب میں انہوں نے الفاظ، مفہوم اور معقول سے عام طور پر بحث کی ہے اور جا بجا ان کی اجتہادی شان دیکھی بھی جاسکتی ہے- درمیان بحث وہ اجتہاد کے ایسے مرتبہ پر جا پہونچے ہیں جہاں انہوں نے اپنے امام سے بھی اختلاف کرلیا ہے- چنانچہ ''عام'' کے مختلف پہلو پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے ایک بحث اس طرح بھی کی ہے کہ کیا ''مشترک سے متعلق عموم کا دعوی'' کرنا صحیح ہے یا نہیں- امام غزالی نے بحث کے آغاز ہی میں اس دعوی کو رد کردیا ہے کہ جو لوگ ''مشترک'' میں عموم کا دعوی کرتے ہیں ان کا اس سے

اختلاف ہے- اور صراحت کے ساتھ انہوں امام شافعی اور قاضی کا ذکر بھی کیا ہے- بحث مختصر مگر جامع ہے- بحث کا خلاصہ ملاحظہ کیجیے:

دو ذات کے درمیان مشترک اسم سے متعلق یہ دعوی کرنا صحیح نہیں ہے کہ وہ عام ہے- اس میں قاضی اور امام شافعی کا اختلاف ہے- کیونکہ مشترک کی وضع جمع کے لیے نہیں ہوئی ہے- اس کی مثال لفظ ''قروء''، ''جاریہ'' اور مشتری'' ہے- اول حیض اور طہر دونوں میں مشترک ہے، دوم کشتی اور باندی دونوں میں مشترک ہے اور سوم ستارہ اور سامان خریدنے والے میں مشترک ہے-عرب ان الفاظ کا استعمال اپنے معنی وضعی میں علی سبیل البدل کرتے ہیں، جمع کے طور پر یک بارگی ہر ایک کے لیے اس کا استعمال نہیں کرتے ہیں- ہاں اتنا ضرور ہے کہ مشترک کی نسبت اپنے مسمی یعنی ذات کی طرف مساوی ہے اور عموم کی نسبت اپنے افراد کی طرف بھی مساوی ہے، لیکن عام کا اپنے افراد پر مساوی ہونے کی نسبت علی سبیل جمع ہے اور مشترک کا اپنے افراد پر مساوی ہونا علی سبیل البدل ہے-مشترک کا مفہوم اپنے تمام افراد پر یک بارگی صادق آنے میں خاموش ہے تاہم اپنے تمام افراد پر دلالت کرنے میں کوئی سکوت نہیں- یونہی فعل کی نسبت امکان وقوع کے اعتبار سے بھی پوری طرح مساوی ہوجاتی ہے، اس لیے کہ ایک خاص نماز جو نبی اکرم ﷺ سے ماثور ہے، اس میں فرض، نفل، ادا، قضا، ظہر اور عصر ہر ایک کا احتمال ہے- اور یہ امکان واحتمال ہمارے علم کی طرف نسبت کرتے ہوئے ہے، لیکن واقع اور علم الہی کے اعتبار سے وہ متعین ہے اس میں کسی چیز کا احتمال نہیں- یہ مساوات کی مختلف قسمیں ہیں- اس کی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ مساوات کی یہ ساری قسمیں یکساں ہیں، حالانکہ یہ اقسام من وجہ ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں- اس تشابہ اور مساوات کی وجہ سے ممکن ہے بعض لوگ یہ گمان کر بیٹھیں کہ عموم اس بات کی دلیل ہے کہ لفظ کی نسبت اپنے مسمی کی طرف مساوی ہو، اور مشترک میں بھی یہ مساوات موجود ہے لہٰذا اس کا بھی حکم وہی ہوگا جو عام کا حکم ہے- ایسا سمجھنا اس تشابہ اور مساوات کی تفصیل سے غافل ہونے کے مترادف ہے-

قاضی نے یہ دلیل دی ہے کہ اگر لفظ کا ذکر دو بار کیا جائے اور ہر بار ایک دوسرا معنی مراد لیا جائے تو اس میں کون سی مشکل ہے کہ ایک ہی بار اس کا ذکر ہو اور اس سے دونوں معنی مراد لیے جائیں جبکہ لفظ میں بھی ہر ایک معنی کی صلاحیت موجود ہے- ہاں جب لفظ ''مؤمن'' کا استعمال کیا

جائے تو اس سے مؤمنین ہی مراد لیے جائیں گے ''مشرکین مراد نہیں لیے جاسکتے کیونکہ لفظ ''مؤمنین'' میں مشرکین کا احتمال نہیں ہے برخلاف مشترک کے کہ اس میں اس کا احتمال ہوتا ہے۔

غزالی کہتے ہیں کہ لفظ سے دونوں معنوں پر ایک مرتبہ دلالت کا قصد کرنا تو ممکن ہے لیکن ایسا بھی ممکن ہے کہ وہ قصد وضع کے خلاف ہو جیسا کہ لفظ ''مؤمنین'' میں ہے۔ کیونکہ عرب نے لفظ ''عین'' کو سونا اور آنکھ کے لیے علی سبیل البدل وضع کیا ہے جمع کے طور پر وضع نہیں کیا۔ ملخصا (۲۲)

(۴) مفہوم صفت اور امام غزالی

''مفہوم'' ان مسائل میں سے ایک ہے جہاں امام غزالی نے اپنی کتاب ''منخول'' میں تو اپنے استاذ امام الحرمین کی پیروی کی ہے اور صفت کا مفہوم اگر حکم کے مناسب ہو تو اس کی حجیت کو تسلیم کیا ہے، لیکن جب وہ اپنی اجتہادی شان اجاگر کرنے مستصفی میں آئے تو نہ استاذ کی پرواہ کی اور نہ ہی امام کی اور نہ ہی اشعری مسلک کی۔ بحث و تمحیص انہیں ماتریدی اور حنفی اصول کی طرف کھینچ لایا اور بے دریغ ''مفہوم مخالف'' کی حجیت سے انکاری کر دیا۔ پانچ طریقوں سے اپنے نظریات پر دلیل دی اور نو طریقوں سے اپنے مخالفین کی تردید کی۔ ہم ان میں سے صرف ایک ایک وجوہ کا ذکر کرتے ہیں، مگر اس سے پہلے غزالی کے الفاظ میں اس کی تعریف ملاحظہ کیجیے:

مفہوم کی تعریف: الاستدلال بتخصیص الشئی بالذکر علی نفی الحکم عما عداہ۔ (۲۳)

مفہوم کا معنی ہے کسی شئی کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کر دینا اس بات کی دلیل بن جائے کہ اس کے علاوہ دیگر اشیاء سے حکم کی نفی ہو گئی۔

اس کا نام مفہوم اس لیے ہے کہ محض یہ مفہوم ہے الفاظ سے اس کا کچھ بھی تعلق نہیں ورنہ الفاظ کی جس پر دلالت ہوتی ہے وہ بھی مفہوم ہے۔ غالبا بعض لوگوں کے مطابق ''دلیل خطاب'' سے بھی اس کو تعبیر کیا جاتا ہے، ہمیں اس سے کچھ سروکار نہیں کیونکہ یہ صرف نام اور اصطلاح کا فرق ہے۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی چیز کے دو اوصاف میں سے ایک پر حکم کو معلق کر دیا جائے تو کیا اس سے مخالف صفت کی نفی ہو جائے گی؟ مثال کے طور پر نبی ﷺ نے فرمایا ''**فی سائمة الغنم الزکاة**'' چراگاہ میں چرنے والی بکریوں پر زکوۃ واجب ہے۔ یہاں غنم کی صفت سائمہ کے

ذریعہ بیان کر دینے سے کیا گھر میں پال کر رکھنے اور چارہ کھلانے والی بکریوں پر زکوۃ کا حکم نہیں دیا جائے گا۔ یا۔ اس صفت کا ذکر کرنے کے باوجود دونوں ہی طرح کی بکریوں پر زکوۃ واجب ہوگی؟

امام شافعی، امام مالک اور ان کے اکثر اصحاب کی رائے یہی ہے کہ اس سے بکری کی دوسری قسموں سے زکوۃ کی نفی ہو گئی اور یہی مذہب امام اشعری کا بھی ہے۔ متکلمین کی ایک جماعت جن میں قاضی سرفہرست ہیں اور فقہاے ماہرین کا ایک گروہ جن میں ابن سریج ہیں، کا ماننا ہے کہ کسی چیز کی صفت بیان کر دینے سے اس کے مخالف کی نفی نہیں ہو جاتی۔ احناف کا بھی یہی مسلک ہے کہ مفہوم مخالف حجت نہیں۔

اپنے نظریات پر امام غزالی کی دلیل

سائمہ کی زکوۃ ثابت کرنا اس نص کا ایک مفہوم ہے۔ محض اس ثبوت کی بنیاد پر معلوفہ (گھر پر چارہ کھانے والے) سے زکوۃ کی نفی اسی وقت ہوگی جبکہ اہل لغت سے متواترا کچھ منقول ہو یا کم از کم متواتر کے قائم مقام کچھ دلیل ہو۔ متواتر کے قائم مقام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہمیں معلوم ہے کہ عرب کا قول ''ضروب'' اور ''قتول'' اور ان جیسے الفاظ جمع کثرت کے لیے ہیں۔ ''علیم'' اور ''اعلم''، ''قدیر'' اور اقدر'' مبالغہ کے لیے ہیں یعنی اسم تفضیل کے اوزان ہیں، اسی طرح یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ نبی ﷺ کے اس قول میں صرف سائمہ کا قصد کیا گیا ہے۔ آحاد کا نقل کرنا کافی نہیں ہوگا کیونکہ ایسی زبان جس میں کلام الہی کا نزول ہوا ہے آحاد کے ذریعہ اس پر حکم لگانا کافی نہیں ہوگا، اس لیے کہ اس میں غلطی کا بھی امکان ہوتا ہے لہٰذا اس کا جواز نہیں ہوسکتا۔

اگر یہ کہا جائے کہ جو لوگ دیگر مفہوم کی نفی کرتے ہیں، ان کی دلیل نقل متواتر بھی ہے؟

ہمارا جواب ہوگا کہ ایسی چیزوں کو دلیل بنانے کی کچھ ضرورت نہیں جن کو خود انہوں نے وضع نہیں کیا، اگر یہ سلسلہ چل پڑے تو غیر متناہی ہوگا، ہاں جو وضع کا دعوی کرے اس کے لیے ضرور حجت ہے۔ (۲۴)

مفہوم مخالف کا اعتبار کرنے والوں کی ایک دلیل اور اس کا رد

۱۔ امام شافعی کا شمار اہل عرب اور علماے لغت میں ہوتا ہے انہوں نے خطاب کو اپنی دلیل بنایا

ہے-امام شافعی "الأم" میں رقمطراز ہیں: **فاذا قيل فی سائمة الغنم هكذا، فيشبه أن لا يكون فی الغنم غير السائمة شئی، لأن كلما قيل فی شئی بصفة والشئی يجمع صفتين يؤخذ من صفة كذا، ففيه دليل على أن لا يؤخذ من غير تلك الصفة من صفتيه**-

أخبرنا الربيع قال: أخبرناالشافعی، قال: روی عن النبی ﷺ أنه قال فی سائمة الغنم كذا- فاذا كان هذا يثبت زكاة فی غير السائمة من الماشية..ولا يبين لی أن فی شئی من الماشية صدقة حتی سائمة(۲۵)

اگر کہا جائے کہ چرنے والے جانوروں میں اس طرح ہے تو اس بات کا تقاضا ہوگا کہ باندھ کر چارہ کھلانے والے جانوروں کا حکم اس کے خلاف ہو- کیونکہ جب کسی شئی کی دو صفتیں ہوں اور اس کی ایک صفت کا ذکر کیا جائے تو مذکورہ صفت ہی دلیل بنے گی اور اس میں اس بات کی دلیل ہوگی کہ اس کے دوصفتوں میں سے صرف مذکورہ صفت کا ہی اعتبار کیا جائے..نبی ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا سائمہ جانور میں ایسا ہے یعنی زکوۃ ہے- لہٰذا میرا خیال نہیں کہ غیر سائمہ میں صدقہ واجب ہوگا-

۲- نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ مالدار شخص جس پر کسی کا حق واجب ہے تو اس کے لیے اس حق کی ادائیگی میں ٹال مٹول سے کام لینا ظلم ہے اور ایسے شخص کی شکایت کرنا اور سزا کے لیے حاکم کے پاس اس کی پیشی کی درخواست کرنا جائز ہے-

امام لغت ابوعبیدہ نے اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہا کہ جس شخص کا حق اس مالدار پر واجب نہیں، اس کے لیے یہ بھی جائز نہیں کہ اس مالدار کے بارے میں کچھ باتیں کرے-

۳-ایک دوسری حدیث ہے-"**لأن يمتلئی جوف أحدكم قيحا حتی يريه خير من أن يمتلئی شعرا**" شاعری سے تشنگی دور کرنے سے بہتر یہ ہے کہ آدمی خون اور پیپ سے سیرابی حاصل کرلے گرچہ اس سے اس کی آنت ہی پھٹ جائے-

ابوعبیدہ نے اس سے متعلق کہا کہ اس سے مراد ہجو یا گالی گلوچ ہے یا پھر نبی اکرم ﷺ کی برائی بیان کرنا ہے اور یہ جس مقدار میں بھی ہو خواہ کم ہو یا زیادہ حرام ہوگا- لہٰذا یہاں امتلا سے خاص کردینا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے علاہ کا حکم الگ ہوگا اور جو خالص شاعری نہیں کرتا وہ

اس وعید میں داخل نہیں-

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ان اماموں کی دلیل کا مدار اجتہاد پر ہے تو ان کی تقلید واجب نہیں اور وہ یہ تصریح کرچکے ہیں کہ یہ اجتہاد ہے، کیونکہ انہوں نے کہا ہے کہ "اگر ماعدا سے نفی پر دلالت نہ کرے تو خصوصیت کے ساتھ ذکر کا کوئی فائدہ نہ ہوگا"- یہ استدلال کئی طرح سے قابل اعتراض ہے..مجتہد پر کسی ایسے شخص کے قول کی اتباع واجب نہیں جس کی عصمت ثابت نہیں..اور اگر ان کی دلیل کا اعتماد کسی منقول پر ہے تو وہ خبر واحد کی حیثیت رکھتی ہے جس کے مقابلہ میں پوری ایک جماعت کا قول ہے جنہوں نے اس موقف کی مخالفت کی ہے-بعض علما نے تو یہ بھی کہا ہے کہ لغت کا کوئی مسئلہ ارباب مذاہب اور اہل رائے کے نقل کرنے سے ثابت نہیں ہوگا کیونکہ ان کا رجحان اپنے مذہب کی تائید کی طرف ہوتا ہے لہٰذا ان کی باتوں پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا-ملخصا (۲۶)

یہ چند مسائل بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش گئے ہیں جہاں امام غزالی بحر علم وفکر اور امام اصول کی حیثیت سے نمایاں ہیں، ان کی اصولی کتابیں اس طرح کی اجتہادی فکر سے بھری ہیں- اللہ تعالی ایسے محققین کے افکار سے ہمیں استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے-

حوالے اور حواشی

۱- شبلی نعمانی، الغزالی، معمولی تبدیلی کے ساتھ، صفحہ ۵، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ، یوپی، ۱۹۹۷ء

۲- امام غزالی کا مختصر تعارف ان کے تذکرہ سے متعلق لکھی گئی کتب ابن السبکی کی "طبقات شافعیہ" جلد ۱/۱۹۱، ابن عباد حنبلی کی "شذرات الذهب" ۱۰/۴ اور ابن کثیر شافعی کی "البدایہ والنہایہ" ۱۷۳/۱۲ کی روشنی میں ہے-

۳- امام اعظم ابوحنیفہ کے بارے میں لکھتے ہیں: **لم يكن مجتهدا لأنه كان لا يعرف اللغة وعليه يدل قوله "ولو رماه بأبو قيس"**-

ابوحنیفہ اس لیے مجتہد نہیں کہ وہ لغت کے عالم نہیں تھے، اس کی ایک مثال ابوحنیفہ کا قول "**ولو رماه بأبو قيس**" میں لفظ "**بأبو**" ہے کہ نحو کے اعتبار سے یہاں "**بأبی**" ہونا چاہیے- آگے لکھا وہ حدیث نہیں جانتے تھے..حدیث ضعیف کو قبول کرلیتے اور صحیح کو رد کردیتے تھے- وہ فقیہ

النفس بھی نہیں تھے-

امام غزالی اپنی اس تحریر میں واضح طور پر متعصب نظر آتے ہیں - اگر فقہ، فقہاء اور مجتہدین کی فہرست سے ابوحنیفہ کا نام نکال دیا جائے تو فقہ کی معنویت ہی ختم ہوجائے گی -ابوحنیفہ کتنے بڑے عالم لغت تھے اس کا پتہ تو ان فقہی مسائل سے لگایا جاسکتا ہے جہاں انہوں نے لغت کی روشنی میں ایسے ایسے مسائل حل جہاں دوسرے مجتہدین کی فکر وفہم جواب دے چکی تھی- ''بأ بوقیس'' سے متعلق اولا جو روایتیں ہیں وہ تو بغیر سند ہیں ،جس کا کوئی اعتبار نہیں اور اگر بعض اختلاف کے ساتھ یہ لفظ امام اعظم کی طرف منسوب بھی ہے تو اس کی سند مقطوع و مردود اور اس کا متن قابل اعتراض ہے- بالفرض یہ لفظ امام صاحب کا تسلیم بھی کرلیا جائے تو بھی اس سے ان کی لغت دانی پر کوئی حرف نہیں آتا بلکہ لغت عرب پر وسعت نظر کی دلیل ہوگی -عربی کا ایک شعر ہے؛

ان أبـــا هـــا وأبـــا أبـــا هـــا　　　قـد بـلـغـا فـى الـمـجد غايتاها

اس شعر میں تیسرا ''أبا'' مشہور قاعدہ کے مطابق ''أبی'' ہونا چاہیئے ،مگر عربی شاعر نے مشہور قاعدہ کے خلاف اس کا استعمال کیا ہے- یونہی صحابی جلیل عبد اللہ ابن مسعود کی لغت بھی کچھ اسی طرح ہے ، بخاری میں ان سے ایک حدیث ہے جس کا جملہ ہے : أنت أبا جهل- قاعدہ کے مطابق یہاں ''ابو'' ہونا چاہیے ...لہٰذا اس بنیاد پر ابوحنیفہ کی اجتہادی شان سے انکار کرنا کھلا تعصب ہے یا تو قلت نظر کی دلیل -ابوحنیفہ کی لغت دانی اور حدیثی مہارت کا پتہ لگانا ہوتو ماضی قریب کے ترکی محقق علامہ زاہد کوثری کی ''**تانیب الخطیب**'' حیات ابو یوسف، حیات محمد ..وغیرہ کا مطالعہ کیجئے -اس مختصر سے تبصرہ میں میں نے ''تانیب'' صفحہ ۴۴ تا ۴۷ سے استفادہ کیا ہے- کہتے ہیں کہ المنخول غزالی کی ابتدائی تصنیف ہے ، احیاء العلوم وغیرہ میں انہوں نے اپنے قول سے رجوع کرلیا ہے -مگر راقم کے مطالعہ میں ایسی کوئی ٹھوس دلیل نہیں آسکی جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ واقعی امام غزالی نے اس فکر سے رجوع کرلیا تھا- **سا محه الله تعالى وسدد خطاه** – اللہ تعالیٰ ہمیں ائمہ کرام کا احترام بجالانے کی توفیق عطا فرمائے-

۴- المنخول صفحہ ۵۸۱ میں امام غزالی نے صحابہ وتابعین اور ان کے بعد مجتہدین علماء کی ایک فہرست اور ان سے متعلق بعض جملے لکھے ہیں - امام مالک کے بارے میں لکھا وہ مجتہد ہیں مگر ''مصالحہ مرسلہ'' اور ''علماء مدینہ کے عمل کی تقدیم'' سے متعلق ان سے کچھ لغزشات صادر ہوئی ہیں-

صفحہ ۴۵۴ اور صفحہ ۶۱۲ پر لکھا ہے کہ امام مالک نے مصالحہ مرسلہ کی حجیت تسلیم کرکے ایک تہائی امت کا قتل کردیا ہے ''مصالحہ مرسلہ'' اصول فقہ کا ایسا مسئلہ ہے جس میں عصر حاضر کے مشہور شافعی عالم علامہ ڈاکٹر سعید رمضان بوطی کے مطابق غزالی کی رای متضاد نظر آتی ہے ، کیونکہ المنخول میں تو انہوں نے امام مالک پر اس لیے تنقید کردی ہے کہ وہ ''مصالح'' کو حجت مانتے ہیں مگر اپنی دوسری تصنیفات مثلا المستصفی میں کسی نہ کسی طرح اس کی حجیت کو ضرور تسلیم کیا ہے-تفصیل کے لیے رجوع کیجئے ڈاکٹر بوطی کی کتاب ''ضوابط المصلحہ'' اس کتاب میں اور بھی بڑی مفید باتیں ہیں-

۵- مقدمہ المنخول من تعلیقات الاصول ،صفحہ ۳۳، دار الفکر، دمشق، شام، سن طباعت ۱۹۹۸ء، تحقیق محمد حسن ہیتو-
۶- مقدمہ ''المستصفی'' ۱/۳۴ مطبع، الرسالہ، بیروت، ۱۹۹۷ء، تحقیق ڈاکٹر محمد سلیمان شقر-
۷- المستصفی ، ۱/۳۵، مطبع، الرسالہ، بیروت، ۱۹۹۷ء، تحقیق ڈاکٹر محمد سلیمان شقر-
۸- المستصفی ، ۱/۳۶، مطبع، الرسالہ، بیروت، ۱۹۹۷ء، تحقیق ڈاکٹر محمد سلیمان شقر-
۹- المستصفی ، ۱/۳۸، مطبع، الرسالہ، بیروت، ۱۹۹۷ء، تحقیق ڈاکٹر محمد سلیمان شقر-
۱۰- ابوالولید محمد بن رشد، الضروری فی أصول الفقہ صفحہ ۳۶، تحقیق جمال الدین العلوی، طبع اول ۱۹۹۴ء، مطبع دارلغرب الاسلامی، بیروت، لبنان-
۱۱- ڈاکٹر علی جمعہ، آلیات الاجتھاد، صفحہ ۴۶، ۴۷، طبع اول ۲۰۰۴ء مطبع دار الرسالہ، قاہرہ، مصر
۱۲- المستصفی ، ۱/۱۱۴، ۱۱۵ مطبع، الرسالہ، بیروت، ۱۹۹۷ء، تحقیق ڈاکٹر محمد سلیمان شقر-
۱۳- المستصفی ، ۱/۲۰۷، مطبع، الرسالہ، بیروت، ۱۹۹۷ء، تحقیق ڈاکٹر محمد سلیمان شقر-
۱۴- المستصفی ، ۱/۲۰۷، مطبع، الرسالہ، بیروت، ۱۹۹۷ء، تحقیق ڈاکٹر محمد سلیمان شقر-
۱۵- المستصفی ، ۱/۲۳۲، مطبع، الرسالہ، بیروت ۱۹۹۷ء، تحقیق ڈاکٹر محمد سلیمان شقر-
۱۶- المستصفی ، ۱/۲۳۲، مطبع، الرسالہ، بیروت ۱۹۹۷ء، تحقیق ڈاکٹر محمد سلیمان شقر-
۱۷- المنخول من تعلیقات الاصول ،صفحہ ۳۸۷، دار الفکر، دمشق، شام، سن طباعت ۱۹۹۸ء، تحقیق محمد حسن ہیتو-
۱۸- الشافعی، الرسالہ، صفحہ ۱۰۶، ۱۰۸، فقرہ نمبر ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۲۲، ۳۲۴، مکتبہ دار التراث، القاہرہ- مصر، سن اشاعت ۱۷۹ء، تحقیق أحمد محمد شاکر-

۱۹- تاج السبکی ،جمع الجوامع مع حاشیہ العطار،۱۱۳/۲،دار الکتب العلمیہ ،بیروت، سن اشاعت۱۹۹۹ء

۲۰- المستصفی ،۲۳۶/۱-۲۳۹ ،مطبع،الرسالہ، بیروت ۱۹۹۷ء، تحقیق ڈاکٹر محمد سلیمان شقر-

۲۱- السیوطی ،الاتقان،صفحہ۵۲۰، النوع الثالث والسبعون، دارمصر للطباعۃ ،القاہرہ،مصر-

۲۲- المستصفی ،۱۴۰/۲-۱۴۲، مطبع،الرسالہ، بیروت ۱۹۹۷ء، تحقیق ڈاکٹر محمد سلیمان شقر-

۲۳- المستصفی ،۱۹۶/۲، مطبع،الرسالہ، بیروت ۱۹۹۷ء، تحقیق ڈاکٹر محمد سلیمان شقر-

۲۴- المستصفی ،۱۹۷/۲، معمولی تبدیلی کے ساتھ، مطبع، الرسالہ، بیروت ۱۹۹۷ء، تحقیق ڈاکٹر محمد سلیمان شقر-

۲۵- الشافعی، کتاب الأم،۲۳،۵/۲، دارالمعرفۃ ، بیروت،سن اشاعت ۱۳۹۳ھ

۲۶- المستصفی ،۲۰۰/۲ ،معمولی تبدیلی کے ساتھ، مطبع، الرسالہ، بیروت ۱۹۹۷ء، تحقیق ڈاکٹر محمد سلیمان شقر-

○○○

ڈاکٹر حمید نسیم رفیع آبادی

امام غزالی اور شاہ ولی اللہ دہلوی: تناظر و تقابل

یہ خوش آئند بات ہے کہ ظفر اسحاق انصاری نے شاہ ولی اللہ کو امام غزالی سے تقابل کے لیے پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

" In fact it would be no exaggeration to say that he ranks among the most towering personalities of Islam, comparable in some respects to intellectual giants like Abu Hamid al-Ghazali."(1)

اس کی توجیہ کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں: کہ غزالی کی طرح شاہ ولی اللہ دہلوی نے اسلام کو بحیثیت کل بطور ایک نظام فکر و عمل کے سمجھنے کی کامیاب کوشش کی ہے-اور غزالی ہی کی طرح شاہ صاحب نے اسلامی احکام کے پیچھے چھپے ہوئے گہرے مفاہیم و مصالح کی تلاش کا کام بھی انجام دیا-

" Like Al-Gazali, Shah Wali Allah attemped to study Islam in its totality and like him he tried to go below the surface and plump the deeper meaning and purpose of the injunctions of Islam."(p-xiii)

سید ابوالحسن علی ندوی نے شاہ ولی اللہ دہلوی کے اس اعتراف کا حوالہ دیا ہے کہ امام غزالی جیسے علمائے سابقین نے علم اسرار الدین کے خدوخال کو واضح کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے- اگرچہ شاہ ولی اللہ دہلوی نے حجۃ اللہ البالغۃ کے مقدمے میں ان کاوشوں کو مختصر اور غیر مکتفی قرار دیا ہے-مگر ان کے وجود سے ہرگز انکار نہیں کیا ہے-اور اس طرح اگر دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، غزالی کو اپنا پیشرو اور پیشوا مانتے ہیں- چنانچہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، امام شاہ ولی اللہ دہلوی پر نظام شریعت، عبادات، احکام اور قوانین کی حکمتوں اور علل کے سلسلے میں غزالی کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''پھر وہ نظام شریعت،عبادات،احکام،اور قوانین کو پیش کرتے ہیں-اور ہر ایک چیز کی حکمتیں سمجھاتے چلے جاتے ہیں-اس خاص مضمون پر جو کام انھوں نے کیا ہے وہ اسی نوعیت کا ہے جو ان سے پہلے امام غزالی نے کیا تھا-اور قدرتی بات ہے کہ وہ اس راہ میں امام موصوف سے آگے بڑھ گئے ہیں''-(۲)

اسی طرح ابوالحسن علی ندوی نے بھی تاریخ دعوت وعزیمت میں تقریباً انہی خیالات کا ذکر کیا ہے-**حجة اللّٰه البالغة** اور **البدور البازغة** جیسی کتابوں میں شاہ صاحب نے حیات وکائنات کے مسائل سے بحث کی ہے اور اسلامی نقطہ نظر سے فلسفہ کو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے-نظام اخلاق پر آپ نے اجتماعی فلسفہ کی عمارت اٹھائی ہے جس کے لیے ارتفاقات کا عنوان تجویز کیا ہے-اور اس سلسلہ میں تدبیر منزل،آداب معاشرت،سیاست مدن، عدالت، ضرب محاصل، انتظام ملکی اور تنظیم عسکری وغیرہ کی تفصیلات بیان کی ہیں- پھر نظام شریعت،عبادات احکام اور قوانین کو پیش کیا ہے اور ہر ایک کی حکمتیں سمجھائی ہیں-یہ وہ کام ہے جس میں آپ اپنے پیش روؤں سے بھی بازی لے گئے ہیں- امام غزالی کی طرح شاہ صاحب بھی اپنے زمانے سے آگے دیکھتے تھے-امام غزالی نے فلسفہ یونان کا گہرا مطالعہ کیا اور اس پر تنقید کی یہاں تک کہ اس کا رُعب جو مسلمانوں پر چھا گیا تھا کم ہوگیا اور لوگ جن نظریات کو حقائق سمجھے بیٹھے تھے، جن پر قرآن وحدیث کی تعلیمات کو منطبق کرنے کے سوا دین کے بچاؤ کی کوئی صورت انہیں نظر نہ آتی تھی- ان کی اصلیت سے بڑی حد تک آگاہ ہوگئے-امام کی تنقید کا اثر مسلم ممالک ہی تک محدود نہ رہا بلکہ یورپ تک پہنچا اور وہاں بھی اس نے فلسفہ یونان کے تسلط کو مٹانے اور ''تنقید وتحقیق'' کو فتح یاب کرنے میں حصہ لیا-(۳)

امام غزالی نے مسلم ممالک میں اس مرض کی بروقت اصلاح کی اور مسلمانوں کو بتایا کہ ان کے دینی عقائد کا اثبات ان غیر معقولات کے التزام پر منحصر نہیں ہے،جن کو فلاسفہ ومتکلمین کی ضد میں اسلام کے وہ حمایتی کررہے تھے جو علوم عقلیہ میں گہری بصیرت نہیں رکھتے تھے-اس کے برعکس امام غزالی نے مسلمانوں کو اس بات کا یقین دلایا کہ ان کے دینی عقائد کا اثبات کرنے کے لیے معقول دلائل موجود ہیں-غرض غزالی کا مستقبل بینی پر مبنی یہ تجدیدی کام نہ صرف ان کے زمانے میں بلکہ اس کے بعد تقریباً کئی صدیوں تک مسلمانوں کو راہ دکھاتا رہا اور ان کو تشکیک اور

احساس کمتری سے نجات دلاتا رہا-اور اسلام پر معقولات کی بنا پر کوئی اعتراض بھی نہیں کرسکتا تھا-اس کے ساتھ ساتھ احکام شریعت اور عبادات ومناسک کے اسرار ومصالح بیان کیے اور دین کا ایک ایسا تصور لوگوں کے سامنے رکھا جس سے وہ غلط فہمیاں دور ہوگئیں جن کی بنا پر پہلے یہ گمان ہونے لگا تھا کہ اسلام عقلی امتحان کا بوجھ نہیں برداشت کرسکتا-(۴)

شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی ایک ایسے جدید علم الکلام کی بنیاد رکھی جس میں قرآن کے طرز استدلال کو بنیاد بنایا گیا اور اسی طریقے سے استفادہ کیا گیا ہے جو نبوت سے ہم آہنگ ہو-(۵)

تاہم شاہ صاحب کو امام غزالی پر ایک فوقیت حاصل تھی کہ وہ علوم حدیث سے کما حقہ، مجتہدانہ اور ماہرانہ واقفیت رکھتے تھے-اور ان کے نقائص جو ان کے تجدیدی کام میں خرابی پیدا کرنے کے باعث تھے،ان میں سب سے بڑا نقص ''حدیث کے علم میں کمزور ہونے کی وجہ سے ان کے کام میں پیدا'' ہوا-(٦) اب تک لوگوں نے جس چیز کو فلسفۂ اسلام کا نام دے رکھا تھا وہ دراصل فلسفہ مسلمین تھا-جس پر یونان وروم اور ایران و ہندوستان کی چھاپ تھی-اس فلسفے میں سیدھی سادی دلیلیں ہیں جو دل ودماغ کو مطمئن کردیتی ہیں،فلسفیانہ موشگافیوں اور لاطائل کلامیات کا ان کے یہاں گذر کم ہوا ہے بس زندگی کے بنیادی مسائل اور معروضی حقائق زیر بحث آئے ہیں-(۷)

اس کے برعکس غزالی کے ہاں یونانی فلسفہ کا اثر بہت زیادہ نظر آرہا ہے-اس کے باوجود کہ موصوف نے فلسفہ کی مخالفت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی،البتہ دونوں مفکرین نے اپنے آئندہ آنے والے زمانے کے لوگوں کو شک وشبہ اور ارتداد وبے دینی کے ممکنہ حملوں سے بچانے کے لیے معقول کام انجام دیا:خصوصاً **حجة اللّٰه البالغة** اور **البدور البازغة** میں شاہ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو سوالات آئندہ ہونے والے تھے ان کا جواب پہلے سے تیار کرکے ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے مسلمانوں کے سپرد کررہے ہیں-اور مناظر احسن گیلانی کا یہ تبصرہ بڑی حد تک صحیح ہے کہ مغربی الحاد وزندقہ کے زہر کا تریاق شاہ ولی اللہ دہلوی کا کلام ہے-گویا جس طرح امام غزالی نے اپنے زمانے میں یونانی فلسفیوں کی غلامی سے مسلمانوں کو نکال کر ان کے سامنے اسلام کی تعلیمات رکھیں بالکل اسی نہج پر شاہ صاحب نے مغربی فلسفہ سے ممکنہ طور پر الحادی اور تشکیکی مسائل کا ادراک شاہ صاحب نے کیا تھا اور ان کا جواب بھی بالکل تیار رکھا تھا-

محمود احمد غازی کا خیال ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلوی اور امام غزالی کے احوال اور واردات قلبی

کو سمجھنے کے لیے فیوض الحرمین اور المنقذ من الضلال کا مطالعہ بہت اہم رہے گا-ایسا لگتا ہے کہ روحانی تجربہ کے بعد شاہ ولی اللہ ایک بہت مقدس مشن کے لیے اپنے آپ کو کمربستہ پاتے ہیں جبکہ غزالی ایک ایسے ہی تجربے سے گزرنے کے بعد صرف ذاتی نجات اور طمانیت قلب کے لیے وقف ہوکر رہ گئے-ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ پیغمبرانہ طریق کی تقلید میں اپنے کام کو انجام دینے لگ گئے جبکہ غزالی صوفیہ کرام کی طرح صرف انفرادی نجات کا مقصد حاصل کرنے سے دلچسپی لینے لگے-(۸)

" Shah Wali Allah emerged from his spiritual experience to head a sacred mission, while Al-Ghazali conteded himself primiarily with his personal satisfaction. Shah Wali Allah's role tended to be Prophetic, while Al-Ghazalis, tended to be largely mystic and saintly"

فارابی ایک ایسا مسلم فلسفی ہے،جس نے فلسفۂ محض میں نام کمایا اور وہ اپنے ماورائی (abstract) عقلی منہاج کے معاملے میں ممتاز حیثیت کا حامل ہے- اس کے برعکس ماوردی سماجی اور سیاسی معاملات میں قانونی طریق (اپروچ) کا علمبردار نظر آتا ہے-جبکہ امام غزالی ایک ایسی ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت کا نام ہے، جس نے علم الکلام، فلسفہ اور قانون تینوں کو تصوف کے ساتھ ملا کر ایک منفرد مقام حاصل کیا ہے-یہی وجہ ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلوی نے حجۃ اللہ البالغۃ میں ان سب مفکرین کے مقابلے میں امام غزالی کو نہ صرف سراہا ہے بلکہ ان کے اثرات کو اپنے فکر وعمل پر محیط بھی قرار دیا ہے جس کا برملا اظہار حضرت شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کے مقدمہ میں اس طرح کیا ہے-(۹)

" ثم من بعد هم العلماء المجتهدون يعللون الاحكام بالمصالح ويفهمون معانيها ويخرجون للحكم المنصوص منا طامنا سبا لدفع ضرا و جلب نفع هو مبسوط في كتبهم ومذاهبهم، ثم اتى الغزالى والخطابى وابن عبدالسلام وامثالهم–شكر الله مساعيهم–بنكت لطيفة وتحقيقاتِ شريفة نعم كما اوجبت السنة هذه...''

ترجمہ: ''اور ان کے بعد مجتہدین احکام کے علل ومصالح برابر سمجھتے رہے اور ہر حکم صریح کی کوئی نہ کوئی علت خواہ وہ حصول نفع ہو یا دفعِ مضرت، ضرور قرار دیتے رہے-جیسا کہ ان کی

کتابوں میں مفصل مذکور ہے- پھر تو غزالی، خطابی اور ابن عبدالسلام وغیرھم نے عجیب لطائف ونکات اور عمدہ عمدہ تحقیقات بیان کیں، خدا ان کو ان کی سعی کا عوض دے''- (۱۰) آگے امام غزالی کی صوفیانہ کتابوں کا حوالہ دے کر فرماتے ہیں:

''ومنها ان طالب الاحسان اذااجتهدفى الطاعات وهويعرف وجه مشروعيتها ويقيد نفسه بالمحافظة على ارواحهاوانوارها نفعه قليلها وكان البعد من ان يخبط خبط عشواء،ولهذا المعنے اعتنے الامام الغزالى فى كتب السلوك بتعريف اسرارالعبادات''. (۱۱)

ترجمہ: سوم یہ کہ طالبِ خیر جب نیکیوں میں انتہائی کوشش کرتا ہے اور وہ ان کے مشروع ہونے کی وجہ بھی بخوبی جانتا ہے اور ان کے تقاضوں اور لوازمات پر پوری طرح نگاہ رکھتا ہے تو وہ تھوڑی عبادت بھی اس کو بہت فائدہ دیتی ہے-اور وہ اس کو خوب پکا ہوکر دیکھ بھال کرتا ہے اندھا دھند نہیں چلتا، اور اسی لیے امام غزالی نے کتب سلوک میں بڑی توجہ واہتمام کے ساتھ لوگوں کو اسرارِ عبادات سے روشناس کرایا ہے- (۱۲)

میرے خیال میں امام غزالی اور شاہ ولی اللہ دہلوی کے درمیان جو سب سے بڑا نقطۂ اشتراک ہے وہ اسرار الدین کے علم کو عام کرنا ہے-احیاء علوم الدین میں امام غزالی نے اس کام کو بحسن وخوبی انجام دیا اور اسی کی تقلید وتوسیع میں شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی حجۃ اللہ البالغہ میں اپنے علمی کمال کے ذریعے سے ایک نیا انداز پیدا کیا-

''شریعت کے مقاصد، اسرار وحکم اور فقہ وحدیث کے مابین تطبیق واختلافی مسائل اور اختلافی نقطہ ہائے نظر کے درمیان تطبیق دینے میں شاہ ولی اللہ نے مجتہدانہ انداز اختیار کیا اور زندگی کے ہر میدان میں تجدیدی کارنامے انجام دیے، خواہ اس کا تعلق عقائد، عبادات، معاملات سے ہو، اجتماعی واخلاق تصوف وسلوک سے ہو، علم وتربیت سے ہو، سیاست ونظام حکمرانی سے ہو، فرق وملل ونحل سے ہو انفرادی، سماجی یا گھریلو معاملات سے ہو، ہر ایک کا حل اور تشفی بخش جواب پیش کیا ہے''-(۱۳)

شاہ ولی اللہ دہلوی کی پوری فکر پر امام غزالی کے اثرات اس طرح چھائے ہوئے ہیں کہ ایسا لگتا ہے جیسے ان کے تجدیدی کارنامے کا ایجنڈا اصل میں امام غزالی نے ہی متعین کیا تھا- اگرچہ حالات وواقعات کے لحاظ سے ان کے متعلقہ کردار میں تفاوت بھی ہو- اس لیے مولانا شبلی کا یہ کہنا

مبنی بر مبالغہ معلوم ہوتا ہے کہ-شاہ ولی اللہ دہلوی کی ''نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی اور ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے'' (۱۴) مولانا آزاد نے شاہ ولی اللہ دہلوی کو حجۃ الاسلام کا لقب دیا ہے اور لکھا ہے:

''بایں ہمہ معلوم ہے کہ وہ جو دور آخر کے فاتح، اور سلطان عصر ہونے کا مقام تھا اور قطبیت وقت کا، وہ صرف حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ ہی کے لیے تھا-اور لوگ بھی بیکار نہ رہے مگر جو کام یہاں انجام پایا وہ صرف یہیں کے لیے تھا''-(۱۵)

یاد رہے کہ حجۃ الاسلام کا لقب دراصل امام غزالی کو ان کے عظیم علمی اور فکری کارناموں کے اعتراف میں دیا گیا تھا، جو انہوں نے مخالفین اسلام جماعتوں، خاص طور پر باطنیہ اور فلاسفہ کے خلاف انجام دیئے تھے-ان کی کتاب **حجۃ الحق** اس سلسلے میں بڑی اہمیت کی حامل تھی- ابوالکلام آزاد نے اس لقب کا استعمال شاہ ولی اللہ دہلوی کے لیے کر کے ان دونوں عظیم اسلامی شخصیات کے کارناموں کی مماثلت سامنے لانے کی کوشش کی ہے-

شاہ ولی اللہ دہلوی نے علم حدیث کو فلسفیانہ تشکیل نو کے انوکھے عمل سے گزارا اور اس کو اسرار الدین کے علم کا نام دیا- ان کے خیال کے مطابق یہ علم مشکل اور دقیق ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام کے تمام علوم وفنون میں سب سے زیادہ عظیم اور جلیل نوعیت کا حامل ہے-اور اس کے گہرے مطالعے سے شرعی احکام کے پیچھے راز ہائے سر بستہ کا سراغ لگانے سے اسلامی تعلیمات کی عظمت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے-چنانچہ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک تمام فنونِ حدیث میں سب سے زیادہ دقیق اور سب کی جڑ (اصل) اور سب سے بلند و برتر اور تمام علوم شرعیہ سے بہتر اور منزلت میں اعلیٰ و افضل اور قدر و قیمت میں سب سے بڑھ کر علم اسرار دین ہے جس میں احکام کی حکمت، ان کی لم اور خواصِ اعمال کے اسرار و نکات بیان ہوتے ہیں- بخدا یہ وہ علم ہے جس کو خدا نصیب کرے وہ فرض عبادات سے فراغت کے بعد اپنے تمام عزیز اوقات اسی میں صرف کرے اور اس کو اپنا توشہ آخرت بنالے، کیونکہ اس علم کی بدولت آدمی شریعت کے حقائق پر مطلع ہو جاتا ہے اور اس کو ان اخبار شریعت سے وہ مناسبت پیدا ہو جاتی ہے جو صاحبِ عروض کو استعارے سے، منطقی کو براہین حکما، سے، نحوی کو کلام فصحا سے اور اصولی کو تفریعات فقہا سے ہوتی ہے- اسی علم کی وجہ سے انسان حاطب لیل اور غائص سیل ہونے

سے محفوظ رہتا ہے''-(۱۶) اور یہی وہ علم ہے جس کی ابتدا صحیح معنوں میں امام غزالی نے کی ہے اور امام غزالی اور شاطبی کے علاوہ کوئی دوسرا اسلامی مفکر اس میدان میں نظر نہیں آتا-(۱۷)

دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے ''یہاں تصوف وفقہ کو باہم سمو دیا گیا ہے اور اسلام کے فقہی نظام (جس کی بنیاد بہر صورت احادیث نبوی پر ہے) کی ایسی عارفانہ، دلنشین اور لگتی ہوئی ترجمانی کی گئی ہے جس سے دین سے وابستگی بڑھتی ہے اور ذوق وشوق کے کوائف تازہ ہوتے ہیں- ناممکن ہے کہ کوئی شخص غزالی کے ان شہ پاروں کا مطالعہ کرے اور بغیر کسی اثر پذیری کے گزر جائے-قلب و ذہن کی سلامتی البتہ شرط ہے''-(۱۸)

میں سمجھتا ہوں کہ صحیح اسلامی روحانیت اور تصوف دراصل مشکوٰۃ نبوت سے روشنی حاصل کرنے کا نام ہے- اور صوفیۂ کرام نے اتباعِ رسول اور محبت رسول کو اپنا مطمح نظر بنایا ہے-جس طرح ہمارے علما اور محدثین نے **اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرسول** کو اپنی تمام کاوشوں کا مرکز ومحور بنایا ہے- بالکل اسی طرح صوفیہ کرام نے اتباع رسول اور محبت رسول کے اس قرآنی اصول: **ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتّبِعونی یحببکم اللّٰہ** کو اپنا مدعا ومقصدِ حیات قرار دیا ہے-چنانچہ امام غزالی فرماتے ہیں:

'' اور اس حالت میں مجھ کو یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ صرف صوفیہ ہی خدا کے راستے پر چلنے والے ہیں- ان کے اخلاق سب سے بہتر ہیں، ان ہی کا راستہ صحیح ہے، اور ظاہر و باطن میں ان کے تمام حرکات وسکنات چراغ نبوت کا پرتو ہیں-جس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی روشنی نہیں-اس لیے جو شخص ذوق سے اس کو حاصل نہیں کرسکتا، وہ صرف نبوت کے نام سے واقف ہے اور اس کی حقیقت سے بے خبر ہے''-(۱۹)

'' اس اندازِ فکر اور اسلوب انشا وتحریر کا انتہائی پسندیدہ نمونہ وہ ہے جو ابن عربی کی فصوص الحکم یا فتوحات میں پایا جاتا ہے اور نہایت متوازن اور معقول انداز وہ ہے جس کے غزالی حامل ہیں-'' غزالی میں دوسرے وجودی صوفیہ کے مقابلہ میں توازن اس وجہ سے ہے کہ تصوف کی منزلیں طے کرنے سے پہلے یہ بہر حال ایک منجھے ہوئے عالمِ دین بلکہ سرخیل علما تھے-اس لیے انھوں نے تصوف کی جس شاخ کو اپنایا ہے قدرتاً وہ ان کے ذوق اعتدال کے خلاف نہیں ہو سکتی تھی''-(۲۰)

چونکہ امام غزالی دراصل صحیح معنوں میں مقاصد دین اور اسرار شریعت کے مشتاق رہے ہیں- وہ علمی لحاظ سے ان تمام روحانی اور صوفیانہ مراحل اور مقامات سے گزرنے کے بعد بھی حدیث کے

علم سے اپنے آپ کو کبھی بے نیاز نہ سمجھ سکے- چنانچہ جب فخر الملک محرم ۵۰۰ھ میں ایک باطنی کے ہاتھ سے شہید ہوا-تو امام صاحب نے عہدۂ تدریس سے کنارہ کشی اختیار کر کے طوس میں خانہ نشینی اختیار کر لی-اور گھر کے پاس ہی ایک مدرسہ اور خانقاہ کی بنیاد ڈالی اور ہمہ وقت ظاہری و باطنی دونوں علوم کی تلقین کرتے رہے البتہ امام صاحب چونکہ اثنائے تحصیل علم میں فن حدیث کی تکمیل نہیں کر پائے تھے-اگر چہ انہوں نے ابوالفتح الحاکمی طوسی سے سنن ابی داؤد پڑھی تھی-فقہا کے ساتھ متفرق طور پر ہزاروں حدیثیں سنی تھیں اور ابوبکر احمد بن عمرو بن ابی عاصم شیبانی نے مولد رسول ﷺ پر جو کتاب لکھی تھی، اس کو امام صاحب نے شیخ ابوعبداللہ محمد بن احمد الخواری سے سنا تھا-تاہم اب تک احادیث صحیحہ کا اصلی خزانہ ان کی نگاہوں سے چھپا ہوا تھا، اس لیے اخیر میں وہ اس طرف متوجہ ہوئے اور محدثین کی صحبت اختیار کی اور حافظ عمر بن ابی الحسن الرواسی طوسی کو اعزاز واکرام کے ساتھ بلا کر ان سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم سنی اور ابن عساکر کے بیان کے مطابق امام صاحب کی زندگی کا خاتمہ علم حدیث کی طرف توجہ، محدثین کی صحبت اور صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے مطالعہ پر ہوا اور ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ اخیر عمر میں جب امام صاحب کو معلوم ہوا کہ صوفیوں کے طریقہ سے ان کا مقصد حاصل نہیں ہوسکتا-تو انھوں نے احادیث سے ہدایت حاصل کرنا چاہی اور بخاری ومسلم کے مطالعہ میں مصروف رہنے لگے-اور اسی حالت میں انہوں نے وفات پائی- (۲۱)

چنانچہ غزالی نے بھی اسرار دین کے اس علم کو پروان چڑھایا جو آگے چل کر شاہ ولی اللہ دہلوی کے ہاں تکمیل کو پہنچا- مثلاً جب غزالی مسائل نماز کا ذکر کرتے ہیں تو صرف اس پر اکتفا نہیں کرتے ہیں کہ اس کے متعلقات ظاہر کی تائید میں قرآن وحدیث کی تصریحات پیش کر دیں- بلکہ اس سے بڑھ کر وہ بتا دیتے ہیں کہ نماز کی روح اور اصل کیا ہے؟ اس میں خضوع وخشوع، تضرع کا کیا درجہ ہے-اور غفلت وسہو کس درجہ مضر ہے؟ پھر یہ بتاتے ہیں کہ ہمارے اسلاف جب نماز پڑھتے تھے تو ان پر شوق ومحویت یا خوف وخشیت الٰہی کا کس قدر غلبہ واستیلا ہوتا تھا-

صدقات کی بحث میں وہ صرف یہ نہیں بتاتے ہیں کہ ان کی حیثیت کیا ہے؟ کن حالات میں کن کن لوگوں پر یہ فرض ہیں اور کہاں کہاں اور کن کن صورتوں میں مستحب ہیں؟ ان کا محل ومصرف کیا ہے؟ کہ یہ سب بحثیں خالص فقہی انداز کی ہیں-ان کا اصل موضوع یہ ہے کہ صدقات سے کس طرح ایک مکمل عبادت کا کام لیا جاسکتا ہے؟ مثلاً ان کے ہاں اس سلسلہ میں یہ بحث زیادہ

اہم ہے کہ سر واظہار میں سے کون صورت ایسی ہے جو اخلاص واحسان کے نقوش کو زیادہ ابھارنے والی ہے-دونوں کے دلائل کیا ہیں؟ اور باطن وقلب کے نقطہ نظر سے کس دلیل میں زیادہ وزن ہے؟ اس کے پہلو بہ پہلو پھر اسلاف کے طرزِ عمل کی ایسی مثالیں پیش کرتے ہیں جو نہایت درجہ دل نشین موثر اور ایمان آفریں ہیں-

یہاں پر ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ اگر فقہ کو پورے نظام دین کا متبادل قرار دیا جائے اور احادیث نبوی میں تزکیہ اور تصفیہ پیدا کرنے کی جو صلاحیت موجود ہے، اس کی طرف دھیان نہ دیا جائے پھر دین صرف بے جان معلومات اور علم الکلام کی موشگافیوں کا مجموعہ ہو کر رہ جاتا ہے-احادیث اور فقہ، یا دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں- دینیات اور روحانیت کے درمیان رشتہ ہمیشہ قائم رہنا چاہئے-شاید اسی لیے امام غزالی نے فقہ میں تصوف کو سمودیا کیونکہ ''امام اس نکتہ جان فزا سے خوب آگاہ ہیں کہ فقہ وقانون میں اگر متصوفانہ عنصر معدوم ہوجائے تو پھر اس میں وہ زندگی، وہ روحانیت اور وہ معنویت باقی نہیں رہتی جو مقصودِ اسلام ہے بلکہ پھر قانون وفقہ میں ایک انداز کا جمود پیدا ہوجاتا ہے-ایک طرح کی تنگ نظرانہ ذہنیت ابھر آتی ہے اور یہ سارا کارخانہ ہی بے جان اور ٹھس ہو کر رہ جاتا ہے- یہی نہیں، پھر اس میں تفریع اور حیل ایسی برائیاں پیدا ہونی شروع ہوجاتی ہیں جو کہ دنیاوی قانون کا خاصہ تو ہیں، دینی کا نہیں-اسی طرح اگر تصوف کو قیدِ شریعت میں محصور نہ رکھا جائے اور اس کی فقہی ودینی حدود کی تعین نہ کی جائے تو یہ تصوف بے راہ روی، الحاد اور زندقہ کے راستہ پر ہو لیتا ہے اور بجائے اس کے کہ سالک میں ایمان واخلاص کے جذبوں کو ابھارے، الٹا گمراہی وضلالت کا باعث ثابت ہوتا ہے-گویا فقہ وتصوف میں تعلق ورشتہ کی وہی نوعیت ہے-جو جسم وروح میں ہے-اگر فقہ کے احکام ومسائل میں یہ روح جاری وساری ہے-تو جسم کا ڈھانچہ بھی قائم ہے-اور یہ روح نہیں ہے تو پھر یہ ڈھانچہ نہیں لاش ہے''-(۲۲)

شاہ ولی اللہ دہلوی قدم قدم پر امام غزالی سے متاثر نظر آتے ہیں-خاص طور پر تصوف کے معاملے میں جن دو برگزیدہ صوفیوں سے شاہ صاحب مرحوم متاثر ہیں، وہ امام غزالی اور شیخ محی الدین ابن عربی ہیں-بعض اوقات تو ایسا لگتا ہے کہ ان کا تصوف دراصل امام غزالی اور ابن عربی کے نظام فکر کی توسیع ہے- چونکہ تصوف میں امام غزالی کا مقام اس قدر اعلیٰ وارفع ہے کہ اس کو بعض لوگوں نے بعد میں آنے والے صوفیہ کا منبع ومرجع قرار دیا ہے-غزالی نے جس طرح پہلی بار

تصوف کو دینیات اور مسلم فلسفہ کا جُز لاینفک بنا دیا اس سے کسی ذی علم کو انکار نہیں-اگر چہ امام ابن تیمیہ کے نزدیک غزالی کا سب سے بڑا جرم یہی تھا کہ انہوں نے کلام کو اسلامی الہیات کا حصہ بنا دیا-اسی بات کی طرف ہرمن سن نے بھی اس طرح اشارہ کیا ہے کہ شاہ ولی اللہ نے دراصل امام غزالی کے صوفیانہ افکار کو اور وسیع کیا اور اپنے دامن کو سابقہ روایاتِ تصوف سے بھرلیا:

" In any particular field to which he addressed himself, Shah Wali Allah clearly building on the tradition, so that one can understand his sufism as extending the ideas of Al-Ghazali.(iiii) and Ibn-Al 'Arabi..."(p-xxxv)

یہ ٹھیک ہے کہ امام غزالی کے اثرات گہرے طور پر شاہ ولی اللہ دہلوی کے تصوف پر مرتب ہوئے ہیں-مگر جہاں تک علم الکلام کا تعلق ہے،وہاں شاہ ولی اللہ دہلوی اس لحاظ سے ممتاز نظر آتے ہیں کہ انہوں نے غزالی کی طرح صرف فلسفہ پر تنقید کو منطقی انجام تک نہیں پہنچایا اور اپنے کارناموں کے ذریعے سے امام غزالی اور رازی کے کام کی توسیع ہی نہیں کی بلکہ ایک نیا اور اچھوتا علم الکلام ترکیب دیا-انہوں نے صرف عقائد تک ہی اپنے سابقہ متکلمین کی طرح اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا بلکہ شریعت کے اعجاز کے علاوہ قضاوقدر،قدامت قرآن،ذات وصفاتِ الٰہی وغیرہ قدیم تصورات متکلمین کو ایک نئی ہمہ جہتی تعبیر وتشریح سے ہمکنار کیا-(۲۳)

شاہ ولی اللہ دہلوی نے مصالح مرسلہ کی ایک بہت اچھی تعریف بیان کی ہے- اور یہ اصطلاح اُن کے فکر و خیال میں ایک بنیادی حیثیت کی حامل اصطلاح ہے-یہ دراصل اس فطری نظام کی عکاس ہے،جس کو شرعی نظام بروئے کار لانا چاہتا ہے-اگر چہ اس اصطلاح کو مالکی فقہ میں مفادعامہ(Public Interest) کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے-مگر غزالی نے اس اصطلاح کو وسیع ترین مفہوم میں استعمال کیا ہے-جن کے مطابق مصالح شریعت کے اس پورے سلسلہ کو محیط ہے،جس میں زندگی،خاندان،عقل اور ملکیت وغیرہ کا تحفظ شامل ہے-شاہ ولی اللہ دہلوی امام غزالی سے متاثر ہوکر اس اصطلاح کو المصالح الکلیہ کے معنی میں سامنے لائے ہیں:

" Al-Ghazzali recognized both this narrower sense of the term and a broader concept of maslaha as furthering the ultimate purpose of the Shariah in the maintenance of religion, life, reason and property. For Shah Wali Allah the term maslaha conveys yet a broader sense of the intended

benefit or salutory purpose of the divine injunctions. At the highest level, this beneficial interest consists of fulfilling the one great universal purpose (Al-maslaha Al-Kulliyya) of the cosmic order."(24)

جب وہ روزہ کا ذکر کرتے ہیں تو اس کی روح وفلسفہ پر زیادہ زور دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ جہاں کھانے پینے یا جنسی فعل سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے،وہاں جھوٹ غیبت اور ریا سے بھی اس کی حقیقت متاثر ہوتی ہے- برائیوں اور معصیتوں سے بھی اس کی صحت واثر آفرینیوں میں فرق آتا ہے-ان کا موقف یہ ہے کہ عبادات میں معانی باطنہ کی نزاکتوں کا خیال رکھنا ظواہر کی بہ نسبت سے کہیں زیادہ اہم ہے- کیونکہ عبادات تو باطن وروح کی کیفیات سے ہی عبارت ہیں-اسی طرح حج کی تفصیلات پر جب گفتگو کرتے ہیں تو ایسے پیارے انداز میں کہ شوق،محبت اور وارفتگی کا سماں پیدا ہوجاتا ہے-غزالی حج کو کوچہ یار میں حاضری قرار دیتے ہیں اور بجا طور پر کہتے ہیں کہ کوئے یار میں حاضری کے وقت جس ادب،جس شوق اور جس بے قراری کا ایک عاشق صادق کو سامنا کرنا پڑتا ہے،بالکل انہی کیفیات کا استحضار ان دیار میں حاضری کے وقت حجاج کے لیے ضروری ہونا چاہیے-(۲۵) شاہ ولی اللہ دہلوی امام غزالی ہی کی طرح ان اہم عبادات پر بات کرتے ہوئے ان کے اندر چھپے ہوئے فلسفہ کو بیان کرتے ہیں-چنانچہ نماز کے بارے میں فرماتے ہیں:

''واضح ہو کہ نماز میں تین چیزیں اصل ہیں-ایک یہ کہ دل سے اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنا،دوسرے زبان سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا،تیسرے جسم سے اللہ تعالیٰ کی غایت درجہ تعظیم کرنا- یہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کے اجزاے نماز ہونے میں تمام امتوں کا اتفاق ہے''-(۲۶)

فلسفہ زکوٰۃ بیان کرتے ہوئے بھی غزالی ہی کی طرح فرماتے ہیں:

''واضح ہو کہ زکواۃ میں سب سے زیادہ جس کی رعایت کی گئی ہے-وہ دو مصلحتیں ہیں،ان میں سے ایک مصلحت انجام کار تہذیب نفس کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ نفوس کے اندر بخل پایا جاتا ہے-اور بخل اخلاق میں بدترین عادت ہے جو آخرت کے اندر نہایت ضرر رساں ہے-اور جب بخیل آدمی مرجاتا ہے تو اس کا دل مال کے ساتھ الجھا رہتا ہے اور اس وجہ سے وہ عذاب میں مبتلا رہتا ہے-اور جو زکوۃ کا عادی ہوجاتا ہے اور بخل کو اپنے نفس سے دور کر دیتا ہے تو وہ اس کے لیے نافع ہے اور آخرت میں خدا تعالیٰ کی فرماں برداری کے بعد تمام اخلاق میں سب سے زیادہ نافع دل کی سخاوت ہے---سخاوت کی اصل شاہ صاحب کے نزدیک ملکیت بہیمیت پر غالب آجائے

اور ملکیت اس پر حاکم ہوجائے اور بہیمیت ملکیت کے رنگ میں رنگیں ہوکر اس کا حکم قبول کرنے لگے دوسری حکمت کا بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ شہر سے متعلق ہے اور وہ یہ ہے کہ شہر میں ناتوان اور حاجت مند ضرور ہوتے ہیں سہی اگر فقرا و حاجت مندوں کے ساتھ ہمدردی کا طریقہ لوگوں میں نہ ہوتو وہ ہلاک ہوجائیں اور بھوکے مرجائیں وغیرہ وغیرہ-(۲۷)

روزہ کی حکمت بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں چونکہ قوت بہیمی کی شدت قوت ملکی کے احکام کے ظاہر ہونے سے مانع تھی اس واسطے اس کا مغلوب کرنا ضروری ہوتا اور چونکہ اس کی شدت اور جوش کا باعث کھانا پینا اور لذائذ شہوانیہ میں منہمک ہونا تھا اور اس انہاک کا وہ اثر ہوتا ہے جو شکم سیر کھانے پینے کا بھی نہیں ہوتا-اسی واسطے ضروری ہوا کہ اس کے مغلوب کرنے کا طریق ان اسباب میں کمی کرنے سے ہو"-(۲۸) حج کی حکمتوں کا ذکر کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ: حج کے اندر جن مصلحتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے وہ چند امور ہیں-ازاں جملہ تعظیم بیت اللہ ہے کیونکہ وہ شعائر الٰہی میں سے ہے-اور اس کی تعظیم خدا تعالیٰ کی تعظیم ہے اور ازاں جملہ اجتماع کے معنی ثابت کرنا ہے کیونکہ ہر دولت اور ملت کے لیے ایک اجتماع کا دن ہوتا ہے جس میں ادنی اور اعلا سب جمع ہوتے ہیں تا کہ ایک دوسرے کی معرفت حاصل کریں" وغیرہ-(۲۹) امام غزالی نے جن تین امور میں اسلامی عقائد کی خلاف ورزی کی پاداشت میں فلاسفہ کو کافر قرار دیا تھا-ان میں ایک اللہ کے جزئیات کے علم کا انکار تھا-چنانچہ فلاسفہ اسلام، فارابی اور ابن سینا اگرچہ اللہ تعالیٰ کے عالم الکلیات ہونے پر یقین رکھتے تھے مگر اللہ کے عالم جزئیات ہونے کی اس طرح تاویل کرتے تھے کہ اس کا منطقی نتیجہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے جزئیات کے علم سے انکار کی صورت میں نکلتا تھا-چنانچہ غزالی تہافت الفلاسفہ کے مسئلہ نمبر ۱۱ میں باب باندھ دیتے ہیں-اور اس کا عنوان اسطرح قائم کرتے ہیں-

"ان فلسفیوں کے قصور استدلال کے بیان میں جو سمجھتے ہیں کہ اول اپنے غیر کو جانتا ہے اور انواع واجناس کو بنوع کلی جانتا ہے"-(۳۰)

شاہ ولی اللہ دہلوی اس موضوع پر فرماتے ہیں کہ" خدا کی حیات ہماری حیات کی طرح نہیں-اس کا دیکھنا ہمارے دیکھنے کی طرح نہیں اس کی قدرت ہماری قدرت کے مِثل نہیں" ... مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بارش کے قطروں کی تعداد اور ریگستانوں کے ریت کے ذرات کا شمار

اور تمام درختوں کے پتوں اور سب جانداروں کے سانسوں کی گنتی جانتا ہے-اور اندھیری رات میں بھی چیونٹی تک کی چال کو دیکھتا ہے-اور بند کمروں میں لحافوں کے نیچے جو گھر گھڑاہٹ یا کھسر پھسر ہوتی ہے اس کو بھی سنتا ہے"-(۳۱)

سرسید احمد خان اس سلسلے میں غزالی کے خیالات کا خلاصہ کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں: جو فلسفیوں کے بارے میں بیان کرتے ہیں-"ان کا یہ کہنا کہ خدا تعالیٰ کو کلیات کا علم ہے جزئیات کا علم نہیں ہے"-(۳۲)

غزالی نے فلسفیوں کے ان خیالات کو موجب کفر قرار دیا ہے جن کے مطابق حشر اجساد کا نہیں بلکہ ارواح کا ہوگا-ارواح عود نہیں کریں گے دوزخ و جنت حور وقصور وغیرہ جسمانی نہیں بلکہ یہ چیزیں صرف روحانی ہیں-" جو جسمانی عذاب وثواب سے اعلا وارفع ہیں-چنانچہ یہ عنوان قائم کرنے کے بعد فلاسفہ کے خیالات کا خلاصہ اس طرح پیش کرتے ہیں:

"شریعت میں عذاب وثواب کی حسی مثالیں جو دی گئی تو ان سے مراد محض تمثیلات ہیں کیونکہ عوام کی کمزور سمجھ ان مثالوں کے بغیر حقایق کا ادراک نہیں کرسکتی اور اسی لیے یہ مثالیں دی گئی ہیں- ورنہ روحانی لذات ان حقیر جسمانی لذات سے بدر جہا رفیع وبلند ہیں"-

"ہم کہتے ہیں کہ بے شک ان میں سے اکثر باتیں وہ ہیں جو شریعت اسلامیہ سے متصادم نہیں کیونکہ ہم اس امر کا انکار نہیں کرتے کہ آخرت میں انواع واقسام کی لذتیں ہیں جو محسوسات کی لذتوں سے بہت ارفع واعلا ہیں-اور نہ ہم جسم سے مفارقت کے بعد روح کی بقا کے منکر ہیں-لیکن ہم کہتے ہیں کہ ان تمام باتوں کو ہم صرف شریعت کے توسط ہی سے جان سکتے ہیں-اس میں معاد کا ذکر آچکا ہے اور معاد بغیر بقاے روح کے ممکن نہیں-ہم فلسفیوں کے صرف اس دعویٰ کے مخالف ہیں کہ اس کی معرفت عقلی قیاس آرائیوں سے ہوسکتی ہے"-(۳۳)

اس کے بعد غزالی فرماتے ہیں: فلاسفہ کی جو باتیں مخالف شرع ہیں وہ درج ذیل ہیں:

حشر بالاجساد کا انکار، جہنم میں عذابِ جسمانیہ کا انکار، جنت میں لذاتِ جسمانیہ کا انکار-جنت ودوزخ کا انکار، جس کی توصیف قرآن مجید میں کی گئی ہے-اب ہم پوچھتے ہیں کہ آخرت میں دونوں قسم کی سعادت یا شقاوت یعنی روحانی وجسمانی کے اجتماع سے بھلا کون سا امر مانع ہے؟ خدا تعالیٰ کا یہ قول کہ "**فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین**"(یعنی کوئی شخص نہیں جانتا

کہ ان نیک بندوں کے لیے آخرت میں کیا آنکھوں کی ٹھنڈک پوشیدہ رکھی گئی ہے) سے مطلب یہ ہے کہ ان تمام نعمتوں سے مجموعی طور پر کوئی بھی واقف نہیں ہے''۔(۳۴)

غزالی فرماتے ہیں کہ آخرت میں جن باتوں کا وعدہ کیا گیا ہے وہ قدرت خداوندی سے محال نہیں ہیں۔اس لیے ان آیتوں کے ظاہری کلام ہی کے مطابق معنی لینا لازم ہے۔

سرسید احمد خان فلاسفہ کے خیالات کو غزالی کی زبان میں مختصراً اس طرح بیان کرتا ہے۔

''ان کا یہ کہنا کہ اجساد محشور نہیں ہونگے اور ثواب یا عذاب روح مجردہ کو ہوگا اور عذاب روحانی ہوگا نہ جسمانی''۔(۳۵)

چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلوی امام غزالی کے معاد سے متعلق تصورات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ **حجۃ اللہ البالغۃ** میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امام غزالی نے عذاب قبر کے باب میں مختلف مقامات کی صورت بہت اچھی طرح بیان کی ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ اس قسم کی احادیث کے ظاہری معنی تو صحیح ہیں لیکن ان کے اسرار معلوم نہ ہوں اور اصل حقیقت کا علم نہ ہو تو اسے ان کو ظاہری معنوں کا انکار نہیں کرنا چاہیے بلکہ سچا جان کر تسلیم کر لینا چاہیے کیونکہ یہی ایمان کا ادنی درجہ ہے۔ اگر کوئی یوں کہے کہ ہم نے کافر کی قبر کو بارہا کھول کر دیکھا اور عرصہ تک اس کی لاش کو بھی قبر میں پڑے دیکھا۔لیکن یہ چیزیں (یعنی ان پر ثواب وعذاب تو نہیں دیکھا) پھر خلاف مشاہدہ چیز کی کیسے تصدیق کی جائے تو اس کا جواب یوں ہے کہ انسان کے ہر ایسی باتوں کی تصدیق کرنے میں تین حال ہیں۔پہلا حال جو کہ سب سے زیادہ واضح صحیح اور قابل تسلیم ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب باتیں اپنی جگہ موجود ہیں، بیشک اس کو سانپ اور اژدہا ڈس رہا ہے، لیکن تجھ کو آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔

کیونکہ ملکوتی امور کے دیکھنے کی ان آنکھوں میں صلاحیت ہی نہیں اور جو چیز بھی آخرت سے تعلق رکھتی ہے وہ ملکوتی ہے۔ دوسرا حال یہ ہے کہ سونے والے کی حالت تو تم کو یاد ہوگی کہ وہ خواب میں سانپ کو ڈستے دیکھتا ہے اور اس کی تکلیف وایذا بھی اس کو محسوس ہوتی ہے جس طرح جاگتے کو محسوس ہوتی ہے یہاں تک کہ تم اس کو چیختے ہوئے اور ماتھے پر پسینہ آتے ہوئے دیکھتے ہو اور کبھی وہ اپنی جگہ سے اچھل بھی پڑتا ہے یہ سب باتیں وہی دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ لیکن ظاہر میں تم اس کو وہیں خاموش پڑا دیکھتے ہو نہ اس کے اردگرد سانپ دکھائی دیتے ہیں نہ بچھو حالانکہ اس کے لحاظ سے سانپ بھی اس کے پاس موجود ہیں اور بچھو بھی، اور تکلیف بھی اسے برابر محسوس

ہو رہی ہے۔لیکن یہ سب باتیں تمہارے لحاظ سے مشاہدہ سے باہر ہیں اور جب سزا وعذاب دراصل ڈسنے کی تکلیف سے ہوتا ہے تو پھر خیالی سانپ ہونے یا حقیقی سانپ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔تیسرا حال یہ ہے کہ تم خوب جانتے ہو کہ سانپ بذاتِ خود کچھ تکلیف وضرر نہیں دیتا بلکہ جس چیز سے تم کو درد و تکلیف پہنچتی ہے وہ اس کا زہر ہے، پھر زہر بھی بذاتِ خود کچھ (باعث) تکلیف نہیں بلکہ اس سے جو اثر حاصل ہوتا ہے دراصل وہی (باعث) تکلیف ہے تو اگر سوائے زہر کے چاہے کسی اور چیز سے یہ اثر حاصل ہو تو وہ بھی ایک قسم کی تکلیف وعذاب ہوگا جو اس سے کسی طرح کم نہ ہوگا۔لیکن اسی عذاب (کی تکلیف) کو بغیر ایسے سبب کی طرف نسبت کیے بیان نہ کر سکو گے جس سے عام طور پر اسی قسم کی تکلیف محسوس ہوتی ہے''۔(۳۶)

یہاں امام غزالی کی اس پوری عبارت کو نقل کر کے مختلف نتائج تک پہنچنے کا عمل اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ شاہ صاحب نے فلسفیوں کے مقابلے میں غزالی کے خیالات کو ہی ترجیح دی ہے اور ایک طرح سے حشر ارواح کے مقابلے میں حشر بالا جساد والے عقیدے کو پوری طرح سے واضح کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کہ ہر ایک جو پیدا ہوتا ہے فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اس کو یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا لیتے ہیں۔''

چنانچہ غزالی ''**کل مولود یولد علی الفطرۃ**'' والی حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''میں نے دیکھا کہ نصاریٰ کے بچوں کی نشو ونما دین نصرانی پر ہی ہوتی ہے اور یہود کے بچوں کی نشو ونما یہودیت پر ہوتی ہے۔اور مسلمانوں کے بچوں کی نشو ونما اسلام پر ہوتی ہے۔میں نے وہ حدیث بھی سنی ہوئی تھی جو رسول خدا سے بدین مضمون مروی ہے کہ جو بچہ پیدا ہوتا ہے فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا لیتے ہیں بس میرے دل میں یہ تحریک پیدا ہوئی کہ حقیقت فطرت اصلی اور حقیقت ان عقائد کی جو تقلید والدین یا استاد عارض ہوتے ہیں معلوم کروں اور ان تقلیدات میں تمیز کروں جن کی ابتداء امور تلقینات سے ہوتی ہے۔اور جن کی وجہ سے تمیز حق وباطل میں اختلاف ہوتے ہیں''۔(۳۷)

شاہ ولی اللہ دہلوی اس فطرت کے موضوع پر کہتے ہیں:

''واضح ہو کہ افراد کی سعادت (بہتری) یہی ہے کہ ان میں نوع کے احکام پورے پورے

پائے جائیں اوران کا مادہ ان سے گریز بھی نہ کرے اور نہ کوئی کمی چھوڑے کہ اس کے بعض نوعی خواص ظاہر نہ ہوسکیں اور اسی لیے آپ افرادنوع کی سعادت اور شقاوت میں مختلف الحال پاتے ہیں اور جہاں تک وہ افراد اپنی نوع کے مقتضا کے موافق رہتے ہیں ان کو تکلیف نہیں پہنچتی لیکن ان افراد کی فطرت کبھی عارضی اسباب کی وجہ سے متغیر ہوجاتی ہے- جیسے ورم وغیرہ- آنحضرت ﷺ کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے:

''پھراس (بچہ) کو ماں باپ اسے یہودی-نصرانی یا مجوسی بنادیتے ہیں''-(**حجۃ اللہ البالغۃ**،ص۱۱۴حوالہ سابقہ)

اس طرح شاہ صاحب مرحوم فطرت اللہ سے ''**اصول بر و اثم**'' بطورکلیات مراد لیتے ہیں نہ کہ ان کے فروع وحدود- دراصل یہی وہ دین ہے جو اختلاف ازمنہ سے بدل نہیں سکتا-(۳۸) دراصل اس بات کی طرف امام غزالی نے احیاءالعلوم میں بھی اشارہ کیا ہے کہ فطرت سے مراد توحید ومعرفتِ الٰہی ہے- کیونکہ باعتبار جبلیت صلاحیت ادراکِ توحید ہرایک قلب میں موجود ہے-

حجۃ اللہ البالغۃ کو بعض لوگوں نے علم حدیث کی اہم کتاب بھی قرار دیا ہے- جیسے شاہ عبدالعزیز نے فرمایا ہے کہ حدیث کے علم کے اسرار ورموز کو خوبصورتی کے ساتھ بیان کرنے میں حجۃ اللہ البالغہ سب سے بہترین مجموعہ ہے-اگرچہ ہمارے پاس اس طرح کے بعض نمونے امام غزالی کی احیاءعلوم الدین اور شیخ عزالدین عبدالسلام الشامی کی القواعدالکبریٰ کی شکل میں موجود ہیں-مگر **حجۃ اللہ البالغۃ** کے مقابلے میں وہ بہت کم اہمیت کے حامل ہیں-(۳۹)

(G.N.Jalbni,Teachings of Hazrat Shah Wali Allah Muhaddis
Delhivi,Kitab Bhavan,New Delhi.p.45)

مولانا مناظراحسن گیلانی نے لکھا ہے:

''پھر خصوصیت کے ساتھ''علم اسرار الدین'' کے سلسلہ میں حدیث اور فقہ کے تقریباً تمام ابواب میں جن حقایق ورموز کو انھوں نے بےنقاب کیا ہے-اس باب میں واقعہ یہ ہے کہ ان کے اس دعویٰ کی کوئی تردید نہیں کرسکتا کہ:

''حدیث کے اسرار اور اسلامی احکام وقوانین کی مصلحتیں اور ترغیبات کی حکمت اور وہ ساری باتیں جو پیغمبر خدا اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں اور جن کی آپ نے تعلیم دی ہے،ان

سب کے اسرار ورموز کو بیان کرنا دراصل ایک مستقل فن ہے-اس فقیر سے پہلے جتنی پختہ بات میں نے کہی ہے کسی سے یہ نہ بن آیا-''(۴۰)

مولانا ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں:

''اسلامی مسائل کی حکیمانہ توجیہ وتشریح اور تطبیق عقل ونقل اگرچہ بارھویں صدی کے عالم کے لیے بالکل نیا موضوع نہیں تھا-خود شاہ صاحب نے حجۃ اللہ کے مقدمہ میں امام غزالی،شاطبی اور شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام کا نام لیا ہے جنہوں نے احکام شرعی کے حکم ومصالح بیان کیے ہیں،لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان بزرگوں نے جو کچھ لکھا اس کی حیثیت اشارات ونکات سے زیادہ نہیں ہے-اسلام کے پورے نظام شرعی کی حکیمانہ تشریح ہمیں شاہ صاحب سے پہلے نہیں ملتی،اس اہتمام،وسعت اور جامعیت کے ساتھ اس موضوع پر ہمارے علم میں **حجۃ اللہ البالغۃ** پہلی تصنیف ہے- اور پھر اس کے اکثر ابواب ومضامین بالکل نئے ہیں،اور فلسفہ،علم الکلام،قرآن و حدیث، تصوف اور ذاتی غور ومشاہدہ اور قوتِ استدلال کی آمیزش شاہ صاحب ہی کا حق ہے''-(۴۱)

ابن تیمیہ کا خیال ہے کہ امام غزالی نے اپنی بہت سی کتابوں میں اس نور کا ذکر کیا ہے،جس کو وہ نورِ الٰہی کہتے ہیں جس کا اعتقاد ہے کہ ریاضت کے بعد عبادت گزاروں کو وہ حاصل ہوجاتا ہے-اور جس کے بعد وہ شرائع کو بھی اسی نور کی روشنی میں جانچ سکتے ہیں-ابن تیمیہ کے مطابق غزالی اس طرح کے اعتقاد کے اس لیے حامل بن گئے تھے؛ کیونکہ انہیں متکلمین اور فلاسفہ کے طریق کار میں اضطراب اور بےچینی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوا جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے صدق طلب اور ہوشیاری کے بدلے میں ایمان کامل عطا کیا-جس طرح وہ کہتے ہیں کہ مشائخ اور صوفیہ،فلسفیوں اور متکلمین کے مقابلے میں زیادہ حق وصداقت کے قریب ہیں مگر ابن تیمیہ کے نزدیک غزالی تک میراث نبوی کا وہ حصہ نہیں پہنچ سکا جو خواص امت کے پاس علوم واحوال کی صورت میں موجود ہے-اور نہ ہی ان کے پاس ان سابقون الاولون کا وہ حال ان کی عبادت اور علم میں منتقل ہوسکا،جس کے ذریعے سے وہ علمی مکاشفات اور معاملات عبادیہ کے اس عظیم درجے تک پہنچ سکے تھے،جہاں تک یہ صوفیاء بھی نہ پہنچ سکے-یہی وجہ تھی کہ امام غزالی نے سمجھا کہ دین کے یہ ثمرات صوفیہ کے طریقے سے ہی حاصل ہوسکیں گے- ان کے پاس اس طرز عمل کے علاوہ اور کوئی نمونہ نہیں تھا- اور قلت علم اور فلاسفہ اور متکلمین سے جو شبہات اور سلوک اُن کو تقلید کی

صورت میں وراثت میں ملے تھے، یہ سب چیزیں اُن کے اور طریق سنت نبویہ کے درمیان میں حائل ہوگئی تھیں- یہی وجہ ہے کہ وہ بعض اوقات اس طریق علم کی مخالفت بھی کرتے رہے ہیں- اس کا سبب یہ تھا کہ چونکہ انہوں نے فلاسفہ اور متکلمین کے علوم بھی حاصل کیے تھے اور اس طرح غیر محسوس طریقے پر ان کے عقائد پر بھی ان کے اثرات مرتب ہوئے تھے- یہی وجہ ہے کہ غزالی پر ان کے اتباعِ رسالت کا معاملہ واضح نہ ہوسکا اور وہ اس معاملے میں پردے میں رہا- حالانکہ اُن کا یہ موقف علم پر مبنی نہ تھا بلکہ فلسفہ اور علم الکلام کے عقائد کا مرہونِ منت تھا- چنانچہ سلف صالحین کا قول ہے "**العلم بالعلم بالكلام هو الجهل**" یعنی علم الکلام پر جو علم مبنی ہو وہ جہالت پر دال ہے- اور جس طرح ابو یوسف نے فرمایا: "**من طلب العلم بالكلام تزندق**" یعنی جو کوئی بھی علم الکلام سے علم حاصل کرنا چاہے وہ زندقہ کا شکار ہوجاتا ہے- حالانکہ ایک ایسا طبقہ سامنے آیا ہے، جو غزالی کی فضیلت اور دیانت کا معتقد تھا، وہ ان کتابوں کو غزالی کی طرف نسبت کرنے سے منع کرتے رہے ہیں چنانچہ مشہور فقیہ ابو محمد عبد السلام [یعنی عزالدین ولقب سلطان العلماء]، نے لکھا ہے کہ "**بداية الهداية**" ،غزالی کی تصنیف نہیں تھی- اور یہ اعلان کیا: کہ یہ کتاب غزالی کی طرف منسوب کی گئی ہے- اسی طرح سے غزالی کی دوسری کتاب "**المضنون به على غير اهله**" کے بارے میں علما کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ غزالی نے نہیں لکھی ہے- مگر جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ سب کتابیں غزالی نے لکھی ہیں اور ان میں موجود مضامین بھی انہیں کے تحریر کردہ ہیں- کیونکہ وہ غزالی کے کلام کو اچھی طرح پہچان سکتے ہیں- اور اس کی مشابہت کو بھی خوب جانتے ہیں- دراصل معاملہ یہ تھا کہ یہ لوگ مضطرب اور پریشان تھے اور کسی ایک بات پر ان کو ثبات حاصل نہ تھا- کیونکہ گو ان لوگوں کے پاس ذہانت اور طلب کا وافر سامان موجود تھا جس کی وجہ سے وہ خاصۃ الخلق یعنی صوفیہ کے طریقے کی طرف سفر کرسکتے تھے مگر ان کے لیے اس خاص راستے کی طرف جانے کا راستہ نہیں تھا، جو اس امت کے خاصان کا راستہ تھا، جس کو ان پاکبازوں نے رسول اللہ ﷺ سے علم اور ایمان کی صورت میں حاصل کیا تھا- یہ لوگ ہی دراصل ایمان اور قرآن کے حقائق کے حاملین اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کے فہم اور علم کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے فہم و علم کے وارث تھے- اسی طرح سے صرف یہی حضرات اپنے اعمال اور احوال میں اس علم کے پیرو کار بھی تھے، جس کو رسالت مآب ﷺ لے

کر تشریف لائے تھے- یہی وجہ ہے کہ شیخ ابو عمرو بن الصلاح (ابو عمر عثمان بن عبدالرحمٰن بن عثمان تقی الدین بن الصلاح الشہر زوری مفتی الشام ومحدثھا توفی سنہ ۶۴۳ھ، ذکر فی البدایۃ ص:۱۶۸ جلد۳) کا یہ قول میں نے خود ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیکھا ہے:

"ابو حامد (یعنی امام غزالی) کے بارے میں لوگوں نے بہت کچھ کہا ہے اور انہوں نے بھی بہت کچھ کہا ہے- البتہ جہاں تک ان کی ان کتابوں کا تعلق ہے، جن میں حق کی مخالفت پائی جاتی ہے- اس طرف التفات نہیں کرنا چاہئے- آدمی کو اس سلسلے میں خاموشی اختیار کرنی چاہئے- اور ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کرنا چاہئے--" یہ بات ابن صلاح نے کسی بُری نیت سے نہیں کہی ہے- کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی لوگوں کی غلطیوں کو معاف کرنے والا ہے- اور ہر گناہ گار کے گناہ کو معاف کرنے والا ہے-" کثرتِ احسان، علم صحیح اور عمل صالح کے باوصف غزالی فلسفہ کی طرف میلان رکھتا تھا مگر اس کو انہوں نے تصوف اور اسلامی عبادات کے قالب میں سامنے لایا ہے- یہی وجہ ہے کہ بہت سارے مسلمان علما نے ان کا رد لکھا ہے- یہاں تک کہ ان کے خاص شاگرد اور ساتھی ابوبکر ابن عربی نے لکھا ہے: "**شيخنا ابو حامد دخل في بطن الفلاسفة، ثم اراد ان يخرج منهم فما قدر**" یعنی ہمارے شیخ ابو حامد فلسفہ کے دل میں داخل ہوگئے- اور اس کے بعد واپس نکلنا چاہا- مگر وہاں سے باہر نہ آسکے-" بعض لوگوں نے ان کی کتابوں سے باطنی مذہب کے لوگوں کے خیالات کی تصدیق کرنے والے اقوال کی نشاندہی کی ہے- یہی وجہ ہے کہ ابو عبداللہ المازری نے اپنی کتاب میں غزالی کا رد لکھا ہے- ابوبکر الطرطوشی، ابو الحسن مرغینانی وغیرہ حضرات نے اس کی کتابوں خاص طور مشکاۃ الانوار کا رد لکھا ہے اسی طرح سے شیخ ابو البیان، شیخ ابو عمرو بن الصلاح وغیرھم نے ان کی تردید کی ہے اور ان کی کتابوں سے احتراز کرنے کی دعوت دی ہے- (۴۲)

دراصل حدیث نبوی کا مطالعہ اسلام میں بڑی اہمیت کا حامل ہے- کیونکہ جس قدر آدمی قرآن کے بعد احادیث صحیحہ سے تعلق پیدا کرے گا وہ اسلام سے اسی قدر قریب ہونے کا شرف بھی حاصل کرے گا - کیونکہ حدیث کی حیثیت اسلام میں صرف علم کی ہی نہیں بلکہ دین کی بھی ہے- اور اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے قرآن پاک کی تشریح و توضیح کا کام انجام دلوایا- چونکہ مسلمانوں کی ابتدائی تین صدیاں قرآن پاک کے بعد احادیث مقدسہ کی جلو میں ہی پروان چڑھی تھیں، اس لیے ان کے خیر القرون ہونے کا اعلان خود لسان نبوت سے ہوا تھا- اگرچہ شاہ ولی اللہ

دہلوی کا تعلق حدیث کے ساتھ اس انہماک اور تعلق کا تھا کہ آپ کو محدثِ دہلوی کے مبارک نام سے جانا جاتا ہے-مگر غزالی نے اگرچہ اپنی کتابوں میں ہزاروں احادیث کو جمع کیا ہے مگر وہ حدیث کے فن سے کما حقہ واقف ہونے کی دھن میں آخری عمر میں ہی لگ سکے-زین الدین عراقی اور حافظ ذہبی نے ان کی کتب خاص طور پر احیاء العلوم کی احادیث میں سے بہت سی احادیث کے بارے میں فرمایا ہے:"**لم اجدلہ سنداً**" (میں نے اس کی سند نہیں پائی) مگر اس کے باوجود اخیر سالوں میں امام صاحب حدیث کے مطالعے میں مصروف ہوگئے-امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

'والمقصو دھنا ان کتب ابی حامد وان کان یذکر فیھا کثیراً من کلامھم الباطل،امابعبارتھم اولعبارۃ اخری،فھوفی آخرعمرہ یبالغ فی ذمھم ویُبین ان طریقھم قد ضمنہ من الجھل والکفر مایو جب ذمھا،وفسادھا اعظم من طریقۃ المتکلمین،ومات وھو مشتغل بہ "البخاری ومسلم"(۴۳)

چونکہ علماے حدیث،ذاتی تجربات کی جگہ پر قرآن وسنت کے زیادہ پابند رہنا چاہتے ہیں اس لیے وہ اگر کسی صوفی کے خیالات کو اس کے کشف کی روشنی میں جو سامنے آتے ہوں، اہل سنت کے نظریات کے خلاف سمجھتے ہوں،تو وہ اس کو"صوفی کے سکر کی پیداوار" سمجھتے ہیں-اور وہاں وہ علما کے موقف کو ہی درست سمجھتے ہیں،جیسا کہ حضرت مجدد الف ثانی نے لکھا ہے:

"حق بجانب علماء اہل حق خواست **شکر اللہ سعیھم** زیرا کہ علوم علماء مقتبس از مشکوٰۃ نبوت است **علی صاحبھا الصلواۃ والسلام والتحیۃ** کہ موید است بوحی قطعی،ومقتدائے معارف ابن صوفیہ کشف والھام است کہ خطارا بوے راہ است ومصداق صحت کشف والھام مطابقت است باعلوم علماء اھل سنت،اگر سر موئے مخالفت است از دائرہ صواب بیرون است-" (۴۴)

یعنی"حق علمائے حق کے ساتھ ہے-چونکہ ان کا علم مشکوٰۃ نبوت سے حاصل شدہ ہے اور نبوت کو وحی الٰہی کی تائید حاصل ہے جبکہ صوفیہ کے علوم ومعارف کا ذریعہ کشف والہام ہے جس میں غلطی کا امکان ہے-اس لیے کشف والہام کے صحیح ہونے کا معیار ان کا علمائے اہل سنّت کے علوم سے مطابق ہونا ہے-اگر اس کے خلاف ذرا سی بھی بات ہوتو وہ دائرہ صواب سے خارج ہوگی-"

اس سے بڑھ کر شیخ مجدد نے ایک اور بات لکھی ہے: وہ یہ کہ"علوم لدینہ کی درستی کا معیار یہ ہے کہ وہ علوم شریعت کے مطابق ہوں-اگر ان میں معمولی سا بھی تجاوز پایا جائے تو سکر کا نتیجہ سمجھا

جائے گا-حق صرف وہ ہے جسے علمائے اہل سنت و جماعت نے حق تسلیم کرلیا ہے-اس کے علاوہ سب الحادو زندقہ ہے اور سکر وغلبہ حال کا نتیجہ ہے-"

"علامت درستی علوم لدینہ مطابقت است بہ صریح علوم شرعیہ اگر سر موتجاوز است از سکر است،"**الحق ماحققہ العلماء من اھل السنۃ والجماعہ وماسوی ذلک اما زندقۃوالحاداوسکر وقت وغلبۃ حال**" (۴۵)

اگرچہ شاہ صاحب چوتھی صدی ہجری کے بعد اجتہاد مطلق کے دروازے کو مسدود مانتے ہیں لیکن خود شاہ صاحب نے"الانصاف" (ص۶۲) میں لکھا ہے کہ"ایک سے زیادہ ائمہ نے اس کی تشریح کی ہے کہ علامہ جلال الدین سیوطی،امام الحرمین اور امام غزالی اجتہاد مطلق کے مرتبے کو پہنچے ہوئے تھے-"(۴۶)

غزالی کی شخصیت اسلام میں سب سے زیادہ ممتاز ہے-ان کی تعلیم ان کی شخصیت کی تصویر ہے-انھوں نے مذہب کے اصل مسئلہ کی تہہ تک پہنچنے میں اپنے ہم عصر فلسفیوں سے زیادہ کوشش کی ہے-چونکہ ان کے پیشرو فلسفی یونانیوں کی طرح عقل پرست تھے اس لیے وہ مذہب کی تعلیم کو محض تخیل یا شارع کی من گھڑت سمجھتے تھے-اس کے نزدیک مذہب یا تو آنکھ بند کرکے اطاعت کرنے کا نام تھا یا علم کے جو ادنیٰ درجے کی حقیقت کا حامل تھا-بہ خلاف اس کے غزالی مذہب کو انسان کی قلبی واردات پر مبنی سمجھتے ہیں-وہ ان کے نزدیک حکمت اور شرع دونوں سے برتر ہے اور اصل میں ایک روحانی کیف ہے"-(۴۷)

مذہب کو صرف بحث وتمحیص اور گفتگو کا موضوع بنانے کے بجائے امام غزالی اس کو ایک روحانی حقیقت کا نام دیتے ہیں-اور اس روحانیت کی دریافت کو مذہبی تجربہ (Religious Experience) کا مرہون منت سمجھتے ہیں-

"مجھ پر کھل گیا کہ خاص الخاص باتیں ان کے طریقے کی وہ ہیں جو سیکھنے سے نہیں آسکتی ہیں بلکہ وہ درجہ ذوق وحال وتبدیل صفات سے پیدا ہوتی ہیں-غرض مجھے یقین ہوگیا کہ صوفیہ صاحب حال ہوتے ہیں نہ کہ صاحب قال اور جو کچھ طریق تعلیم سے حاصل کرنا ممکن تھا وہ میں نے سب حاصل کرلیا اور بجز اس چیز کے جو تعلیم اور تلقین سے حاصل نہیں ہوسکتی- بلکہ ذوق اور سلوک سے حاصل ہوسکتی ہے،اور کچھ سیکھنا باقی نہ رہا"-(۴۸)

غزالی اپنے زمانے کی ذہنی تحریکوں پر نظر ڈالتے ہیں تو انھیں چار چیزیں نظر آتی ہیں-علماے دین کا علم کلام، صوفیوں کا علم باطن، فیثا غورثی عوام پسند فلسفہ اور اشراقی ارسطا طالیت-علم کلام جس بات کو ثابت کرنا چاہتا ہے- وہی غزالی کا بھی عقیدہ ہے البتہ متکلمین کی دلیلیں انھیں کمزور اور ان کے اکثر اقوال محل تامل معلوم ہوتے ہیں-سب سے زیادہ قلبی تعلق انھیں صوفیوں کے علم باطن سے ہے اور یہی بنیاد ہے ان کے عظیم الشان کارنامے کا- انھوں نے مذہبی عقیدے کا دارومدار شخصیت پر رکھا-چنانچہ جس چیز کو متکلمین معقولات سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اسے غزالی باطنی واردات کی حیثیت سے بلا تامل قبول کر لیتے ہیں-عوام پسند فلسفے سے بھی انھوں نے کچھ فائدہ اٹھایا ہے یعنی ریاضی کے فن سے جسے وہ یقینی علم قرار دیتے ہیں اور اس کے فلکیاتی نتائج سے-طبیعیات کو وہ صرف اس حد تک مانتے ہیں جہاں تک اس میں عقائد کی مخالفت نہ ہو-لیکن ارسطو کا فلسفہ جس حیثیت سے کہ فارابی اور ابن سینا نے اس کی تعلیم دی تھی، انھیں اسلام کا دشمن نظر آتا ہے-اور اس سے وہ تمام اسلامی مذاہب سے یعنی سواد عظیم کے نقطہ نظر سے جنگ کرنا چاہتے ہیں اور وہ بھی خود ارسطو کے ہتھیار یعنی منطق سے، کیوں کہ منطق کے اصول بھی ان کے نزدیک اسی قدر مستحکم ہیں جتنے ریاضی کے مسائل--'' (ص۱۱۸دوبور) غزالی نے اگرچہ یونانی فلسفے میں طبیعیات، منطق وغیرہ کو بے ضرر قرار دیا ہے-مگر مابعدالطبیعیات کے بارے میں بہت سخت لب ولہجہ اختیار کیا ہے-اور یہ دراصل اسی مابعد الطبیعیات کے خلاف غزالی کی علمی اور کلامی جنگ ہے، جس نے امام صاحب کو عظیم اسلامی مفکر بنا دیا ہے- حالانکہ یہ جنگ بھی وہ یونانی فلسفے کی ایک شاخ یعنی منطق کے ذریعے سے ہی لڑنا چاہتے تھے-اور منطق کے بارے میں غزالی کا خیال تھا کہ فقہ اور دینیات میں اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے- حالانکہ امام ابن تیمیہ نے فلسفے کے دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ منطق کو بھی اپنی سخت ترین تنقید کا نشانہ بنایا ہے-اور نقضِ منطق اور **الرد علی المنطقیین** دونوں کتابوں میں غزالی پر منطق کے ساتھ اس غیر معمولی انہماک کی وجہ سے بہت زیادہ متہم کیا ہے-دوبوئر نے بڑی اہم بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ غزالی کی دینیات فلسفیانہ غور وفکر کے اثر سے خالی نہیں ہے-انھوں نے یورپ کے آبائے کلیسا کی طرح خواہ جان کر یا بے جانے ہوئے بہت سے فلسفیانہ عناصر اپنے یہاں داخل کر لیے ہیں-اسی لیے مغرب کے مسلمان عرصے تک ان کی دینیات کو بدعت کہہ کر ان پر کفر کا الزام لگاتے

رہے-اس میں شک نہیں کہ ان کی جو تعلیم خدا، طبیعیت اور روح انسانی کے متعلق ہے اس میں ایسے عناصر موجود ہیں جو قدیم اسلام میں نہ تھے-اور کچھ تو مسیح اور یہودی فلسفیوں کے اور کچھ عہد متوسط کے مسلم حکما کے واسطے سے، ثنوی فلسفے سے اخذ کیے گئے ہیں-'' (۴۹)

حقیقت یہ ہے کہ غزالی نے فلسفہ کا مطالعہ اتنے انہماک اور یک سوئی کے ساتھ کیا تھا کہ ہزار کاوشوں کے باوجود وہ اس کے اثرات سے اپنے آپ کو آزاد نہ کر سکے- یہی وجہ ہے کہ امام غزالی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ابوعلی سینا کی کتاب الشفاء نے ان کو بیمار کر دیا اور بعض لوگوں نے غزالی کے اضطراب اور بے چینی کے دور کو ان کے فلسفیانہ، پیچ وتاب کا حامل قرار دیا ہے-

غزالی ہر جگہ تجربے اور مشاہدے پر زور دیتے ہیں متکلمین کے مقابلے میں بھی اور فلسفیوں کے مقابلے میں بھی- عمومی تصورات کی مدد سے یہ لوگ عالم محسوسات کی کثرت کا احاطہ نہیں کر سکتے -مثلاً اشیاء کی محسوس صفات اور ستاروں کے شمار کا علم عین مشاہدے کے ذریعہ سے ہوتا ہے-نہ کہ تصورات محض سے- اس سے بھی کم یہ تصورات ہمارے باطنی نشیب وفراز کا احصاء کر سکتے ہیں-عالم کے استدلالی فہم سے وہ چیز ہمیشہ پوشیدہ رہتی ہے جسے عارف وجدان کے ذریعے معلوم کر لیتا ہے-بہت کم لوگ علم کی اس بلندی پر پہنچتے ہیں جہاں انھیں انبیاء اور مرسلین پہنچا دیتے ہیں-چنانچہ ادنیٰ درجے کی عقل رکھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ ان کی پیروی کریں-(۵۰) غرض غزالی کو جو ماحول پسند آیا وہ صوفیہ کا ماحول تھا- وہ صرف ان ہی کے علم وعمل سے متاثر تھے-غزالی کو صوفیہ کا دامن عمل دنیا طلبی کے داغ دھبوں سے پاک نظر آیا-اس لیے ان کے مسلک تصوف پر بھروسہ کرنا اور ان کے جادۂ عمل پر گامزن ہو، نا انھوں نے اختیار کیا-(۵۱)

غزالی کی تمکین اس دنیا کو خاطر میں نہیں لاتی تھی-لیکن یہ تمکین گہری حقیقت رکھتی تھی-ایک بار بیماری کی حالت میں انھوں نے چشم باطن سے اس خدمت کو دیکھ لیا جس کے لیے انھیں خدا نے پیدا کیا تھا- انھیں القا ہوا کہ خلوت میں صوفیانہ ریاضت کے ذریعے سے اس کی تیاری کرو، تاکہ آگے چل کر مذہبی سیاسی مصلح کی حیثیت سے ظہور کر سکو-(۵۲)

امام غزالی فرماتے ہیں: ''اس کا تمام تر طریقہ یہ ہے کہ نفس جس چیز کی بھی خواہش کرے اور جدھر بھی مائل ہو سب میں اس کی مخالف روش اختیار کی جائے''-(۵۳) اسی طرح تکبر اور غرور نفس کو توڑنے کے لیے انھوں نے بھیک مانگنے کا علاج تجویز کیا ہے- تاکہ عزتِ نفس کا مادہ

خاک میں مل جائے:

لکھتے ہیں:''نفس کی عزت اور بڑائی اسے ذلیل کیے بغیر نہیں ٹوٹ سکتی اور بھیک مانگنے سے بڑھ کر ذلت اور پستی کی بات کوئی نہیں ہوسکتی۔''(احیاءعلوم،ص:۲۶۱)

امام غزالی کہتے ہیں کہ کچھ وقت تک بھیک مانگنے کا عمل جاری رکھا جائے تاکہ تکبر اور غرور نفس کا نام ونشان نہ رہے۔(۵۴) غرض خودداری اور عزت نفس کو خاک میں ملانے کے تمام ممکنہ طریقے اپنائے جاسکتے ہیں، شرط صرف یہ ہے کہ علاج کارگر ہو اور حبِّ جاہ وریاست سے نجات دلانے میں مددگار ثابت ہو(غلام قادر لون ص۲۶۱ مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۹۴، مطالعہ تصوف)

امام غزالی کی ہمہ گیر شخصیت کا ایک عمومی تعارف دیتے ہوئے مشہور مستشرق ڈیبور لکھتا ہے۔اس پورے نظام فلسفہ کا جو مشرق میں یونانی حکمت کی بنیاد پر قائم ہوا گہرا اور کلّی مطالعہ کرنے کے بعد اسے رد کرنے کی کوشش غالباً غزالی سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔۔جس کام کو غزالی نے ہاتھ میں لیا تھا اس کا ایک ایجابی پہلو بھی تھا۔اسلام میں علاوہ علم الکلام کے جس کا مقصد عقائد کی توجیہ اور انھیں عقل سے مطابقت دینا تھا،تصوف بھی موجود تھا جسے اذعانی عقیدے کے باطنی اور احساسی پہلو سے سروکار تھا۔اسلیے اس سے بحث نہ تھی کہ عقائد کے معنی سمجھائے یا انھیں دلائل سے ثابت کرے بلکہ ان کا روحانی اور وجدانی تجربہ کرنا چاہتا تھا۔۔۔''(۵۵) دی بوائر کے نزدیک یورپ میں غزالی کو جو کچھ بھی فضیلت حاصل ہے وہ فلسفہ کے علوم پر تنقید ہی کی بنا ہے اور تاریخ فلسفہ میں ایک صاحب غور وفکر اور اہل نظر فلسفی کی حیثیت سے ان کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے(تاریخ فلسفہ اسلام فلسفہ کا نتیجہ مشرق میں: غزالی ص۔۱۲۴،ترجمہ مرزا محمد ہادی)

جس طرح غزالی نے بہت سارے دوسرے مسلمان اور غیر مسلم فلاسفہ اور مفکرین کو متاثر کیا ہے۔اسی طرح شاہ ولی اللہ دہلوی کو بھی بڑی حد تک متاثر کیا۔کیونکہ غزالی سے ہی شاہ صاحب نے اسلام کے مختلف پہلوں کی عقلی تعبیر وتعریف کا ہنر اخذ کیا۔(۵۶)

غزالی کے علوم فلسفہ سے شغف کا محرک بقول دوبوائر''خالص ذوق علم نہ تھا بلکہ عقلی سلوک کو حل کرنے کی تمنا جوان کے دل میں بسی ہوئی تھی۔ان کا مقصود نہ تو آفرینش عالم کا سراغ لگانا تھا۔اور نہ اپنی قوت خیال کی ماہیت معلوم کرنا، بلکہ اطمینانِ قلب اور معرفت الٰہی حاصل کرنا تھا''۔(۵۷)

دوسری بات یہ ہے کہ امام نے فلسفہ کی تحصیل صرف اس لیے کی کہ فلاسفہ کے ملحدانہ

اعتراضات کے جواب دیں۔انھوں نے فلسفہ کی غلطیاں دکھائیں اور ان غلطیوں پر فلسفیوں کے انداز ہی پر دلیلیں قائم کیں۔ورنہ فلسفہ وحکمت ان کا اکتسابی اور ثانوی فن تھا اور خود ان کے نقطہ نظر سے یہ ان کی زندگی کا کوئی اہم مقصد نہ تھا۔(۵۸)

غزالی عقل کے ذریعے معلوم شدہ علوم میں شک کرتے ہیں مگر یقین کرتے ہیں کہ معرفت اس نور سے حاصل ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ قلب میں ڈال دیتا ہے۔یہاں ذکی مبارک ایک اہم بات کہتا ہے:۔

''دیکارت شک میں گھرا رہا۔امام غزالی نے اس کو صاف کردیا۔''(۵۹)

ایک اہم موضوع جس پر امام غزالی اور شاہ ولی اللہ دہلوی نے بات کی ہے۔وہ علم اور ذرائع علم سے متعلق ہے، شاہ ولی اللہ دہلوی نے وجدان کو ان تمام اقسام علوم کے ساتھ رکھ کر بڑی اہمیت کا حامل قرار دیا ہے۔جن کو یونانی فکر سے متاثر فلاسفہ نے برتا ہے۔مثلاً الخیر الکثیر میں شاہ صاحب نے حسی علم،تخیل،ظن وتخمین اور عقل وفکر جیسے تمام ذرائع علم کا تقابلی موازنہ کرنے کے بعد وجدان کی اہمیت اور افادیت پر تفصیل کے ساتھ بات کی ہے۔یونانی فلاسفہ کی طرح شاہ صاحب علم بالحواس کو ناقابل بھروسہ قرار دیتے ہیں۔مگر سابقہ مسلم فلاسفر جیسے غزالی کی طرح شاہ صاحب عقل کو اس لائق قرار دیتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے عملی معاملات اور اللہ تعالیٰ کے ان مقاصد علیہ کو سمجھنے کی کوشش کی جائے،جو مخلوقات کی پیدائش کے پیچھے کارفرما ہوسکتے ہیں۔فارابی اور ابن سینا نے جو اہمیت قوت تخیل کو دی ہے،جہاں پیغمبرانہ وجدان تمثالات اور ایمان کی صورت میں سامنے آتا ہے،مگر جن کو علمی اور وقوفی زبان میں اچھی طرح سے بیان پیش کیا جاسکتا ہے،شاہ صاحب اس خیال سے زیادہ اختلاف نہیں کرتے ہیں۔کیونکہ شاہ صاحب کے نزدیک وجدان ایک پراسرار طاقت کا نام ہے جو عقل کے دائرے سے باہر ہے اور یہ اس خدائی حقیقت کو منتظم تمثالات اور رمزوکنایات کے ذریعے سے ظاہر کرسکتا ہے۔(۶۰)

"Like the Greeks, he finds sensation unrealiable and like earlier Islamic philosophers such as Al-Ghazali, he asceibes to reason the power to deal with practical matters and issues relating to understanding Gods.purpose of human beings."(Rahimuddin Kemal and Salim Kemal, Shah Wali Allah, chapter 37, in History of Islamic Philosophy, part I,edited

by Seyyed Hossein Nasr and Oliver leaman, Routledge London and New york,1996,p-665)

چنانچہ امام غزالی اور شاہ ولی اللہ دہلوی کا خاص موضوع علمیات اسلام کی ایک ایسی تشریح وتعبیر ہے،جس سے اسلام کی عظمت ظاہر ہونے کے ساتھ ساتھ مخالفین اسلام کے اعتراضات کا کافی وشافی جواب بھی سامنے آجاتا ہے اس لیے ہم ان دونوں بزرگوں کے ان خیالات کا خلاصہ پیش کریں گے جوانہوں نے نبوت کی حقیقت کو ذہن نشین کرانے کے لیے فلسفیانہ دلائل وبراھین کے بل بوتے پر ظاہر کیے ہیں-امام غزالی نے معارج القدس اور شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے-''چونکہ یہ دونوں بزرگ تصوف فلسفہ اور نقلیات تینوں کو چوں سے باخبر ہیں-اس لیے یہ جو کچھ بتائیں گے-اس میں کچھ کچھ ذاتی ذوق ومشاہدہ کا حصہ بھی شامل ہوگا-'' (مولانا سید سلیمان ندوی،سیرت النبی ﷺ،جلد چہارم منصب نبوت مطبع معارف اعظم گڈھ ۱۹۸۶ء ص:۴)امام صاحب فرماتے ہیں:

''نبوت انسانیت کے رتبہ سے بالاتر ہے،جس طرح انسانیت حیوانیت سے بالاتر ہے، ...وہ عطیۂ الٰہی اور موہب ربانی ہے سَعی ومحنت اور کسب وتلاش سے نہیں ملتی-اللہ تعالیٰ فرماتا ہے-

اللہ اعلم حیث یجعل رسلتہ- (۶۱)

''اللہ بہتر جانتا ہے کہ جہاں وہ اپنی پیامبری کا منصب بنائے-'' **وکذلک او حینا الیک روحا من امرنا ماکنت تدری ما الکتب ولا الایمان ولکن جعلناہ نورا نہدی بہ من نشاء من عبادنا**- (۶۲)

ترجمہ:اوراس طرح ہم نے تیرے پاس اپنے حکم سے ایک روح بھیجی تو پہلے نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے لیکن اس کو ہم نے ایک نور بنایا ہے جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں راہ سوجھائیں-

گویہ صحیح ہے کہ عبادات وریاضات نفس میں آثار وحی کے قبول کرنے کی استعداد پیدا کردیتے ہیں اس کے باوجود نبوت کا منصب خاص محض اتفاقی نہیں جو محنت وکوشش سے کسی کو حاصل نہیں ہوسکتا ہے-یہ صحیح ہے کہ اکثر پیغمبروں نے آغاز وحی سے پہلے ایک زمانہ تک عبادات ومراقبہ میں وقت بسر کیا کبھی ایک ایک مہینہ ایک ایک چلّہ اس طرح گزارا کہ وہ مادی دنیا کی

آرائشوں سے یکسر الگ ہوگئے-چنانچہ رسول اللہ نبوت سے پہلے غارِحراء میں جاکر عبادت میں مشغول ہوتے تو رویائے صادقہ دیکھنے لگے جس کی سچائی مثل سپیدۂ صبح کے صاف نمایاں ہوتی تھی-وحی کے بعد بھی آپ اس قدر عبادت میں مصروف رہتے تھے کہ آپ کے دونوں پاؤں سوج جاتے تھے-اس عبادت وریاضت کے ساتھ،نبوت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے حامل میں نسب،کرم اخلاق،نیک طینتی،متانت وغیرہ یہ خصائل حمیدہ موجود ہوں (۶۳) وہ گمراہی وبے راہ روی سے پاک ہوتا ہے-تمام دنیا کی قوتیں اس کی قوت کے سامنے بالآخر طوعاً وکرھاً سرنگوں ہوجاتی ہیں-انبیا کو اپنے نفوسِ قدسیہ کی بنا پر تمام انسانوں پر برتری حاصل ہوتی ہے-وہ دوسروں کو راست سُجھاتے اور خود راہِ راست پر قائم رہتے ہیں ان کی پیغمبرانہ عقل وفہم تمام انسانی عقلوں سے بالاتر ہوتی ہے-اور ان کو وہ ربانی خصوصیت حاصل ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ تمام انسانی نفوس کی تربیت وتزکیہ کا فرض انجام دیتے،ان پر قابو پاتے اور ان کو کام میں لگاتے ہیں-جس طرح انسانوں کے عجیب وغریب کام حیوانوں کو حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں-اسی طرح پیغمبروں کے عجیب وغریب کام انسانوں کو معجزہ نظر آتے ہیں-(۶۴)

انسانوں کے ساتھ بشریت اور انسانیت میں برابر کا شریک ہونے کے باوجود عقلیت ومعنویت میں وہ ان سے بالکل الگ ہوتے ہیں-کیونکہ ان کے اندر وحی کے قبول کرنے کی جو صلاحیت ہوتی ہے وہ دوسرے انسانوں میں نہیں ہوتی ہے-(۶۵) غزالی کی ہی طرح شاہ ولی اللہ دہلوی نے نبوت کے بارے میں اپنے خیالات کو پیش کیا ہے-وہ فرماتے ہیں:

''واضح ہو کہ انسانی طبقوں میں سب سے اعلیٰ درجہ کے لوگ اہل فہم ہیں،یہ لوگ اہل اصطلاح ہوتے ہیں ان کی ملکی قوت نہایت بلند ہوتی ہے یہ لوگ حقانی خواہش سے انتظام مقصود کے قائم کرنے پر آمادہ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ملاء اعلیٰ سے(ان پر) احوال الٰہیہ نازل ہوتے ہیں''-(۶۶) وہ سب لوگوں سے زیادہ راہِ راست کا التزام رکھنے والے،عبادت میں مصروف رہنے والے،لوگوں کے ساتھ معاملات میں انصاف کرنے والے،منفعتِ عام کی رغبت رکھنے والے،بے ضرر،عالم غیب کی طرف ہمیشہ متوجہ وراغب،عالم غیب سے تائید حاصل کرنے والے،ادنیٰ سی ریاضت سے ایسا قرب اور تسکین پانے والے جو دوسروں کو بڑی عبادت اور ریاضت سے حاصل نہ ہو-غرض جب حکمت الٰہی کا اقتضا ہوتا ہے کہ وہ کسی مفہوم کو لوگوں کی طرف

بھیجے تو اس شخص کے ذریعے سے لوگوں کوظلمت سے نور کی طرف دعوت دی جاتی ہے- اور بندوں پر خدا کا فرض ہوتا ہے کہ اپنی زبانوں اور دلوں سے اس کے آگے سربہ تسلیم ہوں- ملاء اعلیٰ کو اس کی تاکید ہوتی ہے کہ اس کے فرماں بردارر ہیں اور ان کے فرمانبرداروں سے خوشنود ہو کر ان کے شریک رہیں اور جو اس کی مخالفت کرے اور عداوت سے پیش آئے اس پر لعنت کریں اور اس سے علیحدگی کریں- دراصل اللہ پیغمبروں کے ذریعے سے کسی قوم کی ترقی اور دوسری قوم کی تنزلی کا اہتمام بھی فرماتا ہے''-(۶۷)

شاہ صاحب بڑی اہم بات کا تذکرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انبیاء کو''گو براہِ راست جسم وجسمانیات سے تعلق نہیں ہوتا بلکہ صرف دل اور قلب وروح کے عالم سے سروکار ہوتا ہے،تاہم اس دل اور قلب وروح کی اصلاح کے لیےجسم وجسمانیات کی کسی قدر اصلاح بھی اس حدتک ان کے فرائض میں داخل ہے- جہاں تک کہ ان کو دل اور قلب وروح کے کاموں کی اصلاح میں اس کی ضرورت معلوم ہوتی ہے''-

حوالہ جات

(1) Zafar Ishaq Ansari Prof. in Mahmood Ahmad Ghazali, Islamic Renaissance in South Asia New Delhi: Adam publishers P-Xiii

۲- ابوالحسن علی ندوی:'' منصب تجدید کی حقیقت اور تاریخ تجدید میں شاہ ولی اللہ کا مقام'' الفرقان بریلی،شاہ ولی اللہ نمبر مرتبہ محمد منظور نعمانی ص:۹۱-۱۹۴۱

۳- مولانا مودودی حوالہ سابقہ ص:۶۹

۴- مولانا مودودی ص:۶۹

۵- عبیداللہ فہدفلاحی، تاریخ دعوت وجہاد برصغیر کے تناظر میں، ہندوستان پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۹۶ ص:۱۲۹-۱۳۲

۶- مولانا مودودی ص:۱۷

۷- عبیداللہ فہدفلاحی،حوالہ سابق ص:۱۳۱

(8) Mahmood Ahmad Ghazali, The Role of Shah Waliullah and his Successors, M.A. Ghazali, Islamic Renaissance in South Asia New

Delhi: Adam publishers -2004,p-86

(9) Chazzali Mahmood:P-37

۱۰- حجۃ اللہ البالغہ اردو ترجمہ: عبدالحق حقانی کتب خانہ دیو بند ص:۴۴، ۱۳۰۲ھ

۱۱- حجۃ اللہ البالغہ ص:۴۸-۴۹ حوالہ سابقہ

۱۲- ص:۴۹

۱۳- پروفیسر محمد اجتبا ندوی، تاریخ فکر اسلامی ، المرکز العلمی ، نئی دہلی، ۱۹۹۹۸ ص:۱۴۶

۱۴- علم الکلام جلد اوّل ص:۸۷

۱۵- تذکرہ مرتب مالک رام، ساہتیہ اکادیمی نئی دہلی ص:۲۶۷-۲۶۸

۱۶- ص:۳۸ حوالہ سابقہ

(17) Mahmood Ahmad Ghazali,opcit p-163

۱۸- مولانا محمد حنیف ندوی،تعلیمات غزالی اسلامک بک فاؤنڈیشن،نئی دہلی ۱۹۸۹ ص:۲

۱۹- مولانا عبدالسلام ندوی ، حکمائے اسلام اوّل ، حصہ اوّل ، مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۵۳ صفحات:۳۹۷-۳۹۸

۲۰- محمد حنیف ندوی صفحات ۸۴-۸۵

۲۱- عبداللہ ندوی حوالہ سابقہ صفحات:۴۰۴-۴۰۵

۲۲- مولانا محمد حنیف ندوی حوالہ سابقہ ص:۸۵۸

۲۳- الغزالی ص:۱۲

(24) (Translators' Introduction,the Concuusive Argument from God,vol.I.Hermansen) P-xvi-xvii(Marcia K.Hermansen,Islamic Research Institute, International Islamic University, Islamabad, 2003 PP-xvi-xvii)

۲۵- ایضا

۲۶- حجۃ،ص:۲۱،جلد دوم

۲۷- ص:۱۲۶-۱۲۷

۲۸- ایضاً:ص:۱۲۵

۲۹- ایضاً:ص:۱۲۴

۳۰ مجموعہ رسائل امام غزالی جلد سوم فیصل پبلیکیشنز دیوبند-۲۰۰۷ص: ۱۴۷

۳۱- حجۃ اللہ البالغہ-ص:۸۳

۳۲- **النظر فی بعض مسائل الامام الھمام ابو حامد محمد الغزالی من العبدالمفتقر الی اللہ الصمد**-مطبع فیض عام ص:۱۱

۳۳- مجموعۂ رسائل امام غزالی جلد سوم ص: ۵۰۰-۵۰۱

۳۴ ص:۵۰۲

۳۵ النظر حوالہ سابقہ-ص:۹

۳۶ صفحات ۶۱-۶۲

۳۷ مجموعہ رسائل امام غزالی (کلام فلسفہ) جلد سوم محمد نوید صدیقی، فیصل پبلیکیشنز، دیوبند، ۲۰۰۷ص: ۱۷۹-۱۸۰

۳۸ اسائل غزالی حوالہ سابقہ حواشی نمبر اصفحات ۱۷۹-۱۸۰

۳۹- **نزھۃ الخواطر** -جلد ششم ص:۴۰۲

۴۰ شاہ ولی اللہ نمبر ص:۲۰۷-۲۰۸

۴۱- ولی اللہ نمبر ص:۳۴۱

۴۲- ابن تیمیہ، **نقض المنطق**، مصحح: محمد حامد الفقی مکتبہ السنۃ المحمدیہ قاہرہ ۱۹۵۱،صفحات ۵۲-۵۶

۴۳- **کتاب الرد علی المنطقیین**،محمد علی روڈ،ص ۱۹۷

۴۴- مکتوبات شیخ احمد سرہندی،تحقیق نور محمد لاہور ۱۹۶۴ جلد سوم،مکتوب

۴۵- مکتوبات جلد ا،مکتوب نمبر ۱۳،ص ۱۰۰،بحوالہ ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری،تصوف اور شریعت،مترجم مشتاق تجاروی مرکزی مکتبہ دہلی ۲۰۰۴ص ۱۰۱-۱۰۲

۴۶- ضیاء الحسن فاروقی مشیر الحق:فکر اسلامی کی تشکیل جدید،ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ،نئی دہلی-حضرت شاہ ولی اللہ کا نظریہ اجتہاد،مولانا سعید احمد اکبر آبادی ص ۲۸۴)

۴۷- **المنقذ مِن الضلال** مجموعہ رسائل جلد سوم حصہ دوم ص ۲۴۱

۴۸- ص:۱۲۲

۴۹- ص:۱۲۲

۵۰- ڈاکٹر سید حسن قادری شور،حوالہ سابقہ ص ۹۹

۵۱- ص:۱۱۷

۵۲- احیاء علوم الدین حصہ سوم،ص ۶۰

۵۳- احیاء علوم،ص ۲،جلد سوم

۵۴- ص ۱۱۵- تاریخ فلسفہ اسلام ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین

۵۵- History of Muslim philosophy,vol.ii,p-1559,New Delhi. عبدالحمید صدیقی

۵۶- ص:۱۱۶

۵۷- ڈاکٹر سید حسین قادری شور،امام غزالی کا فلسفہ مذہب واخلاق، ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی ۱۹۷۷،ص:۱۶۳

۵۸- **الاخلاق عند الغزالی** ،ص:۳۷۷،مطبع الرحمانیہ حصر ۱۹۲۴

۵۹-ایضا

۶۰- انعام-۱۵

۶۱- شوریٰ:۵

۶۲- سورہ نجم:۱

۶۳- سلیمان ندوی حوالہ سابقہ ص 7

۶۴- کہف:12

۶۵- ص:207، حجۃ اللہ البالغہ حوالہ سابقہ،حصہ اول

۶۶- ایضاً ص:209

۶۷- سلیمان ندوی حوالہ سابق ص:33

○○○

ڈاکٹر مشھد العلاف
ترجمہ: مولانا اظہار احمد مصباحی

امام غزالی کی طرف غلط منسوب شدہ کتب و رسائل

ڈاکٹر مشہد العلاف کی یہ تحریر www.ghazali.org سے لی گئی ہے- اس ویب سائٹ پر غزالیات پر بہت سے مواد ہیں- یہ تحریر نہایت منفرد اور علمی ہے، گو کہ اس کے بعض مندرجات سے اہل علم کو اختلاف بھی ہوگا- ہم امید کرتے ہیں کہ اہل علم اس سلسلے میں اپنی متوازن آرا سے ادارے کو نوازیں گے- (ادارہ)

(۱) سر العالمین و کشف ما فی الدارین:

محققین حضرات اس پر متفق ہیں کہ یہ کتاب امام غزالی کی نہیں ہیں بلکہ ان کی طرف منسوب کر دی گئی ہے جیسا کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اپنی کتاب تحفۂ اثنا عشریہ ص: ۸۷ پر فرمایا ہے کہ یہ کتاب امام غزالی کی طرف غلط منسوب کی گئی ہے، اور یہی رائے بدوی کی بھی ہے، اور ایسی ہی رائے مستشرقین کی بھی ہے جیسے، (گولڈزیہر، بوتیج، مکڈونالڈ)، بدوی ص: ۲۷۱

میں کہتا ہوں کہ یہ کتاب امام غزالی کی طرف باطنیوں اسماعیلیوں کی طرف سے غلط منسوب کی گئی ہے اس کے چند واضح اسباب ہیں جنھیں ہم بیان کرتے ہیں:

پہلا سبب: امام ذھبی نے اپنی کتاب سیر اعلام النبلاء کی جلد ۱۹/ص ۳۲۸ پر یہ عبارت نقل کی ہے "**و لابی مظفر یوسف سبط ابن الجوزی فی کتاب " ریاض الافهام ، فی مناقب اهل بیت قال :ذکر ابو حامد فی کتاب "سر العالمین و کشف ما فی الدارین" و سرد کثیرا من هذا الکلام الفشل الذی تزعمه الامامیة وما ادری ما عذره فی هذا ؟ هٰذا ان لم یکن و ضع هٰذٰ وما ذاک ببعید، ففی هذا التالیف بلایا تتطبب**"-

یہ عبارت اس بات پر صراحتا دلالت کرتی ہے کہ امام ذھبی کتاب کو امام غزالی کی طرف منسوب کرنے میں مشکوک ہیں اور ان کی رائے میں یہ کتاب ان پر گڑھی گئی ہے، البتہ یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ ابن جوزی کے نواسے نے خود اپنی طرف سے ان پر گڑھ دیا ہو کیوں کہ وہ کہتے ہیں، **هٰذا ان لم یکن هٰذٰ و ضع هٰذٰ و ما ذاک ببعید** - یہ اس صورت میں ہے کہ انہوں (سبط ابن جوزی) نے خود اسے نہ گڑھا ہو، اور یہ بات (سبط ابن جوزی کا خود سے گڑھنا) بعید نہیں

دوسرا سبب: سر العالمین کے مؤلف، ابو العلا معری کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وانشدنی المعری لنفسه و انا شاب فی صحبة یوسف بن علی شیخ الاسلام
(رسائل الغزالی)

(معری نے یہ اشعار اپنے لیے گنگنائے اور اس وقت میں شیخ الاسلام یوسف ابن علی کی صحبت میں تھا اور جوان تھا اس کے بعد انہوں نے چند اشعار ذکر کیے ہیں)-

یہ ایک مشہور تاریخی حقیقت ہے کہ معری شاعر کی وفات ۴۴۸ھ میں ہوئی اور امام غزالی کی پیدائش ۴۵۰ھ میں ہوئی پھر کیسے اس نے وہ اشعار اپنے لیے گنگنائے ہیں، دوسری طرف ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ معری شاعر قیامت سے پہلے اپنی قبر سے اٹھ گیا ہو- (بدوی: ۲۷۲)

تیسرا سبب: اس کے مؤلف نے معری کے بارے میں لکھا ہے کہ شیخ ابوالعلاء المعری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے لیے یہ اشعار گنگنائے ؎

یاقومی اذنی لبعض الحی عاشقة   والاذن تعشق قبل العین احیانا
ان العیون التی فی طرفها مرض   قتلننا ثم لم یحیین قتلانا
یصرعن ذااللب حتی لاحراک به   وهن اضعف خلق الله ارکانا

(رسائل الغزالی جلد ۶/ص ۴۸)

اس عبارت میں دو تاریخی خطائیں سامنے آتی ہیں: پہلی خطا یہ ہے کہ اس کتاب کے مولف نے معری شاعر کو شیخ کے لقب سے ملقب کیا ہے اور یہ بات عقل سے ماورا ہے کہ امام غزالی جیسا فقیہ ایسے لوگوں کو شیخ کے لقب سے پکارے اور وہ بھی خاص طور سے معری شاعر کو جس پر کہ زندیق ہونے کی تہمت لگائی گئی ہے-

معری شاعر نے یہ شعر کہا ہے:

هفت النصاریٰ وحنیفة مااھتدت　　　ویھود حارت والمجوس مضللة

(نصرانی لغزش کھا گئے اور حنیفہ راستے سے بھٹک گئے - یہود سرگرداں ہو گئے اور مجوس گمراہ کرنے والے ہو گئے)

دوسری خطا یہ ہے کہ ہر وہ شخص جس کو مہارت نہیں بلکہ تھوڑی سی بھی علم وثقافت سے آشنائی ہو حتی کہ ثانوی اور ابتدائی درجہ کا طالب علم بھی جان لے گا کہ اوپر مذکور تینوں اشعار جریر کے ہیں معری کے نہیں ہیں-

چوتھا سبب: کتاب کے مولف نے حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما اور امامت کے موضوع کو بار بار ذکر کیا ہے اور انہوں نے دونوں حضرات کے درمیان ہوئے نزاع پر اور اس بات پر کہ حضرت امیر معاویہ خلافت کے مستحق نہیں، پر گہری نظر ڈالی ہے اور اسی سے یہ بات قطعی طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ باطنی اسماعیلیوں کی طرف سے حضرت امیر معاویہ کے خلاف سازش ہے، کیوں کہ مولف کتاب کے آخر میں مندرجہ ذیل عبارت نقل کرتے ہیں ملاحظہ ہو:

وقد سمعت کلاماً لمعاویة اذقال :ھموا بمعالی الامور لتنالوھا،فانی لم اکن للخلافة اھلا فھممت بھافنلتھا- (رسائل الغزالی جلد ۶/ص:۹۶)

یہی عبارت بعینہ مولف نے کتاب کے شروع میں ذکر کی ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ تم بڑے امور کا ارادہ کرو تو اس کو پالو گے جیسا کہ میں خلافت کا اہل نہیں تھا لیکن میں نے اس کا ارادہ کیا تو اس کو حاصل کر لیا، کتاب کے آخر اور اس کی ابتدا میں اس عبارت کی تکرار بغیر کسی سبب کے نہیں ہوئی ہے بلکہ واضح طور پر لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات ثابت کرنے کے لیے ہوئی ہے کہ حضرت امیر معاویہ خلافت کے اہل نہیں تھے اور یہ حقیقت میں مدح کے سیاق میں ان کی مذمت ہے-

پانچواں سبب: رسالہ پر عام طور سے شیعی رنگ کا غلبہ ہے جس کا اندازہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی شان میں غلو سے ہوتا ہے، مثال کے طور پر اس کمزور اقتباس کو ملاحظہ فرمائیں:

اس بات سے زیادہ تعجب خیز حدیث بلوقیا اور عفان کا قصہ ہے، ان دونوں کا قصہ طویل ہے، صرف اس کی طرف اشارہ کافی ہے، دونوں ایک سفر میں نکلے یہاں تک کہ دونوں ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں کہ سلیمان موجود تھے- بلوقیا ان کی انگلی سے انگوٹھی لینے کے لیے آگے بڑھا، فوراً

موکل اژدھا نے پھونک مار کر بالوقیا کو جلا دیا پھر عفان نے بالوقیا کو شیشی سے مارا تو وہ زندہ ہو گیا پھر اس نے دوسری تیسری بار ہاتھ بڑھایا تو اس نے اس کو تیسری بار کے بعد زندہ کر دیا پھر اس نے چوتھی بار ہاتھ بڑھایا تو جل کر ہلاک ہو گیا- اس پر عفان یہ کہتے ہوئے نکلا کہ شیطان ہلاک ہو گیا شیطان ہلاک ہو گیا اس پر اژدھے نے اس کو آواز دیا کہ قریب آؤ اور تم آزماؤ-

کیوں کہ یہ انگوٹھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے بعد انھیں کے ہاتھ میں جائے گی اور کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہیں جا سکتی، تم ان سے کہنا کہ عرش اعظم والوں نے آپ کی فضیلت اور آپ سے پہلے کے نبیوں کے بارے میں اختلاف کیا ہے تب اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں پر آپ کو چن لیا، پھر مجھے حکم دیا تو میں نے سلیمان کی انگوٹھی کو چھین لیا اور اس کو لے کر میں آپ کے پاس آیا ہوں- رسول اللہ ﷺ نے اس انگوٹھی کو لیا اور حضرت علی کو عطا کر دیا اور حضرت علی نے اس کو اپنی انگلی میں پہن لیا، اتنے میں ان کے پاس پرندے، جنات، انسان حاضر ہو گئے جو دیکھ رہے تھے اور گواہی دے رہے تھے پھر دمریاط جنی داخل ہوا اس کی کہانی بڑی لمبی ہے''- چنانچہ جب لوگ ظہر کی نماز میں تھے تو جبرئیل علیہ السلام نے صفوں کے درمیان چکر لگانے والے سائل کی صورت اختیار کر لی، جب لوگ رکوع میں ہوئے تو اچانک حضرت علی کے پیچھے ایک سائل کھڑے ہو کر کچھ مانگنے لگا حضرت علی نے ہاتھ کی طرف اشارہ فرمایا تو انگوٹھی اڑ کر سائل کے پاس چلی گئی اس پر ملائکہ نے تعجب کی وجہ سے شور بلند کیا اور جبرئیل مبارک بادی پیش کرنے کے لیے تشریف لائے اور بولے: آپ لوگ اہل بیت ہیں اللہ نے آپ لوگوں پر انعام کیا تا کہ آپ لوگوں سے گندگی کو دور کر دے اور آپ لوگوں کو خوب خوب پاک کر دے،، اس کی خبر نبی پاک ﷺ نے حضرت علی کو دی تو حضرت علی نے یہ ارشاد فرمایا کہ ہم زائل ہونے والی نعمت اور بدلنے والا ملک کیا کریں گے اور وہ بھی جب کہ دنیا میں حلال کمانے پر حساب ہے اور حرام کمانے پر عقاب ہے''اس پر اگر کوئی مفتی اعتراض کرے اور کہے کہ حضرت معاویہ نے کیسے دنیا کے لیے جنگ کیا؟ تو جواب یہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسے حق پر جنگ کیا جو ان کا حق تھا اور وہ اس کی وجہ سے ایک حق کی طرف پہونچ رہے تھے- اور رہا تحکیم تو یہ باطل ہے صحیح نہیں ہے اس لیے کہ تحکیم موجود، محدود، معروف، معلوم، غیر مجہول پر ہوتی ہے، یہی فقہ اور شرع ہے- پھر کہو جو تم کہنا چاہتے ہو مزید حقیقت کوئی شخص جاننا چاہے تو اس کو چاہیے کہ میری کتاب نسیم التسنیم اور کتاب ریاض الندیم اور کتاب الاقالیم اور کتاب المسالک والممالک اور ماوردی اور موصلی کی کتابوں کی طرف رجوع کرے- (رسائل الغزالی جلد ۶/ص:۹۲/۹۳)

چھٹا سبب: یہ کتاب خرافات سے بھری ہے- سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ کتاب شرک جلی یعنی ستاروں کی پرستش کے مضمون پر مشتمل ہے مثال کے طور پر دیکھیں:

اٹھارہواں مقالہ تسخیر کی دعاؤں کے بیان میں- سنیچر کے روز اول وقت میں کالے اور نیلے کپڑے میں ملبوس ہوکر پچھّم کی طرف چہرہ کر کے لوبان، رائی کا دانہ، انار کا چھلکا، خشک رائی دھونی کی چیزیں لے کر بیٹھ جائے پھر تثلیث وتسدیس کے مبارک وقت میں کہے "اے سلطان اعظم! بڑے لاؤ لشکر کے بادشاہ آسمان کے مالک، جس کے آسمان کے ستارے تابع ہیں، زلزلہ پیدا کرنے والے گہن لگانے والے زحل! تم ستاروں میں سب کے سردار اور سب سے اشرف ہو، ستاروں کے قائد اور مؤید ہو- میں تم سے سوال کرتا ہوں تم مجھے وہ عطا کرو جو تمہاری جانب سے میرے لیے بہتر ہے-

ملکوتی صفات والے، اطاعت والے، اطاعت کرنے والے، بڑی تدبیر کرنے والے، جس نے اپنے سخاوت کے فیض کو تاریکی پر بہایا تو وہ تاریکی نور سے بدل گئی جس کی ذات پاک ہے جس کی سلطنت ٹھوس ہے میں تم سے وہ سوال کرتا ہوں جو تمہاری جانب سے میرے لیے بہتر ہے، اپنی ہمت میری طرف پھیر دو تم غالب بادشاہ ہو- (رسائل الغزالی جلد/٦/ص:٦٢)

پھر مصنف یہاں تک پہنچتا ہے کہ ہفتہ کے آخری ہر دن کے لیے ایک ستارہ سے سوال کرتا ہے، اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا- مسلم علما سے یہ بہت بعید ہے کہ ایسی شرکیہ باتیں تحریر فرمائیں-

ساتواں سبب: اس رسالہ پر **اخوان الصفا و خلان الوفاء** کی باتوں کا اثر ہے اور افلاطونیہ، فیضیہ اور اسماعیلی شیعہ کا رنگ ہے مثلاً "اور سعادت کلیہ یہ فیض اول کی طرف سے ہے، پھر بطور تحری ہر اس جگہ پر فیض ہوگا جہاں اسے قبول کرلے- اور فیض اول علت اولیٰ کی جانب سے ہے جو فیض وہمی کے طریقے سے پیدا ہوتا ہے جس کی حقیقت کو حاصل کرنے سے عقلیں عاجز ہیں- اور جو فیض اول کی علتوں کی علت سے صادر ہو وہی عقل فعال اور بالکلیہ صادر ہونے والی ہے- اور نفس کلیہ ہی اور نفسوں کو فیض عطا کرتا ہے اور جو مخلوق کی عقل کو روشنی ملتی ہے وہ نور شام میں سورج کی شعاعوں کے نازل ہونے کے مقدار میں ہے اور جو انبیاء کی عقلوں کو روشنی ملتی ہے اس کی مثال اس تیز سورج کی طرح ہے جو بے آب و گیاہ سرزمین میں ہو- (ص:٣٠)

اور جس کے پاس فلسفہ کی ذرا بھی سمجھ ہوگی وہ جان لے گا کہ یہ باطنیہ کے اقوال سے ہیں جس نے خود کو اخوان الصفاء کے نام سے موسوم کرلیا اور معلوم ہونا چاہیئے کہ اخوان الصفاء یہ اسماعیلیہ کا فعال اور متحرک گروپ ہے-

اس سے سمجھ لیا گیا کہ رسالہ قطعی طور پر اسماعیلی شیعوں کی طرف سے گڑھ کر امام غزالی کی جانب غلط منسوب کیا گیا ہے- خاص طور سے اس لیے بھی کہ امام غزالی نے بہت سی کتابیں اور رسائل باطنیوں کے رد میں لکھ کر ان کو عاجز کر دیا، اور ان لوگوں کی حقیقت کو بے نقاب کر دیا- جس کی وجہ سے باطنیوں نے امام غزالی کو مطعون کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے-

آٹھواں سبب: سر العالمین کے مولف نے بہت سی کتابوں کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ امام غزالی کی ہیں مثال کے طور پر یہ عبارت ملاحظہ ہو:

ان اردت سلوک طریق السلف الصالح فعلیک بکتاب "نجاۃ الابرار" ھو ما آخر صنفناہ فی اصول الدین- (رسائل الغزالی جلد/٦ص:٩١)

(اگر تم سلف صالحین کے طریقے پر چلنا چاہتے ہو تو تمہارے لیے نجاۃ الابرار کا مطالعہ ضروری ہے جو اصول الدین میں ہماری آخری تصنیف ہے-

اور یہ یقینی طور پر معلوم ہے کہ مطلقاً امام غزالی کی کوئی بھی کتاب اصول الدین میں اس نام سے نہیں ہے اور ایسے ہی سر العالمین کے مؤلف نے یہ ذکر کیا ہے کہ آنے والی یہ چند کتابیں ان کی (امام غزالی) کی ہیں- "کتاب **عین الحیاۃ، کتاب السبیل، کتاب نسیم التسنیم، کتاب مغایب المذاهب**" اور جدید وقدیم زمانے سے لے کر آج تک یہ معلوم ہے کہ مذکورہ کتابوں میں سے کوئی بھی کتاب امام غزالی کی تالیف کردہ نہیں ہے- پھر امام غزالی نے اسے کیوں کر ذکر کیا جب کہ مصنف اپنی کتاب کے بارے میں زیادہ جانتا ہے- بدوی نے کہا ہے کہ اس کتاب کے عنوانات سر المعالمین کے علاوہ کسی دوسری کتاب میں نہیں وارد ہوئے ہیں (بدوی:ص:٤٠)

(٢) مکاشفۃ القلوب المقرب الیٰ حضرۃ علام الغیوب-

یہ کتاب امام غزالی کی نہیں ان کی طرف غلط منسوب کی گئی ہے چند واضح اسباب کی وجہ سے:

پہلا سبب: یہ ہے کہ مکاشفۃ القلوب کے مولف نے ابتدائے کتاب میں درج ذیل عبارت نقل کی ہے: **وبعد فھٰذا کتاب اختصرتہ من الکتاب البدیع حسن الصنیع المسمیٰ**

بمكاشفة القلوب المقرب الیٰ علام الغيوب المنسوب الیٰ الشيخ الغزالی وقد سميته كاصله بمكاشفةالقلوب واعوذبالله من الشرک والذنوب واقتصرت فيه علیٰ مأةواحد عشر باباً ليحفظ مافيهااولوالعلم اوالالباب– (مکاشفۃ القلوب ص:۷)

(حمد وصلوٰۃ کے بعد اس کتاب کو میں نے مختصر کیا ہے **كتاب البديع حسن الصنيع موسوم به مكاشفة القلوب المقرب الیٰ علام الغيوب** سے جو منسوب ہے شیخ غزالی کی طرف اور اس کا نام میں نے اصل کتاب مکاشفۃ القلوب کی طرح رکھا ہے (اللہ کی پناہ شرک وگناہ سے) اس کو میں نے ایک سو گیارہ ابواب پر منحصر کیا تا کہ اہل علم وعقل کتاب میں جو ہے اس کو محفوظ کر لیں-

یہ غیر معقول بات ہے کہ امام غزالی اپنے لیے ایسی باتیں کہیں-

دوسرا سبب: مکاشفۃ القلوب کے مؤلف نے قرطبی مفسر کا تذکرہ کیا ہے اور ان سے تیرہویں باب میں امانت کے بیان میں چند باتیں نقل کی ہیں- (ص:۳۹)

معلوم ہونا چاہیے کہ قرطبی کی وفات ۶۷۱ھ میں ہوئی ہے اور امام غزالی کی وفات ۵۰۵ھ میں ہوئی ہے پھر کیسے امام غزالی نے قرطبی سے نقل کیا؟

تیسرا سبب: کاتب نے مختلف مقامات پہ مثلاً ص:۱۹/اور ص: ۴۱ پر زہرالریاض سے نقل کیا ہے اور راجح یہ ہے کہ یہ **زهر الرياض وشفاء قلوب المراض** ابوعباس احمد بن محمد ابوبکر خطیب شہاب الدین قسطلانی (متوفی ۹۲۳ھ/ ۱۵۱۷ء) کی کتاب ہے- (بدوی ص: ۳۶۸/ ۳۶۹)

چوتھا سبب: اس کتاب میں امام غزالی کی تصنیفات سے کثیر تعداد میں حکایتیں اور نصیحتیں نقل کی گئی ہیں جیسے احیاء العلوم سے، بدایۃ الھدایۃ سے اور امام غزالی کے علاوہ دیگر مؤلفین کی کتابوں سے بھی بغیر کسی ربط وتعلق کے نقل کی گئی ہیں جن سے امام غزالی کی قلت عقل اور تالیف میں ان کے مستقل ومعہود طریقے سے ہٹنے کی طرف اشارہ ہے-

(۳) المضنون به علیٰ اهله

(اس کتاب کا نام **النفخ و التسوية** بھی ہے اور کچھ لوگوں نے اس کا نام **المضنون به علی اهله** اور یوں ہی **الاجوبةالغزالية فی المسائل الاخروية** بھی ذکر کیا ہے)-

یہ کتاب امام غزالی کی نہیں ہے، ان کی طرف غلط منسوب کی گئی ہے، اس کی وجہیں یہ ہیں :

پہلا سبب: اس کتاب کو امام غزالی کی تصنیف ہونے سے ابن عربی نے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ کتاب ابوالحسن علی المسفر السبتی کی ہے- ابن عربی کا کہنا ہے کہ شیخ مسفر جلیل القدر حکیم تھے اور عارف تھے- ذہین لوگوں میں سے تھے، بڑے نیک نام تھے، میں نے ان کو سبتہ میں دیکھا ہے ان کی چند تصانیف میں جس میں منھاج العابدین بھی ہے جو امام غزالی کی طرف غلط منسوب کی جاتی ہے جب کہ یہ امام غزالی کی تصنیفات سے نہیں ہے- لوگوں نے اس کا نام المضنون الصغیر رکھا ہے- (**محاضرة الابرار مسامرة الاخيار** جلد/۱ص:۱۲۵/ بدوی ص:۱۵۸)

ابن عربی نے یہاں پر پختہ دلیل پیش کی ہے کیوں کہ انہوں نے مؤلف کتاب سے ملاقات کی، جس کی وجہ سے شرط سماع اور شرط معاصرہ دونوں پائی گئی اور بسااوقات شیخ مسفر امام غزالی کی بلاغت اور ان کے اسلوب سے زیادہ متأثر ہوجایا کرتے تھے اسی وجہ سے ان کے کلام کو امام غزالی کی طرف منسوب کردیا گیا-

دوسرا سبب: ابن طفیل نے ذکر کیا ہے کہ مذکورہ کتاب یا اس جیسی کتابیں مضنونات سے ہیں اس لیے کشف کے معاملے میں کچھ ایسے اضافے پر مشتمل نہیں ہیں، جو ان کی مشہور کتابوں میں پھیلے ہوئے ہیں- (حی بن یقظان ص:۲۳ المطبعۃ الکاثولیکیہ، بیروت/ بدوی ص:۱۵۷/۱۵۸)

تیسرا سبب: اس کتاب کے مخطوطات بہت ہی زیادہ متأخر ہیں یہاں تک کہ دسویں ہجری تک پہونچتے ہیں یا اور اس کے بعد تک-

چوتھا سبب: مضنون الصغیر کی تیسری فصل میں یہ عبارت موجود ہے "**المضنون به علیٰ اهلهٖ النفخ والتسوية، الاجوبةالغزاليةفی المسائل الاخروية**"**قيل له ما حقيقة هٰذه الحقيقة؟ قال رضی الله عنه (الغزالی) لاهوداخل ولاهوخارج فقيل له هل هوفی جهة؟ فقال هومنزه عن الحلول والاتصال بالاجسام**–

(رسائل الغزالی جلد/۴ ص:۱۲۰)

(مضنون الصغیر کی تیسری فصل میں یہ عبارت موجود ہے "**المضنون به علیٰ اهله ،النفخ والتسوية،الاجوبةالغزاليةفی المسائل الاخروية**" واضع کتاب کہتا ہے: ان سے پوچھا گیا کہ حقیقت کیا ہے؟ امام غزالی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: نہ وہ داخل ہے اور نہ وہ خارج ہے- پھر ان سے پوچھا گیا کیا وہ کسی جہت میں ہے؟ تو فرمایا: کہ وہ حلول ہونے سے منزہ اور اجسام

میں متصل ہونے سے پاک ہے- یہ جملہ سوال وجواب کوجنم دیتا ہے حتی کہ کتاب کا آخری حصہ بھی کتاب کا نام رکھا گیا"الاجوبة الغزالیةفی المسائل الاخروية" اور یہ دواہم امر پر دالالت کرتا ہے:

(۱) کتاب عام انداز اور تصنیف کے مشہور طریقے پرنہیں لکھی گئی، کیوں کہ آپ خود ہی اپنی کسی تصنیف کے بارے میں نہیں لکھیں گے قیل لہ اور آپ خود اپنی ذات کو رضی اللہ عنہ سے نہیں ملقب کریں گے-

(۲) کسی شخص نے اس کو لکھا اور لکھنے کے بعد اس تحریر کو امام غزالی اور سائل کے درمیان گفتگو کا موضوع بنادیا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ امام غزالی کی تالیف نہیں ہے-

پانچواں سبب: اس کتاب کو امام غزالی کی تصنیف ہونے سے مستشرقین نے بھی انکار کیا ہے- جیسے منٹگمری واٹ-

(۴)المضنون علیٰ غیر اھلہ

یہ کتاب امام غزالی کی نہیں ہے، غلط ان کی طرف منسوب کی گئی، مندرجہ ذیل اسباب کی وجہ سے:

پہلا سبب: امام حافظ ابن الصلاح نے اس کتاب کو امام غزالی کی ہونے سے انکار کیا ہے اور شیخ تقی الدین عثمانی ابن الصلاح نے فرمایا:**"كتاب المضنون"المنسوب اليه(ای للغزالی)معاذالله ان يكون له ،وقد شاهدت على ظهر كتاب نسخةمنه بخط الصدرالمكين القاضی كمال الدين محمد بن عبدالله بن القاسم الشهروزی انه موضوع على الغزالی ومخترع من "مقاصد الفلسفة" الذی نقضه بكتاب"تهافت الفلاسفة"وانه نفذفی طلب هذاالكتاب الیٰ البلادالبعيدفلم يقف له علیٰ خير"**

(کتاب الطبقات للشیخ محی الدین النووی/ بدوی ص:۵۴۵)

(شیخ تقی الدین عثمان ابن الصلاح نے فرمایا:"کتاب المضنون" جو امام غزالی کی طرف منسوب ہے، اللہ کی پناہ کہ یہ کتاب ان کی ہو- کیوں کہ میں نے اس کتاب کے نسخے کے اوپر قاضی کمال الدین محمد بن عبداللہ بن قاسم شہروزی کی تحریر میں یہ لکھا ہوا پایا کہ حقیقتاً یہ کتاب امام غزالی پہ چسپاں کی گئی ہے اور مقاصد الفلاسفہ سے گڑھی ہوئی ہے، جس کا رد امام غزالی نے اپنی

کتاب تہافت الفلاسفہ میں کیا اور انہوں نے اس کتاب کی طلب میں بلاد بعیدہ کا سفر کیا لیکن واقفیت نہ ہوسکی- اسی طرح ابن الصلاح نے بھی کہا ہے کہ حقیقتاً یہ کتاب موضوع ہے اور واضع نے بعض فصول کو مقاصد فلاسفہ کی طرف منسوب کردیا ہے تاکہ اس کی رائے درست مانی جائے لیکن یہ بات قطعی طور پر معلوم ہے کہ مقاصد فلاسفہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں فلاسفہ کی وہ رائیں وارد ہوئی ہیں جن پر امام غزالی نے اپنی کتاب تہافت الفلاسفہ میں سخت تنقید کی ہے-

دوسرا سبب: امام سبکی نے بھی اس کتاب کے متعلق امام غزالی کی تصنیف ہونے سے انکار کیا ہے اور ابن صلاح کی بھی رائے کو پیش کیا ہے کہ یہ کتاب امام غزالی پر گڑھی ہوئی ہے-**ثم قال والامر كماقال (ای كماقال ابن الصلاح)وقد اشتمل "المضنون "علیٰ التصريح بقدم العالم،ونفی العلم القديم بالجزئيات ونفی الصفات وكل واحد ةمن هٰذه يكفرالغزالی قائلهاهواهل السنةاجمعون فكيف يتصورانه يقولها؟**

(طبقات الشافعیۃ الکبریٰ جلد۶/ص:۲۵۷)

پھر فرمایا کہ معاملہ ویسا ہی ہے جیسا کہ ابن الصلاح نے کہا، کیوں کہ کتاب "مضنون" عالم کے قدیم ہونے پر مشتمل ہے- اور علم قدیم بالجزئیات کی نفی پر مشتمل ہے اور ان میں سے ہر ایک قول کے قائل کی امام غزالی تکفیر کرتے ہیں- خواہ وہ اہل سنت ہی کیوں نہ ہوں پھر کیسے متصور ہے کہ وہ خود ایسی بات کہیں گے-

تیسرا سبب: دکتور بدوی کا خیال یہ ہے کہ ابن صلاح اور سبکی کی دلیلیں مضمون کتاب سے تعلق رکھتی ہیں اور یہ واقعی بہت قوی دلیلیں ہیں (بدوی ص:۱۵۴)

چوتھا سبب: کتاب اپنے بھائی احمد کو نذر کی ہوئی ہے اور امام غزالی کی عادت کتابوں کو اپنے بھائی کی طرف نذر کرنے کی نہیں-

پانچواں سبب: اس کتاب کے مخطوطات کی تاریخ بہت ہی متأخر ہے- یہاں تک کہ گیارہویں صدی ہجری کو پہنچتی ہے یا اس کے بھی بعد-

چھٹا سبب: سب سے اہم بات یہ ہے کہ کتاب کھلے ہوئے کفر پر مشتمل ہے جیسے کہ ناحل کا قول:

الزمان لايكون محدوداوخلق الزمان فی الزمان امر محال– (رسائل/ص:۸۵/۸۶)

زمانہ محدود نہیں ہوتا اور زمانے کی تخلیق زمانے میں محال ہے- **قدم عالم فی الزمان** کے

قائلین فلاسفہ کا یہی قول ہے اوریہی وہ رائے ہے جس کی سخت تنقید امام غزالی نے اپنی کتاب تہافت الفلاسفہ میں کی ہے اوراس قول کے قائلین فلاسفہ کی تکفیر بھی کی ہے، ہم نے اس موضوع پر اپنی کتاب فقہ **الحضارةفی المبحث الرابع تحت نقد الفلسفة** میں گفتگو کی ہے-اس بناپر مکمل طور سے وہ بات ٹوٹ جاتی ہے جس کو امام غزالی نے فلسفیوں کی تنقید میں اپنی کتاب تہافت الفلاسفہ میں پیش کیاہے-یعنی اپنے قول (**المدةوالزمان مخلوق عندنا**)

ساتواں سبب: کتاب کی زبان بڑی ہی باریک ہے، امام غزالی کی زبان اوراس کتاب کی زبان میں کوئی مشابہت ہی نہیں ہے اور اسی طرح اس کتاب کے مصطلحات امام غزالی کی مصطلحات کی طرح نہیں ہیں، اس کی مثال ملاحظہ فرمائیں :اس کتاب کے صفحہ ۹۸/پر ہے ''**الانسان التولدی والانسان التوالدی** '' اورامام غزالی نے ان مصطلحات کواپنی کتاب میں کہیں نہیں استعمال کیاہے-اسی طرح یہ کتاب فلسفی اصطلاحات سے بھری ہے جیسے: **العقول وکرةالنار والآثار العلويةوالمادةوالصورةوالنفس الكليةوغيرها**-

آٹھواں سبب: کتاب کی فصلیں خلاف ترتیب ہیں، بغیر سوچے سمجھے ایک دوسرے کے ساتھ بغیر کسی ربط وتعلق کے اکٹھا کردی گئی ہیں-اورکتاب صرف تالیف کردینے سے علامتی کتاب نہیں ہوتی-کیوں کہ مؤلف نے داخل کتاب میں ایک جگہ پر گفتگو کی ہے علم ربوبیت کے متعلق آیت کریمہ پھراس کوچھوڑکر دوسری فصل میں چلے گئے یعنی تعلیقات آیت کریمہ پر جیسے اللہ تعالیٰ کے قول ''**فليرتقوا فی الاسباب**'' پھراس کے بعدمباشرۃً دوسری فصل اور دوسرے عنوانات کےتحت چلے گئے یعنی ''**ان الرزق مقدر مضمون**'' پر-

نواں سبب: کتاب ناپسندیدہ زبان پر مشتمل ہے اورمسلم علما سے ایسی زبان کا استعمال بعید ہے مثال کے طور پر یہ عبارت ملاحظہ ہو: **مادةالارض مادةمشتركةبين ازواج وفحول وهی اخس لانهامثل مومسةتقبل كل ناكح**- (رسائل جلد۴/ص:۸۶)

اور ہروہ شخص جوامام غزالی کی کتاب پڑھنے والا ہے اس کوان کی بلندوبالازبان کامعیارمعلوم ہے یہاں تک کہ جب وہ گفتگوکرتے ہیں سبابہ کے بارے میں تو سبابہ کی جگہ اسے مسبحہ کہتے ہیں-

دسواں سبب: کتاب بہت ساری خرافات سے بھری ہوئی ہے جس کاصدور ایک فقیہ سے محال ہے مثال کے طور پر اس کمزورنص کوملاحظہ فرمائیں:''**وقد تتولد العقارب من الباذروج**

ولباب الخبز والحيات من العسل والنحل من العجل المنخنق المنكسرة عظامه والبق من الخل- (رسائل الغزالی جلد۴/ص:۹۸/۹۹)

اور یہ امرمسلم ہے کہ فقہائے اسلام کا مبحث کھٹمل اوربچھوکی پیدائش نہیں ہے اور نہ ہی یہ فقہ کے موضوع اوراس کے اصول سے ہے،تو جوشخص اس کتاب کو پڑھے اوراس بات کاگمان رکھے کہ یہ کتاب امام غزالی کی ہے تواس نے اپنے آپ کوغافل رکھااوراپنی عقل کوحقیر سمجھا، جس کا گمان نہیں کیا جاسکتااس لیے کہ بلاداسلامیہ میں یہ بات ایسی کھلی اور واضح ہے کہ جس میں کسی کو اختلاف ہی نہیں ہوسکتااورعقلاً بھی سمجھ میں آنے والی بات ہے اس شخص کے لیے جو بلاداسلامیہ سے باہر رہتا ہے-

(۵) معارج القدس فی مدارج معرفةالنفس

یہ کتاب امام غزالی کی نہیں ہے ان کی طرف غلط منسوب کی گئی ہے چنداسباب کے وجہ سے :

پہلاسبب: امام غزالی نے نہ تواس کا ذکرکیاہے اپنی کتاب میں اورنہ ہی اس کی طرف اشارہ کیاہے یہاں تک کہ ''**المنقذمن الضلال**''جس میں انہوں نے اپنی بہت ساری کتابوں کاتذکرہ کیاہے لیکن اس میں بھی انہوں نے اس کتاب کا تذکرہ نہیں کیا ہے اور نہ ہی احیاء العلوم میں اس کا تذکرہ کیاہے-

دوسراسبب: امام غزالی نے معارج قدس میں اپنی کسی دوسری کتاب کا تذکرہ نہیں کیاہے اور نہ ہی اپنی دوسری کتابوں کے فصلوں میں سے کسی فصل کی طرف اشارہ کیاہے-

تیسراسبب: معارج القدس کے کاتب نے مقدمہ کونفس کے متعلق الفاظ مترادف کے معانی میں جوعنوان متعین کیاہے یعنی ''النفس ،القلب ،الروح ،العقل'' یہ ایک ناقص اور خام تلخیص ہے احیاء العلوم کی مشہورومعروف فصل کی جو پچاس صفحہ میں پھیلی ہوئی ہے اور یہ ربع مھلکات کی سب سے پہلی کتاب ہے جومشہور ہے شرح عجائب القلب کے نام سے جس میں امام غزالی نے چاروں الفاظ پہ سیر حاصل گفتگو کی ہے اگر یہ کتاب ان کی تالیفات میں سے ہوتی تومزیداس کی طرف اشارہ احیاء العلوم میں فرمادیتے اوراگر یہ کتاب احیاء العلوم سے پہلے کی ہوتی تب بھی اس کی طرف اشارہ احیاء العلوم میں ضرورفرماتے-

چوتھا سبب: اس کتاب میں بھی ایک فصل ہے "بیان امثلۃالقلب" کےعنوان سے اوراس کی تین مثالیں ہیں اور یہ بھی ایک ناقص خام تلخیص ہے بعینہ احیاء العلوم کی اسی فصل کی اگر اس کتاب کے مؤلف امام غزالی ہوتے تو کتاب شرح عجائب القلب کی تفصیلات کی طرف احیاء العلوم میں ضرور اشارہ فرماتے-

پانچواں سبب: ائمہ متقدمین جیسے کہ علامہ سبکی اوران کے علاوہ جن لوگوں نے امام غزالی کی تصانیف کا اہتمام کیا ہے، کسی ایک نے بھی اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے اور ائمہ متأخرین میں سے جیسے مرتضی اور ان کے علاوہ جن لوگوں نے امام غزالی کی تصانیف کا اہتمام کیا ہے کسی نے بھی اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب امام غزالی کی طرف غلط منسوب کی گئی ہے اور وہ بھی بہت اخیر کے ادوار میں-

چھٹا سبب: مخطوطہ کتاب نمبر ۲۳۰/فلسفہ دارالکتب المصر یہ کے تذکرے میں بدوی کہتے ہیں کہ معارج القدس کے علاوہ کوئی کتاب مؤلف کتاب کے نام کے بغیر وارد نہیں ہے (بدوی ص:۲۴۵)

ساتواں سبب: مجملاً یہ کتاب امام غزالی کی کتابوں کی تلخیصات کے مجموعے سے کچھ زیادہ نہیں ہے جس میں کوئی مضبوط ربط وتعلق نہیں ہے-

(۶) الرسالةاللدنيةاورسالةفي بيان العلم اللدني

یہ رسالہ امام غزالی سے ثابت نہیں ہے چند اسباب کے وجہ سے :

پہلا سبب: اس کتاب کا تذکرہ نہ تو امام سبکی نے کیا ہے اور نہ ہی امام مرتضٰی نے کیا ہے جب کہ انہیں دونوں حضرات نے امام غزالی کی تالیفات کا تذکرہ بڑی تعداد میں کیا ہے-

دوسرا سبب: رسالہ میں غوروفکر سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ایک شخص امام غزالی کا دوست تھا اس نے کسی عالم سے علم لدنی کے تعلق سے مناظرہ کرلیا پھر اس عالم نے اس پر دلیل قائم کردی اور علم لدنی کا انکار کردیا اس کے بعد یہ شخص اپنی دلیلوں کو ٹھوس کرنے کے لیے امام غزالی کے پاس آیا اس نے امام غزالی سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ علم لدنی کی تصحیح اور مراتب علوم کے کچھ حصے آپ ذکر فرمادیں اور اس کو اپنی طرف منسوب فرمادیں اوراس کے ثابت کرنے

کا اقرار کرلیں (رسائل جلد/۳ص:۵۸)

یہ واقعہ اس بات پر دلالت کررہا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ جب وہ اپنے مذہب اور اپنی رائے کی تقویت چاہتے تھے تو مشہور علماء کے ناموں کا سہارا لیتے تھے اور اپنی فکروں کو ان کی طرف منسوب کردیتے تھے-

تیسرا سبب: رسالہ میں ان کتابوں کی ملاوٹ ہے جن کتابوں کا نام امام غزالی نے خلاف عادت ذکر نہیں کیا ہے-

چوتھا سبب: رسالے میں ان موضوعات کی ملاوٹ ہے جن پر کہ امام غزالی لکھنے والے تھے جیسے علوم ثلٰثہ، شرائط التکفیر، پھر امام غزالی نے ان میں سے کسی موضوع پر کچھ نہیں لکھا-

پانچواں سبب: یہ رسالہ صوفیہ اور فقہاکے بیچ تفرقہ پیدا کرکے مسلمانوں کی صفوں میں اختلاف پیدا کرنے کے درپے ہے-

اور یہ غیر معقول بات ہے کہ امام غزالی جیسے فقیہ کی کتاب سے ان چیزوں کا صدور ہو، حالاں کہ امام غزالی کی زندگی کا مقصد ہی مسلمانوں کے درمیان اتحاد واتفاق قائم کرنا اور اختلاف کی جڑ کو اکھاڑ پھینکنا تھا جیسا کہ ان کی کتاب "فیصل التفرقة" سے واضح ہے اس کتاب میں امت محمدیہ ﷺ کے درمیان اتحاد کو قائم رکھنے اور بعض پر بعض کی تکفیر کرنے والے مسئلے میں لوگوں کو غوروخوض کرنے سے دور رکھنے کی اَن تھک کوشش ہے-

چھٹا سبب: اس کتاب کے بارے میں مستشرقین نے بھی شک کیا ہے-

ساتواں سبب: میں دیکھ رہا ہوں کہ اس رسالہ کا واضع کتاب المضنون به على غير اهله کا بھی واضع ہے اصطلاحات اور لغت کی مشابہت کی وجہ سے-

(۷) منهاج العارفين

یہ کتاب امام غزالی سے ثابت نہیں ہے چند اسباب کی وجہ سے :

پہلا سبب: اس کتاب کے موضوعات مہتم بالشان نہیں ہیں یہاں تک کہ بدوی اس کتاب کے متعلق فرماتے ہیں: **وعلى كل حال فالكتاب ليس بذى شان من بين كتب الغزالى**- (بدوی ص:۲۵۰)

دوسرا سبب: مولف نے اس کتاب کے لکھنے کا کوئی سبب ظاہر نہیں کیا ہے- یا یہ کہ انہوں نے جواب دیا ہے ان سوالوں کا یا ان کے مشابہ سوالوں کا جن کو امام غزالی نے اپنی کتاب میں درج فرمایا ہے-

تیسرا سبب: کتاب ۱۱ صفحہ کی ہے اور اٹھائیس ابواب پر مشتمل ہے وہ ابواب یہ ہیں: **باب البيان نحو المريدين، باب الاحكام، الرعاية، مفتاح الرعاية، النية، الذكر، الشكر، اللباس، القيام، السواک، التبرز، الطهارة، الخروج، دخول المسجد، افتتاح الصلوٰة، القرأة، الركوع، السجود التشهد، السلام، الدعاء، الصوم، الزكاة، الحج، السلامة، العزلة، العبادة، التفكر-**

پھر یہ عبارت آئی ہے مولف کے قول کے بعد: **تم بحمد الله وعونه وحسن توفيقه والحمدلله وحده-** پھر کچھ جملے آئے ہیں جو پندرہ سطر کے قریب قریب ہیں-
(رسائل جلد ۶ ص:۵۶)

شیخ محمد بن علی ابن الساکن نے کہا کہ یہ ابواب نہایت ہی مختصر ہیں جن کی طرف کوئی عبقری شخصیت نظر التفات نہیں کر سکتی-

چوتھا سبب: اس کتاب میں تصوف، مریدین، اور خرقہ کی کامیابی اور اس کے غلبہ کی بحث ہے اور امام غزالی اپنی کتاب میں ان بحثوں کو اہمیت نہیں دیتے- پھر رسالہ کے آخر میں ہے: **تم بحمد الله وعونه وحسن توفيقه والحمدلله وحده-**

شیخ محمد بن علی ابن الساکن نے **دليل الطالبين الیٰ نهاية المطالب** میں فرمایا کہ انہوں نے کہا کہ طالب مجتہد جب خرقہ پہننے کا ارادہ کرے تو اس پر ضروری ہے کہ عام دنوں میں جو کپڑا پہنتا تھا اس کپڑے کو نکال دے اور اچھا لباس پہنے اور اس جماعت کا سب سے اچھا لباس صوف (اون) ہے- کیوں کہ وہ لوگ اس صوف کی طرف منسوب گئے ہیں-

کہا گیا کہ سب سے پہلے جس نے صوف پہنا وہ آدم اور حوا علیہا السلام ہیں- اور موسیٰ اور عیسیٰ اور یحییٰ علیہم السلام صوف پہنا کرتے تھے اور رسول ﷺ عبا مبارک پہنا کرتے تھے جس کی قیمت پانچ درہم تھی اور مناسب یہ ہے کہ جس شخص کا نفس کدورت سے پاک وصاف ہو وہی صوف پہنے-
حسن بصری نے فرمایا کہ مجھے خبر پہنچی کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم صوف نہ پہنو

مگر جب تمہارے دل صاف ستھرے ہوں اور جو شخص دغا بازی اور خیانت کے طور پر صوف پہنے گا تو پروردگار عالم اس سے نفرت کرے گا- پس جب پہن لیا تو ضروری ہے کہ اس کے تقاضے کو برقرار رکھے اور وہ تقاضے تین ہیں: صاد کا تقاضا یہ ہے "**الصدق، والصفاء، والصيانة، والصبر، والصلاح**" واو کا تقاضا یہ ہے "**الوصيلة، الوفاء، الوجد**" فا کا تقاضا یہ ہے "**الفرح، التفجع**" اور اگر (پیوند والا لباس) پہنا تو ضروری ہے کہ اس کے حروف کے حق کو ادا کرے وہ چار ہیں: میم کا حق، "**المعرفة، المجاهده، المذلة**" اور راء کا حق یہ ہے "**الرحمه، الرأفة، الرياضة، الراحة**" اور قاف کا حق "**القناعة، والقربة، والقوة والقول والصدق**"، اور عین کا حق "**العلم، والعمل، والعشق، والعبودية**"-

نبی پاک ﷺ نے مرقع (پیوند لگے کپڑے) پہننے کا حکم دیا ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ تمہاری خوشی میرے ساتھ ملے رہنے میں ہے- مردوں کی ہم نشینی سے بچو، اور کسی کپڑے کو نہ بدلو جب تک کہ اس میں پیوند نہ لگا لو- (رسائل الغزالی جلد ۳ ص:۵۶)

پانچواں سبب: اس کتاب میں مریدین کی عملی زندگی کے طریقے کا ثبوت ہے- ایک شخص علوم دین اور لغت میں بڑا ماہر تھا عرفان کا راستہ چلنے والوں کی رہنمائی کے لیے اس شخص نے ایک کتاب لکھی اور اس پر اس نے امام غزالی کا نام لکھ دیا تا کہ کتاب زیادہ مشہور اور موثر ہو جائے-

چھٹا سبب: اس کتاب کو امام غزالی کی تصنیف ہونے سے "اسین بلاثیوس" نے بھی انکار کیا ہے جو کہ مستشرقین میں سے ہے-

(۸) منهاج العابدين

یہ کتاب امام غزالی کی نہیں ہے بلکہ ان کی طرف غلط منسوب کی گئی ہے چند واضح اسباب کی وجہ سے جسے ہم بیان کرتے ہیں:

پہلا سبب: ابن عربی نے اس کتاب کو ابوالحسن علی المسفر السبتی کی طرف منسوب کیا ہے- جیسا کہ گفتگو گزر چکی ہے-

دوسرا سبب: اس کتاب میں بہت سی کتابوں کے نام شمار گئے ہیں مثلاً "**القربة الیٰ الله، اخلاق الابرار والنجاة من الاشرار**" اور امام غزالی کی ان ناموں کی کتابیں ہم تک نہیں

پہنچیں نیز انہوں نے بھی مذکورہ ناموں کو اپنی کسی بھی کتب صحیحہ معتمدہ میں ذکر نہیں کیا ہے-

تیسرا سبب: سر العارفین کے مولف نے " **نجاۃ الابرار** " کا تذکرہ کیا ہے جیسا کہ گزرا اور اس کتاب " **نجاۃ الابرار** " میں اس چیز کا ثبوت ہے کہ منہاج العابدین منحول ہے، ساتھ ہی دونوں کتابوں میں امام غزالی کی کتابوں سے لوگوں کو پھیرنے کی سازش بھی کی گئی ہے-

چوتھا سبب: اس کتاب کے مولف نے بارہا "**قال شیخنا، قال شیخی الامام ویروی عنه شعراً**"، جیسی تعبیرات تکرار کے ساتھ ذکر کیا ہے-

اور ہر قاری کو یہ معلوم ہے کہ امام غزالی نہ تو اس قسم کے صیغے لاتے ہیں اور نہ ہی اس کی تکرار کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کتابوں میں بھی نہیں جن کتابوں کو آپ نے جوانی میں تصنیف فرمایا ہے-تو جب جوانی کا یہ عالم ہے کہ ان صیغوں کی تکرار نہیں کرتے تو پھر جب آخر عمر میں منہاج العابدین کو تصنیف فرمایا تو اس میں کیسے یہ صیغے اور جملے آ گئے- یہ آپ کی معتبر تصنیفی شخصیت پر عیب ہے اور آپ کی پختگی علم پر بھی دھبہ ہے- اس بارے میں میرا خیال ہے کہ امام غزالی کا کوئی شیخ اور امام شاعری کا استاذ نہیں ہے-

پانچواں سبب: مولف کتاب صاحب علم معلوم ہو رہا ہے اور اسے احیاء العلوم پر اچھی مہارت ہے میں سمجھتا ہوں کہ کتابت میں صاحب ملکہ شخص ہے جس نے احیاء العلوم کی تلخیص کی اور بعض دوسری اشیاء اپنی طرف سے اس نے بڑھا دی-

(۹) رسالۃ الطیر

یہ رسالہ امام غزالی کا نہیں ہے چند اسباب کی وجہ سے :

پہلا سبب: اس رسالے کی زبان ہے جو امام غزالی کی زبان نہیں ہے-

دوسرا سبب: رسالہ پرندہ اور عنقا کی زبان پر لکھا گیا ہے جب کہ امام غزالی کی زبان بہت ہی فصیح اور عجمیوں کی زبان سے زیادہ صریح تھی-

تیسرا سبب: رسالۃ الطیر فارسی زبان میں ہے جو احمد الغزالی کی تصنیف ہے-(بدوی ص:۲۴۲)

○○○

امام محمد غزالی
ترجمہ: ضیاء الرحمٰن علیمی

امام غزالی کے آخری الفاظ

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی امام احمد غزالی کا بیان ہے :" جب میرے بھائی کی وفات کا وقت قریب آیا تو انھوں نے مجھ سے فرمایا:" میرا کفن لاؤ تا کہ میں اپنے بادشاہ کی بارگاہ میں حاضری کی تیاری کروں-" میں نے کفن لا کر دیا اور وہ اسے لے کر بالا خانے پر چلے گئے۔ وہاں جا کر انہوں نے غسل کیا اور کفن پہن لیا- ہم بعد میں جب بالا خانے پر گئے تو وہ اپنے رب کی ملاقات سے شرف یاب ہو چکے تھے- وہیں میں نے ان کے سرہانے ایک رقعہ پڑا ہوا پایا جس میں یہ اشعار لکھے ہوئے تھے-" عربی اشعار" بادہ وساغر" کے کالم میں ملاحظہ فرمائیں- یہاں ان کا سلیس ترجمہ حاضر ہے-(علیمی)

١- میرے ان دوستوں سے کہہ دو جو میری میت پر رو رہے ہیں اور غم کی وجہ سے آنسو بہا رہے ہیں-

٢- کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں مر چکا ہوں، نہیں قسم خدا کی، میں مرا نہیں ہوں۔

٣- یہ تو میری ظاہری شکل وصورت تھی اور میں نے ایک زمانے تک لبادۂ جسم اوڑھ رکھا تھا۔

٤- میں تو درحقیقت ایک موتی ہوں جو ایک صدف میں بند تھا، وہ موتی نکل گیا اور سیپ رہ گیا۔

٥- میں تو ایک طائر لاہوتی ہوں اور یہ جسم میرا پنجرہ، اب میں پنجرے سے نکل کر آزاد ہو گیا ہوں۔

٦- اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے پنجرے سے رہائی دی اور بلندی میں اپنے پاس میرا

ایک گھر بنایا۔

۷- پہلے میں تمہارے مابین مردہ تھا، اب مجھے حیات جاوید مل گئی ہے اور اب میں نے کفن اتار دیا ہے۔

۸- میں تمھاری دنیا سے کوچ کر گیا اور میں نے تم کو چھوڑ دیا کیوں کہ مجھے تمھاری دنیا اور تمھارا وطن پسند نہیں ہے۔

۹- اب میں اپنے بادشاہ ذوالجلال سے سرگوشیاں کر رہا ہوں اور ذات حق کا مشاہدہ کھلی آنکھوں سے کر رہا ہوں۔

۱۰- نوشتہ تقدیر میری نگاہوں کے سامنے ہے اور میں جو ہو چکا یا جو ہوگا یا ہونے والا ہے اسے دیکھ رہا ہوں۔

۱۱- میرا کھانا پینا ایک ہی ہے- یہ ایک راز ہے، اسے اچھی طرح سمجھ لو-

۱۲- وہ کوئی عمدہ شراب یا شہد نہیں اور نہ وہ پانی ہے بلکہ وہ دودھ ہے-

۱۳- وہ رسول اللہ ﷺ کا مشروب ہے، ہماری تخلیق تو کارخانہ فطرت کا ایک راز ہے-

۱۴- جو اس دنیا میں زندہ ہے وہ گہری نیند میں ہے، جب اسے موت آئے گی تو طائر غفلت اڑ جائے گا-

۱۵- اس موت کو موت نہ سمجھو یہ تو درحقیقت زندگی ہے- یہ تو آرزوؤں کی منزل ہے-

۱۶- موت کی یلغار سے مت گھبراؤ، کیوں کہ وہ تو صرف اس دنیا سے منتقل ہو جانے کا نام ہے-

۱۷- اپنے آپ سے لباس جسم اتار کر رکھ دو، کھلی آنکھوں سے ذات حق کا مشاہدہ کرو گے-

۱۸- محنت سے زاد سفر تیار کر لو اور اس میں سستی نہ کرو کیوں کہ کاہل انسان دانش مند نہیں ہوتا-

۱۹- رحم فرمانے والے رب سے حسن ظن رکھو، تم اپنی کوشش کا بہترین بدلہ پاؤ گے اور بلا خوف و خطر اس کی بارگاہ میں حاضر ہو گے-

۲۰- میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو میں ہوں وہ تم ہو، مجھ میں اور تم میں کوئی فرق نہیں ہے-

۲۱- روح میرے اندر بھی ہے اور تمہارے اندر بھی، ایسے ہی جسم تمہارے پاس بھی ہے اور میرے پاس بھی-

۲۲- تو جو چیز بہتر ہوگی وہ ہم سب کے لیے ہوگی اور جو بری ہوگی وہ ہم سب کے لیے ہوگی اور

اپنے شامت نفس کے سبب ہوگی-

۲۳- تو میرے لیے تم سب دعائے رحمت کرو، تمہیں بھی رحمت رب حاصل ہوگی اور یقین رکھو کہ میرے بعد تمہاری باری ہے-

۲۴- میں اپنے رب سے رحمت کا طلب گار ہوں، اللہ میرے اس دوست پر بھی رحم فرمائے جو میری اس دعا پر آمین کہے-

۲۵- آپ سب لوگوں کی خدمت میں میری جانب سے پاکیزہ سلام پیش ہے، اور سلام الٰہی تو سراسر خیر ہے-

○○○

پیمانہ

کتاب : **روشنی کا سفر**

مصنف : **پروفیسر اختر الواسع**

سال اشاعت : مئی ۲۰۰۸ء

ضخامت : 224 صفحات

قیمت : -/200 روپے

ناشر : اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی

کہا جاتا ہے کہ ناقد کو سخن فہم ہونا چاہیے، طرفدار نہیں- لیکن سخن فہمی کے لیے سخنور کی شخصیت اور اس پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا مطالعہ کرنا ضروری ہے، اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا- کیوں کہ ادب، ادیب کی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے اور آئینہ چونکہ جھوٹ نہیں بولتا، اس لیے اس میں وہی حقائق منعکس ہوتے ہیں جو اس کے گرد و پیش میں واقعتاً موجود ہوتے ہیں- یہ اور بات ہے کہ ہم کبھی ان حقائق کو محسوس کر لیتے ہیں، لیکن اکثر یہ حقائق ہماری نظروں سے اوجھل رہ جاتے ہیں جنہیں ادیب کی نظریں دیکھ لیتی ہیں اور جب وہ الفاظ کی شکل میں ان کی تصویر کشی کرتا ہے تو ہم انہیں محسوس کیے اور ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتے-

کئی بار ہم غلط فہمی کا شکار ہو کر سخن فہمی اور طرفداری کے بیچ فرق نہیں کر پاتے اور طرفداری کو سخن فہمی یا اس کے برعکس گمان کر بیٹھتے ہیں- میں امید کرتا ہوں کہ قارئین میرے اس تبصرے کے معاملے میں اس قسم کی غلط فہمی سے بچیں گے-

موجودہ صدی میں برصغیر کے مشہور ترین مسلم دانشوروں میں ایک اہم نام اختر الواسع صاحب کا ہے- وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اسلامیات کا پروفیسر ہونے کے ساتھ کئی اہم مناصب پر فائز ہیں- لیکن ان کا امتیاز یہ ہے کہ خالق کائنات نے انہیں غیر معمولی قوت گویائی، سائنٹفک انداز استدلال، موثر لب ولہجہ اور منطقی تحلیل و تجزیہ کی صلاحیتوں سے نوازا ہے- وہ اسلامیات کے پروفیسر ضرور ہیں، لیکن ماورائے اسلامیات سے بھی حذر نہیں کرتے، بلکہ علاقائی، قومی اور بین اقوامی سطح کے سمینار، مذاکرات اور کانفرنسوں میں شرکت کے ذریعے ہر شب کو سحر کرنے کی کوششوں میں سرگرداں رہتے ہیں-

پروفیسر اختر الواسع نے علی گڑھ کے ایسے گھرانے میں آنکھیں کھولیں جو تصوف کی روشنی سے منور تھا- ان کے دادا، اولیاے کرام اور صوفیۂ عظام کے بڑے عقیدت مند تھے- ان کے نانا، ماموں اور تایا باقاعدہ صوفی سلسلوں میں بیعت تھے- یہ چیزیں ان کی ذہنیت اور طبیعت کی تکوین میں بہت اثر انداز ہوئیں اور وہ آسمان علم وفضل کے افق پر ایسے سورج کی طرح طلوع ہوئے جس پر کئی بار شدید کہرے نے غلبہ پانے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی ہی ہاتھ آئی- ہم نے پچھلے دنوں دیکھا کہ جس شخصیت کے وجودی عناصر میں ہر جا تصوف کی کارفرمائی ہے، اس نے تصوف مخالف تحریک، تخریب کی علم بردار جماعت، دولت وسلطنت کے اسیر گروہ، اور سامراج واد کی کوکھ سے جنم لینے والے طبقہ کو اسلام کا داعی ومحافظ، سامراج مخالف مورچہ اور مجاہد آزادی تک لکھ دیا- ایسے حالات کئی بار پیش آئے، لیکن روشنی کی وہ کرن جو تصوف کے سانچے میں ڈھل کر اس شخصیت کے وجود کو منور کر رہی تھی، اس نے آخر ''روشنی کا سفر'' کی شکل میں اپنا راستہ ڈھونڈ ہی لیا-

روشنی کا سفر ایک رہنما کتاب ہے جس میں طریق تصوف کے بنیادی سنگ میل کو بہت واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے- اس ضمن میں صوفی مصنفین کے حالات وکوائف یکجا کرنے کے علاوہ ان کی تصنیفات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے- ساتھ ہی چشتی سلسلہ کے اکابر صوفیہ کی نظری وعملی تعلیمات کا حاصل ونچوڑ بھی اس میں پیش کر دیا گیا ہے-

روشنی کا سفر باضابطہ تصنیف نہیں ہے، بلکہ اختر الواسع صاحب کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انہوں نے تصوف کے موضوع پر وقتاً فوقتاً لکھے ہیں- لیکن ان مضامین کو کتاب کی شکل میں اس سلیقے سے جمع کیا گیا ہے کہ کہیں سے بھی بے ترتیبی کا گمان تک نہیں گزرتا- اختر الواسع صاحب نے یہ مضامین قلبی اطمینان کی پیاسی انسانیت کو ایسے پنگھٹ کی راہ دکھانے کے مقصد سے لکھے ہیں جس کا صاف وشفاف پانی نہ کبھی ختم ہوتا ہے نہ ہی گدلا اور جس سے ہر کسی کو اس کے ذوق اور پیاس کے مطابق سیراب ہونے کی آزادی ہے- یہی مقصد ان مضامین کو کتاب کی شکل میں جمع کرنے کا بھی ہے- پیش گفتار کے تحت مصنف لکھتے ہیں:

''موجودہ زمانے میں جب ساری دنیا میں انسانی زندگی سخت عذابوں میں مبتلا ہے اور انسانی اقدار کی بقا وبرتری ایک جاں گسل مسئلہ بنی ہوئی ہے، جنہوں نے صدیوں سے انسان کو انسان کی حیثیت میں قائم رکھا ہے، تصوف ہی وہ صاف پانی کا دھارا معلوم ہوتا ہے جو دنیا اور

انسانوں کے دل ودماغ میں لگی ہوئی آگ کو بجھانے اور انہیں سکون اور اطمینان قلب فراہم کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے- یہ کتاب اس جانب پیش رفت کرنے میں ذرا بھی معاون ہو سکے تو یہ راقم الحروف کے لیے باعث صد افتخار ہوگا-''

کتاب میں ''صوفی اور تصوف''، ''صوفی طریق فکر وتربیت''، چودہ صوفیۂ کرام اور صوفیہ کی عقیدت مند ایک مستشرقہ پر کل 27 مضامین ہیں- مضامین کے لیے عناوین کے انتخاب میں اس مہارت سے کام لیا گیا ہے کہ ہر عنوان اپنے مضمون کا خلاصہ معلوم ہوتا ہے-

صوفیۂ کرام کے تذکروں میں ان کے مقام اور زمان کا خاص خیال رکھا گیا ہے- ان تذکروں کا سلسلہ حضرت ابونصر سراج سے شروع ہو کر حضرت خواجہ حسن نظامی پر ختم ہوتا ہے- بیچ کے صوفیہ کے نام اس طرح ہیں: ابوبکر کلاباذی، ابوالقاسم قشیری، شیخ عبدالقادر جیلانی، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، بابا فریدالدین گنج شکر، حضرت بوعلی شاہ قلندر پانی پتی، محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیا، حضرت امیر خسرو، شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری، سید میر علی ہمدانی، سید محمد اشرف جہاں گیر سمنانی، خواجہ حسن نظامی-

ان صوفیہ کی حیات وتعلیمات کا مطالعہ کرنا چاہیں تو ان کے ملفوظات ومعمولات اور سوانح کی شکل میں سینکڑوں کتابیں مل جائیں گی- لیکن ان کی ورق گردانی کی نہ سب کے پاس فرصت ہے، نہ صلاحیت اور نہ ہی وہ اعلی ذوق ہے کہ ان سے مغز حاصل کر سکے- خوشی کا مقام ہے کہ پروفیسر اختر الواسع نے اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر ذخائر تصوف کی ورق گردانی کی اور اپنی خداداد صلاحیت اور ذوق سلیم سے کام لیتے ہوئے گلستان تصوف سے عطر کشید کر کے ہر خاص وعام کو مشام جاں معطر کرنے کا موقع دیا ہے- میں نے اپنی باشعور زندگی کے جتنے بھی ماہ وسال گزارے ہیں اس درمیان تصوف کے موضوع پر اردو زبان میں ایسی کوئی کامیاب کوشش نہ دیکھی ہے نہ سنی ہے-

تصوف اسلامی طبیعت ہی نہیں، عام انسانی فطرت سے بھی سے بے حد قریب ہے- اس میں ایسی مقناطیسیت ہے جو انسانی مزاج کو اپنی جانب کھینچتی ہے اور جس پر اختلاف مذہب اثر انداز نہیں ہوتا- کیوں کہ تصوف کی تعلیمات مذہب سے بڑھ کر پوری انسانیت پر مرتکز ہے- چنانچہ بابا فریدالدین گنج شکر مخلوق خدا کی دلداری ودلگیری کو حج اکبر مانتے تھے- ان کا ماننا تھا کہ کسی کا دل دکھانے والی بات اس لیے نہیں کہنی چاہیے کہ اس میں خداے لم یزل بستا ہے اور کسی کا

دل اس لیے نہیں توڑنا چاہیے کہ سب انسان بیش بہا موتی ہیں- اسی طرح محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیا یہ دعا کیا کرتے تھے ''جو مجھے رنج دے وہ خوب راحت پائے، اس کے گلشن حیات کا ہر پھول بے خار ہو-''

اس قسم کی تعلیمات سے کون انسان ہے جس کا دل متاثر نہیں ہوگا- ظاہر ہے ایسی تعلیمات جس انداز و اسلوب میں بھی پیش کی جائیں گی، انسان ان کی جانب مائل ہوگا، کیوں کہ سونا جس شکل میں بھی ہو، پر کشش ہوتا ہے- لیکن پروفیسر اختر الواسع کے حسن انتخاب، منفرد انداز، انوکھا اسلوب، لہجہ کی متانت، جملوں کی نفاست، کوثر و تسنیم میں ڈھلی ہوئی شیریں زبان اور خوبصورت پیش کش نے صوفیہ کی ان تعلیمات اور تذکروں کو اور بھی پر کشش بنا دیا ہے-

نظری سطح پر ہم نے دین و دنیا کا ایسا مفہوم متعین کر لیا جس سے ہر شعبۂ زندگی پر منفی اثر پڑا ہے- اس مفہوم کی بنیاد پر عبادات و معاملات کے باب میں بھی ہم نے زیادتی اور غلو سے کام لیا ہے- اس سلسلے میں پروفیسر اختر الواسع نے فوائد الفواد سے حضرت محبوب الٰہی کا ایک ارشاد نقل کیا ہے جسے ذہن نشیں کرنے کی ضرورت ہے- آپ نے فرمایا:

''جو کچھ کفاف یا خرچ لازمی سے زیادہ ہو وہ صورت اور معنی میں دنیا ہے، طاعت خدا اخلاص کے ساتھ صورت اور معنی میں دنیا نہیں ہے- ریا کاری کی عبادت جس سے فائدے کی امید ہو صورت میں دنیا نہیں معلوم ہوتی، لیکن اصل معنی میں دنیا ہے- آخر میں وہ سارے کام جو کوئی شخص اپنی بیوی اور گھر والوں کو روزی فراہم کرنے کے لیے کرتا ہے تا کہ ان کا حق ادا کرے، یہ صورت میں دنیا معلوم ہوتی ہے، لیکن معنی میں دنیا نہیں ہے-'' (ص:۱۱۳)

دل کو چھو جانے والے اس قسم کے ارشادات کتاب میں جگہ جگہ بہت ہی سلیقے سے بیان کیے گئے ہیں- بس کتاب حاصل کریں اور شروع ہو جائیں، ساری خوبیاں آپ سے اپنا وجود خود ہی منوالیں گی-

کتاب کی تزئین، پیش کش، ٹائپنگ اور پروف ریڈنگ میں بھی خاص احتیاط برتا گیا ہے اور اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ کسی بھی طور کوئی غلطی یا نقص جگہ نہ پاسکے، اور اسی لیے چند مقامات کے علاوہ شاید ہی کہیں نقطے کا بھی فرق نظر آسکے- البتہ کتاب کی پشت پر ایک ایسی غلطی در آئی ہے جس نے پروفیسر اختر الواسع کو پانچ صدی پیچھے دھکیل دیا ہے-

زبان کے تعلق سے بھی مصنف سے دو تین مقامات پر ایک ہی قسم کا سہو ہوا ہے- انہوں نے

انجذاب کو تعدیہ کے طور پر استعمال کیا ہے، جب کہ انجذاب ایک انفعالی کیفیت کا نام ہے جس میں اثر پذیری کا معنی پایا جاتا ہے، اثر آفرینی کا نہیں- لیکن مصنف نے اس سے اثر آفرینی کا کام لیا ہے- حضرت امیر خسرو کے حب وطن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب وطن سے محبت کا جذبہ شخصیت کی ایک بنیادی قدر کے واسطے سے رونما ہوتا ہے تو اس کی شکل بالکل مختلف ہوتی ہے- اس میں عجیب و غریب وسعت ہوتی ہے- مختلف میلانات کو ایک ہی نقطے پر سمیٹ لینے کی اس میں ایک غیر معمولی قوت انجذاب ہوتی ہے جو ایک دوسرے سے برسر پیکار رویوں کو بھی ایک ہی راستہ پر لگا دیتی ہے-'' (ص:۱۴۵)

یہ ایک فروعی بات تھی جو ضمن میں آگئی- اصل بات یہ ہے کہ یہ کتاب تصوف سے شغف رکھنے والوں کے لیے ایک انمول تحفہ ہے اور بیمار انسانیت کے لیے بے مثال نسخہ- میری کیا وقعت کہ کوئی تجویز پیش کروں، لیکن اتنا ضرور عرض کر سکتا ہوں کہ اس کتاب کے حوالے سے خواجہ حسن ثانی نظامی کی رائے اور تجویز پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے- ''سوغات دلوں کے لیے'' کے تحت آپ لکھتے ہیں:

''پروفیسر اختر الواسع صاحب نے اپنا بھی بھلا کیا ہے، ہمارا بھی بھلا کیا ہے- ان کا فراہم کردہ عطر بیک وقت مجموعہ بھی ہے، مفرد بھی- اگر صاحب کتاب کو مصور کہوں تو ان کے کینوس کی وسعت کو بیان کرتے کرتے عاجز ہو جاؤں- جو کچھ ان کے انتخاب میں آیا ہے، وہ چاہے صوفی بزرگوں کے اسمائے گرامی ہوں یا رنگا رنگ تعلیمات، لکھنے والے کے خوش مذاق ہونے کا ثبوت تو فراہم کرتے ہی ہیں، پڑھنے والوں کو بھی یقیناً ایک نئی لذت سے آشنا کریں گے- ایسی لذت جو ایک گھونٹ پینے کے بعد دوسرے گھونٹ کا تقاضا کرے! کاش کہ اس کو نصاب تعلیم میں شریک کیا جاسکے! یہ نئی نسل کے کام کی چیز بطور خاص ہے!''

تبصرہ نگار: نیاز احمد مصباحی

○○○

نام کتاب : الفرق الصوفية فى الاسلام

مصنف : J. Spencer Brimingham

مترجم : ڈاکٹر عبدالقادر البحراوی

ضخامت : 424 صفحات

ناشر : **دار النهضة العربية للطباعة و النشر، بيروت**

تصوف کے موضوع پر مستشرقین نے بھی خوب داد تحقیق دی ہے- ان کی متعدد کتابوں میں اس حقیقت کا برملا اعتراف ملتا ہے کہ اسلام کی دعوت وتبلیغ میں صوفیہ کا مؤثر رول رہا ہے اور دنیا کے بہت سے گوشوں میں خصوصاً ایشیا اور افریقی مما لک میں اسلام تلوار سے نہیں صوفیہ کے روحانی کردار سے پھیلا ہے-لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس موضوع پر بھی مستشرقین کی خاص تعداد کہیں اپنی ''مخصوص ذہنیت'' تو کہیں ''سطحیت'' کے زیر اثر عجیب وغریب کرشمے دکھاتی نظر آتی ہے- لیجیے چند جھلکیاں آپ بھی ملاحظہ فرمایئے!

مشہور جرمن مستشرق ڈاکٹر اگناتس گولڈزیہر نے تصوف کی ابتدا کے متعلق یہ رائے قائم فرمائی ''چوں کہ قرآن میں خدا کی محبت کے مقابلے میں خدا کے خوف پر زیادہ زور دیا گیا ہے، لہٰذا اس خوف کی وجہ سے اسلام میں رہبانیت کی ابتدا ہوئی-'' (A literary history of the Arbas page-225, By Nichelson)

موسیو جوزف ارنسٹ ریناں کی عجیب وغریب تحقیق یہ ہے کہ ''فلسفۂ عرب اور الٰہیات کا سنگ بنیاد رکھنے والا فرموریس ہے'' (قرون وسطیٰ کا اسلامی فلسفہ، صفحہ ۹۳)

پروفیسر مرگس اور پروفیسر تو لک نے نو افلاطونیت کو تصوف کا ماخذ قرار دیا اور نکلسن کی اس تحقیق کو صحیح تصور کیا کہ صوفیہ کرام کے شاعر اعظم مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی پلاٹی نیوس کی تصنیف امینڈس یعنی نظام تسعہ کا نقش ثانی ہے (قرون وسطیٰ کا اسلامی فلسفہ، ۱۹۱)-

اس طرح بیسویں صدی عیسوی تک تصوف پر خامہ فرسائی کرنے والے اکثر مستشرقین کہیں عیسائی خانقاہیت تو کہیں نوافلاطونیت، کہیں یونانی حکمت الاشراق تو کہیں ایرانی فلسفہ، کبھی ہندوستانی نظریۂ ویدانت تو کبھی بدھ مت کے اثرات اور انہی جیسے ہفوات پر بزعم خود تصوف کی

عمارت کھڑی کیے ہوئے ہیں-

سردست زیر تبصرہ کتاب بھی ایک انگریز مستشرق کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے J. Spencer Brimingham کی کتاب "The Sufi orders in Islam" دراصل آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے ۱۹۷۳ میں شائع کی تھی- مصنف نے اس کتاب میں تصوف اسلامی کی نشو ونما سے لے کر بیسویں صدی تک عالم اسلام میں اس کے فروغ وارتقا کا تاریخی منظر پیش کیا ہے- صوفیہ کے عظیم مشائخ، اہم سلاسل، ان کی شاخیں، افکار ونظریات، احوال و واردات، مراسم و وظائف اور عالم اسلام کی سماجی زندگی میں ان کے ہمہ گیر اثرات، یہ سب مصنف کے حیطۂ تحریر میں ہیں- یوں ہی تصوف کے بہروپ میں اسے بدنام کرنے والے غیر اسلامی افکار وعناصر اور نام نہاد صوفیہ کا ذکر بھی ہمیں جا بجا ملتا ہے- یہ الگ بات ہے کہ مؤلف نے ان کا حقیقی چہرہ دکھانے کی بجائے، انھیں ''اسلامی تصوف'' کے دامن میں چھپانے کی کوشش کی ہے-

اس وقت ہمارے ہاتھوں میں اصل کتاب نہیں بلکہ اس کا عربی ترجمہ ہے، جسے ڈاکٹر عبدالقادر البحروای نے حواشی کے اضافہ کے ساتھ تحریر کیا ہے- اور ''**دار النهضة العربيه للطباعة و النشر**'' بیروت نے اس کی اشاعت کی ہے- موصوف متعدد دینی وعلمی بلند پایہ کتابوں کے مصنف ومؤلف ہیں- عربی زبان کو انھوں نے ''**البلاعة فى الدين**'' اور ''**الغزو الثقافى : عوامله، مظاهره و نتائجه**'' کے علاوہ اور بھی قیمتی سرمائے عطا کیے ہیں- ان کا یہ ترجمہ نہ صرف رواں دواں اور شستہ ہے بلکہ انگریزی نثر کا زور بیان عربی میں منتقل کرنے کا فن سکھاتا ہے- کتاب کے بہت سے مقامات صوفیانہ مصطلحات اور فلسفیانہ مباحث پر مشتمل ہونے کی وجہ سے خالص علمی و فنی اور دقیق ہیں- مگر فاضل مترجم نے جس خوش اسلوبی سے انھیں ترجمہ اور بوقت ضرورت حواشی میں منتقل کر دیا ہے اس سے ان کی ذہانت، فلسفہ میں درک اور علمی تبحر کا پتہ چلتا ہے-

کتاب کے شروع میں فاضل مترجم کا وقیع مقدمہ ہے، جس میں اسلامی تصوف کا مختصر تعارف پیش کر کے اس کے بارے میں علما، مشائخ صوفیہ اور بعض مخالفین تصوف کے بنیادی نظریات کا تجزیہ کیا گیا ہے- ''سنی تصوف'' کی ترجمانی کرتے ہوئے فاضل مترجم رقم طراز ہیں: ''تصوف کا سررشتہ بنیادی طور پر قرآن وسنت اور صحابۂ کرام کی زندگیوں سے جا ملتا ہے- اسی وجہ سے اسے ''سنی تصوف'' کہا جاتا ہے- اس میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعارض کی کوئی گنجائش نہیں-

یہی وجہ ہے کہ امام قشیری جو سنی صوفی تھے، فرماتے ہیں: **من علامة صحة العارف ألا يقع منه فی أحكام الشريعة تقصير فی جميع أحواله**- یعنی ''عارف کے صحیح ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس سے کسی بھی صورت میں احکام شریعت میں کوئی کوتاہی سرزد نہ ہو-''

مقدمہ کے بعد اصل کتاب کا ترجمہ ہے، جو نو فصلوں اور آٹھ ضمیموں پر مشتمل ہے- پہلی فصل میں یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام میں صوفی سلسلوں کا آغاز کب اور کیسے ہوا- اس بحث کے شروع میں مؤلف نے لفظ صوفی کے اشتقاق و اصل کے حوالے سے مختلف آرا بھی ذکر کی ہیں- تصوف کے اسلامی و غیر اسلامی دونوں قسم کے مصادر بیان کیے ہیں اور رباط، خانقاہ اور زاویہ جیسی صوفیانہ مصطلحات میں فرق واضح کیا ہے-

دوسری فصل میں صوفی طریقت کے اہم اور مرکزی سلسلوں کا بیان ہے- جس میں ''مدارس تصوف'' کی اہم شخصیات کا ذکر کرتے ہوئے سہروردیہ، رفاعیہ، قادریہ اور مصر و مغرب کے صوفیہ کا ذکر ہے- اس کے بعد ایران، ترکی اور ہندوستان کے معروف سلاسل کا تفصیلی خاکہ ہے-

تیسری فصل میں سلاسل صوفیہ کے قیام کو موضوع بنایا گیا ہے اور مؤلف نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ حکومت عثمانیہ کے آغاز کے ساتھ ہی ان کا قیام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تھا- آگے کی فصلیں مع عناوین حسب ذیل ہیں:

چوتھی فصل: انیسویں صدی عیسوی میں احیاء و تجدید کی تحریکات- پانچویں فصل: تصوف اور فلسفۂ الٰہیہ: صوفیہ کی نظر میں- چھٹی فصل: سلاسل صوفیہ کی تنظیم- ساتویں فصل: صوفیہ کے مراسم و شعائر اور دینی محافل- آٹھویں فصل: اسلامی معاشرہ میں سلاسل صوفیہ کا کردار- نویں فصل: موجودہ عالم اسلام میں سلاسل صوفیہ- اس طرح 26 صفحات پر پھیلے ہوئے آٹھ ضمیموں میں صوفیہ کے نسب نامے ذکر کر کے مؤلف نے اپنی کتاب کا اختتام کر دیا ہے-

شروع کی تمہیدی گفتگو کے بعد یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ یہ کتاب اپنے قارئین سے کس دقت نظر اور باریک بینی کا تقاضا کرتی ہے- یوں بھی مستشرقین کی کسی بھی اسلامی کتاب کا مطالعہ کرتے وقت بنیادی طور پر یہ تجسس رہنا چاہیے کہ وہ ہماری وراثت پر جانکاہ محنت کر کے کس مقصد کے حصول میں سرگرم ہیں؟ در پردہ اغراض کیا ہیں اور منہج و طریقۂ کار کیسا ہے؟ کیوں کہ اب تک اسلامی موضوعات پر اکثر مستشرقین کی تحقیقات ''در پردہ مقصد'' کی چغلی کھا رہی ہیں- اسلامی

ثقافت کے کسی پہلو میں افراط اور کسی میں تفریط کے داغ دھبے دکھا کر اس کی موزونیت اور اعتدال کو مشتبہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے- ہمیں سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ J. Spencer Brimingham کی یہ کتاب بھی اس سلسلہ کی ہی ایک کڑی ہے- کتاب کے عنوان اور مرکزی خیال کے علاوہ موضوع سخن سے گہری آگہی قاری کی دسترس میں نہ ہو تو مستشرق کی پرفریب سادگی اس کے در پردہ مقصد اور تہہ داری کا حجاب بن سکتی ہے- مختلف مباحث میں مؤلف کے اسلوب بیان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ تصوف کو اس غیر اسلامی عینک سے دیکھنے کے عادی ہیں، جو شرعی التزامات سے بے پروائی اور دینی فرائض میں کوتاہی کو نظر انداز کر دیتی ہے- اس لیے جب نام نہاد متصوفین کے انحراف پر علما کی گرفت ہوتی ہے تو وہ آنکھ موند کر ان کا دفاع کرتے ہیں اور علمائے اہل سنت کو رجعت پسند اور اپنے خول میں بند کہہ کر گزر جاتے ہیں- فاضل مترجم کے مقدمہ کا یہ اقتباس اسی نقص کی شکایت کر رہا ہے- ''جس کتاب کا ترجمہ ہم پیش کر رہے ہیں، اس میں سلاسل صوفیہ، ان کی نشو و نما، ان کے مقامات اور ان کی شاخوں کے متعلق بے حد مفید معلومات ہیں، مگر ساتھ ہی بعض عیوب بھی جگہ پا گئے ہیں- ہم نے ان کی تردید کی کوشش کی ہے اور جا بجا ان کی تصحیح بھی کی ہے-'' (مقدمہ، صفحہ ۱۰)

مترجم قابل صد تبریک ہیں کہ انھوں نے کتاب میں جھلک رہی مصنف کی مستشرقانہ نیت اور مریضانہ ذہنیت کو خوب آشکار کرنے کی کوشش کی ہے اور جا بجا ان کی غلط فہمیوں کا ازالہ اور علمی خیانتوں کا محاسبہ کیا ہے- مصنف کی خامیوں پر مترجم کے ریمارک کی چند جھلکیاں آپ بھی ملاحظہ فرمائیے!

● ''اسلام میں ظاہری و باطنی مذاہب کے مابین کا نزاع فقہائے شریعت کا پیدا کردہ ہے...... کئی بار مشائخ صوفیہ میں بھی اتباع شریعت اور اس سے محبت کے اظہار میں منافست جاری ہوئی اور اس عمل میں بہت سے صوفی گروہ اپنے اساسی عناصر سے دور ہو گئے-'' (صفحہ ۱۶۴)

فاضل مترجم اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''یہاں مصنف کی رائے یہ ہے کہ محض شریعت حقہ یا اسلام سے موافقت ہی وہ چیز ہے جو تصوف کو بے معنی اور بے مضمون بنا دیتی ہے- حالانکہ یہ فکر اسلامی تصوف میں قطعاً نظر نہیں آتی، اگرچہ تصوف کے سطحی مظاہر اور اس کے نام پر ہونے والے تجاوزات و انحرافات میں اسے دیکھا جا سکتا ہے-'' (نفس مرجع)

● ''صوفیہ کے نزدیک حقیقت کے براہ راست تجربہ کو وحی تاریخی (وحی الٰہی) پر بھی اولیت

حاصل ہے- اور یہیں سے اہل تصوف اور شریعت کے حامیوں میں ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے-'' (صفحہ ۲۱۹)-

فاضل مترجم اس پر اپنا ریمارک دیتے ہیں: ''یہاں مصنف کی وہ فکر واشگاف ہوتی ہے جس پر وہ شروع سے مصر ہیں- یعنی تصوف ''دین منزل'' سے بالکل مختلف شے کا نام ہے- یہ فکر سراسر غلط ہے کیوں کہ اسلامی تصوف اعتدال پسند، فکری کج رویوں سے دور اور غلو آمیز سلوک سے نفور ہے- اس کا اسلام سے کوئی تعارض نہیں، بلکہ وہ اسی کے اندر کی پیداوار اور اس سے ہم آہنگ ہے-'' (نفس مرجع)

● ''عالم عرب اور مغرب میں غنوصی صوفیہ کا ورثہ اس وقت پامال ہوگیا، جب صوفیہ نے شریعت کے سامنے سرتسلیم خم کر دیا اور وہ اسلامی تعلیمات سے متفق ہوگئے- تاہم یہ ورثہ ایران میں شیعیت کے زیر سایہ محفوظ رہا، جہاں شیو صوفیہ کا ''مدرسہ افہانیہ'' گھٹا ٹوپ اندھیروں میں بھی ملا سدرا، ملا ہادی اور صنبر اوی جیسے صوفیہ کی روشنیاں بکھیر رہا تھا'' (صفحہ 203)-

فاضل مترجم اس پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ''مصنف کا اسلوب دیکھیے کہ جب وہ **تصلب فی الدین، تمسک بالشریعة** اور بعض نام نہاد متصوفین کے انحرافات پر علما کی جرح و قدح کا ذکر کر رہے ہیں تو ان ساری چیزوں کو ''گھٹا ٹوپ اندھیروں'' سے تشبیہ دے رہے ہیں جب کہ غیر اسلامی غنوصی افکار وعقائد کے حاملین کو ان گھنے اندھیروں میں ''روشنی'' کے مانند قرار دے رہے ہیں-'' (حوالۂ سابق)

● ''مکہ میں حکومت عثمانیہ کے زیر حمایت علما و اشراف کا طبقہ دینی وشہری دونوں امور میں حاکم مطلق بن گیا، اس لیے قائدین تصوف کے اثرات پر انھوں نے قابو پالیا- چنانچہ انھوں نے نہ صرف اپنے سیاسی رعب و دبدبہ بلکہ مالی قوت کے ذریعہ بھی انھیں پھلنے پھولنے سے روکے رکھا- چنانچہ ان صوفیہ کی اہانت اور ان پر الزامات واتہامات آئے دن عام ہوگئیں-'' (صفحہ ۱۹۶)

فاضل مترجم اس پر اپنی تنقید لکھتے ہیں: ''مصنف علما اور متصوفین کے اختلاف کو حکومت و دولت کی بنیاد پر پیدا ہونے والے جھگڑے کا رنگ دے رہے ہیں- یہاں بھی وہی صورت نظر آرہی ہے جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں- یعنی مصنف تصوف کا دفاع بہرحال کرتے ہیں، خواہ اس کے پردہ میں کچھ بھی چل رہا ہو اور اس کے نام پر خلاف شرع افعال ہی کیوں نہ انجام دیے جا رہے ہوں- ایسا لگتا ہے کہ ان جگہوں پر انھیں علمائے اسلام پر برسنے کا موقع ہاتھ آجاتا ہے، اس لیے (نام نہاد) صوفیہ کے تجاوزات وانحرافات پر علما کے موقف کو سمجھنے کی بجائے ان پر وار کرنا شروع کر دیتے ہیں-'' (نفس مرجع)

انگریز مصنف نے ۴۲۴ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں بہت سی جگہوں پر شریعت اور طریقت یا علما وصوفیہ کو باہم دست وگریباں دکھا کر ایک جہان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے جب کہ فاضل مترجم نے جہاں کہیں ضرورت محسوس کی، وہاں حاشیہ لگا کر بے لاگ تبصرہ اور غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے- جس کی داد نہ دینا بیداد کے مترادف ہوگا- ویسے ان کے علاوہ بھی بہت سے مقامات پر مصنف کا قلم ''مستشرقانہ ذہنیت'' کا عکاس نظر آتا ہے- چند نمونے اس کے بھی دیکھیے!

1- اناضول میں ترکیوں کے قبول اسلام کو مسلمانوں سے ان کی شکست کا نتیجہ قرار دے رہے ہیں اور شاید یہ تصور دہرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا- (صفحہ ۳۴۶)

2- واقعۂ معراج کو ''اسطورہ'' سے تعبیر کیا ہے- (صفحہ ۳۰۹)

3- صوفیہ کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کا عوام الناس کے اوراد میں شامل ہو جانا اور ہر نماز کے بعد بطور وظیفہ ان کا پڑھا جانا، مصنف کی نظر میں (نعوذ باللہ) سوقیانہ عمل اور روحانیت سے خالی ہے- (صفحہ ۲۸۷)

4- مذہب اسلام کو اقوام وممالک کی طرف منسوب کر کے محض علاقائی بنیادوں پر اسے متعدد خانوں میں بانٹنا اور ایرانی اسلامی، افریقی اسلام، ایشیائی اسلام اور ہندی اسلام جیسی اصطلاحات ایجاد کر کے اسلام کے وسیع عالمی تصور کو مسخ کرنا مستشرقین کا پرانا طریقہ رہا ہے- موصوف نے بھی اس زہرناک اسلوب کی پیروی کی ہے- (صفحہ ۴۹، ۲۹۰)

اس قسم کے داغ دھبوں اور فحش عیوب کے باوجود یہ کتاب سلاسل صوفیہ، ان کے ارتقائی مراحل، متعلقہ مقامات اور امت مسلمہ میں مشائخ تصوف کے روحانی تصرفات کے حوالے سے قیمتی تاریخی معلومات سے لبریز ہے- مصنف کے انداز نگارش میں معروضیت کی سعی پیہم ہے- کتاب کی ترتیب وتہذیب میں حسن سلیقہ نمایاں ہے- طباعت دیدہ زیب اور سرورق بھی نہایت خوب صورت ہے- البتہ کمپوزنگ کی بکثرت غلطیاں قارئین کی الجھنوں کا سبب بن سکتی ہیں- تصوف کے موضوع پر ریسرچ کرنے والوں کے لیے یہ کتاب تاریخی جہت سے بیش قیمتی تحفہ اور عمدہ ذخیرہ ہے، تاہم فکری جہت سے مستشرقین کی تحقیقات کو ''خضر راہ'' بنا لینا ہماری سمجھ میں نا سمجھی ہے-

تبصرہ نگار: غلام رسول دہلوی

○○○

نام کتاب : What is Sufism? (**تصوف کیا ھے؟**)

مصنف : **Martin Lings (ابوبکر سراج الدین)**

ضخامت : 133 صفحات

ناشر : سہیل اکیڈمی، چوک اردو بازار، لاہور، (پاکستان)

اسلامی تاریخ میں تصوف ہی ایک ایسا وسیع المعنی متنازع (Controversial) لفظ ہے جس کو دنیا کے ایک گروہ نے کسی حد تک عین اسلام اور عین ایمان قرار دیا ہے تو دوسرے نے اسلام سے منحرف ایک بدعتی تحریک۔ اس اختلاف نے خود مسلم فرقے اور جماعتوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے لوگوں کو بھی تصوف کے مطالعے پر مجبور کیا ہے جس کے نتیجے میں برصغیر اور اسلامی ممالک کے علاوہ یورپ، امریکہ اور افریقہ وغیرہ کے بے شمار مسلم و غیر مسلم اسکالروں نے تصوف کی گتھی کو سلجھانے کا بڑا ہی تفصیلی کام کا ہے جو تقریباً دنیا کی تمام زبانوں میں موجود ہے۔ اور اس بے لوث خدمت کی وجہ یہ ہے کہ ان اسکالروں کے نظریے اور تحقیق کے مطابق تصوف کا تصور کسی نہ کسی حیثیت سے دنیا کے تمام مذاہب میں ہے- یہ اور بات ہے کہ اس کے برتنے اور محسوس کرنے کا انداز جداگانہ ہے۔ لہٰذا اگر اس لاینحل قضیے کا کوئی علمی اور مثبت حل نکلتا ہے تو نہ صرف یہ اسلام اور مسلمانوں کے حق میں بہتر ہوگا بلکہ پوری دنیائے انسانیت کے لیے مذہب اور خدا کو صحیح طور پر پہچاننے اور اس کے بتائے ہوئے احکام کو عملی انداز میں برتنے کا ایک متفق علیہ پیمانہ بھی مل جائے گا-

زیر نظر کتاب (What is Sufism?) انہی عظیم اسکالروں میں سے ایک نو مسلم صوفی اسکالر (مارٹن لنگس/ ابوبکر سراج الدین، ۱۹۰۹۔۲۰۰۵) کی تصوف کے موضوع پر لکھی گئی مشہور زمانہ اور معرکہ آرا تصنیف مانی جاتی ہے۔ مارٹن لنگس کا شمار ایک انگریز صوفی مسلم مصنف اور دنیا کے عظیم اسکالر کے طور پر ہوتا ہے۔ موصوف مانچسٹر کی ایک پروٹسٹنٹ فیملی میں پیدا ہوئے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی سے انگریزی زبان میں گریجویشن کرنے کے بعد یونیورسٹی آف کینساس میں لیکچرار مقرر ہوئے، قاہرہ یونیورسٹی مصر میں بھی انگریزی ادب خصوصاً شیکسپیرین لٹریچر کے استاذ رہے- ۱۹۳۹ مصر میں شاذلیہ سلسلے کے بعض صوفیہ سے متاثر ہو کر مشرف بہ اسلام ہو گئے- ۱۹۵۲ میں انگلینڈ واپس آکر عربی ادب میں ڈبل گریجویشن کیا اور یونیورسٹی آف لندن کے اسکول آف اورینٹل اینڈ

افریکن اسٹڈیز (School of Oriental and African Studies) سے الجیریا کے ایک صوفی احمد علوی پر اپنی پی.ایچ.ڈی مکمل کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۷۰ سے ۱۹۷۴ تک وہ برٹش میوزیم میں مشرقی مخطوطات اور کتابوں کے محافظ رہے۔ آپ نے مختلف ممالک کا سفر کیا اور بے شمار اسلامی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ موصوف رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور برٹش میوزیم کے زمانے تک ممبر رہے۔ انھوں نے اسلام اور متعلقہ موضوعات پر متعدد بیش قیمت کتابیں، مضامین اور مقالات لکھے۔ ساتھ ہی Encyclopedia of Britannica کے لیے اسلام، تصوف اور تقابل ادیان پہ گراں قدر مقالے لکھے۔ موصوف کو انگریزی ادب، فلسفہ، تصوف اور تقابل ادیان میں استاذ الاساتذہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اسی طرح ان کی کتاب What is Sufism? تصوف کے جدید محققین کے نزدیک ماخذ کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

اس کتاب کو انھوں نے پیش لفظ کے علاوہ نو ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ مثلاً: (۱) تصوف کی حقیقت، (۲) تصوف کی آفاقیت، (۳) قرآن، (۴) پیغمبر اسلام، (۵) قلب (روح تصوف)، (۶) اصول تصوف، (۷) طریقہ تصوف، (۸) تصوف کی خصوصیات اور (۹) تصوف عہد بہ عہد۔

ان کی اس کتاب کی یہ بھی ایک خصوصیت اور انفرادیت ہے کہ موصوف نے پوری کتاب میں ہر باب کا چربہ اور خلاصہ متعلقہ باب کے پہلے ہی پیراگراف میں بڑے ہی اختصار اور اچھوتے انداز میں پیش کر دیا ہے۔ جس کو پڑھ لینے کے بعد قاری پوری کتاب کو پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر تصوف کی خصوصیات والے باب کے پہلے پیراگراف میں تصوف کی حقیقت کے تعلق سے یوں رقم طراز ہیں:

Sufism is central, exalted, profound and mysterious; it is inexorable, exacting, powerful, dangerous, aloof— and necessary. This aspect has to do with its inclusiveness.(Chpter: 8,p:92)

’’تصوف ایک مرکزی، لائق تعریف، عمیق، پراسرار، مضبوط، نپا تلا، سخت گیر، طاقتور، پرخطر، الگ تھلگ اور ناگزیر امر ہے۔ لہٰذا اس پہلو کو اس کی جامعیت کے ساتھ برتنے کی ضرورت ہے۔‘‘

اس کے علاوہ ہر باب کے شروع میں تصوف کے تعلق سے کچھ اسی طرح کے جامع تمہیدی کلمات لکھے ہیں۔ لیکن اس کتاب میں مارٹن لنگس کی جس بات نے مجھے تبصرہ کرنے پہ برانگیختہ کیا وہ ایک ایسی خدا لگتی تلخ حقیقت ہے جس کا فی زمانہ کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ اسی کے ساتھ یہ

بات حامیانِ تصوف کے لیے ایک تازیانہ اور لائق حیرت وعبرت بھی جسے فراخ دلی سے قبول
کرکے انہیں اپنا محاسبہ کرنا چاہیے کہ واقعی تصوف کے نام پر پیشہ ور خانقاہی افراد جو کچھ کررہے
ہیں کیا اسلام میں اس کی اجازت ہے، یا کیا ان بزرگوں نے ایسا ہی کیا تھا؟۔جن کے محض عمل کو
دیکھ کر ہزاروں اور لاکھوں افراد نے اسلام کی حقانیت کا بانگ دہل اعلان کیا تھا اور اپنے آبائی
مذہب کو ترک کرکے آغوش میں اسلام پناہ لے لی تھی۔اور اپنے کردار سے ایک جہان کو سر تسلیم خم
کرنے پر مجبور کردیا تھا۔مارٹن کا دل پہ ہاتھ رکھ کے پڑھنے والا پیراگراف یہ ہے:

"To-day Sufism (Tasawwuf) is a name wihout a reality.It was once a reality without a name.'Commenting on this in the following century,Hujwiri adds:'In the time of the Companians of the Prophet(S.A.W) and their immediate successors this name did not exist, but its reality was in every one. Now the name exists without the reality.'Similarly,but without being so absolute either in praise or blame,Ibn Khlaldun remarks that in the first three generetions of Islam mysticism was too general to have a special name. But when worldliness spread and men tended to become more and more bound up with the ties of this life, those who dedicated themselves to the worship of God were distinguished from the rest by the title of Sufis'." (Chapter 5, p:45)

''آج تصوف حقیقت سے پرے محض ایک نام رہ گیا ہے جب کہ وہ بھی ایک زمانہ تھا جب
یہ نام کے بغیر ایک مسلم حقیقت تھا۔بعد کی صدی میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے علی ہجویری نے لکھا
ہے کہ ''پیغمبر اسلام ﷺ کے اصحاب اور حقیقی وارثوں کے زمانے میں اس نام کا وجود نہیں تھا لیکن
اس کی حقیقت ہر شخص میں موجود تھی اور اب نام تو موجود ہے مگر حقیقت کے بغیر۔'' ٹھیک اسی طرح
مدح و ذم سے بے نیاز ہو کر ابن خلدون نے یوں اظہار خیال کیا ہے: ''اسلام کی پہلی تین
پیڑھیوں کے درمیان تصوف کا نام موجود نہیں تھا لیکن جب دنیاداری عام ہوگئی اور لوگوں کا رجحان
مادی زندگی کی طرف زیادہ بڑھ گیا تو وہ لوگ جنہوں نے خود کو اللہ کی عبادت کے لیے وقف کردیا
انہیں اوروں سے ممتاز کرکے صوفی کے نام سے پکارا جانے لگا۔''

اس پیراگراف میں یہ جملہ کہ '' آج تصوف حقیقت سے پرے محض ایک نام رہ گیا
ہے۔جبکہ وہ بھی ایک زمانہ تھا جب یہ نام کے بغیر ایک مسلم حقیقت تھی'' چوتھی صدی ہجری کے

ایک عالم ابوالحسن فشانجی کا ہے اور آج یعنی اس تحریر کے گیارہ سو سالوں بعد جو بگاڑ آیا ہے وہ ہم
سب کے سامنے ہے۔اسے ہم تمام مسلمانوں کو محسوس کرنا چاہیے۔اور ساتھ ہی اس کا مداوا بھی
تلاش کرنا چاہیے۔ورنہ تصوف کا ڈھنڈورا نہیں پیٹنا چاہیے۔کیوں کہ اس سے اسلام اور مسلمانوں
کی بڑی رسوائی ہوئی ہے، ہو رہی ہے اور اگر اس کا سدباب نہ کیا گیا تو ہوتی رہے گی۔جس کے
ذمہ دار صرف اور صرف پیشہ ور اہل خانقاہ، ماڈرن صوفیہ اور شکم پرور علما ہوں گے۔جنہیں تاریخ
کبھی معاف نہیں کرے گی اور جارج برناڈ شا جیسا دنیا کا عظیم اسکالر یہی کہتا ہوا نظر آئے گا کہ

"I Love Islam, but i hate muslims becouse they don't follow Islam properly."

''میں اسلام سے محبت کرتا ہوں لیکن مسلمانوں سے نفرت، کیوں کہ وہ لوگ کما حقہ اسلام کا
اتباع نہیں کرتے۔''

اس کے علاوہ مارٹن لنگس نے اپنی اس کتاب کے ہر باب کے ہر پیراگراف اور سطر میں
حامیان تصوف کی بے اعتدالی کے سبب پیدا شدہ خستہ حالی اور اسلام کی غلط ترجمانی پر جو آنسو بہایا
ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

تبصرہ نگار: اشرف الکوثر مصباحی

○○○

مکتوبات

پروفیسر سید شاہ محمد امین میاں قادری، (سجادہ نشین خانقاہ قادریہ برکاتیہ، مارہرہ)

اہل اللہ کا طریقہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ وہ اصلاح نفس کی جملہ صورتوں کو بروئے کار لا کر انسانوں کی فلاح کی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں- زبانی، عملی اور تحریری طریقوں کو مراکز تصوف نے وقتاً فوقتاً اپنا کر اپنے حلقۂ اثر کے اخلاقی و روحانی ارتقا کی جو مثالیں قائم کی ہیں، ارباب نظر ان سے واقف ہیں- سید سراواں شریف سے ''الاحسان'' کی اشاعت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے- مجلّے کا نام اپنے مشمولات کا تعارف بھی کراتا ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مشہور حدیث جبریل کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے- ارباب تصوف کا سلوک و احسان سے جو عملی تعلق ہے اس کے پیش نظر اس مجلّے کی اشاعت اس بات کا بھی اشارہ ہے کہ صاحبزادگان سید سراواں شریف اسی روش پر گامزن اور ثابت قدم ہیں جو ان کے اسلاف والا تبار کی روش تھی-

فقیر قادری اس مجلّے کی اشاعت پر اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہے اور دعا گو ہے کہ مولیٰ کریم بطفیل رسول وآل رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس خدمت کو قبول فرمائے- آمین

□□□

مولانا یٰسین اختر مصباحی، (بانی ومہتمم دارالقلم، دہلی)

یہ خبر باعث مسرت ہے کہ حضرت شیخ ابوسعید احسان اللہ چشتی الہ آبادی کی سرپرستی میں خانقاہ عارفیہ سید سراواں الہ آباد سے 'الاحسان' کے نام سے ایک رسالہ کا اجرا ہونے والا ہے، جس کا خاص مسرت بخش پہلو یہ ہے کہ یہ رسالہ تصوف و اخلاق کی تعلیمات پر مشتمل ہوگا اور اس کے زیادہ تر مضامین و مقالات ترجیحی طور پر تصوف و اخلاق ہی سے متعلق ہوں گے-

کسی رسالہ کا اجرا کچھ زیادہ مشکل نہیں لیکن اسے تسلسل کے ساتھ جاری اور باقی رکھنا نہایت دشوار گزار امر ہے- لیکن مجھے امید ہے کہ اس رسالہ کے سرپرست اور دیگر ارباب حل وعقد نے اس دشوار گزار مہم کو سر کرنے کے لیے متعلقہ ومطلوبہ امور کا یقیناً جائزہ لے لیا ہوگا اور مکمل تیاری کے بعد ہی قدم آگے بڑھایا ہوگا-

اس عالم اسباب میں اسباب پر نظر رکھنا ضروری ہے لیکن خالق اسباب پر اعتماد وتوکل سب سے بڑی دولت ہے اور یہی اعتماد وتوکل علی اللہ تصوف کی بنیاد ہے- لہٰذا اس بنیاد پر جس تعمیر کا

آغاز ہوگا وہ یقیناً پایۂ تکمیل تک پہنچے گا-

اخلاص قلب، تصوف کا راس المال ہے، جس کے ہوتے ہوئے کسی اور مال و دولت کی ضرورت نہیں اور اگر ہے بھی تو وہ راہ نہیں بلکہ وہ گرد راہ ہے-

میری دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے حبیب پاک صاحب لولاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ وطفیل میں کتابی سلسلہ الاحسان کو عمر دراز عطا فرمائے اور اسے سیرت وتصوف و اخلاق کا مرقع بنائے-**السعی منا و الاتمام من الله**-

بہر صورت طلب لازم ہے آب زندگانی کی
اگر پایا خضر تم ہو نہ پایا تو سکندر ہو

❒❒❒

مفتی محمد نظام الدین رضوی، (صدر مفتی دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ)

یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ زیر سرپرستی شیخ طریقت عالی جناب شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ چشتی صفوی دام ظلہ العالی، علم تصوف و احسان پر آپ ایک اہم مجلّہ ''الاحسان'' شائع کررہے ہیں، جو تذکیر وتزکیہ، صوفی ادب، تحقیق وتنقید اور امام محمد غزالی رحمۃ اللہ تعالی علیہ پر خصوصی گوشہ اور تصوف پر مباحثہ وغیرہ اہم عنوانات پر علمی مضامین کا گلدستہ ہے-

اس پہلو سے کام کرنے کی ضرورت تھی- خاص طور پر اس زمانے میں جب کہ تصوف کے منکرین اس پر طعن وتشنیع کرتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت اور اہمیت و افادیت دلائل شرعیہ کی روشنی میں اجاگر کرنے کی ضرورت زیادہ تھی- خدا کرے یہ کتابی سلسلہ ہماری توقعات کے مطابق ہو-

دعا ہے کہ اللہ عزوجل آپ کی یہ علمی کاوش قبول فرمائے اور آپ کو اور سرپرست ادارہ نیز معاونین وارباب قلم کو جزائے خیر عطا فرمائے-(آمین!)

❒❒❒

پروفیسر اختر الواسع، (صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-۲۵)

ایک ایسے دور میں جب خانقاہیں عام طور پر محض اسیر مناجات ہیں، چشتیہ نظامیہ سلسلۂ

تصوف کی، علم و عرفان کی روایت کی توسیع میں خانقاہ سید سراواں، حضرت شیخ طریقت عالم شریعت ابوسعید احسان اللہ چشتی دامت برکاتہم کی رہنمائی اور سرپرستی میں جو غیر معمولی خدمات انجام دے رہی ہے وہ بہت اہمیت کی حامل ہے- ہندوستان میں امام غزالی کے نام اور پیغام کو عام کرنے کے علاوہ اب ایک ایسا مجلّہ تصوف شائع کرنے کا فیصلہ انہی کوششوں کا نیا سنگ میل ہے- مجھے یقین ہے کہ اس سے ہم جیسے لوگ جو گناہوں کے مرض میں مبتلا ہیں وہ اپنے لیے کوئی نہ کوئی نسخۂ شافی ضرور پائیں گے-

میں مجلّے کی اشاعت کے لیے مبارک باد دیتا ہوں اور خداوند قدوس کی بارگاہ کی میں دعا کرتا ہوں کہ وہ اس سلسلے کو نافع بنائے اور جاری رکھے-

❒❒❒

پروفیسر مسعود انور علوی، (صدر شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا- یاد فرمائی کا شکریہ ''!عصر حاضر میں تصوف ،صوفیہ اور خانقاہوں کی اہمیت'' کے عنوان سے انشاء اللہ ایک مقالہ روانہ خدمت کروں گا-۳۰/۴۰/روز مصروفیت بہت ہے -آپ نے ۲۵/اگست کی تحدید فرمائی ہے- وقت کم ہے مگر حضرت قبلہ ابومیاں صاحب زید لطفہ ومدظلہ کا معاملہ ہی دوسرا ہے-حکم سرآنکھوں پر-کوشش کروں گا کہ بذریعہ ای میل اسکین کرا کے روانہ کردوں-

سب سے ماوجب-خدا کرے یہ عریضہ آپ کو مل جائے -اللہ تعالیٰ آپ سب کی کوششوں کو بارآور فرمائے-آمین!

❒❒❒

پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، (سابق صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

گرامی نامہ وقت اجابت کے عین لمحہ میں موصول ہوا -اس وقت مطالعہ تصوف ہی کا چل رہا تھا- آپ کے گرامی نامے نے تحریک دی اور ایک طویل تحقیقی مقالہ حقیقت تصوف پر تیار ہوگیا، وہ ارسال خدمت ہے-پسند آئے تو چھاپ دیں اور بہر حال اس کی وصول یابی کی رسید سے نوازیں-

ناپسند ہو تو بلاتکلف وتردد واپس کردیں کہ طالبان تصوف اور بھی ہیں- اللہ تعالیٰ آپ کو تمام اعمال صالحہ میں کامیابی عطا فرمائے اور اسلامی تصوف کی صحیح خدمت کا موقع دے- یہ سلسلہ جاری رہا تو سلاسل تصوف کی طرح بعض اور مضامین ومقالات احسان حاضر کروں گا- دعاؤں میں یاد رکھیں-

□□□

پروفیسر سید طلحہ رضوی برقؔ، (ویر کنور سنگھ یونیورسٹی، آرہ، بہار)

نامہ گرامی مورخہ ۵/اگست ۲۰۰۹/موصول ہوا- اس سے قبل والا خط بھی مل گیا تھا- یاد فرمائی و برق نوازی کے لیے سراپا سپاس ہوں- جواب خط میں تاخیر ہوئی، شرمندہ ہوں-

اس طرف بیمار رہنے لگا ہوں اور کمزوری بڑھ گئی ہے- آنکھ میں موتیابند کا پانی آرہا ہے- لکھنے پڑھنے میں دقت ہو رہی ہے- آپ کا حکم سر آنکھوں پر "الاحسان" کے لیے لکھنا میری سعادت ہوگی - مودبانہ عرض ہے کہ مرسلہ عنوان "شاعر عرفان حق مولانا جلال الدین رومی" پر فی الوقت مقالہ لکھنا میرے لیے مشکل ہوگا- گزشتہ سال چوں کہ عالمی پیمانے پر رومی صدی منائی گئی اور شہروں شہروں ان سے متعلق سیمینار منعقد ہوا- پٹنہ میں "خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری" نے بھی کل ہند سیمینار منعقد کی- یہ کم نوا بھی مدعو کیا گیا تھا- اس سیمینار میں میں نے ایک مقالہ بعنوان "عظیم صوفی جلال الدین رومی" پڑھا تھا- یہ مقالہ میرے بھانجے داماد مولانا سید شاہ رکن الدین اصدق سلمہ نے اپنے سہ ماہی رسالہ "جام شہود" میں شایع کیا ہے- میں اس کی زیراکس نقل اس خط کے ساتھ ارسال خدمت کر رہا ہوں - اگر آپ پسند فرمائیں تو اسے "الاحسان" کے اس شمارے میں شائع فرما دیں- مجھے خوشی ہوگی اور مولانا رکن الدین بھی خوش ہوں گے-

جیسا آپ بہتر سمجھیں- اس ماہ مبارک کی خصوصی دعاؤں میں مجھ گنہ گار کو یاد رکھیں اور صحت وسلامتی ایمان کی دعاء فرما دیں- **هل جزاء الاحسان الا الاحسان**-

□□□

مولانا محمد شاکر نوری، (امیر سنّی دعوت اسلامی، ممبئی)

موجودہ دور میں انسانی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات اظہر من الشمس ہوگی کہ ہر طرف

بے قراری و بے چینی کا دور دورہ ہے- مختلف دانش وروں نے یہ منصوبہ پیش کیا کہ آج کے دور کی بے قراری و بے چینی کا علاج مادی ترقیات میں مضمر ہے، چنانچہ چاند پر پانی دریافت کرنے کی بات کہی جانے لگی اور انسان ترقی کر کے چاند پر بھی پہنچنے کا دعوی کرنے لگا مگر انسانی زندگیوں میں سکون وقرار کی دولت اب تک فراہم نہ کر سکا- وجہ یہ ہے کہ بے قراری و بے چینی کا علاج مادی ترقیات میں نہیں بلکہ ذکر الٰہی وذکر رسول اور انسانی ہم دردی میں ہے-

جہاں جہاں مادی ترقی زوروں پر ہے اور تسکین قلب کا کوئی سامان نہیں ہے وہاں انسانیت سسکتی ہوئی نظر آرہی ہے- قرآن مقدس میں پہلے طمانیت قلب کی دولت سے مالا مال ہونے اور پھر آسمان وزمین میں غور وفکر کرنے والوں کو "عقل والا" کہا گیا ہے- ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ان فی خلق السموات والارض واختلاف اللیل والنهار لأیات لاولی الالباب الذین یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلیٰ جنوبهم ویتفکرون فی خلق السموات والارض ... الخ

آج سائنس کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھ رہا ہے اور سوسائٹی میں سب سے زیادہ عزت وشرف والا سائنس دانوں کو سمجھا جا رہا ہے- سائنسی علوم میں مہارت اچھی چیز ہے لیکن قلب ویران ہو تو یہی سائنسی تحقیقات انسانوں میں فساد کا باعث ہو جاتی ہیں- جتنے بھی اولیائے کرام تشریف لائے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں کرامتوں کا تاج عطا فرمایا تھا لیکن ان اللہ والوں نے کرامتیں کبھی کبھی دکھائیں اور زندگی کا بیشتر حصہ انسانی خدمات، انسانی ہمدردی اور تزکیہ نفوس میں گزارا- تزکیہ نفس کو قرآن میں فلاح کا ذریعہ قرار دیا گیا- تزکیہ نفس ہی کا نام تصوف ہے، جو اسلام کے فروغ کا سب سے موثر ذریعہ ہے-

آج مغرب ترقی کی بلندیوں پر فائز ہے لیکن وہاں کے انسانوں میں اگر جھانک کر دیکھا جائے تو مایوسی، افسردگی، بے قراری، بے چینی حد سے زیادہ پائی جا رہی ہے- اہل مغرب کسی حد تک اب یہ تسلیم کرنے لگے ہیں کہ ہماری پریشانیوں اور بے چینیوں کا حل اسلام میں موجود ہے-

آج عالمی سطح پر فروغ اسلام میں جو چیز زیادہ کارآمد ہو سکتی ہے وہ تصوف ہے - لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ تصوف کو اپنی زندگی کے شب وروز میں داخل کیا جائے، آج دنیا کو عملی تصوف کی ضرورت ہے-

قابل صد مبارکباد ہیں شیخ طریقت حضرت ابوسعید احسان اللہ چشتی مدظلہ العالی اور ان کے رفقائے کار جنھوں نے تصوف کے فروغ کے لیے ''الاحسان'' نکالنے کا عزم مصمم کیا اور تصوف کی معلومات سے لوگوں کو روشناس کرنے کا بیڑا اٹھایا - دعا ہے کہ اللہ رب العزت چشتی صاحب اور ان کے رفقا کو عمر خضر عطا فرمائے اور ان کے عزائم کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے -آمین!

□□□

مفتی عبدالمنان کلیمی، (مفتی شہر مرآباد و صدر مجلس علماے ہند)

تصوف اسلام وسنت کا ایسا اہم شعبہ ہے جس کے انکار کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تصوف کا ارباب علم وتحقیق کے نزدیک واضح مفہوم و مدلول یہ ہے کہ قرآن وسنت سے ارشادات و فرمودات کی روشنی میں تزکیۂ قلب اور تصفیۂ ذہن کے ساتھ بہتر سے بہتر عمل و کردار کا مظاہرہ کیا جائے۔تصوف کے مفہوم کا یہی مرکز ومحور ہے کہ اسلاف سے اخلاف تک تمام اولیاے کرام اور بزرگان دین نے فکر وعمل کی دنیا میں عظیم انقلاب برپا کیا ہے۔ یہ وہ موضوع ہے جس سے ہر دور میں اسلام کو زبردست فروغ ملا۔ جو لوگ اسلام سے تعلق نہیں رکھتے تھے وہ کشاں کشاں اسلام کی طرف مائل ہوئے۔ ہمیشہ کے لیے انھوں نے اسلام وسنت کو مذہب و مسلک بنالیا۔صوفیۂ کرام اور ان کے صوفیانہ کارناموں پر مشتمل زیر اشاعت سالنامہ ''الاحسان'' کے تعلق سے میں مدیر رسالہ ''الاحسان'' مولانا مجیب الرحمٰن علیمی اور ان کے تمام معاونین کو صمیم قلب سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ رب قدیر صوفیہ کرام کے صدقہ و طفیل تصوف کے تعلق سے ارباب علم وفضل بہتر سے بہتر خدمات انجام دیں اور قوم وملت کے لیے تصوف کے میدان میں مشعل راہ بنیں۔

□□□

مولانا فروغ احمد اعظمی، (پرنسپل: جامعہ علیمیہ،جمداشاہی،بستی، یوپی)

جیسے جیسے زمانہ دور رسالت سے دور ہوتا جارہا ہے،ہم عام مسلمان اتنا ہی زیادہ اپنے خدا سے دور ہوتے جارہے ہیں،اس کی وجہ بہت ظاہر ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم ضرورت سے زیادہ دنیا میں مشغول اور دنیاداروں سے بہت زیادہ قریب ہوگئے ہیں کہ ہمیں نہ اپنے خدا کے حقوق یاد

رہے اور نہ بندوں کے- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں اور امور نافلہ تو کجا ہم فرائض وواجبات سے بھی غافل ہوگئے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم دنیا میں بھی ذلیل وخوار اور ناکام ونامراد ہیں اور اللہ کے حضور بھی ناپسندیدہ ہوگئے ہیں، اور اس کی رحمت ہم سے روٹھ گئی ہے-

اللہ تعالیٰ کے حضور پسندیدہ اور کامیاب وفلاح یاب بندے وہی ہیں ،جو ہر جگہ ،ہر دم ،ہر کام میں اسے یاد رکھتے ہیں اور اس سے ڈرتے رہتے ہیں اور عبادت کے ساتھ تمام عادات ومعاملات میں بھی حضور قلب رکھتے ہیں ،اور اس تصور کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں کہ اگر ہم خدا کو نہیں دیکھ پاتے تو ہمارا خدا ہمیں یقیناً دیکھ رہا ہے- اسی کو حدیث رسول اور صوفیہ کی زبان میں ''احسان'' کہا جاتا ہے اور اسی کا دوسرا نام ''تصوف'' ہے-

اس گفتگو سے یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ ہر دور کا ہر مسلمان ، ہر آن ''احسان'' کا ضرورت مند ہے-مادیت اور نفسانیت کے اس گئے گذرے دور میں تو احسان (تصوف) کی ضرورت اور زیادہ بڑھ گئی ہے- اسی احسان کی فکری تربیت اور عملی تعلیم کے لیے سید سراواں الہ آباد کی خانقاہ عارفیہ جدوجہد کررہی ہے اور اس نے اپنی حالیہ مخلصانہ تعلیمی وتربیتی اور اصلاحی وروحانی سرگرمیوں کی بہ دولت موجودہ خانقاہوں میں ماضی کی طرف پلٹتے ہوئے ایک خاص امتیاز پیدا کرلیا ہے-

اس روحانی مے کدے کے پیر مغاں شیخ طریقت حضرت شاہ ابوسعید احسان اللہ چشتی مدظلہ العالی ہیں ،آپ نے روحانیت کی تعلیم وتبلیغ کو مزید عام کرنے کے لیے کتابی سلسلہ ''الاحسان'' کے اجرا کا پروگرام بنایا ہے ،خدا کرے تصوف کا یہ موضوعاتی مجلّہ مقبول خاص وعام ہو اور زیادہ سے زیادہ لوگ اسے پڑھ کر فائدہ اٹھائیں ،اور مجلّہ ''الاحسان'' ہر مسلمان بلکہ ہر انسان کی ضرورت بن جائے-

مولیٰ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے شرکاے کار کو عمر خضر عطا فرمائے اور آپ حضرات کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے-اس دور میں حضرت موصوف کی انوکھی روحانی خدمات بہت زیادہ قدردانی کی مستحق ہیں-مولیٰ تعالیٰ ہماری تشنہ اور بے قرار روح کو بھی روحانیت سے لذت چشیدہ اور سیراب کرے اور دولت ایمان کا شکر گزار بنا کر نعمت احسان سے بھی نوازے،آمین!

صبح پیری شام ہونے آئی میرؔ   تو نہ جیتا یاں بہت دن کم رہا

□□□

ڈاکٹر سیدشمیم احمدگوہر، (سجادہ نشیں: خانقاہ حلیمیہ ابوالعلائیہ، چک، الہ آباد)

مجلّہ ''الاحسان'' سید سراواں الہ آباد کے اجرا سے متعلق آپ کا مطبوعہ اعلان نامہ موصول ہوا، یادآوری کا شکریہ!

شاہ صفی اکیڈمی، جامعہ عارفیہ کی جانب سے مجلّہ الاحسان کے اجرا پر مبارک باد قبول فرمائیں- آپ نے بہت سنگلاخ، پرخار اور صبر آزما اشاعتی وادی میں قدم رکھا ہے- اس وادی میں بڑے بڑے شہسوار مات کھا چکے ہیں- اللہ تعالیٰ آپ کے ایمان افروز حوصلوں میں استحکام وتوانائی عطا فرمائے اور جذبۂ دینی میں برکتیں مرحمت فرمائے- آمین!

آپ نے مجلّہ کی بنیادی اغراض ومقاصد اور نظریات ومنصوبہ جات کو متصوفانہ تبلیغ وتعارف اوراس کے خیروبرکت سے وابستہ رکھا ہے- یہ بہت ہی فال نیک ہے- اس میں کوئی شک نہیں کہ صوفیانہ وعارفانہ محرکات ومشن ہی عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرسکتے ہیں ''الاحسان'' کی روشنی کو دور دور تک پہنچانے کی کوشش کیجیے چند برسوں کے بعد آپ کی یہ اشاعتی خدمت تاریخ کی پیشانی پر آبرو بن کر چمکے گی-

نقلی صوفیوں اور خرقہ پوشوں کے انکشاف وعقدہ کشائی میں وقت خراب کرنے سے کچھ حاصل نہیں- اصل صوفی وتصوف سے روشناس کرانے اوران کے اسرار رموز کے حقائق واضح کرنے ہی سے فریضہ نوازی کو زیادہ تقویت حاصل ہوگی-

دعا ہے کہ رب قدیر اپنے پیارے حبیب علیہ السلام والتسلیم کے صدقے میں ہم سب کے ''مجلّہ الاحسان'' کی عمر طویل کرے- صوفیائے کرام اور عرفائے عظام علیہم الرحمۃ والرضوان کے عقیدہ ومسلک اور راز ونیاز کا سچا علم بردار بنائے آمین! آپ کی نوازش پر جو جواز سماع سے متعلق ایک مختصر سا تحقیقی مقالہ ارسال کر رہا ہوں- اگر پسند آجائے تو شائع کردیں- ان شاء اللہ میں اپنے حقیر قلمی تعاون کے سلسلہ کو جاری رکھنے کی کوشش کروں گا-

□□□

ڈاکٹر قمر الهدی فریدی، (شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

''الاحسان'' کے اجرا کے منصوبے پر مبارکباد قبول فرمائیں- اللہ تعالیٰ استحکام اور قبول عام

سے سرفراز فرمائے- اس دوران آپ کے دو خطوط ملے- خیال تھا کہ آپ کے تجویز کردہ عنوان پر مضمون لکھ کر جلد ہی بھیج دوں گا- اسی کے ساتھ مبارک باد کا خط بھی چلا جائے گا- لیکن میری کوتاہی نے مضمون لکھنے کی اب تک اجازت نہیں دی- ان شاء اللہ دوسرے شمارے میں شرکت کی کوشش کروں گا- معذرت قبول فرمائیں- امید کہ ''الاحسان'' سے جو توقعات ہم لوگوں نے وابستہ کر رکھی ہیں، وہ پوری ہوں گی-

□□□

سید ضیاعلوی، (سجادہ نشین مخدوم قاضی بدرالدین المعروف قاضی بڈھن شاہ اناوی، اناؤ، یو. پی.)

چند روز قبل عزیزی و محبی میاں حسن سعید سلمہ اللہ تعالیٰ کی زبانی دو خوش بخت اور مبارک خبریں سماعت میں آئیں- پہلی یہ کہ خانقاہِ عالیہ حضرت شاہ عارف صفی قدس سرہٗ سے تصوف اور معرفت پر مشتمل رسالہ ''الاحسان'' کی اشاعت ہونے جا رہی ہے، اللہ جل شانہٗ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ اور طفیل میں اسے قبولِ ہر خاص و عام فرمائے اور ہدایت سے مزین فرما دے- آمین!

دوسری مبارک اور صد مبارک خوش خبری جو اب تک کانوں میں رس گھول رہی ہے وہ یہ کہ آقائے من حضرت مخدوم شیخ سعد الدین قدس سرہٗ خیرآبادی کی نایاب تصنیف ''مجمع السلوک'' بھی خانقاہِ عالیہ عارفیہ میں پہنچ گئی ہے- اب دل بے قرار ہے کہ کاش اس کا ترجمہ معہ شرح اور اصل متن کے جلد طبع ہو جائے- اور یہ کام اپنے سلسلے میں صرف آپ کی خانقاہ سے ہی ممکن ہے-

میں صدق دل سے دعا گو ہوں، اللہ رب العزت آپ کی کوششوں اور جہتوں کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور اس کارِ عظیم کو آپ کے لیے اور آپ کے وابستگان کے لیے توشۂ آخرت بنا دے- آمین!

□□□

ڈاکٹر سید حسنین اختر، (شعبہ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد)

مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ومسرت ہوئی کہ آپ حضرات ''الاحسان'' نامی مجلّہ شروع کرنے جا رہے ہیں- اس دور میں جب انسان اپنی فکری بے راہ روی کے باعث صحیح سمت سے بھٹک کر اضطراب و بے چینی کا شکار ہے تو اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ انسان کو اس اضطرابی کیفیت

سے چھٹکارا دلایا جائے-صوفیہ کرام کی تعلیمات اوران کے اقوال اس سلسلے میں بڑے ممد و معاون ہیں- اگر ہم صحیح ڈھنگ سے اور باضابطہ طریقے سے صوفیہ کرام کی تعلیمات کی تبلیغ کریں تو یہ انسانی سماج کے لیے ایک بہت بڑی خدمت ہوگی-

قابل مبارک باد ہیں وہ لوگ جنھوں نے مجلّہ ''الاحسان'' جاری کرنے کا عزم کیا، تاکہ وہ یہ خدمت جلیلہ انجام دیں- میری خداوند قدوس سے دعا ہے کہ آپ تمام حضرات کی وہ اس کارخیر میں مدد فرمائے اور بہترین اجر سے نوازے-

□□□

مولانا محمد ارشاد عالم نعمانی، (دارالقلم، ذاکر نگر، نئی دہلی)

تصوف وسلوک اور طریقت و اصحاب طریقت کی تحقیق و تفہیم پر مشتمل آپ کی باوقار زیر ادارت نکلنے والا سالانہ مجلّہ ''الاحسان'' کا دعوتی مراسلہ موصول ہوا۔ کچھ ناگزیر مصروفیات کی وجہ سے میں آپ کے حکم کی تکمیل سے قاصر رہا جس کے لیے میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔

اہل سنت و جماعت کے کثیرالاشاعت اور مقبول خاص و عام رسالہ جام نور میں مجلّہ کے تعارفی اشتہار کے مطالعہ کے بعد مجلّہ کی قدر و منزلت اور معیار و منہاج کا صحیح علم ہوا۔ جس طرح آپ حضرات نے مجلّہ کی ابواب بندی کی ہے اور جن خطوط پر اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے یقیناً یہ تصوف وطریقت کی وسیع تفہیم و تحقیق کے باب میں ایک منفرد اور اپنی نوعیت کا مثالی مجلّہ ثابت ہوگا۔ آپ کی ٹیم میں شامل افراد کے اسما بھی مکمل طور سے اس بات کی ضمانت ہیں کہ اس مقصد خیر میں آپ کو امید سے زیادہ کامیابی میسر آئے گی۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ مجلّہ خود ایک معروف خانقاہ اور شیخ کامل کی سرپرستی میں نکل رہا ہے۔ جو مجلّہ کی کامیابی کی سو فیصد گارنٹی ہے۔ قابل مسرت بلکہ لائق تقلید اور مثالی قدم اٹھانے پر شیخ طریقت، مرشد برحق حضور شاہ احسان اللہ صفوی قبلہ مدظلہ العالی کو فقیر راقم السطور ہدیہ تبریک و تحسین پیش کرتا ہے اور بارگاہ رب العزت میں دعا گو ہے کہ اللہ رب کریم حضرت کا سایۂ عاطفت تا دیر ہم لوگوں پر قائم رکھے۔ اور دین وسنیت کا بیش از بیش خدمات لے۔

□□□

تاج الفحول اکیڈمی بدایوں شریف کی جدید مطبوعات

۱۔ احقاق حق (فارسی) — صفحات:155 — قیمت:65
سیدنا شاہ فضل رسول قادری بدایونی — ترجمہ وتحقیق: مولانا اسید الحق قادری

۲۔ عقیدۂ شفاعت: کتاب وسنت کی روشنی میں — صفحات:122 — قیمت:40
سیدنا شاہ فضل رسول قادری بدایونی — تسہیل وتخریج: مولانا اسید الحق قادری

۳۔ اختلافی مسائل پر تاریخی فتوی — صفحات:80 — قیمت:30
سیدنا شاہ فضل رسول قادری بدایونی — ترجمہ وتخریج: مولانا اسید الحق قادری

۴۔ اکمال فی بحث شد الرحال (فارسی) — صفحات:۔56 — قیمت:20
سیدنا شاہ فضل رسول قادری بدایونی — ترجمہ وتخریج: مولانا اسید الحق قادری

۵۔ فصل الخطاب — صفحات:48 — قیمت:20
سیدنا شاہ فضل رسول قادری بدایونی — تسہیل وتخریج: مولانا اسید الحق قادری

۶۔ حرز معظم (فارسی) — صفحات:56 — قیمت:20
سیدنا شاہ فضل رسول قادری بدایونی — ترجمہ وتخریج: مولانا اسید الحق قادری

۷۔ مولود منظوم (مع انتخاب نعت ومناقب) — صفحات:180 — قیمت:50
سیدنا شاہ فضل رسول قادری بدایونی

۸۔ سنت مصافحہ (عربی) — صفحات:64 — قیمت:20
تاج الفحول مولانا شاہ عبدالقادر قادری بدایونی — ترجمہ وتخریج: مولانا اسید الحق قادری

۹۔ الکلام السدید (عربی) — صفحات:40 — قیمت:20
تاج الفحول مولانا شاہ عبدالقادر قادری بدایونی — ترجمہ وتخریج: مولانا اسید الحق قادری

۱۰۔ رد روافض (فارسی) — صفحات:116 — قیمت:40
تاج الفحول مولانا شاہ عبدالقادر قادری بدایونی — ترجمہ وترتیب: مولانا اسید الحق قادری

۱۱۔ طوالع الانوار (تذکرۂ فضل رسول) — صفحات:104 — قیمت:35
مولانا انوار الحق عثمانی بدایونی — تسہیل وترتیب: مولانا اسید الحق قادری

۱۲۔ مردے سنتے ہیں — صفحات:92 — قیمت:45

مولانا عبدالقیوم شہید قادری بدایونی   ترتیب وتخریج: مولانا دلشاد احمد قادری

۱۳۔ مضامین شہید   صفحات:122   قیمت:35

مولانا عبدالقیوم شہید قادری بدایونی   ترتیب وتخریج: مولانا محمد عطیف قادری

۱۴۔ ملت اسلامیہ کا ماضی حال مستقبل   صفحات:70   قیمت:25

مولانا عبدالقیوم شہید قادری بدایونی   ترتیب وتقدیم: مولانا اسید الحق قادری

۱۵۔ عرس کی شرعی حیثیت   صفحات:136   قیمت:50

مولانا عبدالماجد قادری بدایونی   ترتیب وتخریج: مولانا دلشاد احمد قادری

۱۶۔ فلاح دارین   صفحات: 124   قیمت:55

مولانا عبدالماجد قادری بدایونی   ترتیب وتخریج: مولانا دلشاد احمد قادری

۱۷۔ خطبات صدارت   صفحات: 96   قیمت:30

عاشق الرسول مولانا عبدالقدیر قادری بدایونی   ترتیب وتقدیم: مولانا اسید الحق قادری

۱۸۔ مثنوی غوثیہ   صفحات: 46   قیمت:20

عاشق الرسول مولانا عبدالقدیر قادری بدایونی   ترتیب وتقدیم: مولانا اسید الحق قادری

۱۹۔ عقائد اہل سنت   صفحات:206   قیمت:75

مولانا محمد عبدالحامد قادری بدایونی   تخریج وتحقیق: مولانا دلشاد احمد قادری

۲۰۔ دعوت عمل   صفحات:72   قیمت:25

مولانا محمد عبدالحامد قادری بدایونی

۲۱۔ شارحۃ الصدور   صفحات:96   قیمت:30

مفتی حبیب الرحمٰن قادری بدایونی

۲۲۔ الدرر السنیۃ فی الرد علی الوہابیۃ   صفحات: 76   قیمت:25

شیخ احمد بن زینی دحلان مکی   ترجمہ: مفتی حبیب الرحمٰن قادری

۲۳۔ احکام قبور   صفحات:40   قیمت:15

مفتی محمد ابراہیم قادری بدایونی   تخریج وتحقیق: مولانا دلشاد احمد قادری

۲۴۔ ریاض القرأت   صفحات: 54   قیمت:25

مفتی محمد ابراہیم قادری بدایونی   ترتیب: قاری شان رضا قادری

۲۵۔ تذکار محبوب (تذکرہ حضرت تاج الفحول)   صفحات:64   قیمت:20

مولانا عبدالرحیم قادری بدایونی

۲۶۔ مختصر سیرت خیر البشر   صفحات:68   قیمت:30

مولانا محمد عبدالہادی قادری بدایونی

۲۷۔ احوال ومقامات   صفحات:110   قیمت:40

مولانا محمد عبدالہادی قادری بدایونی   ترتیب وتلخیص: مولانا اسید الحق قادری

۲۸۔ خمیازۂ حیات (مجموعۂ کلام)   صفحات:200   قیمت:80

مولانا محمد عبدالہادی قادری بدایونی

۲۹۔ باقیات ہادی   صفحات:212   قیمت:70

مولانا محمد عبدالہادی قادری بدایونی   ترتیب: مولانا اسید الحق قادری

۳۰۔ مدینے میں (مجموعۂ کلام)   صفحات:68   قیمت:20

حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری بدایونی

۳۱۔ مولانا فیض احمد بدایونی   صفحات:64   قیمت:20

پروفیسر محمد ایوب قادری   تقدیم وترتیب: مولانا اسید الحق قادری

۳۲۔ قرآن کریم کی سائنسی تفسیر ایک تنقیدی مطالعہ   صفحات: 64   قیمت:20

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری

۳۳۔ حدیث افتراق امت تحقیقی مطالعہ کی روشنی میں صفحات:84   قیمت:25

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری

۳۴۔ احادیث قدسیہ   صفحات:182   قیمت:50

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری

۳۵۔ تذکرۂ ماجد   صفحات:136   قیمت:40

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری

تقسیم کار: **مکتبہ جام نور**، ۴۲۲ مٹیا محل جامع مسجد، دہلی۔۶

اس شمارے کے خاص قلم کار

- مولانا یٰسین اختر مصباحی، بانی: دارالقلم قادری مسجد روڈ، ذاکر نگر، اوکھلا، نئ دہلی۔ ۲۵
- مولانا عبدالمبین نعمانی، بانی رکن: المجمع الاسلامی، ملت نگر، مبارک پور، اعظم گڑھ (یوپی)
- پروفیسر اختر الواسع، صدر: شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئ دہلی۔ ۲۵
- پروفیسر مسعود انور علوی، صدر: شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (یوپی)
- مولانا سید اشتیاق عالم شہبازی، سجادہ نشیں: خانقاہ شہبازیہ، ملا چک شریف بھاگل پور (بہار)
- پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، سابق چیئرمین: شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (یوپی)
- پروفیسر علی احسان ایتک، صدر: شعبۂ الٰہیات، ۹ ستمبر یونیورسٹی (ترکی)
- مولانا فیضان المصطفیٰ قادری، ایڈیٹر: سہ ماہی امجدیہ، گھوسی، مئو (یوپی)
- مولانا منظر الاسلام ازہری، کیری مسجد، ۱۰۷۶ W. Chatham Street کیری، نارتھ کیرولینا (امریکا)
- ڈاکٹر سید حسنین اختر، ریڈر شعبۂ عربی، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد (یوپی)
- ڈاکٹر حمید نسیم رفیع آبادی، شاہ ہمدان انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، سری نگر یونیورسٹی (کشمیر)
- ڈاکٹر مشتاق احمد تجاروی، استاذ: شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئ دہلی۔ ۲۵
- مولانا امام الدین مصباحی، استاذ: کلیۃ البنات السعیدیہ، جہانگیر نگر، گھورے، فتح پور (یوپی)
- مولانا مظہر حسین علیمی: الجامعۃ الغوثیۃ، کامبیکر اسٹریٹ، ممبئی۔ ۳

شاہ صفی اکیڈمی کی فخریہ پیش کش

گنجینۂ معانی، بحر حقائق ومعارف، اسرار ومسائل تصوف

نغمات الاسرار فی مقامات الابرار

جلد منظر عام پر

صریر خامہ

شیخ طریقت حضرت شاہ ابوسعید احسان اللہ چشتی محمدی دام ظلہٗ

تقدیم: پروفیسر مسعود انور علوی

حواشی: ذیشان احمد مصباحی

ناشر: شاہ صفی اکیڈمی، جامعہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد (یوپی)